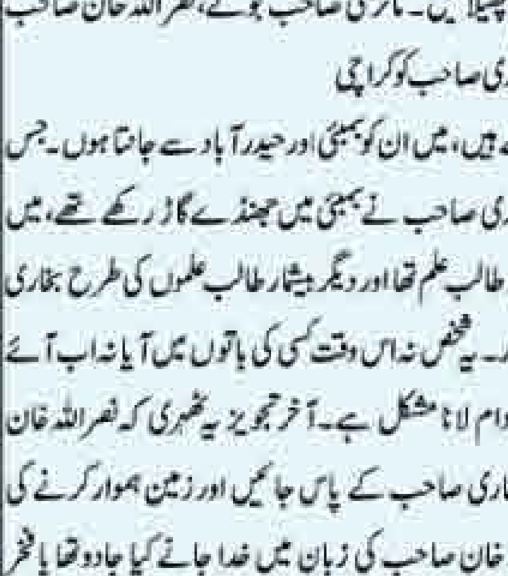


اتحادیوں نے خوبرو جرمن جاسوسہ کو جال میں پھنسا کر ہٹلر کا دھڑن تختہ کیا

کافر ادا حسینہ، دل پھینک امریکی افسروں سے اہم راز لیکر جرمنوں کو پہنچاتی تھی- آئزن ہاور نے بے وقوف بنانے کیلئے ہالینڈ میں فوجیں اتارنے کا فرضی منصوبہ تیار کیا- جس کا نقشہ جاسوسہ نے جرمنی پہنچایا تو تمام نازی فوج ہالینڈ میں جمع ہو گئی اور اتحادی افواج نے نارمنڈی میں اتر کر ہٹلر کا سورج غروب کر دیا- زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس

آج کل کرسٹائن کیلر کا نام تمام دنیا میں اچھالا جا رہا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی انگلستان کا نام، انگلستان کی سیاست کا نام اور بے چارے میکملن کا نام۔ زمانے کی ہوس پرستی دیکھئے کہ کرسٹائن کیلر کی اور وارڈ کی ناگفتہ حرکتوں کا تو ذکر ہے، مگر وہ جاسوسی والا معاملہ کہیں بیچ ہی میں دب دبا کر رہ گیا، جس سے قصے کا آغاز ہوا تھا۔ قصہ تو اس بات سے شروع ہوا تھا کہ انگلستان کے وزیر دفاع اور روس کے سفارت خانے کے ایک مقتدر اہل کار دونوں نے اس عورت سے محبت کی پینگیں بڑھا رکھی تھیں اور کیا تعجب کہ اس عورت کے ذریعے روس نے انگلستان کے وزیر دفاع سے راز کی باتیں معلوم کر لی ہوں۔



''حریت'' کی رسم بسم اللہ دسمبر 62ء کی تیسری تاریخ کو ہوئی اور ''حریت'' کا یہ پہلا پرچہ بخاری صاحب قبلہ کی سرگزشت کی پہلی قسط سے مزین تھا۔ قبلہ بخاری صاحب کو سرگزشت لکھنے پر کس طرح آمادہ کیا گیا؟ اس کا احوال ''آداب عرض'' کے مشہور مقالہ نویس اور لائق احترام جناب نصر اللہ خان یوں بیان فرماتے ہیں کہ ''جناب فخر ماتری مرحوم و مغفور اور میں کئی دن تک سر جوڑ کر بیٹھے رہے اور سوچتے رہے کہ بخاری صاحب کو ''حریت'' کی قلمی اعانت پر کیونکر آمادہ کیا جائے۔ سوچ بچار کے بعد میں نے صلاح دی کہ ماتری صاحب آپ بخاری صاحب کو اپنے گھر پر بلائیں اور ہوا کا رخ دیکھ کر دام پھیلائیں۔ ماتری صاحب بولے، نصر اللہ خان صاحب آپ تو شاید بخاری صاحب کو کراچی آ کر جاننے لگے ہیں، میں ان کو بمبئی اور حیدر آباد سے جانتا ہوں۔ جس زمانے میں بخاری صاحب نے بمبئی میں جھنڈے گاڑ رکھے تھے، میں اس زمانے میں طالب علم تھا اور دیگر بیشمار طالب علموں کی طرح بخاری صاحب کا پرستار۔ یہ شخص نہ اس وقت کسی کی باتوں میں آیا نہ اب آئے گا۔ اس کو زیر دام لانا مشکل ہے۔ آخر تجویز یہ ٹھہری کہ نصر اللہ خان صاحب پہلے بخاری صاحب کے پاس جائیں اور زمین ہموار کرنے کی کوشش کریں۔ خان صاحب کی زبان میں خدا جانے کیا جادو تھا یا فخر ماتری کے نام میں کیا طلسم تھا کہ بخاری صاحب ''حریت'' میں مضمون لکھنے پر آمادہ ہو گئے۔ مگر ساتھ ہی یہ پخ لگا دی کہ موضوع کا انتخاب ماتری صاحب کریں۔ اب فیصلہ یہ ہوا کہ ماتری صاحب اور بخاری صاحب چائے پر ملیں۔ تجدید ملاقات بھی ہو اور مضامین کا موضوع بھی طے پائے۔ فخری ماتری اور بخاری صاحب ملے۔ چائے پی گئی۔ احمد آباد کی باتیں ہوئیں۔ بمبئی کا تذکرہ ہوا۔ مسلم لیگ، پاکستان، ہندوستان، ہندو، مسلمان، غرض یہ کہ سب باتوں کا تذکرہ ہوا۔ فخر صاحب اس کوشش میں کہ مضمون کا ذکر بخاری صاحب کریں اور بخاری صاحب اس سعی میں کہ ماتری صاحب قصہ کا آغاز کریں!

جب ماتری صاحب بہت تنگ آ گئے تو تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر فرمایا، ارے بھائی مضمون کی بات بھی کرو گے یا نہیں۔ دونوں دوستوں کے قہقہے سے ہوٹل گونج اٹھا۔ اس کے بعد دونوں نہایت سنجیدگی سے موضوع پر غور کرنے لگے۔ جو مضمون بخاری صاحب تجویز کرتے، وہ ماتری صاحب رد کر دیتے۔ اور جو موضوع ماتری صاحب تجویز فرماتے وہ بخاری صاحب کو ناپسند ہوتا۔ آخر جب محفل برخاست ہوئی تو دونوں نے اتفاق رائے سے اس بات کو تسلیم کیا کہ دونوں کی تجاویز ناقابل تسلیم تھیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ دونوں الگ الگ سوچیں اور پھر مل کر ایک دوسرے کی تجاویز پر غور کریں۔ علیک سلیک کے بعد ماتری صاحب اپنی گاڑی میں سوار ہوئے اور بخاری صاحب قبلہ اپنی گاڑی میں۔ دونوں گاڑیاں چل پڑیں۔ اتنے میں ماتری صاحب نے اپنی گاڑی کا ہارن زور زور سے بجایا۔ بخاری صاحب نے سر موڑ کر ماتری صاحب کی گاڑی کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اشارے سے کہا کہ ٹھہر جایئے۔

ماتری صاحب بھی گاڑی سے اترے اور بخاری صاحب بھی۔ ماتری صاحب نے کہا موضوع مل گیا۔ بخاری صاحب نے کہا، کیا؟ فرمایا، اپنی سرگزشت لکھو۔ کچھ تامل کے بعد بخاری صاحب نے اس تجویز پر صاد کر دیا اور یوں یہ نادر روزگار سرگزشت شائع کرنے کا سہرا ''حریت'' کے سر رہا۔ یہ سرگزشت بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ اس میں دلچسپ خود کلامی کے بعد اہم حصے قارئین کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

اب ان راز کی باتوں کا کہیں ذکر نہیں آتا۔ صرف راز و نیاز کی باتوں کا چرچا ہے۔ یعنی قصہ غم دنیا سے چلا تھا، مگر غم جاناں کی طرف مڑ گیا۔

جاسوسی کا پیشہ ایسا ہیبت ناک پیشہ ہے کہ اس کی داستانیں سن کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس میں تو یہاں تک ہوتا ہے کہ جانتے ہیں کہ فلاں دشمن کا جاسوس ہے اور اگر چاہیں تو اس کو گرفتار کر لیں، اس کے گولی ماردیں، مگر نہیں۔ اسے کھلا چھوڑ دیتے ہیں اور طرح طرح سے اس کو غلط اطلاعات بہم پہنچاتے ہیں۔ اور یوں دشمن کو بھول بھلیاں میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آج میں ایک ایسا ہی بھول بھلیوں میں ڈال دینے والا قصہ سناتا ہوں۔

آپ کہیں گے کہ بخاری کو جاسوسی قصوں سے کیا مطلب؟

گزارش ہے کہ یہ خاکسار، سرکار کا نمک خوار، جنگ کے شروع میں سرکار کی جے پکارنے کے لیے لندن چلا گیا اور لندن کے علاوہ یورپ اور افریقہ کے جنگی محاذوں کے چکر بھی کاٹتا رہا۔ یوں کہئے کہ جنگی پرچہ نویس تھا۔ اور اسی پرچہ نویسی کے دوران میں ایسی ایسی باتیں اس کے کان میں پڑیں کہ نہ پڑتیں تو بہتر تھا۔

جنگ کے دوران میں تو اس قصے کی بھنک بہت کم آدمیوں کو تھی جو میں آپ کے پیش کر رہا ہوں، بلکہ جنگ کے بعد بھی کوئی دس سال تک اس قصہ کو صیغہ راز میں رکھا گیا اور کسی نے اس پر قلم نہ اٹھایا۔ آخر جب اس عجیب و غریب ڈرامے کے کردار مرکھپ گئے یا ادھر ادھر کھنڈ گئے تو اس قصے کی نقاب کشائی ہوئی۔

قصہ انگریزوں کے جنگ جیتنے کا ہے اور چھ جون 1944ء سے تعلق رکھتا ہے، جب اتحادیوں کی فوج نارمنڈی میں اتری اور ہٹلر کی فوج کو شکست ہوئی۔ یہ سب کچھ ایک جاسوسی کارنامہ کی بدولت ہوا۔

اس قصے کا آغاز 1943ء سے ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں اتحادی الجزائر شمالی افریقہ میں بیٹھے ہوئے جنگ کا نقشہ تیار کر رہے تھے۔ جنرل آئزن ہاور اور ان کے ساتھیوں نے منصوبہ تیار کیا کہ اتحادیوں کی فوجیں اچانک سسلی میں اتار دی جائیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ منصوبہ راز میں رکھا گیا اور ہر طرح مکمل انتظام اس امر کا کیا گیا کہ گنتی کے چند افسروں کے سوائے کسی کو اس کی خبر نہ ہو۔

جن افسروں کو اس راز کا علم تھا، ان میں ایک جوان امریکی بھی تھا۔ یہ صاحب داد عشرت دینے میں بہت طاق تھے۔ ان دنوں ایک ولندیزی لڑکی سے ان کی بہت گاڑھی چھن رہی تھی۔ یہ لڑکی دراصل ولندیزی نہ تھی، ولندیزی بنی ہوئی تھی۔ اصل میں یہ جرمن لڑکی تھی۔ اس کا نام تھا، فرض کیجئے حنیفہ۔ بلا کی خوبصورت، فن مہمان داری میں طاق، آداب گفتگو میں فرد۔

جنرل آئزن ہاور کے خفیہ دفتر میں فیصلہ ہوا کہ اتحادی فوج سسلی میں اترے۔ صبح کو فیصلہ ہوا اور شام کو اس کی اطلاع برلن کو مل گئی اور جنرل آئزن ہاور کے کیے دھرے پر پانی پھر گیا۔ اتحادی فوج نے وہ منہ کی کھائی کہ اس کی فوج کے بڑے بڑے سورما بیٹھے زخم چاٹتے رہے۔

اب تشویش یہ ہوئی کہ جرمنوں کو کیسے معلوم ہو گیا کہ اتحادی حملہ کرنے والے ہیں۔ سسلی میں تو جرمنوں کی فوج نہ تھی اور اگر تھی بھی تو بہت معمولی۔ یہ کیوں کر ہوا کہ انہوں نے اتحادیوں کے حملے کے دن سے ٹھیک پہلے تمام فوج وہاں بلالی۔ ضرور کوئی گھر کا بھیدی ہے، جس نے اتحادیوں کی یہ لنکا ڈھائی ہے۔

یہ ڈھونڈ مچی ہوئی تھی کہ وہ امریکی میجر صاحب منہ بسورے ہوئے آئے جو حنیفہ کے ساتھ رنگ رلیاں منانے میں مشہور تھے۔ یہ صاحب اداس بیٹھے تھے۔ کسی نے پوچھا کیوں بھئی کیا ہوا۔ آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور فرمایا میری حنیفہ کہیں چلی گئی۔

ہوتے ہوتے خبر سب میں مشہور ہوئی کہ حنیفہ میجر صاحب کو چھوڑ کر بھاگ گئی ہے۔ جب یہ خبر خفیہ دفتر والوں کے پاس پہنچی تو ان کے کان کھڑے ہوئے۔ میجر صاحب کی طلبی ہوئی اور ان سے وہ پوچھ گچھ ہوئی جو پوچھ گچھ کا حق ہے۔ معلوم ہوا کہ حضرت نے عشق کی ترنگ میں آ کر حنیفہ کو بتا دیا تھا کہ ہم فلاں تاریخ کو سسلی پر حملہ کرنے والے ہیں۔

اس زمانے میں خفیہ کارروائیوں کے انچارج جنرل ڈنوون تھے۔ ان کے ساتھ ان کے دست راست دو افسر تھے۔ ان تینوں نے صلاح کی کہ جو ہوا سو ہوا، اب ایسی تدابیر کرنی چاہئیں کہ حنیفہ کو یہ خیال بھی نہ گزرے کہ ہم اس پر شک کر رہے ہیں۔ حنیفہ کو یہ خیال رہا کہ مجھ پر کسی کو شبہ نہیں تو وہ پھر کسی نہ کسی دن جاسوسی کرنے آ نکلے گی، پھر جو ہو سو ہو۔

اب سنئے کہ اس بات کو کوئی مہینہ بھر بھی نہ گزرا تھا، ایک نوجوان افسر خوشی خوشی کینٹین میں آئے اور فرمایا کہ حنیفہ ہالینڈ سے لندن آ گئی ہے۔ اس کو کیا معلوم کہ اس ظالم کافرہ کا یہاں کس کس کو انتظار تھا۔ خفیہ دفتر والوں نے جب سنا کہ بی صاحبہ تشریف لے آئی ہیں تو بہت خوش ہوئے۔ ادھر بی صاحبہ تھیں کہ کھلے بندوں ہوٹلوں میں، کلبوں میں، سیر تماشوں میں فوجی افسروں سے ملتی تھیں اور ان کا جی بہلاتی تھیں۔ انہیں کیا معلوم کہ مجھے کوئی تاڑ رہا ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ خفیہ والے میرے کرتوتوں سے واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ میں جرمن نژاد ہوں اور جرمنوں کی جاسوس ہوں۔

اس عورت کی موجودگی سے کیا فائدہ اٹھایا جائے؟ کس طرح اس عورت کو دھوکا دیا جائے؟ کس طرح اس عورت کے ذریعہ جرمنوں کو غلط فوجی اطلاعات دی جائیں؟ وہ کیا اطلاع ہو جو غلط بھی ہو اور جرمنوں کو سخت ترین مغالطے میں بھی ڈال دے؟ یہ تھے وہ سوال جو خفیہ دفتر کے افسروں کے ذہن میں چکر لگا رہے تھے۔

ان دنوں اتحادی اپنی فوجیں نارمنڈی میں اتارنے والے تھے اور حملے کی تیاریاں مکمل کر رہے تھے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ ان کے جاسوس انہیں یہ بھی خبریں پہنچا رہے تھے کہ جرمنوں کو اس حملے کی تیاریوں کا پورا پورا علم ہے اور وہ مقابلے کے لیے ہر قسم کی جوابی تیاریاں کر رہے ہیں۔

اب فوجی خفیہ دفتر نے یہ تجویز سوچی کہ حملے کا رخ بدلنے کی جھوٹی تیاری کی جائے اور یہ ظاہر کیا جائے کہ چونکہ اتحادیوں کو جرمنوں کی جوابی تیاری کا حال معلوم ہو گیا ہے اس لیے اب وہ نارمنڈی میں اپنی فوجیں نہیں اتاریں گے، بلکہ نارمنڈی کے بجائے ہالینڈ کے راستے حملہ کریں گے۔

اب دیکھئے اس کام کی تیاریاں اور اس میں حنیفہ کا کردار۔ اتحادیوں کے خفیہ محکمے کو یقین تھا کہ یہ کمبخت عورت اس بلا کی حسین اور ذہین ہے کہ جس افسر پر چاہے اپنا جادو چلا دے اور اس سے کسی نہ کسی طرح خفیہ سے خفیہ راز بھی اگلوا لے۔

اب یہ تلاش ہوئی کہ وہ افسر کون ہو جس سے یہ لڑکی راز اگلوائے۔ چنانچہ ایک نہایت لائق، خوبصورت، نہایت رعنا افسر ڈھونڈ نکالا گیا۔ مگر مصیبت یہ آن پڑی کہ افسر اتنا بڑا ایکٹر نہ تھا کہ حنیفہ کو پھانسنے میں لے آئے۔ اگر اس افسر کو معلوم ہو گیا کہ یہ عورت جاسوس ہے اور میں اس کو غلط اطلاع دیکر پھانسنے میں لا رہا ہوں تو یہ شخص اس عورت کے ساتھ گرم جوشی سے نہ مل سکے گا۔ اور وہ عورت تاڑ لے گی کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔

فیصلہ یہ ہوا کہ اس نوجوان افسر کو، جس کا نام فرض کیجئے جان تھا، یہ نہ بتایا جائے کہ یہ عورت جاسوس ہے اور نہ اس کو یہ بتایا جائے کہ جس حملے کی تیاری کے کاموں پر تم کو لگایا جا رہا ہے، وہ دراصل دشمن کی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہے۔ مراد اس سے یہ مصلحت وقت کہئے یا کچھ اور، خفیہ دفتر نے اپنے خاص آدمی کو بھی دھوکا دینے سے گریز نہ کیا۔

اب اس مسئلہ پر سوچ بچار ہونے لگا کہ کوئی ایسا ادارہ ہو جس میں ہالینڈ پر حملے کی تیاری کا جھوٹا منصوبہ تیار کیا جائے۔

اس کی ترکیب دیکھئے۔ ایک فلم کمپنی بنائی گئی۔ وارڈو سٹریٹ لندن میں اس کا باقاعدہ دفتر اور اسٹوڈیو بنایا گیا۔ اس کمپنی میں سب کے سب ہالینڈ کے باشندے رکھے گئے۔ وطن پرست، وطن سے ہٹلر کی مار کھا کر نکلے ہوئے لندن میں پناہ گزیں۔ اس فلم کمپنی کا کام یہ تھا کہ ہالینڈ کے لٹے پٹے لوگوں کے متعلق دستاویزی فلمیں بنائے، پمفلٹ جاری کرے اور کسی نہ کسی طریقے سے یہ پمفلٹ ہالینڈ میں پہنچائے، تاکہ وہاں کے لوگوں کا حوصلہ بڑھے اور وہ یقین کر لیں کہ ایک نہ ایک دن اتحادی ہم کو ہٹلر کے چنگل سے چھڑا دیں گے۔

اس کمپنی میں اتحادیوں نے مظلوم ولندیزیوں کی امداد کے لیے اپنے دو چار افسر بھی متعین کر دیے۔ ان افسروں میں ایک تو جان تھا اور دو چار اور۔ ان سے کہا گیا کہ دیکھو کانوں کان کسی کو اس کی خبر نہ ہو کہ اتحادی ہالینڈ میں اپنی فوجیں اتارنے والے ہیں۔

یہ ادارہ چند ہی ہفتے میں اپنا کام کرنے لگا۔ دھڑا دھڑ دستاویزی فلمیں بننے لگیں، پمفلٹ چھپنے لگے اور ادارے میں کام کرنے والا ہر ولندیزی یہ سمجھنے لگا کہ میں اپنے وطن کو آزاد کرانے کے لیے کام کر رہا ہوں۔

جب اس ادارے کا کام اطمینان بخش طور پر چلنے لگا تو اس بات کی تدبیریں ہونے لگیں کہ جان اور حنیفہ کو ایک دوسرے سے ملایا جائے۔ ان دنوں حنیفہ ایک اور افسر کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی تھی، مگر اس افسر کو اس فلمی ادارے سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ اور نہ مناسب سمجھا گیا کہ اس افسر کو اس ادارے میں شامل کر لیا جائے۔ بہت غور و خوض کے بعد ایک بہت بڑی دعوت کا اعلان کیا گیا۔ اس دعوت میں بہت سے افسروں کو بلایا گیا، جن میں جان بھی تھا اور وہ افسر بھی جس کے ساتھ حنیفہ گلچھرے اڑا رہی تھی۔ ترکیب ایسی چلی گئی کہ اس افسر نے کہہ سن کر حنیفہ کے نام بھی دعوت نامہ جاری کرا دیا۔

عین دعوت کے دن اس افسر کو ایک سرکاری کام پر چھ سات سو میل دور ہوائی جہاز کے ذریعہ بھیج دیا گیا اور یوں حنیفہ اس افسر کے بغیر دعوت میں شریک ہوئی۔ یعنی کباب بغیر ہڈی کے۔ یہ دعوت کیا تھی محفل جمشید تھی۔ شراب پانی کی طرح بہہ رہی تھی اور موسیقی کا ایسا آہنگ قائم تھا کہ سرور کی کیفیت دوبالا ہو رہی تھی۔

حنیفہ کا محفل میں آنا تھا کہ محفل جگمگا اٹھی۔ تمام نگاہیں حنیفہ کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ خفیہ دفتر کا ایک افسر آگے بڑھا اور اس نے نہایت تپاک سے حنیفہ کو خوش آمدید کہا۔ شراب کا دور چلا۔ دل و دماغ پر سرور طاری ہوا اور آنکھوں میں لال لال ڈورے پڑنے لگے۔

خفیہ دفتر کے افسر شراب کے نشے میں بدمست ہونے والے کہاں، مگر اب کے اس نے اپنے اوپر ایسا سرور طاری کیا کہ حنیفہ بھی اس کے چکر میں آ گئی۔ دونوں اٹھ کر رقص کرنے لگے۔ گھوم گھوم کر اور جھوم جھوم کر۔ جان اس دنیا سے الگ ایک میز پر تنہا بیٹھا شراب کے کڑوے گھونٹ حلق سے اتار رہا تھا۔ نہ جانے اس کو تنہائی کاٹ رہی تھی یا اپنے کسی خیال میں غرق تھا۔

رقص کرتے کرتے جب خفیہ افسر کی نظر جان پر پڑی تو اس نے حنیفہ سے کہا کہ دیکھو اس آدمی کی طرف بھی نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھنا۔ حنیفہ بولی کون آدمی؟ خفیہ افسر نے کہا وہ سنہری بالوں والا۔ اپنے آپ کو بہت بڑا خفیہ افسر سمجھتا ہے۔ گھمنڈ اس کو یہ ہے کہ کوئی لڑکی میرے چنگل سے بچ کر نہیں جا سکتی، اور خدا جانے لڑکیوں کو کیا ہو گیا ہے کہ جس کو دیکھو اس پر جان چھڑکتی ہے۔ دو چار مرتبہ یہ دشمن کی فوج میں گھس کر اس کے راز کیا معلوم کر لایا کہ زمین پر گھمنڈ کے مارے اس کا پاؤں ہی نہیں ٹکتا۔

اب جو رقص کچھ دیر کے لیے ختم ہوا تو خفیہ فوجی افسر کہیں ادھر ادھر ٹل گیا۔ کوئی بیس پچیس منٹ بعد آ کر دیکھتا ہے کہ حنیفہ اور جان ایک دوسرے سے بغلگیر ہیں اور ہرے بھرے پودوں کی طرح رقص میں لہک رہے ہیں۔

رقص و سرود کی محفل رات گئے تک قائم رہی۔ کوئی دو ڈھائی بجے محفل ختم ہوئی تو بہکی بہکی نگاہیں، لڑکھڑاتے ہوئے قدم، لوگ رقص گاہ سے باہر نکل کر گاڑیوں میں بیٹھنے لگے اور اپنے اپنے گھر کی راہ لینے لگے۔ ایک ٹیکسی میں حنیفہ سوار ہوئی اور اس کے ساتھ جان بھی۔

حنیفہ کی قیام گاہ پر سراغ رساں پہلے ہی سے متعین تھے۔ انہوں نے خفیہ فوجی دفتر کو اطلاع دی کہ جان، حنیفہ کے ساتھ اس کی قیام گاہ میں داخل ہو گیا ہے۔ اگلے روز صبح نو بجے سراغ رساں نے پھر اطلاع دی کہ ابھی ابھی جان ٹیکسی میں بیٹھ کر دفتر کی طرف روانہ ہوا ہے۔

حنیفہ جرمن جاسوس اور سادہ لوح کپتان جان کی دوستی ہو گئی اور وہ بھی ایسی کہ دونوں ایک دوسرے پر فریفتہ۔ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ سائے کی طرح۔ کپتان جان تو دل و جان سے اس پر فدا، مگر وہ جان جیسے کپتان پر قربان اور دل سے جرمنوں کے ساتھ۔ کمبخت محبت کی پینگیں بھی بڑھاتی تھی اور اتحادیوں کے فوجی راز پر بھی ہاتھ ڈالتی جاتی تھی۔

جب کپتان جان اور حنیفہ آپس میں خوب گھل مل گئے اور خفیہ دفتر والوں کو یقین ہو گیا کہ دونوں ایک دوسرے کے چنگل میں ہیں تو انہوں نے کپتان جان کو بڑی بڑی کانفرنسوں میں بلانا شروع کیا۔ ایسی کانفرنسیں جو بند کمروں میں ہوتی ہیں۔ ایسے کمروں میں جن کی دیواروں پر موٹے موٹے گدیلے جڑے ہوتے کہ اندر کی آواز باہر نہ جانے پائے۔ ایسے کمرے جن کے باہر بیس بیس فٹ تک خاردار تار کے گچھے پڑے ہوتے ہیں اور بیس فٹ کے باہر مسلح پہرہ ہوتا ہے۔

کپتان جان ایسی کانفرنسوں میں بلایا جاتا تھا۔ ایسی کانفرنسوں میں ہالینڈ پر فوجیں اتارنے کی تیاریوں کا ذکر کیا جاتا تھا۔ اور حملے کے انتظامات کے متعلق بحث کی جاتی تھی۔

لندن میں تو یہ کچھ ہوتا تھا اور ادھر جرمنی میں اتحادیوں کے جاسوس اس ٹوہ میں رہتے تھے کہ ان کانفرنسوں کا حال یہاں جرمنی میں ہٹلر کو معلوم ہوتا ہے یا نہیں۔ وہ فوراً اطلاع دیتے تھے کہ ہٹلر کے ہائی کمان کو معلوم ہوا ہے کہ فلاں مقام پر لندن میں کانفرنس ہوئی ہے اور اس میں ہالینڈ پر حملے کی تیاریوں پر بحث ہوئی تھی۔

ہوتا یہ تھا کہ لندن کی کانفرنسوں کی تمام باتیں کپتان اپنی سادگی میں حنیفہ کو بتا دیتا تھا اور حنیفہ یہ باتیں خفیہ طریقے سے جرمنی پہنچا دیتی تھی۔

لندن کے خفیہ دفتر نے حنیفہ کو مزید پھانسا دینے کے لیے ایک ترکیب چلی۔ کپتان جان کو حکم دیا کہ تمہیں نہایت خفیہ کاغذات لیکر فرانس جانا ہے۔ ایک خفیہ طیارے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ یہ طیارہ تم کو رود بار انگلستان کے پار لے جائے گا اور جرمن فوجوں کے عقب میں اتار دے گا۔ وہاں تم سے ہمارا ایک جاسوس آ کر ملے گا۔ اس کو یہ کاغذات دے دینا۔ کل رات کو بارہ بجے سفر کے لیے تیار ہو جاؤ اور فلاں ہوائی اڈے پر پہنچ جاؤ۔

ان سراغ رسانوں نے جو حنیفہ کے گھر پر متعین تھے اطلاع دی کہ کپتان جان رو رو کر حنیفہ سے رخصت ہوا۔ اتحادیوں کے جاسوس نے جرمنی سے اطلاع دی کہ لندن سے ہٹلر کے خفیہ دفتر کو خبر ملی ہے کہ ایک جاسوس انگلستان سے فرانس کے ساحل پر فلاں وقت اترے گا۔ وہ کچھ کاغذات وہاں کسی جاسوس کو دے گا۔ جو جاسوس لندن سے آ رہا ہے اس کو نہ کسی قسم کا گزند پہنچایا جائے نہ اس کو گرفتار کرنے کی کوشش کی جائے۔ البتہ اس جاسوس پر ضرور نگاہ رکھی جائے جس کو لندن کا جاسوس کاغذات کا پلندہ دے گا۔

یہی ہوا۔ کپتان جان رات کی تاریکی میں فرانس پہنچا۔ اس سے ایک جاسوس ملا اور کاغذات لے کر چلا گیا۔ کپتان جان صحیح سلامت لندن پہنچ گیا۔ لیکن اس دوسرے جاسوس کو جرمنوں نے مار ڈالا۔

اب حنیفہ کی ہٹلر کے خفیہ دفتر میں دھاک بیٹھ گئی۔ سب کو یقین ہو گیا کہ حنیفہ بہت غضب کی سراغ رساں ہے، لہٰذا اس کی باتوں پر اعتبار کر لینا چاہیے، مگر چند جرمن جرنیل شکی واقعہ ہوئے تھے۔

جب جرمن جرنیلوں کی شک و شبہ کی خبر لندن کے خفیہ دفتر والوں کے پاس پہنچی تو وہ سوچ میں پڑ گئے کہ ایسی کون سی تدبیریں کی جائیں کہ جرمن جرنیلوں کے دل میں کوئی شک و شبہ نہ رہے اور وہ واقعی سمجھنے لگیں کہ اتحادی نارمنڈی کے ساحل پر نہیں، بلکہ ہالینڈ کے ساحل پر اپنی فوجیں اتارنے والے ہیں۔

اس ضمن میں لندن کے خفیہ دفتر نے دو تدبیریں کیں اور وہ دونوں کامیاب رہیں۔ ایک تدبیر تو یہ تھی کہ ان لوگوں کی سرگرمیاں تیز کر دی جائیں جو ہالینڈ میں تخریبی کارروائیاں کر رہے تھے۔ ان کے ایک سربراہ کو خفیہ طیارے کے ذریعہ لندن بلوایا۔ وہ ولندیزی اور یہ انگریز۔ ''زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم''۔ ضرورت اس امر کی پڑی کہ بیچ میں کسی اعتباری مترجم کو بلایا جائے۔ خفیہ دفتر کے ایک بڑے افسر نے کپتان جان سے ذکر کیا اور کہا کہ مترجم کے بغیر کام بنے گا نہیں اور اعتباری مترجم کا ملنا بے انتہا مشکل ہے۔ کپتان جان یہ سن کر پہلے تو کچھ ہچکچایا پھر بولا میں ایک عورت کو جانتا ہوں، ہالینڈ کی رہنے والی ہے، میری بے انتہا دوست ہے اور نہایت قابل اعتماد ہے۔ خفیہ دفتر کا افسر بولا ہاں اگر تمہیں اس پر اعتبار ہے تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں، اس کا نام اور پتہ دے دو تاکہ میں اپنے طور پر بھی کچھ دریافت کر لوں کہ وہ عورت بھروسے کے قابل ہے یا نہیں۔

خفیہ دفتر والوں کو حنیفہ کے بارے میں دریافت تو کیا کرنا تھا، انہوں نے تو پانسا پھینکا تھا کہ مترجم کا ذکر کریں گے تو جان حنیفہ کا نام لے گا، ہم حنیفہ کو بلالیں گے اور اس کے سامنے ہالینڈ سے آئے ہوئے جاسوس کے ساتھ باتیں کریں گے۔ حنیفہ جب اپنے کانوں سے ساری باتیں سن لے گی تو اس کو مزید یقین ہو جائے گا کہ اتحادی ہالینڈ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں اور ظاہر بات ہے کہ وہ تمام گفتگو جرمنی پہنچائے گی۔

ہالینڈ سے وہ خفیہ آدمی آیا۔ خفیہ کمرے میں اس کے ساتھ کھل کر باتیں ہوئیں کہ اتحادی ہالینڈ کے ساحل پر اپنی فوجیں اتار رہے ہیں۔

حنیفہ مترجم کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ لہٰذا سب کچھ سن رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی کہ سب حالات پوست کندہ مجھے معلوم ہو گئے۔

حنیفہ نے یہ سب حالات جرمنی پہنچا دیے۔ وہاں سب لوگ بوکھلا گئے کہ اب کیا ہو گا۔ اور کیا کرتے، اپنی فوجوں کو نارمنڈی کے ساحل سے ہٹانے کی تدبیریں کرنے لگے۔

جب اتحادیوں کے جاسوسوں نے خبر پہنچائی کہ جرمن نارمنڈی سے اپنی فوجیں ہٹانے کی تدبیر کر رہے ہیں تو بہت خوش ہوئے کہ تیر نشانے پر بیٹھا۔ انہوں نے حنیفہ کو اس فلم کمپنی کے دفتر میں ملازم رکھ لیا اور تمام پراپیگنڈے کا کام اس کے سپرد کر دیا۔ اب رات دن فلموں کے مسودے تیار ہونے لگے۔ فلم کیمرے رات دن چلنے لگے۔ ایکٹروں کی ریل پیل ہو گئی۔ چھاپے خانے کو حکم دیا گیا کہ چوبیس گھنٹے کھلا رہے اور چوبیس گھنٹے حملے کے متعلق ہدایات اور کاغذات چھاپا جائے۔

ان سب کاموں میں پیش پیش حنیفہ کو رکھا گیا۔ وہ یہاں کا کام بھی کرتی تھی اور یہاں کے کاغذات کے ایک ایک پرزے کی نقل جرمنی بھی خفیہ طور پر بھیجتی۔

کپتان جان غریب بالکل بے گناہ، اس کو کیا معلوم کہ حنیفہ دشمن کی جاسوس ہے اور دشمن کو اطلاعات بھیج رہی ہے۔ خفیہ دفتر والوں کو سب سے بڑی تشویش یہ تھی کہ کپتان جان کو یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ حنیفہ دشمن کی جاسوس ہے۔ اگر کہیں کپتان جان کو یہ معلوم ہو گیا کہ حنیفہ دشمن کی جاسوس ہے تو وہ تمام بھانڈا پھوڑ دے گا۔ اس وقت حنیفہ کو گرفتار کر کے کیفر کردار تک پہنچانا پڑتا اور بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا۔ اور دشمن تک ہالینڈ پر حملے کی خبر پہنچانے والا کوئی نہ رہتا۔

میں نے حنیفہ کو ایک دو مرتبہ دیکھا ہے، بے حد حسین تھی اور نک سک کی ایسی درست کہ معلوم ہوتا تھا کہ نہایت ہی اعلیٰ خاندان کی ہے۔ کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ پارٹی ہو، اس میں اس کے نام دعوت نامہ ضرور آتا اور دعوت میں ہر شخص اسی بات کا مشتاق رہتا کہ حنیفہ مجھ سے بات کرے، میری میز پر آئے، میرے ساتھ تصویر کھنچوائے۔

میرے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ کافر جاسوس ہو سکتی ہے۔ ایک مجھ ہی پر کیا منحصر، کوئی بھی اس کو جاسوس نہ سمجھتا تھا۔ اگر اس کے جاسوس ہونے کا کسی کو علم تھا تو صرف تین آدمیوں کو۔ ایک تو جنرل ڈنوون کو اور دوسرے اس کے دو افسروں کو۔ جب کپتان جان جیسا آدمی اس کو جاسوس نہ سمجھتا تھا تو ہم آپ کس شمار میں ہیں۔

خیر چھوڑیئے میرے قصہ کو۔ میں کیا بتاؤں ان گنہگار آنکھوں نے کیا کیا کچھ دیکھا اور ان معصیت زدہ کانوں نے کیا کیا کچھ سنا۔ آیئے پھر حنیفہ اور جان کا قصہ سنیں۔ دیکھیں اور غور کریں کہ جاسوسی کے فن کو اتحادیوں نے کس عروج پر پہنچا دیا تھا۔

اتحادیوں کے جاسوسوں نے جرمنی سے اطلاع دی کہ ہٹلر کا ہائی کمان اس فوجی نقشے کی تلاش میں ہے جس کے مطابق اتحادی اپنی فوجیں ہالینڈ میں اتارنے والے ہیں۔ اس نقشہ جنگ کو حاصل کرنے کے لیے انہوں نے اپنے جاسوسوں کو لندن میں کہلا بھیجا ہے۔ لہٰذا احتیاط لازمی ہے۔

احتیاط کیسی، لندن کا خفیہ دفتر تو چاہتا ہی یہی تھا کہ کسی نہ کسی طرح یہ جنگی نقشہ جرمنی کے جاسوسوں کے ہاتھ لگ جائے اور وہ اسے جرمنی بھیج دیں تاکہ وہاں والوں کو یقین ہو جائے کہ اتحادی نارمنڈی میں نہیں، بلکہ ہالینڈ میں اپنی فوجیں اتارنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

لندن کے خفیہ دفتر نے نہایت احتیاط سے اتحادی فوجوں کو ہالینڈ میں اتارنے کا نقشہ تیار کیا۔ یہ نقشہ ہر اعتبار سے مکمل تھا اور بالکل ویسا ہی تھا جیسے جنگ کا اصلی نقشہ ہونا چاہیے۔

جب یہ نقشہ مکمل ہو گیا اور تجوری میں رکھ دیا گیا تو اس تدبیر پر غور ہونے لگا کہ حنیفہ کو یہ نقشہ چرانے پر کس طرح اکسایا جائے۔

خفیہ دفتر کا بڑا افسر تین مرتبہ اپنی چابیاں میز پر یوں چھوڑ کر چلا گیا جیسے بھول گیا ہو، مگر ہر مرتبہ آ کر دیکھا کہ چابیاں جوں کی توں پڑی ہیں اور کسی نے ان کو چھوا تک نہیں۔ ایک مرتبہ اس نے اپنی چابیاں کپتان جان کو بھی دے دیں اور دے کر بھول گیا۔ خیال اس کا یہ تھا کہ شاید جان یہ چابیاں گھر لے جائے اور وہاں حنیفہ چوری سے ان چابیوں جیسی دوسری چابیاں بنوالے۔

ایک دن خفیہ دفتر کے بڑے افسر نے جنگی نقشہ تجوری سے نکالا، کپتان جان اور ایک آدھ اور افسر کو دکھایا اور ضروری صلاح مشورہ کرنے کے بعد نقشے کو پھر تجوری میں رکھ دیا اور جان سے کہا، آؤ باہر چلیں کھانا کھائیں۔ مراد اس کی یہ تھی کہ جان کو دفتر سے باہر لے جاؤں تاکہ حنیفہ اکیلی دفتر میں رہ جائے اور تجوری کھول کر نقشہ اڑا لے۔

جب خفیہ دفتر کا بڑا افسر جان کو لے کر باہر گیا تو حنیفہ نے کام شروع کر دیا۔ اپنا ہینڈ بیگ کھولا اور اس میں سے تجوری کی وہ چابی نکالی جو اس نے بنوا رکھی تھی۔ چابی کو تجوری کے تالے میں ڈالا، کھٹ کی آواز آئی اور تجوری کھل گئی۔ حنیفہ نے نقشے نکالے میز پر پھیلائے اور ماچس کے برابر کیمرے سے ان نقشوں کی دھڑا دھڑ تصویریں لے لیں!

حنیفہ نے سب کام مکمل کر لیا تھا۔ نقشے کی تصویریں اس کے کیمرے میں تھیں۔ اس نے اصلی نقشے پھر تجوری میں رکھ دیے، تجوری کا تالا بند کر دیا اور باہر سڑک پر آ گئی۔

اب حنیفہ کا صرف ایک ہی کام رہ گیا تھا اور وہ یہ کہ انگلستان سے بھاگ کر جرمنی پہنچے اور انگلستان کے جنگی نقشے ہائی کمان میں پیش کرے۔

حنیفہ جرمنی پہنچی۔ وہ نقشے ہائی کمان کو پیش کیے۔ وہاں سخت بھگدڑ مچ گئی اور نہایت سرعت سے ہٹلر کی تمام فوج ہالینڈ میں جمع ہو گئی۔ اتنے میں 6 جون 1944ء کا سورج نمودار ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی کہ اتحادیوں کی فوج نارمنڈی کے ساحل پر اتری اور ہٹلر کا چڑھا ہوا سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

عورت دھوکا دینے میں بہت ماہر مشہور ہے، لیکن مرد بھی اس سے کچھ کم نہیں۔ حنیفہ سے پوچھئے! (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

منگل/18مارچ2014ء
روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد



سر آغا خان کی تقریر سننے کیلئے اسماعیلیوں نے بمبئی کے سارے ریڈیو خرید لئے

اطلاع ملنے پر ہزاروں مداحوں نے اسٹوڈیو آنے کی اجازت طلب کی-معذرت پر سڑک پر اکٹھے ہونے کا اعلان کر دیا-مجبوراً گھر جا کر تقریر ریکارڈ کرنا پڑی-اسٹوڈیو آنے والے وائسرائے کے فحش لطیفے کی حادثاتی ریکارڈنگ نے میری جان نکال دی-زیڈ اے بخاری کی کتاب ''سرگزشت'' سے اقتباس



''حریت'' کی رسم بسم اللہ دسمبر 62ء کی تیسری تاریخ کو ہوئی اور ''حریت'' کا یہ پہلا پرچہ بخاری صاحب قبلہ کی سرگزشت کی پہلی قسط سے مزین تھا۔ قبلہ بخاری صاحب کو سرگزشت لکھنے پر کس طرح آمادہ کیا گیا؟ اس کا احوال ''آداب عرض'' کے مشہور مقالہ نویس اور لائق احترام جناب نصر اللہ خان یوں بیان فرماتے ہیں کہ ''جناب فخر ماتری مرحوم و مغفور اور میں کئی دن تک سر جوڑ کر بیٹھے رہے اور سوچتے رہے کہ بخاری صاحب کو ''حریت'' کی قلمی اعانت پر کیونکر آمادہ کیا جائے۔ سوچ بچار کے بعد میں نے صلاح دی کہ ماتری صاحب آپ بخاری صاحب کو اپنے گھر پر بلائیں اور ہوا کا رخ دیکھ کر دام پھیلائیں۔ ماتری صاحب بولے، نصر اللہ خان صاحب آپ تو شاید بخاری صاحب کو کراچی آ کر جاننے لگے ہیں، میں ان کو بمبئی اور حیدر آباد سے جانتا ہوں۔ جس زمانے میں بخاری صاحب نے بمبئی میں جھنڈے گاڑ رکھے تھے، میں اس زمانے میں طالب علم تھا اور دیگر بیشمار طالب علموں کی طرح بخاری صاحب کا پرستار۔ یہ شخص نہ اس وقت کسی کی باتوں میں آیا نہ اب آئے گا۔ اس کو زیر دام لانا مشکل ہے۔ آخر تجویز یہ ٹھہری کہ نصر اللہ خان صاحب پہلے بخاری صاحب کے پاس جائیں اور زمین ہموار کرنے کی کوشش کریں۔ خان صاحب کی زبان میں خدا جانے کیا جادو تھا یا فخر ماتری کے نام میں کیا طلسم تھا کہ بخاری صاحب ''حریت'' میں مضمون لکھنے پر آمادہ ہو گئے۔ مگر ساتھ ہی یہ بخ لگا دی کہ موضوع کا انتخاب ماتری صاحب کریں۔ اب فیصلہ یہ ہوا کہ ماتری صاحب اور بخاری صاحب چائے پر ملیں۔ تجدید ملاقات بھی ہو اور مضامین کا موضوع بھی طے پائے۔ فخری ماتری اور بخاری صاحب ملے۔ چائے پی گئی۔ احمد آباد کی باتیں ہوئیں۔ بمبئی کا تذکرہ ہوا۔ مسلم لیگ، پاکستان، ہندوستان، ہندو، مسلمان، غرض یہ کہ سب باتوں کا تذکرہ ہوا۔ فخر صاحب اس کوشش میں کہ مضمون کا ذکر بخاری صاحب کریں اور بخاری صاحب اس سعی میں کہ ماتری صاحب قصہ کا آغاز کریں!

جب ماتری صاحب بہت تنگ آ گئے تو تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر فرمایا، ارے بھائی مضمون کی بات بھی کرو گے یا نہیں۔ دونوں دوستوں کے قہقہے سے ہوٹل گونج اٹھا۔ اس کے بعد دونوں نہایت سنجیدگی سے موضوع پر غور کرنے لگے۔ جو مضمون بخاری صاحب تجویز کرتے، وہ ماتری صاحب رد کر دیتے۔ اور جو موضوع ماتری صاحب تجویز فرماتے وہ بخاری صاحب کو ناپسند ہوتا۔ آخر جب محفل برخاست ہوئی تو دونوں نے اتفاق رائے سے اس بات کو تسلیم کیا کہ دونوں کی تجاویز ناقابل تسلیم تھیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ دونوں الگ الگ سوچیں اور پھر مل کر ایک دوسرے کی تجاویز پر غور کریں۔ علیک سلیک کے بعد ماتری صاحب اپنی گاڑی میں سوار ہوئے اور بخاری صاحب قبلہ اپنی گاڑی میں۔ دونوں گاڑیاں چل پڑیں۔ اتنے میں ماتری صاحب نے اپنی گاڑی کا ہارن زور زور سے بجایا۔ بخاری صاحب نے سر موڑ کر ماتری صاحب کی گاڑی کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اشارے سے کہا کہ ٹھہر جایئے۔

ماتری صاحب بھی گاڑی سے اترے اور بخاری صاحب بھی۔ ماتری صاحب نے کہا موضوع مل گیا۔ بخاری صاحب نے کہا، کیا؟ فرمایا، اپنی سرگزشت لکھو۔ کچھ تامل کے بعد بخاری صاحب نے اس تجویز پر صاد کر دیا اور یوں یہ نادر روزگار سرگزشت شائع کرنے کا سہرا ''حریت'' کے سر رہا۔ یہ سرگزشت بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ اس میں دلچسپ خودکلامی کے بعد اہم حصے قارئین کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

ایک دن تاج ہوٹل میں شام کے وقت دوستوں کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا کہ دیکھا سر آغا خان ایک میز پر تشریف فرما ہیں اور کھانا نوش فرما رہے ہیں۔ جب ان کے سامنے کافی آئی تو میں اٹھ کر ان کے پاس گیا۔ بعد آداب فارسی میں عرض کیا ہمارے لیے ریڈیو سے تقریر نشر کریں۔ فرمایا کس موضوع پر۔ میں نے کہا سوچ کر عرض کروں گا۔ پہلے ہامی بھر لیجئے۔ سر آغا خان کے ساتھ ان کے سیکریٹری حاجی صاحب تھے۔ آغا خان نے ان سے کہا مجھے منظور ہے، تاریخ مقرر کر لو۔

تاریخ مقرر ہو گئی اور میں سوچنے لگا کہ موضوع کیا ہو گا۔ آغا خان مرحوم دنیا کے نامور مسلمانوں میں شمار ہوتے تھے اور انہیں بین الاقوامی سیاسیات میں بھی دخل تھا، اس لیے بہت سوچ بچار کے بعد ہم نے ان سے اسلام اور بین الاقوامی امن کے موضوع پر تقریر نشر کرنے کی درخواست کی۔ یہ موضوع انہوں نے منظور کر لیا اور ہم نے تقریر کے دن اور وقت کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کا اخباروں میں چھپنا تھا کہ ہمیں دھڑا دھڑ درخواستیں موصول ہونے لگیں کہ اس دن ہم کو اسٹوڈیو میں آنے کی اجازت دی جائے۔ دو، چار، دس درخواستیں ہوتیں تو ہم منظور کر لیتے، لیکن آغا خان کے ہزاروں مشتاقوں کی سمائی اسٹوڈیو میں کہاں ہوتی۔ چنانچہ ہم نے معذرت چاہی۔ اس پر آغا خان کے فدایان نے سڑک پر اکٹھے ہونے کا بندوبست کیا اور اس کا اعلان بھی کر دیا۔

جب کمشنر پولیس نے یہ حالت دیکھی تو مجھ سے کہا کہ آغا اگر اسٹوڈیو میں تشریف لائیں گے تو پولیس کو بہت زبردست انتظامات کرنے پڑیں گے۔ اس لیے بہتر یہی ہو گا کہ تم آغا خان کی تقریر کا ریکارڈ ان کے گھر پر جا کر پہلے سے تیار کر لو۔

میں نے بھی مصلحت اسی میں دیکھی اور آغا خان سے اجازت لے کر ایک دن پہلے تقریر کو ریکارڈ کرنے کے بندوبست میں لگ گیا۔

ان دنوں ہمارے پاس ریکارڈ کرنے کا ایسا سامان نہ تھا کہ اسٹوڈیو سے اٹھا کر باہر لے جائیں۔ اسٹوڈیو کے علاوہ کسی اور مقام سے ریکارڈ کرنا ہوتا تو ٹیلی فون کی لائن لگائی جاتی تھی، آواز ٹیلی فون کے ذریعے کنٹرول روم میں پہنچائی جاتی تھی اور یہاں ریکارڈ ہوتی تھی۔

میں نے ٹیلی فون والوں سے کہا کہ آغا خان کی کوٹھی اور ریڈیو کے درمیان ایک دن کے لیے ٹیلی فون لگا دو، تاکہ ہم آغا خان کی تقریر ریکارڈ کر لیں۔ اس زمانے میں بمبئی میں ٹیلی فون کا کام ایک نجی کمپنی کرتی تھی۔ اس کے منیجر ایک انگریز پارکر نامی تھے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ پانچ ہزار روپے لوں گا۔ میں نے کہا تم تو ہمیشہ اس کام کے پچاس روپے لیتے ہو، یہ پانچ ہزار کیسے۔ فرمایا بزنس ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ آغا خان کی تقریر سے ریڈیو کی مقبولیت میں کتنا اضافہ ہو جائے گا۔ ہم تو پانچ ہزار لیں گے، ایک کوڑی کم نہیں۔

اب میں کیا کرتا۔ نہ تو میں خود پانچ ہزار کی منظوری دے سکتا تھا اور نہ کوئی اور۔ آخر کار ایک ترکیب سوجھی۔ سیدھا آغا خان کے پاس گیا اور ان کو سارا حال سنایا۔ آغا خان بہت ہنسے اور حاجی سے کہا کہ پارکر کو ٹیلی فون کرو اور اس سے کہو کہ بخاری کی مجبوریوں کو سمجھے اور اسے دق نہ کرے۔

یہ تدبیر کارگر ہوئی۔ پارکر صاحب کی کیا جرأت کہ آغا خان کی بات ٹال دیں۔ چنانچہ پچاس روپے میں ٹیلی فون کی لائن ملی اور ہم آغا خان کی تقریر ریکارڈ کرنے ان کے در دولت پر حاضر ہوئے۔

آغا خان مرحوم مع اپنی بیگم کے کھانے کے بعد پڈنگ کی طشتری ہاتھ میں لیے باہر نکلے اور فرمایا لاؤ مائیکروفون۔ میں نے مائیکروفون پیش کیا۔ کچھ سوچ میں پڑ گئے اور پوچھا موضوع کیا تھا؟ میں نے عرض کیا اسلام اور بین اقوامی امن۔ طشتری انہوں نے الگ رکھ دی اور فی البدیہہ تقریر فرمانے لگے۔ ایسے نازک موضوع پر اس قدر بے تکان بولے کہ میں حیرت میں رہ گیا۔

تقریر کا ریکارڈ تیار ہو گیا تو میں نے کہا، صاحب یہ تقریر تو تمام دنیا کے لیے ہے۔ اب مجھ پر کرم کیجئے اور کچھ میرے لیے بھی ریکارڈ کر دیجئے۔ اس دریا دل شخص نے کہا ہاں بولو۔ میں نے عرض کیا ایک تقریر ریڈیو کے بارے میں بھی ریکارڈ کر دیجئے اور اسماعیلی حضرات کو حکم دیجئے کہ ریڈیو خریدیں اور سنیں۔ آغا خان نے یہ تقریر بھی ریکارڈ کر دی۔

اس تقریر کا ریکارڈ ہم نے آغا خان کے جنم دن پر نشر کیا۔ نشر کرنے سے پہلے میں نے تقریر کا مسودہ اکبر فاضل بھائی کو دے دیا تھا کہ اسماعیلی فرقے کے رسالے میں آغا خان کے جنم دن پر شائع ہو جائے۔

اکبر فاضل بھائی ریڈیو کے بہت بڑے سوداگر ہیں۔ انہوں نے مسودہ دیکھا تو سمجھ گئے کہ صاحب استطاعت اسماعیلی آغا خان کی تقریر سن کر ریڈیو خریدنے کے لیے دکانوں پر ٹوٹ پڑیں گے۔ چنانچہ اکبر نے اس یلغار کا بندوبست کر لیا۔

تقریر نشر ہوئی۔ ایک ہی دن میں بمبئی کے ریڈیو سیٹوں کی تعداد اٹھارہ ہزار سے اکیاون ہزار تک پہنچ گئی اور اگر دکانوں پر ریڈیو سیٹ ختم نہ ہو جاتے، تو خدا جانے یا اکبر فاضل بھائی جانیں کہ کہاں پہنچتی۔

تقریروں کے ریکارڈ کرنے کے سلسلے میں مجھے ایک واقعہ اور یاد آتا ہے۔ لارڈ لن لتھگو بمبئی تشریف لائے۔ فیلڈن ان کے ہمراہ تھے۔ ہم نے درخواست کی کہ حضور وائسرائے ریڈیو اسٹیشن کا معائنہ فرمانے کے لیے تشریف لائیں۔ ہماری درخواست منظور ہو گئی۔

ادھر یہ درخواست منظور ہوئی اور ادھر پولیس نے ہمارے اسٹوڈیو کا طواف کرنا شروع کر دیا اور ہر ایک آدمی کے متعلق پوچھ گچھ شروع کر دی۔ یہ کون ہے؟ کب ملازم ہوا؟ اس کا باپ کون ہے؟ کہاں کام کرتا تھا یا کرتا ہے؟ اس کے خیالات کیسے ہیں؟ اس کے پاس اسلحہ ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ پوچھ گچھ کا سلسلہ چلتے چلتے جب سی سی مہتہ اور مہر اسانی تک پہنچا تو انہیں دیکھتے ہی پولیس والوں کا رنگ اڑ گیا۔ مجھے الگ لے گئے اور فرمایا کہ یہ دونوں بہت خطرناک بلکہ خوفناک قسم کے لوگ ہیں، انہیں فوراً چھٹی دے دو۔ میں نے کہا ہوش کی باتیں کیجئے، یہ ایسے نہیں ہیں۔ فرمایا نہیں، ان کا ریکارڈ ہمارے پاس موجود ہے۔ ہم ہرگز اجازت نہ دیں گے کہ یہ لوگ وائسرائے کی آمد پر یہیں موجود رہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ وائسرائے کی جان بہت قیمتی ہے؟ ایسی قیمتی جان کو جوکھم میں ڈالنا کہاں کی دانائی ہے؟ میں نے عرض کی کہ بندہ پرور جان تو ہماری بھی قیمتی ہے۔ اگر اب تک ان حضرات کے ہاتھوں ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا تو وائسرائے کو کیا پہنچے گا۔ ہم نے یہ بھی سمجھایا کہ اگر وائسرائے کے دشمنوں کو کچھ ہو بھی گیا تو انگلستان کو خدا آباد رکھے، وہاں سے کوئی اور وائسرائے آ جائے گا، لیکن اگر ہم مارے گئے تو ایسے غلام کہاں سے آئیں گے۔

ہم نے ہزار سمجھایا مگر پولیس والوں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ سی سی مہتہ اور مہر اسانی تو کہتے تھے کہ چلو جان چھوٹی، ہم کون سے ایسے وائسرائے کے دیدار کے بھوکے ہیں کہ ان کے درشن نہ ہوں گے تو راتوں کی نیند اچاٹ ہو جائے گی۔ مگر میں نے ان کی منت خوشامد کی کہ تمہیں ضرور موجود رہو، ورنہ ریڈیو کی توہین ہو گی۔ آخر یاسین نوری اور مرار جی ڈیسائی کی سفارش پر پولیس نے سی سی مہتہ اور مہر اسانی کو وائسرائے کے دیدار کی اجازت دے دی۔

ریڈیو کے غسل خانے میں سی آئی ڈی، ہاتھ میں طنبورہ پکڑے ہوئے گویے کے روپ میں سی آئی ڈی، پردوں کے پیچھے سی آئی ڈی، چپراسی کے لباس میں سی آئی ڈی۔

توبہ انگریز حاکم بھی کتنا ہردلعزیز ہوتا تھا!

میں نے وائسرائے کو ہر اسٹوڈیو میں گھمایا۔ یہ دکھانے کے لیے کہ ہم کتنے چاق و چوبند ہیں، میں نے کنٹرول روم سے کہہ رکھا تھا کہ ہر اسٹوڈیو کا مائیکروفون کھلا رکھو اور جو گفتگو ہمارے اور وائسرائے کے درمیان ہو ریکارڈ کر لو۔ ہم سب سے آخر میں وائسرائے بہادر کو کنٹرول روم میں لائیں گے۔ جونہی کنٹرول روم میں داخل ہوں تم ان کی گفتگو کا ریکارڈ بجانا شروع کر دینا۔ وائسرائے سن کر حیران ہوں گے کہ ابھی بات کی اور ابھی ریکارڈ بن گیا!

خیر ہر اسٹوڈیو میں وائسرائے کی بات چیت کا ریکارڈ چپکے چپکے بنتا رہا۔ وائسرائے صاحب خوب موڈ میں تھے۔ جب آخری اسٹوڈیو میں پہنچے تو فیلڈن نے انہیں ایک لطیفہ سنایا۔ قہقہے بلند ہوئے ہنسی کے شور سے دیواریں ہلنے لگیں۔ وائسرائے نے گل پہ گل لگایا اور فرمایا ہمارا بھی لطیفہ سنو۔

اب جو لطیفہ سنایا تو فحش۔ سب ہنس رہے تھے اور میری جان نکل رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ یہ گل افشانی بھی ریکارڈ ہو رہی ہے۔ کئی دفعہ چاہا کہ اسٹوڈیو سے بھاگ کر جاؤں اور کنٹرول روم سے کہوں کہ یہ گوہر افشانی ریکارڈ نہ کرو، مگر وائسرائے کے حضور سے بھاگ نکلنے کی جرأت نہ ہوئی۔ آخر کنٹرول روم کی طرف چلنے لگے تو میں نے فیلڈن سے کہا، کنٹرول روم دکھانے کی ضرورت نہیں۔ کہا، واہ کیوں نہیں؟ یہ کہہ کر وائسرائے سمیت فیلڈن کنٹرول روم میں داخل ہو گیا۔ میں بھی پیچھے پیچھے۔ انجینئر کو اشارہ کر رہا ہوں کہ ریکارڈ نہ بجاؤ، مگر وہ سمجھا کہ شاید یہ کم بخت کہہ رہا ہے کہ سنائی نہیں دیتا آواز اونچی کرو۔ زور زور سے ریکارڈ بجا اور فحش لطیفہ بھی۔ اب کی بار اس لطیفے پر کوئی نہ ہنسا۔ نہ فیلڈن، نہ وائسرائے، نہ میں۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

بدھ 19 مارچ 2014ء
روزنامہ امت کراچی / حیدر آباد

'انتہا پسند ہندو تنظیم نے میرے قتل کا حکم جاری کر دیا تھا'

قتل کی ذمہ داری بمبئی ریڈیو میں میرے ماتحت افسر کو سونپی گئی تھی - راشٹریہ سیوک سنگھ کے رکن بال سیتا رام مرڈھیکر نے مارنے کے بجائے مجھے پاکستان ہجرت کرنے کا مشورہ دیا - میسور کے مہاراجہ کا بھائی ادھی راج نشے میں دھت اسٹیشن پہنچ گیا - اس کی حرکتوں سے ہندو عملے کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا - زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس

"حریت" کی رسم بسم اللہ دسمبر 62ء کی تیسری تاریخ کو ہوئی اور "حریت" کا یہ پہلا پرچہ بخاری صاحب قبلہ کی سرگزشت کی پہلی قسط سے مزین تھا۔ قبلہ بخاری صاحب کو سرگزشت لکھنے پر کس طرح آمادہ کیا گیا؟ اس کا احوال "آداب عرض" کے مشہور مقالہ نویس اور لائق احترام جناب نصر اللہ خان یوں بیان فرماتے ہیں کہ "جناب فخر ماتری مرحوم و مغفور اور میں کئی دن تک سر جوڑ کر بیٹھے رہے اور سوچتے رہے کہ بخاری صاحب کو "حریت" کی قلمی اعانت پر کیونکر آمادہ کیا جائے۔ سوچ بچار کے بعد میں نے صلاح دی کہ ماتری صاحب آپ بخاری صاحب کو اپنے گھر پر بلائیں اور ہوا کا رخ دیکھ کر دام پھیلائیں۔ ماتری صاحب بولے، نصر اللہ خان صاحب آپ تو شاید بخاری صاحب کو کراچی آ کر جاننے لگے ہیں، میں ان کو بمبئی اور حیدر آباد سے جانتا ہوں۔ جس زمانے میں بخاری صاحب نے بمبئی میں جھنڈے گاڑ رکھے تھے، میں اس زمانے میں طالب علم تھا اور دیگر بیشمار طالب علموں کی طرح بخاری صاحب کا پرستار۔ یہ شخص نہ اس وقت کسی کی باتوں میں آیا نہ اب آئے گا۔ اس کو زیر دام لانا مشکل ہے۔ آخر تجویز یہ ٹھہری کہ نصر اللہ خان صاحب پہلے بخاری صاحب کے پاس جائیں اور زمین ہموار کرنے کی کوشش کریں۔ خان صاحب کی زبان میں خدا جانے کیا جادو تھا یا فخر ماتری کے نام میں کیا طلسم تھا کہ بخاری صاحب "حریت" میں مضمون لکھنے پر آمادہ ہو گئے۔ مگر ساتھ ہی یہ بیخ لگا دی کہ موضوع کا انتخاب ماتری صاحب کریں۔ اب فیصلہ یہ ہوا کہ ماتری صاحب اور بخاری صاحب چائے پر ملیں۔ تجدید ملاقات بھی ہو اور مضامین کا موضوع بھی طے پائے۔ فخری ماتری اور بخاری صاحب ملے۔ چائے پی گئی۔ احمد آباد کی باتیں ہوئیں۔ بمبئی کا تذکرہ ہوا۔ مسلم لیگ، پاکستان، ہندوستان، ہندو، مسلمان، غرض یہ کہ سب باتوں کا تذکرہ ہوا۔ فخر صاحب اس کوشش میں کہ مضمون کا ذکر بخاری صاحب کریں اور بخاری صاحب اس سعی میں کہ ماتری صاحب قصہ کا آغاز کریں!

جب ماتری صاحب بہت تنگ آ گئے تو تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر فرمایا، ارے بھائی مضمون کی بات بھی کرو گے یا نہیں۔ دونوں دوستوں کے قہقہے سے ہوٹل گونج اٹھا۔ اس کے بعد دونوں نہایت سنجیدگی سے موضوع پر غور کرنے لگے۔ جو مضمون بخاری صاحب تجویز کرتے، وہ ماتری صاحب رد کر دیتے۔ اور جو موضوع ماتری صاحب تجویز فرماتے وہ بخاری صاحب کو ناپسند ہوتا۔ آخر جب محفل برخاست ہوئی تو دونوں نے اتفاق رائے سے اس بات کو تسلیم کیا کہ دونوں کی تجاویز ناقابل تسلیم تھیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ دونوں الگ الگ سوچیں اور پھر مل کر ایک دوسرے کی تجاویز پر غور کریں۔ علیک سلیک کے بعد ماتری صاحب اپنی گاڑی میں سوار ہوئے اور بخاری صاحب قبلہ اپنی گاڑی میں۔ دونوں گاڑیاں چل پڑیں۔ اتنے میں ماتری صاحب نے اپنی گاڑی کا ہارن زور زور سے بجایا۔ بخاری صاحب نے سر موڑ کر ماتری صاحب کی گاڑی کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اشارے سے کہا کہ ٹھہر جایئے۔

ماتری صاحب بھی گاڑی سے اترے اور بخاری صاحب بھی۔ ماتری صاحب نے کہا موضوع مل گیا۔ بخاری صاحب نے کہا، کیا؟ فرمایا، اپنی سرگزشت لکھو۔ کچھ تامل کے بعد بخاری صاحب نے اس تجویز پر صاد کر دیا اور یوں یہ نادر روزگار سرگزشت شائع کرنے کا سہرا "حریت" کے سر رہا۔ یہ سرگزشت بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ اس میں دلچسپ خود کلامی کے بعد اہم حصے قارئین کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں

سرکاری ملازم کو سیاست سے الگ تھلگ رہنا چاہیے۔ میں نے بھی کوشش کی کہ سیاست سے الگ تھلگ رہوں مگر نہ رہ سکا۔ اس سے میری مراد یہ نہیں کہ میں بھی بمبئی کے آزاد میدان میں تقریریں کیا کرتا تھا یا کسی سیاسی پارٹی کا رکن تھا۔ حکومت کے نقطہ نظر کی حمایت ہی میں سہی، لیکن اگر سیاسی تقریریں ریڈیو سے نشر کرائی ہوں تو ریڈیو چلانے والے کو ملک کے سیاسی حالات سے تھوڑا بہت باخبر رہنا ہی پڑتا ہے۔ اب ایسا بھی کون جیوٹ ہوگا کہ ملک کی سیاسی جماعتوں کے عزائم اور مقاصد سے واقفیت بھی رکھے اور کسی پارٹی کے خیالات سے متاثر نہ ہو۔

میں کوئی اکیس برس کا تھا۔ یعنی 1925ء کا زمانہ تھا کہ بہار پراونشل ہندو مہاسبھا کا ایک جلسہ مظفر پور میں ہوا۔ اس جلسہ میں لالہ لاجپت رائے اور بھائی پرمانند نے تقریریں کیں۔ انہوں نے فرمایا کہ ہندو قوم بڑی سورما ہے، گوشت نہیں کھاتی البتہ قوموں کو ضرور کھاتی ہے۔ ہندوستان میں یونانی آئے، انہیں کھا گئی۔ ہن آئے انہیں کھا گئی۔ مگر رام جانے یہ مردم خور قوم مسلمانوں کو کیوں نہ کھا سکی۔ ہزار سال سے مسلمان ہندوستان کے سینے پر دندنا رہے ہیں، لیکن ہندو قوم ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ ہندو قوم کو مردم خوری اور قوم خوری کی عادت فراموش نہیں کرنی چاہیے اور مسلمانوں کو اپنے دندان آز سے چبا لینا چاہیے۔

ان تقریروں نے مجھے ہندو مہاسبھا سے سخت متنفر کر دیا۔ آج اس بات کو کچھ کم چالیس برس ہوتے ہیں، مگر لالہ لاجپت رائے اور بھائی پرمانند کے یہ فقرے میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ آج تک بندے ماترم، پرتاب، کیسری، کی وہ سرخیاں میری آنکھوں میں نشتر بن کر چبھ رہی ہیں، جو ان اخبارات نے لاجپت رائے اور پرمانند کی تقریروں پر لگائی تھیں۔ ہندوؤں کی یہ باتیں میرے دل میں داغ بن کر ثبت تھیں۔ ان کی باتوں سے جی جلتا تھا اور اس بات پر بھی جی جلتا تھا کہ مسلمان قوم اس مردم خور قوم سے پیچھا چھڑانے کی کوئی تدبیر ہی نہیں کرتی تھی۔ یہ قوم کی قوم سوئی پڑی تھی۔ اگر اقبال اور قائداعظم اس قوم کو جھنجھوڑ کر نہ جگاتے تو یہ قوم مر جاتی اور ایسی حالت میں مرتی کہ کوئی جنازہ اٹھانے والا بھی نہ ہوتا۔

میں بمبئی اسٹیشن کا ڈائریکٹر ہو کر آیا تو دیکھا کہ دفتر میں تقریباً سب کے سب ہندو ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ مرہٹی گجراتی کا کام چلانے والے ہندو ہی ہو سکتے تھے۔ ایسے مسلمان کتنے تھے اور کہاں سے آتے جو مرہٹی اور گجراتی کے قابل قبول اہل قلم ہوں۔ چنانچہ میں نے کوشش کی کہ اگر غیر مسلموں کو ملازم رکھنا ہی ہے تو ایسے لوگوں کو ملازم رکھا جائے جو طبعاً مردم خور نہ ہوں۔ یہ میری خوش قسمتی تھی یا یوں کہئے کہ نیک نیتی تھی کہ مجھے نہایت ہی پڑھا لکھا اور نہایت ہی شریف عملہ مل گیا۔ اس عملے میں سی سی مہتہ، ڈنگر راؤ، مہر امسانی، رام مرہٹے، نگرکر، سنس وغیرہ جیسے شریف اور شریف زادے آ شامل ہوئے۔ ایک صاحب اور بھی آئے تھے جو مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے اور جن کا احسان میں کبھی نہ اتار سکوں گا۔ ان کا نام بال سیتا رام مرڈھیکر تھا۔ مرہٹے تھے اور سخت قسم کے مرہٹے۔ انگریزی لباس میں ملبوس، ناٹا قد، منحنی جسم، چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں، منہ میں بڑا سا پائپ! انگریزی ادب میں انگلستان سے سند لے کر آئے تھے اور مرہٹی شاعری میں ان کا شہرہ تھا۔ پہلے ہی دن سے ان میں اور مجھ میں گاڑھی چھننے لگی۔ یہ مجھ سے غالب پڑھتے تھے اور میں ان سے مرہٹی۔ مرہٹی کے اہل قلم اسٹوڈیو میں آئیں تو مرڈھیکر سے متاثر ہوں۔ انگریزی کے اہل قلم آئیں تو مہر امسانی کی رائے کو وقعت دیں۔ گجراتی کے اہل قلم آئیں تو سی سی مہتہ کا لوہا مانیں۔ اردو کے اہل قلم آئیں تو میں ان کی صحبت سے فیض اٹھاؤں۔ غرض کہ بمبئی کا ریڈیو اسٹیشن مرہٹی، گجراتی، انگریزی اور اردو کے اہل قلم کا مرکز بن گیا اور زندگی کے دن چین سے گزرنے لگے۔

مرڈھیکر اردو کا ایک لفظ بھی نہیں جانتا تھا۔ وہی ٹوٹی پھوٹی مرہٹوں والی اردو بولتا تھا۔ اور بس۔ مگر غالب کے دیوان کو ہمیشہ سینے سے لگائے پھرتا تھا اور اس انہماک سے غالب کو پڑھتا تھا کہ مجھے پڑھانے میں مزا آ جاتا تھا۔ میں پہلے اسے شعر پڑھ کر سناتا۔ پھر ایک ایک لفظ کا ترجمہ انگریزی میں کرتا۔ پھر تلمیحات سمجھاتا۔ پھر لفظ کے بنیادی اور فروعی معنی بیان کرتا۔ پھر پر بحث ہوتی اور یوں کہیں جا کر مرڈھیکر کی تسلی ہوتی۔

یہ سب کچھ درست، مگر مرڈھیکر سخت متعصب کا ہندو تھا۔ شیواجی کا ذکر، پرانج پائی کا ذکر، جیکر کا ذکر، ہندو مہا سبھا کا ذکر، ہر وقت اس کی زبان پر رہتا۔ وہ صرف مسلمانوں ہی سے الگ تھلگ نہ تھا، بلکہ گجراتی ہندوؤں سے بھی ذرا الگ تھلگ ہی رہتا تھا۔ سی سی مہتہ کو اچھا سمجھتا تھا مگر ساتھ ساتھ اس کو یہ بھی کد تھی کہ یہ گجراتی کیوں ہے، مرہٹہ کیوں نہیں۔ ڈنگر راؤ کو بہت چاہتا تھا لیکن اس بات پر برہم بھی تھا کہ یہ شخص بھائی اشرف خان کا مرید کیوں ہے؟ خیر عیسیٰ بدین خود موسیٰ بدین خود۔ کوئی مسلمان ہونے پر فخر کرے، کوئی ہندو ہونے پر، اس پر کسی کو کیا اعتراض۔ مجھے ایسے آدمی بہ نسبت ان آدمیوں کے زیادہ پسند آتے تھے، جو ہوں کچھ اور نظر کچھ اور آئیں۔ ہم تو اس بات کے قائل ہیں کہ انسان جو ہو وہی نظر آئے۔ میٹھی چھری نہ بنے۔

بمبئی میں میرا گھر دفتر سے ملحق تھا۔ میرا قاعدہ تھا کہ شام کے چار بجے چائے گھر سے منگواتا تھا۔ سستا زمانہ تھا۔ آٹھ دس آدمیوں کی چائے بن کر آتی اور دفتر کے افسر میرے ساتھ بیٹھ کر چائے پیتے۔ دن بھر کے کام کے متعلق باتیں ہوتیں۔ کچھ نئی باتیں پوچھی جاتیں، کچھ پرانی باتوں کا ذکر ہوتا اور کئی امور کا فیصلہ بغیر لکھا پڑھی کے ہو جاتا۔ چائے کی اس مجلس میں ہم ایک آدھ ایسے کارندے کو بھی شریک کر لیتے تھے، جس کے کام کی تعریف کرنی ہو یا جسے اس کی غلطی سے موثر طریقے پر آگاہ کرنا ہو۔ یہ صحبت بہت پر لطف ہوتی تھی۔ سی سی مہتہ، ڈنگر راؤ، رام مرہٹے، میر امسانی، بال سیتا رام مرڈھیکر اس محفل کی روح تھے۔ ایک دن میرے پاس ٹیلیفون آیا کہ مہاراج ادھی راج میسور، یعنی مہاراجہ میسور کے بھائی مجھ سے ایک براڈ کاسٹ کے سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا بسر و چشم تشریف لائیں۔ شام کے پانچ بجے کا وقت مقرر ہوا۔ مرڈھیکر نے سنا تو بہت خوش ہوا کہ مہاراجہ میسور کے بھائی تشریف لا رہے ہیں۔ ایک تو میسور کی ریاست ویسے ہی بہت بڑی تھی اور پھر وہ ہندو ریاست۔ مرڈھیکر جتنا بھی خوش ہوتا تھوڑا تھا۔ اسٹوڈیو کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گیا۔ یہ کرسی یہاں رکھو، یہ میز ہٹا دو، یہ چپراسی یہاں کھڑا رہے اور وہ ادھر چلا جائے، مہاراجہ کو یوں سلام کیا جائے، مہاراجہ کے استقبال کے لئے دروازے پر فلاں شخص کھڑا ہو اور لفٹ کے قریب فلاں شخص۔ پھر سب افسر قطار باندھ کر کھڑے ہو جائیں، بخاری سب سے تعارف کرائے۔ غرض کہ مرڈھیکر یوں اسٹوڈیو کے انتظام و انصرام میں منہمک ہو گیا جیسے برات آ رہی ہو۔

پانچ بجے مہاراجہ ادھی راج کی سواری آئی۔ مہاراجہ آگے آگے، پیچھے پیچھے ان کی صاحبزادیاں۔ ان کے پیچھے دو آدمی بادہ فرنگ کی بوتلیں اٹھائے ہوئے۔ مہاراجہ ادھی راج شراب کے نشے میں گھوم رہے تھے، جھوم رہے تھے، پاؤں رکھتے کہیں تھے پڑتا کہیں تھا۔ مہر امسانی، ڈنگر راؤ، سی سی مہتہ، رام مرہٹے، مرڈھیکر سب قطار باندھے کھڑے تھے۔ مگر اب جو دیکھتا ہوں تو مہر امسانی منہ پھیر کر سیدھی اپنے کمرے میں جا رہی ہے۔ سی سی مہتہ کھسکے جا رہا ہے۔ رام مرہٹے مہاراج کو سہارا دینے کے لئے آگے بڑھ رہا ہے۔ ڈنگر راؤ اپنی ٹھوڑی کھجا رہا ہے۔ مرڈھیکر میری طرف آنکھیں ڈالے دیکھ رہا ہے۔ اور میں ہوں کہ بت بنا کھڑا ہوں۔

بمشکل تمام ہم مہاراج صاحب کو بڑے اسٹوڈیو میں لے گئے۔ وہاں بیٹھے تو مہاراج کے سیکرٹری نے فرمایا مہاراج ولایت جا رہے ہیں اور ان کی صاحبزادیاں بھی۔ مہاراج تقریر براڈ کاسٹ فرمائیں گے اور صاحبزادیاں پیانو بجائیں گی۔ مگر ابھی فوراً میں کچھ کہنے والا تھا کہ مہاراج بولے شراب۔ میں بہت گھبرایا کہ شراب اور پھر اسٹوڈیو میں۔ خیر کچھ سنبھل کر بولا۔ مہاراج بمبئی کی کانگریس حکومت کے وزیراعلیٰ مسٹر کھیر تشریف لا رہے ہیں۔ وہ آپ سے ملاقات کرنے کی بڑی متمنی ہیں۔ اس لئے میری گزارش ہے کہ تھوڑی دیر کیلئے شراب کے ارادے کو ملتوی کر دیا جائے۔ مہاراج کو ہوش آ گیا۔ فوراً حکم دیا کہ شراب برداروں کو کہیں چھپا دیا جائے اور فوراً براڈ کاسٹ شروع کیا جائے۔ میں نے جھوٹ موٹ کل پرزے چلانے کے بعد اسٹوڈیو کی سرخ بتی روشن کر دی اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر سب کو خاموش رہنے کی ہدایت دی۔ اس کے بعد نہایت طمطراق سے مہاراجہ کے نام کا اعلان کیا اور مہاراجہ نے تقریر کا آغاز کیا۔ مگر سنتا کون تھا، صرف سرخ بتی جل رہی تھی۔ اور مہاراجہ سمجھ رہے تھے کہ جو کچھ ہم ارشاد فرما رہے ہیں چار دانگ عالم میں سنائی دے رہا ہے۔ تقریر میں کبھی انہوں نے میسور کو مخاطب کیا کہ ہم جا رہے ہیں، کبھی انگلستان کو مخاطب کیا کہ ہم آ رہے ہیں۔ کبھی کھیر صاحب کو مخاطب کر کے کہا کہ ہم آپ کا انتظار اسٹوڈیو میں کر رہے ہیں۔ اس کے بعد صاحبزادیوں نے پیانو بجایا۔ بجایا کیا توڑا۔ یہ سب کچھ تو ہو گیا۔ اب میں مہاراجہ کو دفان کیسے کروں۔ وہ تو کھیر صاحب کا انتظار کر رہے تھے۔

آخر مجھے ترکیب سوجھی۔ اسٹوڈیو کے باہر گیا اور گھبرایا ہوا اندر آیا اور کہا مہاراج غلطی ہو گئی، کھیر صاحب بجائے یہاں آنے کے تاج ہوٹل میں چلے گئے ہیں اور وہیں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ بس یہ سنتے ہی مہاراجہ صاحب سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے اور ہماری جان میں جان آئی۔ جب مہاراجہ چلے گئے تو ہم نے مرڈھیکر کو آڑے ہاتھوں لیا کہ یہ تھے تمہارے مہاراجہ۔ یہ ہے تمہاری سب سے بڑی ریاست۔ مرڈھیکر غریب اس قدر شرمندہ ہوا کہ دوسرے دن دفتر نہ آیا۔

کچھ اسی قسم کا واقعہ میرے ساتھ دہلی میں پیش آ چکا تھا۔ زہرہ انبالے والی اسٹوڈیو میں گا رہی تھی کہ کوئی چھ سات سکھ اسٹوڈیو کے احاطے میں داخل ہو گئے اور عین اسٹوڈیو کے دروازے کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ مجھے اطلاع ملی تو میں دفتر سے اٹھ کر اسٹوڈیو کی طرف آیا۔ ان حضرات میں ایک صاحب وہ بھی جواب پٹیالہ کے مہاراجہ ہیں، اس وقت ولی عہد تھے۔ میں نے ان کو پہچان تو لیا مگر انجان بن کر پوچھا کہ کہئے حضرات کیسے تشریف لائے۔ فرمایا تم چپ رہو جی، ہم زہرہ بائی کو لے جانے آئے ہیں۔ میں نے کہا سردار جی صاحبان، آپ باہر سڑک پر کھڑے رہئے۔ اسٹوڈیو سے تشریف لے جایئے۔ سیدھی انگلی گھی تھوڑا ہی چڑھتا ہے۔ وہ کہاں ماننے والے تھے۔ لگے مجھے ڈانٹنے ڈپٹنے۔ میں نے نہایت اطمینان لیکن نہایت بلند آواز سے چپراسیوں کو حکم دیا کہ احاطے کے سب دروازے بند کر دو اور صاحب کو پیٹو۔ اس پر ایک سردار صاحب بولے، جانتے ہو کون ہیں۔ میں نے عرض کیا جی ہاں جانتا ہوں۔ اسی لئے تو یہاں فضیحتہ کرانا چاہتا ہوں کہ کل ذرا اخباروں میں دھوم مچے۔ دفتر خارجہ میں اطلاع پہنچے۔ وائسرائے کو خبر ملے کہ حضور ایک گانے والی کے فراق میں اسٹوڈیو تشریف لے گئے تھے اور گستاخ چپراسیوں کے ہاتھوں پٹ گئے۔ میری بات سن کر مہاراجہ صاحب مع ہمیر و بنگاہ نو دو گیارہ ہو گئے۔

مہاراجہ ادھی راج میسور کے واقعہ کے چند ہی روز بعد قزلباش مجھے، مرڈھیکر کو اور حبیب تنوری کو نواب صاحب ساچن کے یہاں لے گئے۔ نواب صاحب تاج ہوٹل میں مقیم تھے۔ شام کا وقت تھا، ہوٹل کا وسیع کمرہ، چاروں طرف کرسیاں بچھی ہوئی، کوئی دس بارہ حضرات بیٹھے تھے، ہم بھی جا بیٹھے۔ معلوم ہوا نواب صاحب ابھی تشریف لانے والے ہیں۔ تھوڑی دیر میں حضور برآمد ہوئے۔ گورا رنگ، گٹھا ہوا جسم، نہایت قاعدے کا انگریزی وضع کا لباس، سب سے ہنس ہنس کر ہاتھ ملایا۔ نہایت مہذب طور پر سب کی مزاج پرسی کی، نہایت تہذیب سے کرسی پر براجمان ہوئے۔ مگر بیٹھتے ہی فرمایا "کون ہے"۔

بس اس صدا کا بلند ہونا تھا کہ شراب کی بوتلیں کھلنے لگیں اور گلاس بھرے جانے لگے۔ ہم نے دل میں کہا کہ عجیب مصیبت ہے۔ ہم معذرت کرنے ہی والے تھے کہ قزلباش نے کہا، گلاس بھروا لو اور پڑا رہنے دو۔ حضور کے عطیے کو رد کرنا گستاخی ہے۔ ہم کسمسائے، مگر قزلباش نے کہا، ذرا دیکھو تو سہی کیا ہونے والا ہے۔

نواب صاحب نے گلاس اٹھا کر منہ سے لگایا اور ڈگ لگا کر پی گئے۔ ابھی ہونٹوں سے ہٹا کر گلاس میز پر رکھا ہی تھا کہ پکارے "کون ہے"؟ اس حکم حاکم پر آب دار نے پھر نواب صاحب کا گلاس بھر دیا۔ اس کے بعد نواب صاحب میں نہ وہ تہذیب رہی نہ وہ شرافت، نہ وہ اخلاق رہا نہ وہ آداب محفل، لگے واہی تباہی بکنے۔ بولتے بولتے اپنی ہی بات کاٹ کر فرماتے "کون ہے"۔ اور ان کا گلاس پھر بھر دیا جاتا۔ ہم سب بھوک کے مارے نڈھال ہو رہے تھے۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ اور وہاں سے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد "کون ہے" کی صدا بلند ہو رہی تھی۔ آخر رات کے ڈیڑھ بجے نواب صاحب کرسی سے گر پڑے اور خدام ادب انہیں پا بدست دگرے دست بدست دگرے، اٹھا کر خواب گاہ میں لے گئے۔ معلوم ہوا کہ سرکار کا یہ معمول ہے کہ رات کے ڈیڑھ بجے کرسی سے گر پڑتے ہیں اور انہیں اٹھا کر بستر پر ڈال دیا جاتا ہے۔ صبح کو پانچ بجے سرکار کو جگا کر سالٹ پلایا جاتا ہے اور پھر تھپک تھپک کر سلا دیا جاتا ہے۔ سرکار چار بجے سہ پہر تک استراحت فرماتے ہیں۔ جب اٹھتے ہیں تو انہیں حقنہ کرایا جاتا ہے، پھر سرکار ناشتہ تناول فرماتے ہیں اور غسل فرمانے کے بعد سات بجے پھر محفل میں شریک ہو کر "کون ہے، کون ہے" کا ورد کرتے ہیں۔

اب مرڈھیکر کی چڑھ بنی۔ ہم نے مہاراجہ ادھی راج میسور کا مذاق اڑایا تھا۔ اب مرڈھیکر نواب ساچن کا مذاق اڑانے لگا۔ ہم نے ہزار کہا کہ میاں ساچن دو گز کی ریاست۔ اس کا اور میسور کا کیا مقابلہ۔ مگر قصہ تو والیان ریاست کا تھا۔ چھوٹی بڑی ریاست سے کیا مطلب۔ نواب صاحب ساچن والے قصے نے مرڈھیکر کی کچھ اشک شوئی کر دی۔

1947ء میں جب برصغیر کو تقسیم کرنے کی تجویز بالآخر منظور ہوئی اور پاکستان معرض وجود میں آیا تو سرکار دہلی نے تمام ملازموں کو چٹھی لکھی کہ بتاؤ تم ہندوستان میں نوکری کرو گے یا پاکستان میں۔ یہ چٹھی میرے پاس بھی آئی۔ فیصلہ تو مجھے جو کرنا تھا وہی کرنا تھا۔ لیکن پھر بھی اپنے ساتھیوں کے دلوں کو ٹٹولنے کیلئے میں نے سب سے پوچھا کہ بولو بھائیو، کیا کروں۔ یہاں ہندوستان میں ہم مسلمانوں کے رہنے کی گنجائش ہے یا ہم پاکستان چلے جائیں۔ ظاہری یا دلی محبت کے باعث کسی نے کچھ کہا، کسی نے کچھ۔ مگر مرڈھیکر مصر ہوا کہ تم پاکستان چلے جاؤ۔ اس کا اصرار دیکھ کر میں نے جان کر سی سی مہتہ کو اس کے آگے کر دوں، کیونکہ سی سی مہتہ کا اصرار تھا کہ پاکستان نہ جاؤ۔ یہ دونوں آپس میں بحث کریں اور میں چپکے بیٹھا سنتا رہوں۔ سی سی مہتہ تو جذباتی قسم کا آدمی ہے۔ کبھی محبت کا واسطہ دے، کبھی روئے، کبھی آہیں بھرے۔ مگر مرڈھیکر ٹھوس قسم کا آدمی۔ بس اس کو یہی رٹ کہ جب مسلمان کیلئے پاکستان بنا ہے تو مسلمانوں کو پاکستان چلا جانا چاہیے۔ ہندوستان میں ان کا کیا کام۔ خیر، میں اگست 1947ء میں پاکستان آ گیا۔ یہاں ریڈیو کی تشکیل میں ہاتھ پاؤں مارنے لگا اور اس سلسلے میں ڈھاکے کے بھی چکر کاٹنے لگا۔ اس زمانے میں ریڈیو پاکستان کا صدر دفتر نیڈوز ہوٹل لاہور میں تھا۔ تین ہی تو کل اسٹیشن تھے۔ ایک پشاور، ایک لاہور میں اور ایک ڈھاکہ۔ کراچی میں کوئی اسٹیشن ہی نہ تھا تو میں کراچی میں رہ کر کیا کرتا۔ خبریں بھی لاہور سے براڈ کاسٹ ہوتی تھیں اور دوسرے اہم پروگرام بھی۔ ڈھاکہ کیلئے جانا ہوتو پہلے کراچی آنا پڑتا۔ یہاں سے اورینٹ ایرویز کے ڈکوٹا میں ڈھاکے کوئی نو گھنٹے میں خدا خدا کر کے پہنچتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ہم لوگوں کو کلکتے کے راستے ڈھاکے جانے میں کوئی باک نہ تھا۔ کراچی سے ہم انگریزی جہاز میں کلکتے جاتے اور وہاں سے ہندوستانی جہاز میں بیٹھ کر ڈھاکے۔

ایک مرتبہ میں کلکتے کے راستے ڈھاکے جا رہا تھا کہ کلکتے کے ایک ہوٹل میں اچانک مرڈھیکر سے ملاقات ہوئی۔ بڑے تپاک سے ملے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ بمبئی کا ذکر بڑی دیر تک ہوتا رہا۔ آخر باتوں باتوں میں مرڈھیکر سے میں نے پوچھا کہ میاں میری سمجھ میں یہ بات آج تک نہیں آئی کہ تم میرے پاکستان آنے پر اتنا اصرار کیوں کر رہے تھے۔ دفتر میں سبھی کہتے تھے کہ ہندوستان میں رہ جاؤ بس مہر امسانی تھی اور تم تھے جو میرے پاکستان آنے پر مصر تھے۔ مہر کہتی تو تھی کہ پاکستان چلے جاؤ، مگر وہ اس قدر اصرار نہ کرتی تھی۔ تم تو میرے پیچھے پڑ گئے تھے کہ پاکستان جاؤ اور فوراً جاؤ۔ اس قدر اصرار آخر تم نے کیوں کیا؟

کچھ دیر تو مرڈھیکر خاموش رہا اور پھر کہا، اگر سننا ہی چاہتے ہو تو سنو کہ میں کیوں تم کو پاکستان جانے پر مجبور کر رہا تھا۔ میں راشٹریہ سیوک سنگھ کا ممبر ہوں۔ آر ایس ایس کی طرف سے مجھے حکم ملا تھا کہ تم کو جان سے مار ڈالوں۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

جمعرات/20مارچ 2014ء
روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

ریڈیو پاکستان کراچی کا پہلا ٹرانسمیٹر "تنور" میں لگایا گیا

کے ای ایس سی بجلی دینے کی پوزیشن میں نہیں تھی - چھوٹے سے طویلے میں جنریٹر لگا کر قوم تک آواز پہنچانے کا بندوبست کیا گیا - جہاں جھلسا دینے والی گرمی میں انجینئرز کام کرتے تھے - افتتاح کے موقع پر مولانا شبیر احمد عثمانی کی تلاوت سے سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے - زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس

سب سے پہلا شارٹ ویو ٹرانسمیٹر ڈھاکے میں لگایا گیا۔ یہ دس کلوواٹ کا تھا۔ کراچی میں دو شارٹ ویو ٹرانسمیٹر پچاس پچاس کلوواٹ کے لگائے گئے۔

انسان کو غرض آم کھانے سے ہونی چاہیے، پیڑ گننے سے نہیں۔ ہر چند کہ ہم سب اس مقولہ کی صداقت کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن جو ملتا تھا یہی کہتا تھا کہ انڈیا میں تو 100 کلوواٹ کا ٹرانسمیٹر ہے، یہاں صرف پچاس کلوواٹ کا کیوں لگایا گیا؟

جنگ کے زمانہ میں انگریزوں نے دلی کو مشرق میں اپنے پراپیگنڈے کا مرکز بنا لیا تھا اور اس مقصد کے لیے اپنے یہاں سے ٹرانسمیٹر لا کر دلی میں نصب کر دیے تھے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جب برصغیر کی تقسیم ہوئی تو بٹوارے میں کچھ ٹرانسمیٹر پاکستان کو بھی ملتے، مگر اہل ہندوستان نے پاکستان کو کوئی ٹرانسمیٹر نہ دیا۔ خیر ٹرانسمیٹر تو ایسی چیز ہے کہ انسان خرید سکتا ہے۔ ٹرانسمیٹر کوئی تاج محل یا دلی کی جامع مسجد تو ہے نہیں کہ کوئی خرید نہ سکے۔ سب سے بڑا ستم اہل ہندوستان نے ہمارے ساتھ یہ کیا کہ ہمیں ٹرانسمیٹر چلانے کے لیے کوئی میٹر بھی نہ دیا۔ یہ معاملہ ذرا تفصیل چاہتا ہے۔

تمام دنیا کے براڈکاسٹنگ اداروں نے ایک بین الاقوامی مجلس قائم کر رکھی ہے۔ یہ مجلس دنیا کے مختلف براڈکاسٹنگ اداروں کو وہ میٹر الاٹ کرتی ہے جن پر ٹرانسمیٹر چلتے ہیں۔ فرض کیجیے ہم اپنی آواز انگلستان پہنچانا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ آواز انگلستان میں انگلستان کی گھڑیوں کے مطابق شام کے چھ بجے پہنچے۔ اب چونکہ انگلستان اور پاکستان میں طلوع آفتاب کے وقت میں چھ گھنٹے کا فرق ہے اس لیے جب وہاں شام کے چھ بجیں گے تو یہاں رات کے بارہ بجیں گے۔ یعنی ہم جو پروگرام رات کے بارہ بجے نشر کریں گے، وہ پروگرام انگلستان کی گھڑیوں کے مطابق شام کے چھ بجے سنائی دے گا۔

ظاہر بات ہے کہ ہم کو کسی ایسے میٹر پر پروگرام نشر کرنا ہوگا جو انگلستان تک ہماری آواز پہنچا سکے۔ فرض کیجیے یہ میٹر 31 ہے۔ اب بین الاقوامی مجلس کو یہ دیکھنا ہوگا کہ پاکستان کے آس پاس کا کوئی اور ملک تو رات کے بارہ بجے وہ میٹر استعمال نہیں کر رہا ہے۔ اگر کر رہا ہے تو اس کو ہمارے لیے راستہ صاف کرنا پڑے گا۔ یعنی اس میٹر سے اس وقت اسے ہٹ جانا پڑے گا۔ اگر یہ ممکن نہیں تو پھر ہم کو اپنے براڈکاسٹنگ کا وقت بدلنا ہو گا۔ اور کسی ایسے وقت پر پروگرام نشر کرنا ہوگا، جبکہ 31 میٹر بینڈ پر کوئی اور براڈکاسٹ نہ کر رہا ہو۔

بین الاقوامی مجلس کو یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ ہم کس طاقت سے براڈکاسٹ کر رہے ہیں۔ فرض کیجیے کہ ہم 50 یا 100 کلوواٹ کے ٹرانسمیٹر سے براڈکاسٹ کرتے ہیں تو ممکن ہے کہ مصر یا ایران یا افریقہ کے کسی ایسے ٹرانسمیٹر کی آواز ہم دبا دیں، جو ہم سے کم طاقت کے ٹرانسمیٹر پر ہمارے ہی میٹر کے آس پاس براڈکاسٹ کر رہا ہو۔

اس سرسری بیان سے آپ پر یہ امر بخوبی واضح ہو گیا ہوگا کہ دنیا بھر کے ٹرانسمیٹروں کے لیے میٹر مقرر کرنا اور ان کے براڈکاسٹ کے اوقات معین کرنا کتنا بڑا کام ہے۔ اگر یہ بین الاقوامی مجلس ناپید ہو جائے تو ریڈیو کی دنیا میں ہڑبونگ مچ جائے اور ریڈیو اسٹیشن ایک دوسرے کی آواز دباتے رہیں۔

دنیا بھر کے ریڈیو اسٹیشنوں کا مفاد اسی میں ہے کہ اس مجلس کے ساتھ تعاون کریں تاکہ ایک ہی میٹر پر بیک وقت دو دو تین تین آوازیں سنائی نہ دیں۔ اب کا حال تو مجھے معلوم نہیں، لیکن میرے ریڈیو کے زمانے میں اس بین الاقوامی مجلس نے پاکستان کو میٹر دینے سے انکار کر دیا اور ہم سے صاف کہہ دیا کہ ہم نے تمام برصغیر کو جس میں وہ علاقہ شامل ہے جو اب پاکستان کہلاتا ہے، مناسب میٹر دے رکھے ہیں۔ پاکستان اگر ایک الگ ملک ہو گیا ہے تو اس کو لازم ہے کہ وہ اپنے حصہ کے میٹر ہندوستان سے طلب کرے۔ ہم پاکستان کے لیے نئے میٹر کہاں سے لائیں۔

یہ تھی اس وقت کی صورت حال۔ یعنی ہمارے پاس شارٹ ویو پر براڈکاسٹ کرنے کے لیے کوئی میٹر ہی نہ تھا۔ دوسری صورت حال یہ تھی کہ اس وقت دنیا کی منڈی میں 100 کلوواٹ کا کوئی ٹرانسمیٹر تیار نہ تھا۔ بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ٹرانسمیٹر میں اور کونین کی شیشی میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ جس طرح کونین ہر جگہ دستیاب ہے، پچاس گولیاں چاہئیں تو پچاس لے لو اور سو چاہئیں تو سو لے لو۔ اسی طرح ٹرانسمیٹر بھی دکانوں میں بکے رہتے ہیں اور خریدار جو ٹرانسمیٹر چاہے خرید سکتا ہے۔ لیکن حقیقت اس سے بہت مختلف ہے۔ اتفاق سے اور اسے حسن اتفاق کہیے کہ ہمیں پچاس کلوواٹ کا ٹرانسمیٹر تقریباً تیار مل گیا۔ اگر تیار کرنا پڑتا تو سال ڈیڑھ سال کا عرصہ اور لگ جاتا۔

یہاں ایک اور بات بھی عرض کر دوں اور وہ یہ کہ اگر ایک پروگرام پچاس واٹ کے ٹرا[nsmیٹر]... واٹ کے ٹرانسمیٹر پر دوسرا پروگرام، تو پروگرام سن کر یہ پہچاننا ناممکن ہے کہ کون سا پرو[گرام] کون سا پچاس کلوواٹ پر۔ ہاں اگر خاص قسم کا آلہ لگا کر آواز کی پیمائش کی جائے تو تفا[وت]... پچاس کلوواٹ سے محض اس لیے بڑا سمجھتے کہ 100 کا عدد پچاس سے بڑا ہے۔

بعض ملکوں میں بجلی سے چلنے والی چیزوں کی اتنی بھرمار ہوتی ہے کہ چھوٹے موٹے ٹرا[نسمیٹر]... مثال ہے۔ وہاں کے ایک چوک میں جسے ٹائمز اسکوائر کہتے ہیں، اتنی بجلی خرچ ہوتی ... ہوتی تھی۔ اگر وہاں براڈکاسٹ کرنا ہو تو لازم آتا ہے کہ بجلی سے چلنے والی مشینوں وغیرہ ...

بہرحال اس وقت ہمیں بیرونی نشریات کے لیے اور خود اپنے ملک میں خبریں اور قومی ... ٹرانسمیٹر دستیاب ہو گیا۔ ان شارٹ ویو ٹرانسمیٹروں کے علاوہ ہم نے کراچی کے لیے ... کا میڈیم ویو ٹرانسمیٹر بھی آ گیا اور اس کا کھمبا بھی آ گیا، لیکن ابھی ٹرانسمیٹر کی عمارت تیا[ر نہ تھی]... تھے کہ کوئی کام جلدی نہیں کرنا چاہیے۔ چاہے وہ ٹرانسمیٹر کے عمارت تیار کرنا ہی کیوں [نہ ہو]... ہماری حمیت نے گوارا نہ کیا کہ 10 کلوواٹ کا ٹرانسمیٹر آیا رکھا ہو، اس کے کھمبے کا سا[مان]... ریڈیو پاکستان کے انجینئروں کو خدا خوش رکھے، اس وقت انہوں نے وہ ہمت دکھائی کہ براڈکاسٹنگ کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں مل سکتی۔

کھمبے کا تعلق ٹرانسمیٹر کی عمارت سے کچھ نہ تھا۔ اس کو تو باہر میدان میں نصب ہونا تھا۔

چنانچہ فیصلہ ہوا کہ یہ میڈیم ویو کا کھمبا اپنی جگہ پر نصب کر دیا جائے۔ باقی رہا دس کلوواٹ کا ٹرانسمیٹر، اس کے متعلق یہ تجویز ٹھہری کہ سڑک پار جو چھوٹا سا کمرہ پرانے زمانے کا بنا ہوا دکھائی دیتا ہے، اس میں ٹرانسمیٹر عارضی طور پر نصب کر دیا جائے اور سڑک کھود کر زمین دوز تار کے ذریعہ ٹرانسمیٹر کو کھمبے سے ملا دیا جائے۔

یہ کمرہ کسی زمانے میں پی ڈبلیو ڈی کا تھا۔ 20x20 فٹ کا کمرہ، پتھر کی دیواریں، کھپریل کی چھت، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ڈبل روٹی پکانے کا تنور ہو۔ ریڈیو پاکستان کے باہمت انجینئروں نے اس تنور میں ٹرانسمیٹر لگا دیا۔

یہ وہ زمانہ ہے کہ جب لانڈھی میں بجلی نہ تھی۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ جب کراچی کی الیکٹرک سپلائی کمپنی کسی نئی عمارت میں بجلی دے ہی نہیں سکتی تھی اور اگر دیتی بھی تھی تو صرف اس قدر کہ شوم کی قبر پر چھوٹا سا دیا جل سکے۔ ریڈیو پاکستان کے منچلے انجینئروں نے اس کا حل بھی سوچ لیا۔ جس کوٹھری میں انہوں نے ٹرانسمیٹر لگایا تھا، اس کے قریب ایک چھوٹا سا طویلا بھی تھا۔ ریڈیو پاکستان کے انجینئروں نے یہاں ایک جنریٹر لگا دیا۔ اور اس جنریٹر سے خود بجلی پیدا کی، تاکہ 10 کلوواٹ کا ٹرانسمیٹر چل سکے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ آپ کا ریڈیو سیٹ کچھ دیر تک چلتا رہے تو کافی گرم ہو جاتا ہے۔ آپ کے ریڈیو سیٹ کی گرمی کو اگر لاکھ سے ضرب دے دی جائے تو کچھ اندازہ اس گرمی کا لگتا ہے جو ہمارے ٹرانسمیٹر کی کوٹھری میں تھی۔ ریڈیو پاکستان کے نوجوان انجینئروں نے اس جھلسا دینے والی گرمی میں ٹرانسمیٹر چلایا اور قوم تک قوم کی آواز پہنچائی۔ زندہ باد نوجوانان ریڈیو پاکستان۔

جب یہ ٹرانسمیٹر چلنے لگا تو ہم نے انٹیلی جنس اسکول والے چھوٹے ٹرانسمیٹر کو بند کر دیا۔ وہ گٹر پائپ بھی اتار دیا جس کی واپسی کے لیے کراچی میونسپل کارپوریشن بار بار تقاضہ کر چکی تھی۔ دراصل یہ تھا بھی چوری کا مال۔ ہم خدا جانے یہ گٹر پائپ کام چلانے کے لیے کہاں سے اٹھا لائے تھے۔

یہ چھوٹا ٹرانسمیٹر تو ہم نے بند کر دیا۔ لیکن اسٹوڈیو یہی رکھا۔ اور کوئی عمارت ہی نہ تھی جہاں سے پروگرام براڈکاسٹ کیا جاتا۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اسٹوڈیو کے پروگرام ٹرانسمیٹر تک کیونکر پہنچائے جائیں۔ عام طور پر اسٹوڈیو اور ٹرانسمیٹر کے درمیان ایک خاص قسم کی ٹیلی فون لائن ہوتی ہے۔ اسٹوڈیو کا پروگرام اس ٹیلی لائن کے ذریعے ٹرانسمیٹر تک پہنچتا ہے، اور ٹیلی لائن بلکہ خاطر خواہ ٹیلی لائن اس زمانے میں مل نہ سکی۔

دشمن جب بھی کسی ریڈیو اسٹیشن کا قلع قمع کرنا چاہتا ہے تو وہ ٹیلی فون لائن کاٹ دیتا ہے جو اسٹوڈیو کو ٹرانسمیٹر سے ملاتی ہے اور یوں ریڈیو کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔

دشمن سے ہمیشہ ہوشیار رہنا چاہیے۔ ہم نے حفظ ماتقدم کے طور پر ایسے چھوٹے چھوٹے ٹرانسمیٹر بھی خرید رکھے تھے جو اسٹوڈیو کو ٹرانسمیٹر سے ملا دینے کے کام آتے تھے۔ ہم نے یہ چھوٹے ٹرانسمیٹر انٹیلی جنس اسکول میں لگا دیے اور ان کے ذریعے اسٹوڈیو کی آواز کو ٹرانسمیٹر تک پہنچایا۔

میں وہ شام کو بھی نہیں بھلا سکتا، جب ہم نے عارضی طور پر لگے ہوئے 10 کلوواٹ کے میڈیم ویو ٹرانسمیٹر کا افتتاح کیا تھا۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی ہمارے ساتھ لانڈھی گئے۔ جس وقت علامہ عثمانی نے قرآن پاک کی تلاوت فرمائی تو ہم سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

شام کی نماز کا وقت قریب تھا۔ ہم میدان میں کھمبے کے پاس آئے تاکہ مولانا کے پیچھے باجماعت نماز پڑھی جائے۔ مولانا پر اس وقت عجیب کیفیت طاری تھی۔ اسی کیفیت میں چلتے چلتے کھمبے کے قریب پہنچے۔ بے حد قریب۔ اگر ایک قدم بھی اور اٹھاتے تو اس زبردست بجلی کی لپیٹ میں آ جاتے جس کی رو کھمبے میں دوڑ رہی تھی۔ ہمارے چیف انجینئر ریاض احمد نے چیخ ماری اور لپک کر آگے بڑھے اور مولانا کا بازو پکڑ کر بہت زور سے کھینچا۔ میں مولانا کی سیدھ میں کھڑا تھا۔ میں نے ان کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ ورنہ پتھریلی زمین پر گر کر خدا جانے ان کا کیا حال ہوتا۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

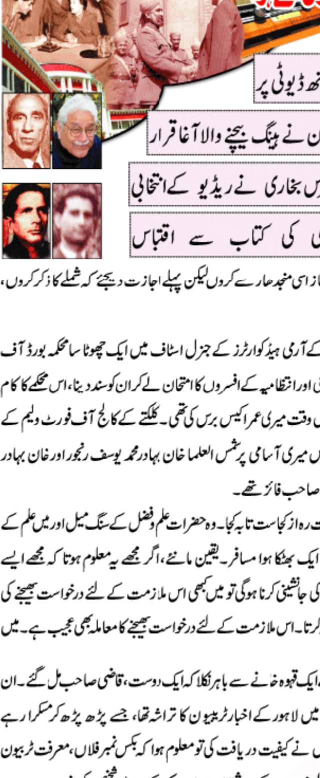
سرگزشت
سید ذوالفقار علی بخاری

"حریت" کی رسم بسم اللہ دسمبر 62ء کی تیسری تاریخ کو ہوئی اور "حریت" کا یہ پہلا پرچہ بخاری صاحب قبلہ کی سرگزشت کی پہلی قسط سے مزین تھا۔ قبلہ بخاری صاحب کو سرگزشت لکھنے پر کس طرح آمادہ کیا گیا؟ اس کا احوال "آداب عرض" کے مشہور مقالہ نویس اور لائق احترام جناب نصر اللہ خان یوں بیان فرماتے ہیں کہ "جناب فخر ماتری مرحوم و مغفور اور میں کئی دن تک سر جوڑ کر بیٹھے رہے اور سوچتے رہے کہ بخاری صاحب کو "حریت" کی قلمی اعانت پر کیونکر آمادہ کیا جائے۔ سوچ بچار کے بعد میں نے صلاح دی کہ ماتری صاحب آپ بخاری صاحب کو اپنے گھر پر بلائیں اور ہوا کا رخ دیکھ کر دام پھیلائیں۔ ماتری صاحب بولے، نصر اللہ خان صاحب آپ تو شاید بخاری صاحب کو کراچی آ کر جاننے لگے ہیں، میں ان کو بمبئی اور حیدرآباد سے جانتا ہوں۔ جس زمانے میں بخاری صاحب نے بمبئی میں جھنڈے گاڑ رکھے تھے، میں اس زمانے میں طالب علم تھا اور دیگر بیشمار طالب علموں کی طرح بخاری صاحب کا پرستار۔ یہ شخص نہ اس وقت کسی کی باتوں میں آیا نہ اب آئے گا۔ اس کو زیر دام لانا مشکل ہے۔ آخر تجویز یہ ٹھہری کہ نصر اللہ خان صاحب پہلے بخاری صاحب کے پاس جائیں اور زمین ہموار کرنے کی کوشش کریں۔ خان صاحب کی زبان میں خدا جانے کیا جادو تھا یا فخر ماتری کے نام میں کیا طلسم تھا کہ بخاری صاحب "حریت" میں مضمون لکھنے پر آمادہ ہو گئے۔ مگر ساتھ ہی یہ شرط لگا دی کہ موضوع کا انتخاب ماتری صاحب کریں۔ اب فیصلہ یہ ہوا کہ ماتری صاحب اور بخاری صاحب چائے پر ملیں۔ تجدید ملاقات بھی ہو اور مضامین کا موضوع بھی طے پائے۔ فخری ماتری اور بخاری صاحب ملے۔ چائے پی گئی۔ احمد آباد کی باتیں ہوئیں۔ بمبئی کا تذکرہ ہوا۔ مسلم لیگ، پاکستان، ہندوستان، ہندو، مسلمان، غرض یہ کہ سب باتوں کا تذکرہ ہوا۔ فخر صاحب اس کوشش میں کہ مضمون کا ذکر بخاری صاحب کریں اور بخاری صاحب اس سعی میں کہ ماتری صاحب قصہ کا آغاز کریں!

جب ماتری صاحب بہت تنگ آ گئے تو تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر فرمایا، ارے بھائی مضمون کی بات بھی کرو گے یا نہیں۔ دونوں دوستوں کے قہقہے سے ہوٹل گونج اٹھا۔ اس کے بعد دونوں نہایت سنجیدگی سے موضوع پر غور کرنے لگے۔ جو مضمون بخاری صاحب تجویز کرتے، وہ ماتری صاحب رد کر دیتے۔ اور جو موضوع ماتری صاحب تجویز فرماتے وہ بخاری صاحب کو ناپسند ہوتا۔ آخر جب محفل برخاست ہوئی تو دونوں نے اتفاق رائے سے اس بات کو تسلیم کیا کہ دونوں کی تجاویز ناقابل تسلیم تھیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ دونوں الگ الگ سوچیں اور پھر مل کر ایک دوسرے کی تجاویز پر غور کریں۔ علیک سلیک کے بعد ماتری صاحب اپنی گاڑی میں سوار ہوئے اور بخاری صاحب قبلہ اپنی گاڑی میں۔ دونوں گاڑیاں چل پڑیں۔ اتنے میں ماتری صاحب نے اپنی گاڑی کا ہارن زور زور سے بجایا۔ بخاری صاحب نے سر موڑ کر ماتری صاحب کی گاڑی کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اشارے سے کہا کہ ٹھہر جائیے۔ ماتری صاحب بھی گاڑی سے اترے اور بخاری صاحب بھی۔ ماتری صاحب نے کہا موضوع مل گیا۔ بخاری صاحب نے کہا، کیا؟ فرمایا، اپنی سرگزشت لکھو۔ کچھ تامل کے بعد بخاری صاحب نے اس تجویز پر صاد کر دیا اور یوں یہ نادر روزگار سرگزشت شائع کرنے کا سہرا "حریت" کے سر رہا۔ یہ سرگزشت بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ اس میں دلچسپ خود کلامی کے بعد اہم حصے قارئین کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

''ریڈیو دہلی میں پہلے روز میرا استقبال قہقہوں سے ہوا''

پہاڑی بوٹ-ہنٹنگ کوٹ اور دو شکاری کتوں کے ساتھ ڈیوٹی پر آیا-حلیہ دیکھ کر سجاد سرور نیازی-آغا اشرف-مجاز اور فیلڈن نے ہینگ بیچنے والا آغا قرار دیدیا مجھے سفارشی کے طعنے سے بچانے کیلئے بڑے بھائی پطرس بخاری نے ریڈیو کے انتخابی پینل سے استعفیٰ دیدیا تھا- زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



میری زندگی کے طوفان کی منجدھار ریڈیو ہے۔ جی چاہتا ہے کہ داستان کا آغاز اسی منجدھار سے کروں لیکن پہلے اجازت دیجئے کہ شملے کا ذکر کروں، کیونکہ میرا اور ریڈیو کا معاملہ شملے ہی سے شروع ہوتا ہے۔

کلکتے کا کالج آف فورٹ ولیم ٹوٹا تو انگریزوں نے اس کے بدلے شملے کے آرمی ہیڈ کوارٹرز کے جنرل اسٹاف میں ایک چھوٹا سا محکمہ بورڈ آف ایگزامنرز کے نام سے قائم کرلیا۔ مشرقی زبانوں میں امتحان دینے والے فوجی اور انتظامیہ کے افسروں کا امتحان لے کر ان کو سند دینا، اس محکمے کا کام تھا۔ مجھے اس محکمے میں بورڈ کے ایک ممبر کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ اس وقت میری عمر اکیس برس کی تھی۔ کلکتے کے کالج آف فورٹ ولیم کے زمانے میں میری آسامی پر شمس العلما خان بہادر محمد یوسف رنجور اور خان بہادر برکت علی صاحب فائز تھے۔

ببین تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔ وہ حضرات علم و فضل کے سنگ میل اور میں علم کے راستے کا ایک بھٹکا ہوا مسافر۔ یقین مانئے، اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ مجھے ایسے حضرات کی جانشینی کرنا ہوگی تو میں کبھی اس ملازمت کے لئے درخواست بھیجنے کی جرأت نہ کرتا۔ اس ملازمت کے لئے درخواست بھیجنے کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ میں

پشاور کے ایک قہوہ خانے سے باہر نکلا کہ ایک دوست، قاضی صاحب مل گئے۔ ان کے ہاتھ میں لاہور کے اخبار ٹریبیون کا تراشہ تھا، جسے پڑھ پڑھ کر مسکرا رہے تھے۔ میں نے کیفیت دریافت کی تو معلوم ہوا کہ بکس نمبر فلاں، معرفت ٹریبون لاہور کی طرف سے ایک اشتہار چھپا ہے کہ ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو انگریزی، اردو، فارسی، عربی، پشتو، پنجابی جانتا ہو۔ قاضی صاحب تو برابر مسکرا رہے تھے کہ لو بتاؤ اتنی ساری زبانیں جاننے والا ان کو کون ملے گا، لیکن میں سوچ رہا تھا اور دل میں کہہ رہا تھا کہ ان سب زبانوں میں تھوڑی بہت شد بد تو رکھتا ہوں، اگر میں اس آسامی کے لئے درخواست دے دوں تو ہرج ہی کیا ہے۔ اور کچھ نہیں تو ذرا مذاق ہی رہے گا۔

میں نے قاضی صاحب سے اشتہار لے لیا، اور ایک ٹائپ کرنے والے کی دکان میں گھس گیا۔ وہاں بیٹھ کر عرضی ٹائپ کی اور ڈاک میں ڈال دی۔ میں نے عرضی میں یہ بھی لکھ دیا کہ اگر میرے متعلق کچھ مزید معلوم کرنا ہو تو پروفیسر محمد سعید دہلوی اور علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کو زحمت دی جائے۔ اس کے بعد میں نے یہی مناسب سمجھا کہ درخواست اور درخواست کے تمام متعلقات کو فراموش کردوں۔ میں نے یہ بھی دریافت کرنے کی کوشش نہ کی کہ یہ اشتہار کس کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ مجھے تو گمان تک نہیں تھا کہ اتنی اہم آسامی پر میرا تقرر ہو سکے گا۔

اس بات کو مہینہ ڈیڑھ گزر گیا اور میں محض دشت نوردی کے لئے لاہور آیا۔ اس زمانے میں میرے مرحوم بھائی احمد شاہ بخاری سینٹرل ٹریننگ کالج میں پروفیسر تھے، اور دہلی مسلم ہوٹل انارکلی میں مقیم تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ دہلی مسلم ہوٹل میں فروکش ہوا۔ جب مجھے ان کے ساتھ رہتے ہوئے دو تین دن گزر گئے تو انہوں نے مجھ سے کہا عجیب نالائق ہو، کب کے آئے ہوئے ہو اور ابھی تک نہ ڈاکٹر صاحب کے یہاں سلام کے لئے حاضر ہوئے نہ مرزا صاحب کے یہاں۔ ملازمت کی درخواست میں ان کے نام کا حوالہ دینے میں تمہیں باک نہیں لیکن ان کی خدمت میں حاضر ہونے میں تساہل برتتے ہو۔

بھائی اس قدر برہم تھے کہ ان سے مزید تفصیلات پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ سیدھا مرزا صاحب کے در دولت پر حاضر ہوا۔ پائجامہ، کرتا اور روئی کی صدری پہنے باہر تشریف لائے۔ سرکنڈے کے ایک مونڈھے پر مجھے بیٹھنے کا حکم دیا۔ اور خود دوسرے مونڈھے پر تشریف فرما ہوئے۔ میں خاموش بیٹھا تھا۔ مرزا صاحب بھی کچھ دیر خاموش رہے اور پھر فرمایا: ''آپ شملے کب جا رہے ہیں؟''۔

مرزا صاحب ہمیشہ چھوٹوں کو آپ کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا، کہ آپ کا جواب آپ، تم کا تم اور تو کا تو ہے۔ اب چھوٹوں سے تم اور تو کون سنے۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔

مرزا صاحب نے شملے کا جو پوچھا تو میں سکتے میں رہ گیا۔ رک رک کر کہا، قبلہ میں شملے جا کر کیا کروں گا۔ میرا تو وہاں جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ مرزا صاحب کے ارشادات سے معلوم ہوا کہ وہ اشتہار جو ٹریبیون میں کسی بکس نمبر کے حوالے سے چھپا تھا، دراصل شملے کے بورڈ آف ایگزامنرز جنرل اسٹاف کی طرف سے تھا۔ وہاں ان کو بورڈ کے ممبر کی ضرورت ہے۔ مرزا صاحب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انہوں نے استفسار پر میری سفارش کردی ہے۔

مرزا صاحب سے رخصت ہو کر میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے شمس العلما خان بہادر مولوی محمد یوسف رنجور کا ذکر کیا۔ کالج آف فورٹ ولیم کا ذکر کیا، گلکرسٹ وغیرہ کے کارناموں کا تذکرہ کیا۔ جانسن، فوربس، فلاٹ وغیرہ کا تذکرہ کرتے رہے اور میں شرم کے مارے زمین میں گڑتا گیا۔ میں نے سوچا، میں کیا اور میری بساط کیا۔ جہاں ایسے ایسے لوگ کام کر چکے ہیں۔ میں جا کر کیا کروں گا۔ یقین مانئے میں کچھ دل برداشتہ سا ہو گیا۔ بس ایک ہی بات دل کو تقویت پہنچاتی اور وہ یہ کہ انگریز کا محکمہ ہے، سمجھ لے گا کہ مرزا صاحب نے اور ڈاکٹر صاحب نے محض محبت کی بنا پر لکھ دیا، ورنہ ایک اکیس برس کا نوجوان اور وہ بھی کج مج زبان، رنجور کی جانشینی کرنے کے قابل کہاں۔ لیکن قدرت کو میری آزمائش منظور تھی۔ لاہور سے پشاور گیا تو گھر پر ایک خط پڑا پایا۔ جس میں لکھا تھا کہ تمہاری درخواست منظور کی گئی ہے۔ تم کو عنقریب شملہ بلایا جائے گا اور آزمائشی طور پر ملازم رکھا جائے گا۔ تیار رہو۔ کچھ دن کے بعد ایک اور خط ملا جس میں لکھا تھا کہ ملازمت کے لئے شملہ آؤ۔ خط کے ساتھ ریل کا ایک فوجی پاس بھی نتھی تھا۔

''حریت'' کی رسم بسم اللہ دسمبر 62ء کی تیسری تاریخ کو ہوئی اور ''حریت'' کا یہ پہلا پرچہ بخاری صاحب قبلہ کی سرگزشت کی پہلی قسط سے مزین تھا۔ قبلہ بخاری صاحب کو سرگزشت لکھنے پر کس طرح آمادہ کیا گیا؟ اس کا احوال ''آداب عرض'' کے مشہور مقالہ نویس اور لائق احترام جناب نصر اللہ خان یوں بیان فرماتے ہیں کہ ''جناب فخر ماتری مرحوم و مغفور اور میں کئی دن تک سر جوڑ کر بیٹھے رہے اور سوچتے رہے کہ بخاری صاحب کو ''حریت'' کی قلمی اعانت پر کیونکر آمادہ کیا جائے۔ سوچ بچار کے بعد میں نے صلاح دی کہ ماتری صاحب آپ بخاری صاحب کو اپنے گھر پر بلائیں اور ہوا کا رخ دیکھ کر دام پھیلائیں۔ ماتری صاحب بولے، نصر اللہ خان صاحب آپ تو شاید بخاری صاحب کو کراچی آ کر جاننے لگے ہیں، میں ان کو بمبئی اور حیدر آباد سے جانتا ہوں۔ جس زمانے میں بخاری صاحب نے بمبئی میں جھنڈے گاڑ رکھے تھے، میں اس زمانے میں طالب علم تھا اور دیگر بیشمار طالب علموں کی طرح بخاری صاحب کا پرستار۔ یہ شخص نہ اس وقت کسی کی باتوں میں آیا نہ اب آئے گا۔ اس کو زیر دام لانا مشکل ہے۔ آخر تجویز یہ ٹھہری کہ نصر اللہ خان صاحب پہلے بخاری صاحب کے پاس جائیں اور زمین ہموار کرنے کی کوشش کریں۔ خان صاحب کی زبان میں خدا جانے کیا جادو تھا یا فخر ماتری کے نام میں کیا طلسم تھا کہ بخاری صاحب ''حریت'' میں مضمون لکھنے پر آمادہ ہوگئے۔ مگر ساتھ ہی یہ پخ لگا دی کہ موضوع کا انتخاب ماتری صاحب کریں۔ اب فیصلہ یہ ہوا کہ ماتری صاحب اور بخاری صاحب چائے پر ملیں۔ تجدید ملاقات بھی ہو اور مضامین کا موضوع بھی طے پائے۔ فخری ماتری اور بخاری صاحب ملے۔ چائے پی گئی۔ احمد آباد کی باتیں ہوئیں۔ بمبئی کا تذکرہ ہوا۔ مسلم لیگ، پاکستان، ہندوستان، ہندو، مسلمان، غرض یہ کہ سب باتوں کا تذکرہ ہوا۔ فخر صاحب اس کوشش میں کہ مضمون کا ذکر بخاری صاحب کریں اور بخاری صاحب اس سعی میں کہ ماتری صاحب قصہ کا آغاز کریں!

جب ماتری صاحب بہت تنگ آ گئے تو تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر فرمایا، ارے بھائی مضمون کی بات بھی کرو گے یا نہیں۔ دونوں دوستوں کے قہقہے سے ہوٹل گونج اٹھا۔ اس کے بعد دونوں نہایت سنجیدگی سے موضوع پر غور کرنے لگے۔ جو مضمون بخاری صاحب تجویز کرتے، وہ ماتری صاحب رد کر دیتے۔ اور جو موضوع ماتری صاحب تجویز فرماتے وہ بخاری صاحب کو ناپسند ہوتا۔ آخر جب محفل برخاست ہوئی تو دونوں نے اتفاق رائے سے اس بات کو تسلیم کیا کہ دونوں کی تجاویز ناقابل تسلیم تھیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ دونوں الگ الگ سوچیں اور پھر مل کر ایک دوسرے کی تجاویز پر غور کریں۔ علیک سلیک کے بعد ماتری صاحب اپنی گاڑی میں سوار ہوئے اور بخاری صاحب قبلہ اپنی گاڑی میں۔ دونوں گاڑیاں چل پڑیں۔ اتنے میں ماتری صاحب نے اپنی گاڑی کا ہارن زور زور سے بجایا۔ بخاری صاحب نے سر موڑ کر ماتری صاحب کی گاڑی کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اشارے سے کہا کہ ٹھہر جایئے۔

ماتری صاحب بھی گاڑی سے اترے اور بخاری صاحب بھی۔ ماتری صاحب نے کہا موضوع مل گیا۔ بخاری صاحب نے کہا، کیا؟ فرمایا، اپنی سرگزشت لکھو۔ کچھ تامل کے بعد بخاری صاحب نے اس تجویز پر صاد کر دیا اور یوں یہ نادر روزگار سرگزشت شائع کرنے کا سہرا ''حریت'' کے سر رہا۔ یہ سرگزشت بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ اس میں دلچسپ خود کلامی کے بعد اہم حصے قارئین کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

یہ زمانہ 1925ء کا تھا۔ میں نے دل میں سوچا انگریز کرنل کا خط آیا ہے، آرمی ہیڈ کوارٹرز جنرل اسٹاف میں ملازمت ہے، عہدے کا نام ممبر بورڈ آف ایگزامنرز ہے، ریل کا فوجی پاس ملا ہے، لہٰذا کچھ نہ کچھ انگریزی ٹھاٹھ ضرور کرنا چاہئے۔ اور تو کچھ نہ سوجھا پشاور کے صدر بازار میں گیا اور وہاں سے آٹھ دس آنے میں ایک کباڑی کی دکان سے انگریزی ہیٹ خرید لی۔ اور سامان میں سب کپڑوں کے نیچے رکھ دی تا کہ والد کو پتہ نہ چلے کہ میاں ہیٹ پہننے والے ہیں۔

جب گاڑی لاہور سے آگے نکل گئی تو میں نے کہا بس یہیں سے انگریزی ٹھاٹھ شروع کر دینا چاہئے۔ لاہور تک تو جاننے پہچاننے والے بہت تھے، لاہور سے آگے مجھے کون جانتا ہے اور کون کہے گا کہ دیکھو پیر سید اسد اللہ شاہ بخاری کا بیٹا ہیٹ پہنے پھرتا ہے۔ یہ تو اجنبی دیار ہے، یہاں جو جی چاہے کرو۔ چنانچہ میں نے عمامہ ڈھیلا جامہ ٹرنک میں بند کیا اور پلس فور اور ہیٹ پہن کر انگریزوں کی طرح سفر کرنا شروع کر دیا۔ ایک معمولی سا مار دھاڑ والا ناول خاص انگریزوں کے انداز میں یوں انہماک سے پڑھنے لگا گویا کوئی ادق فلسفے کی کتاب زیر مطالعہ ہو۔ کباڑی کی دکان سے خریدا ہوا پائپ میرے منہ میں اس انداز سے اٹک رہا تھا کہ شرلک ہومز بھی رشک کرے۔

اس ہیٹ کذائی کے ساتھ لازم آیا کہ اردو کو خیر باد کہہ کر انگریزی بولوں اور بجائے نان کباب کھانے کے ریفریشمنٹ روم میں جا کر ولایتی کھانا کھاؤں۔ انبالے کے اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری تو جہاں اور انگریز صاحبان ریفریشمنٹ روم میں گئے وہاں میں بھی گٹ پٹ کرتا ہوا ایک میز پر براجمان ہو گیا۔ ساری عمر چھری کانٹے سے کھانا کھانے کا اتفاق نہ ہوا تھا، سمجھ میں نہ آیا کہ اس منزل سے کیسے گزروں گا۔ اتنے میں بیرا سوپ یعنی شوربے کی رکابی میرے سامنے رکھ گیا۔ میں نے کنکھیوں سے دائیں بائیں دیکھا اور جی میں کہا جو نیت امام کی وہ نیت ہماری۔ جس طرح یہ لوگ کھاتے ہیں تم بھی کھاؤ۔ چنانچہ اوروں کی طرح سوپ زہر مار کیا۔ مچھلی حلق سے اتاری۔ گوشت منہ میں ٹھونسا۔ ساگودانے کی لئی کھائی، کڑوی زہر کافی پی۔

بیرے نے کہا تین روپے آٹھ آنے۔ میں انگریز تو بن چکا تھا۔ منہ ٹیڑھا کر کے انگریزی میں کہا۔ بل لاؤ ہم اردو نہیں جانتے۔ بیرا چلا گیا۔ کوئی چار قدم پر دوسرے بیرے نے اس سے پوچھا ''اے کہاں جا رہا ہے؟''

وہ بولا ''بل لینے جا رہا ہوں۔ سالا اردو نہیں سمجھتا''۔

میں نے بل ادا کیا۔ سیدھا گاڑی میں آیا۔ ہیٹ کھڑکی سے باہر پھینک دی۔ ٹرنک سے پگڑی نکال کر سر پر باندھ لی۔ وہ وقت اور یہ وقت پھر کبھی ہیٹ نہیں پہنی۔

بورڈ آف ایگزامنرز کی ملازمت میں بڑے بڑے جغادری انگریزوں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں کمانڈر ان چیف بھی تھے۔ وائسرائے بھی تھے اور انتظامیہ کے بڑے بڑے افسر بھی۔ اس زمانے کا انگریز بعد کے انگریزوں سے بہت مختلف تھا۔ دوسروں کی عزت کرنا جانتا تھا۔ حاکم لوگ صرف اسی بنا پر حاکم مقرر نہیں کئے جاتے کہ انہوں نے کتابیں رٹ کر سول سروس کا امتحان پاس کر لیا ہے۔ بلکہ اس وقت کا انگریز یہ جانتا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے دماغ سے ابھی بوئے سلطانی نہیں گئی۔ ان پر حکومت کرنے کے لئے ایسے لوگ درکار ہیں جو گھر کے رئیس ہوں اور جانتے ہوں کہ جن کے پدر سلطان ہوں ان سے ملتے وقت حفظ مراتب کے مختلف منازل سے کیونکر گزرنا چاہئے۔ ان انگریزوں میں احساس کمتری نسبتاً کم تھا۔ یہ لوگ موقع آ پڑے تو اپنے اوپر بھی ہنس لیتے تھے۔ توازن اسی شخص کا درست رہ سکتا ہے، جو اپنے اوپر ہنسنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور اس صلاحیت کو بروئے کار لاتا رہے۔

لارڈ برڈوڈ جو اس زمانے میں کمانڈر انچیف تھے، مسلمانوں کی زندہ دلی اور بے باکی کے ثبوت میں ایک دن فرمانے لگے کہ سہراب نامی ایک سوداگر گھوڑے بیچا کرتا تھا۔ اس کا ایک گھوڑا مجھے بہت پسند آیا۔ سہراب نے اس گھوڑے کے دام چار سو بتائے۔ لیکن میں نے دو سو لگائے۔ اتنی کم قیمت لگانے پر وہ جل گیا۔ مگر نہایت اطمینان سے کہا۔ صاحب یہ جانور ہے۔ اس کو بڑے چھوٹے کی کیا تمیز۔ ذرا ہٹ جایئے کہیں لات نہ مار دے۔

ایک اور صاحب نے قصہ سنایا کہ میں نیا نیا ہندوستان آیا۔ اردو زبان سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اور اس بات سے بہت چڑتا تھا کہ لوگ اردو بولتے وقت انگریزی کے الفاظ جا بجا استعمال کرتے ہیں۔ میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ ایسے لوگوں کی تقلید سے بچوں گا، اور اردو بولتے وقت انگریزی کے الفاظ کبھی استعمال نہ کروں گا، مگر ایک دن منہ کی کھانا پڑی۔ میں ہوٹل میں کھانا کھا رہا تھا، بیرا نے آ کر پوچھا کیوں صاحب کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں۔ میں نے کہا ہاں بادنجان فرنگی لاؤ۔ بادنجان فرنگی، وہ کچھ نہ سمجھا۔ آخر ساتھ کی میز والے بیرا نے اس سے کہا، ابے صاحب ٹماٹر مانگ رہا ہے۔ اور میری طرف پلٹ کر کہا صاحب نیا بیرا ہے، انگریزی نہیں جانتا۔

ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ اس زمانے کا انگریز اس قدر احساس کمتری میں مبتلا نہیں تھا، جس قدر آج کا انگریز ہے۔ وہ خاندانی حاکم تھا۔ اور بعد کا انگریز امتحانی حاکم۔ انہیں انگریزوں میں میرا ایک دوست اور شاگرد گورنر پنجاب کا اے، ڈی، سی تھا۔ نوجوان لڑکا تھا بلا کا ذہین۔ پڑھنے لکھنے کا بہت شوقین۔ انگریزی ادب پر بڑی گہری نظر رکھتا تھا اور اردو، فارسی ادب کا جائزہ لینے میں ہر وقت منہمک رہتا تھا۔ میں ایسے دوستوں اور شاگردوں کو اکثر اپنے یہاں کی ادبی مجلسوں میں بلایا کرتا اور اردو ناٹک دیکھنے کی دعوت بھی دیتا تھا۔

1935ء کا ذکر ہے کہ میں نے سید امتیاز علی تاج کا ڈرامہ انارکلی گیٹی تھیٹر شملے میں پیش کیا۔ سلیم کا پارٹ میں خود کر رہا تھا اور میں ہی اس ڈرامہ کا پروڈیوسر بھی تھا۔ تھیٹر کی اگلی تین صفیں میرے انگریز دوستوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس ڈرامے کی اور میرے پارٹ کی بہت تعریف ہوئی۔ اگلے روز جب میں اپنے دوست سے ملنے گیا تو اس نے بجائے سبق پڑھنے کے انارکلی ڈرامے کا ذکر شروع کر دیا اور میرے تعریف کو اس قدر طول دیا کہ مجھے شرم آنے لگی۔ آخر اس نے کہا تم باقاعدہ تھیٹر چلانے کا پیشہ کیوں اختیار نہیں کر لیتے۔ میں نے کہا بھائی یہ فلم کا زمانہ ہے، تھیٹر کو کون پوچھتا ہے۔ اس نے کہا تو پھر فلم سازی شروع کرو۔ میں نے کہا نہ صاحب، فلم کے حسن جہاں تاب سے آنکھیں خیرہ ہونے کا ڈر ہے۔ بہت ہنسے اور فرمایا تو پھر براڈکاسٹنگ کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ میں نے کبھی براڈکاسٹنگ کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ میں نے کہا صاحب براڈکاسٹنگ کیا بلا ہے۔ اس پر انہوں نے مارکونی اور جانے کس کس کا ذکر کر کے مجھے بتایا کہ براڈکاسٹنگ کیا ہے۔ پھر کہا کہ پرسوں شب لارڈ ولنگڈن کی ضیافت میں ایک صاحب فیلڈن نامی سے ملاقات ہوئی تھی، وہ یہاں لندن سے براڈکاسٹنگ کی بنیاد رکھنے آئے ہیں۔ ان کو ایسے آدمیوں کی سخت ضرورت ہے جو براڈکاسٹنگ کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ میں نے کہا، نہ صاحب میں سرکاری نوکری چھوڑ کر براڈکاسٹنگ میں کہاں دھکے کھاتا پھروں گا۔ اس پر وہ بولے کہ براڈکاسٹنگ بھی سرکاری محکمہ ہے۔

میں یہ سن کر سمجھا کہ صاحب کا دماغ چل گیا ہے۔ میں نے کہا آپ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی گویا گائے کہ......

آیا کرو ادھر بھی مری جاں کبھی کبھی تو اس کا ذمہ دار حضور ملک معظم کو ٹھہرایا جائے گا؟ فرمایا ہاں۔ اس پر ہم ہنس پڑے۔ اس ملاقات کے کچھ روز بعد وہ شملے سے لاہور چلے گئے۔

ایک دن میں دفتر میں بیٹھا کسی کتاب کا ترجمہ کر رہا تھا کہ ان صاحب کی طرف سے ایک تار ملا، جس میں لکھا تھا کہ فیلڈن کی خواہش ہے کہ تم 25 جولائی کو دہلی پہنچو اور اس اثنا میں اپنی اسناد وغیرہ اسے بھیج دو۔ میں نے تار دو ایک مرتبہ پڑھا، اس کے بعد لاحول پڑھی اور تار میز کی دراز میں ڈال کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس کے دو دن بعد مجھے ان صاحب کا ایک خط ملا، اس کے ساتھ وہ خط بھی ملفوف تھا جو فیلڈن نے ان کو لکھا تھا۔ فیلڈن کا خط پڑھ کر میں حیرت میں رہ گیا۔ اس خط کے ہر لفظ سے ایک نہایت ہی جاذب شخصیت نمایاں ہوتی تھی۔ اگر اردو میں یہ خط لکھا ہوتا تو اس کا مضمون کچھ اس قسم کا ہوتا۔ ''ہوش کی باتیں کرو، جن صلاحیتوں کا ذکر تم کر رہے ہو وہ صلاحیتیں کسی میں کہاں۔ لندن کی بی بی سی بھی گدھوں سے بھری ہوئی ہے اور یہاں کے ریڈیو کے لئے بھی خدا نے چاہا تو گدھے ہی ملیں گے۔ غور سے دیکھو کہ کہیں وہ شخص جس کا تم ذکر کر رہے ہو گدھا تو نہیں۔ اور اگر گدھا نہیں تو اس سے کہو کہ 25 جولائی کو دہلی میں بورڈ کے سامنے پیش ہو اور اس اثنا میں مجھے اپنی اسناد وغیرہ بھیج دے''۔

درخواست تو میں نے نہ بھیجی البتہ مقررہ تاریخ سے دو دن قبل دہلی پہنچ گیا۔ اسٹیشن پر پہنچا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کہاں جاؤں اور کس سے پوچھوں کہ ریڈیو کیا بلا ہے۔ اور فیلڈن کہاں رہتا ہے۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد منشی اکبر خان حیدری کے مکان کا رخ کیا۔ میرا یہ عزیز دوست اور محسن مچھلی والاں میں رہتا تھا۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور دہلی آنے کا سبب دریافت کیا۔ میں نے سب حال بیان کیا۔ حیدری خدا اسے غریق رحمت کرے، گرد و پیش کے تمام حالات سے باخبر رہتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا، ہاں بھئی سنا ہے کہ ریڈیو کا محکمہ کھلنے والا ہے اور یہ بھی سنا ہے کہ آج کل اس کے ابتدائی انتظامی امور چودھری نواب علی سپرنٹنڈنٹ کے سپرد ہیں۔

چودھری صاحب سے میری تھوڑی بہت شناسائی تھی۔ میں ان کے گھر کا پتہ پوچھتا ہوا نئی دہلی پہنچا۔ بہت تپاک سے ملے اور زبردستی مجھ سے عرضی لکھوائی بلکہ خود لکھ کر دی، اور مجھ سے اس پر دستخط کرا لئے۔ اس کے بعد پوچھا ''تمہارے بھائی صاحب آ گئے ہیں''۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ میں نے کہا ''بھائی صاحب؟ کون بھائی صاحب؟''

فرمایا ''پروفیسر احمد شاہ''

میں نے کہا ''وہ یہاں کیوں آتے؟''

فرمایا ''وہ انتخاب کرنے والے بورڈ کے ممبر ہیں''

میرا رنگ اڑ گیا۔ چودھری صاحب سے رخصت ہو کر شہر آیا۔ ایک دکان سے پروفیسر بشیر احمد ہاشمی کو ٹیلیفون کیا۔ ایک جگہ اور ٹیلیفون کیا۔ تمام ہوٹلوں میں ٹیلیفون کیا مگر کہیں بھی بھائی کا پتہ نہ چلا۔ اگلے دن صبح سویرے دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچا اور لاہور سے آنے والی گاڑیوں کے مسافروں میں بھائی کو تلاش کرنے لگا۔ آخر مل گئے۔ دیکھ کر سخت حیران ہوئے اور جب میں نے کیفیت سنائی تو فرمایا لوگ کب مانیں گے کہ تم میرے ممبر ہونے سے ناواقف تھے اور میں تمہارے امیدوار ہونے سے۔ میں نے کہا کہ بندہ واپس جا رہا ہے۔ کہنے لگے اچھا جاؤ لیکن اب آئے ہو تو فیلڈن سے مل لو۔ میں نے کہا آپ کی فیلڈنگ سے ملاقات ہے؟ فرمایا نہیں۔ میں تو پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے بورڈ کا ممبر مقرر کیا گیا ہوں۔

فیلڈن صاحب سیسل ہوٹل دہلی میں مقیم تھے۔ ان کی ملاقات کے لئے کارڈ بھیجا۔ اندر سے آواز آئی آؤ، آؤ۔ مگر اس زور سے اور اس تپاک سے کہ ہوٹل ہل گیا۔ میں اندر گیا اور جاتے ہی دھک سے رہ گیا۔ فیلڈن صاحب چھ فٹ تین انچ کے منحنی انسان، سر پر لمبے لمبے بال۔ ننگ دھڑنگ۔ صرف ایک لنگوٹی نما جانگھیا پہنے کھڑے تھے۔ میں نے ایسا انگریز کاہے کو دیکھا تھا۔ مجھے حیرت زدہ دیکھ کر فرمایا۔ گرمی بہت ہے۔ تم بھی کوٹ اتار دو۔ پھر کہا، تم نے یہ گرم کپڑے کیوں پہن رکھے ہیں؟ میں نے عرض کیا۔ صاحب شملے میں رہتا ہوں۔ وہاں ہم گرم ہی کپڑے پہنتے ہیں۔ ہم شملے کے باسیوں کے پاس ٹھنڈے کپڑے نہیں ہوتے۔

یہ ملاقات پہلی نظر میں محبت والی ملاقات تھی۔ چند ہی لمحوں بعد یہ محسوس ہوا جیسے کہ ہم ایک دوسرے کو مدت سے جانتے ہوں۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ شخص مجھے دھکے دے کر باہر نہیں نکال دے گا، تو میں نے کہا آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ لیکن میں آپ کے انٹرویو والے بورڈ میں شریک نہیں ہوں گا۔ کیونکہ مجھے آج ہی معلوم ہوا ہے کہ بورڈ کے ممبروں میں میرے بھائی احمد شاہ بخاری بھی شامل ہیں۔ یہ سن کر فیلڈن صاحب نے جو کچھ کہا، وہ فیلڈن ہی کا حصہ ہے۔ بولے ''کیا بھائی سے تمہارے تعلقات اچھے نہیں''۔

آخر میں نے انہیں سمجھایا کہ میاں یہ ہندوستان ہے۔ یہاں کنبہ پروری بہت چلتی۔ اگر میں اپنی صلاحیتوں کی بنا پر لے بھی لیا گیا تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ بھائی کی سفارش پر لیا گیا ہے۔ مجھے تو معاف ہی رکھو۔ اچھی خاصی روزی کما رہا ہوں۔ تمہارے محکمے سے جو تنخواہ ملے گی، وہ اس تنخواہ سے بہت کم ہوگی جو مجھے اس شملے میں مل رہی ہے۔ اس پر فیلڈن صاحب بھٹیاریوں کی طرح گالیوں پر اتر آئے۔ کچھ گالیاں مجھے سنائیں۔ کچھ دنیا کو۔ اور کچھ تنخواہوں کے لالچ میں پھنسنے والوں کو۔ اس کے بعد مجھے اپنی گاڑی میں بٹھایا اور ڈرائیور سے کہا کہ اسے اسٹیشن ڈائریکٹر کے گھر لے جاؤ۔

میں علی پور ہاؤس میں سیٹھنا کے گھر گیا۔ ایک سیڑھی پر کھڑے چق کے لئے دیوار میں کیل ٹھونک رہے تھے۔ خدا جانے فیلڈن کی موٹر دیکھ کر یا کسی اور بوکھلاہٹ کے مارے ہتھوڑی کیل کی بجائے اپنے انگوٹھے پر مار لی۔ درد کے مارے بلبلا اٹھے۔ میں نے چند جملے ہمدردی کے کہنا اپنا فرض سمجھا۔ میری آواز سن کر فوراً پلٹے اور کہا ''تم کون ہو؟''

میں نے کہا ''بخاری ہوں۔ نوکری کے لئے شملے سے آیا ہوں''۔

''چلے جاؤ۔ تمہارے لئے کوئی نوکری نہیں''۔

میں نے کہا چلو چھٹی ہوئی۔ لوٹ کر فیلڈن کے پاس گیا اور کہا کہ جناب شام کی گاڑی سے واپس شملے جا رہا ہوں۔ سیٹھنا صاحب مجھے دیکھ کر سخت برہم ہوئے اور مجھے صاف جواب دے دیا۔ فیلڈن نے سیٹھنا کی برہمی کی وجہ پوچھی۔ میں نے کہا صاحب بظاہر تو کوئی خاص وجہ نہیں، البتہ چق کے لئے کیل گاڑ رہے تھے، ہتھوڑی انگوٹھے پر لگ گئی۔

خیر میرے بھائی مرحوم نے اس بورڈ میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ میں بورڈ کے سامنے پیش ہوا۔ اور ڈائریکٹر آف پروگرامز کے عہدے کیلئے منتخب کر لیا گیا۔ واپس شملے آیا تو میرے کرنل سخت برہم ہوئے اور کہا میں تم کو نہیں جانے دوں گا۔ میں نے فیلڈن کو لکھا۔ فیلڈن نے لارڈ ولنگڈن کو لکھا۔ دنگا فساد ہوا۔ تب جا کر مجھے شملے سے دہلی آنے کی اجازت ملی اور یوں میری ریڈیو کی زندگی کی ابتدا ہوئی۔

دہلی ریڈیو میں ملازمت کا پہلا دن مجھے اب تک یاد ہے۔ اور یاد بھی کیوں نہ ہو۔ اس دن میں نے وہ خفت اٹھائی تھی کہ بھول ہی نہیں سکتا۔ میں شملہ کے فوجی دفتر کا ملازم، مجھے کیا معلوم کہ ریڈیو کے نازک اندام خوش خرام، گل گفتار لوگوں کے سامنے کیا وتیرہ اختیار کرنا چاہئے اور ان کے حضور کس لباس میں پیش ہونا چاہئے۔ پہاڑی قسم کا بوٹ، گہرے فاختئی رنگ کی گرم پتلون، دبیز پٹی کا شکاری کوٹ۔ آستینوں پر چمڑا منڈھا ہوا۔ بغل میں ڈیڑھ فٹ کی بید، منہ میں پائپ، ہم رکابی میں مہاراجہ پٹیالہ کا عطیہ دو شکاری کتے، اس حلیہ اور بھیر و بنگاہ کے ساتھ لیفٹ رائٹ کرتا ہوا میں 18 علی پور روڈ کے احاطہ میں داخل ہوا۔ احاطے کے وسط میں فیلڈن صاحب کھڑے تھے۔ جب ان سے پہلی ملاقات ہوٹل کے کمرے میں ہوئی تو یہ حضرت جانگھیا پہنے ہوئے ننگ دھڑنگ نظر آئے تھے۔ اب جو دیکھتا ہوں تو ریشم کی پتلون، آدھی آستین اور کھلے گریبان کی جالی دار قمیص۔ پاؤں میں بغیر موزوں کے مدراسی وضع کا چپل پہنے کھڑے ہیں۔ جلو میں دو تین فیلڈن ہی کی طرح کے دھان پان برخوردار ہیں۔ ایک برخوردار سجاد سرور نیازی۔ گورا رنگ، تیکھے نقش، ستواں ناک، برگ گل جیسے پتلے پتلے ہونٹ۔ کالے پیٹینٹ کا نہایت ہی پتلے تلے کا جوتا اور نیلا سوٹ۔ نیازی کا بانکپن غضب ڈھا رہا تھا۔ دوسرے برخوردار اسرار الحق مجاز۔ لمبے سیاہ بال، رنگ میں نمک، آنکھوں میں چمک، کمر میں لچک، کمر میں ایک بل آئے تو اچکن تین جھٹکے کھائے۔ تیسرے برخوردار آغا اشرف۔ سانولا رنگ، فاختئی اچکن، تنگ مہری کا پائجامہ، چہرے پر صرف مسکراہٹ نہیں بلکہ قہقہہ اور وہ بھی ایسا کہ کمرے کو ہلا دے، پیٹ میں بل ڈال دے اور فضا میں گونج پیدا کر دے۔ دانتوں کی چمک کا وہ عالم کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔ ہائے مجاز، ہائے آغا اشرف۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

میری وضع قطع دیکھ کر ان حضرات نے مجھے تازہ وارد آغا ہینگ بیچنے والا قرار دیا۔ نیازی نے اپنی پتلی سی ناک چڑھا لی۔ مجاز زیر لب مسکرائے۔ آغا اشرف کھلکھلا کر ہنسے۔ فیلڈن نے ایک گھمبیری کھائی۔ سنبھلے تو بولے ماؤنٹ ایورسٹ فتح کرنے آئے ہو۔ میں نے کہا، میں ریڈیو کو ماؤنٹ ایورسٹ سے بھی اونچا سمجھتا ہوں۔ یہ محض فقرہ بازی تھی مگر سننے والوں کا حسن ساعت ملاحظہ ہو، وہ سمجھے کہ بہت اونچی بات کہہ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نیازی کی چڑھی ہوئی ناک اپنی جگہ پر لوٹ آئی، مجاز فکر حسن میں ڈوب گئے، آغا اشرف کی کھلی ہوئی باچھیں اپنی جگہ پر واپس آ گئیں۔ فیلڈن کو کچھ نہ سوجھا محض اضطراری کیفیت میں مجھ سے کہا اندر آؤ۔ میں کمرے میں گیا تو بس خدا دے اور بندہ لے۔ فرمایا جس لباس میں تم نے نزول اجلال فرمایا ہے، اس سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ تم ریڈیو کے بارے میں کچھ نہ سیکھ سکو گے۔ ریڈیو کے لئے اہل ذوق درکار ہیں۔ اور تم بد ذوقی کے چلتے پھرتے نمونے ہو۔ تمہارے لباس سے تمہارے انداز فکر کا پتہ چلتا ہے۔ ان بدنما موٹے موٹے کپڑوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تم موٹی عقل کے آدمی ہو۔ تمہارا تفکر کرخت اور تمہارا کردار درشت ہے۔ اور پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم یہ کتے ساتھ ساتھ کیوں لئے پھرتے ہو؟ میں نے کہا، محض اس لئے کہ یہ میرے لباس پر کوئی اعتراض نہیں کرتے۔ فیلڈن نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی اور مجھے اپنے ساتھ ہوٹل میں لے گیا۔ یہاں مجھے کھانا کھلایا، ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ کچھ اس کا مزاج درست ہوا، کچھ میرے ہوش ٹھکانے آئے۔ اتنے میں خدا بخش ملازم نے اطلاع دی کہ درزی آ گیا ہے۔ کہا بلا لاؤ۔ درزی اندر آیا تو میری طرف اشارہ کر کے کہا۔ ان کے لئے چھ ٹھنڈے سوٹ بنا دو۔

18، علی پور روڈ پر ایک کرایہ کا بنگلہ ریڈیو کے لئے لے لیا گیا تھا۔ لیکن ابھی یہ بھائیں بھائیں کرتا ہوا ایک اجاڑ قسم کا مکان تھا اور بس۔ عملے کی یہ حالت تھی کہ سوائے اسٹیشن ڈائریکٹر اور چند انجینئروں کے کوئی ملازم ہی نہیں رکھا گیا تھا۔ فیلڈن نے مجھ سے کہا کہ بنگلے کو اسٹوڈیو بنانا اور پروگرام کے لئے مناسب لوگوں کو منتخب کرنا تمہارے فرائض میں داخل ہوگا۔ میں بہت گھبرایا۔ مجھے کیا معلوم کہ اسٹوڈیو کیا ہوتا ہے۔ میں تو اس کی الف بے سے بھی واقف نہ تھا۔ ساری عمر اسٹوڈیو دیکھا بھی نہ تھا۔ باقی رہا کارکنوں کا انتخاب، سو وہ بھی مجھ سے کیوں کر ممکن تھا۔ جو لوگ انتخاب کے لئے پہلے ہی سے موجود تھے، ان کا ذکر تو میں کر ہی چکا ہوں۔ یہ وہی ہیں جو سب کے سب مجھ پر ہنسے تھے۔

آغا اشرف، حضرت محمد حسین آزاد کے پوتے تھے۔ آغا طاہر کے چھوٹے بھائی تھے۔ شریف النفس تھے۔ شیریں مقال تھے۔ میں ان کو اپنا چھوٹا سمجھتا تھا۔ مگر وہ مجھ پر ہنسے تھے۔ مجاز ہونہار شاعر سہی، مگر مجھ پر ہنسا کیوں؟ باقی رہا نیازی، اس سے تو میں پہلے ہی سے جلا ہوا تھا۔ کم بخت کالج کے زمانے میں اپنے آپ کو رفیق غزنوی سے بہتر گویا سمجھتا تھا۔ رفیق میرے بچپن کا دوست، مجھے جان سے عزیز، یہ نیازی کون ہوتا تھا اپنے آپ کو اس سے بہتر سمجھنے والا! کالج کے زمانے میں جب نیازی، رفیق کے مقابلے میں میدان میں اترا تو یار لوگوں میں یہ طے ہوا کہ ہز ماسٹرز وائس کا ایک ریکارڈ ایسا بھروایا جائے جس کے ایک طرف رفیق کا گانا ہو اور دوسری طرف نیازی کا، تا کہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔ ریکارڈ بنا اور خوب بکا۔ رفیق کے دلدادہ جن میں یہ خاکسار سر فہرست تھا، یہ ایمان رکھتے تھے کہ اس ریکارڈ کی ہر دلعزیزی رفیق کے گانے کی وجہ سے ہے۔ لیکن نیازی اس کو اپنی کرامات کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

میں نے مکان کو اسٹوڈیو کی شکل دینے اور کارکنوں کے انتخاب کا ذمہ لینے سے اپنی معذوری ظاہر کی۔ فیلڈن نے کہا اس کا علاج سہل ہے۔ اسٹوڈیو کے بارے میں بہت سی کتابیں میرے پاس رکھی ہیں۔ ان کا مطالعہ کرو اور انتخاب کے بارے میں تعصب کو بالائے طاق رکھو۔ یہ لوگ تمہیں دیکھ کر ہنسے تو کیا ہوا۔ تم ہو ہی ایسے وحشی انسان کہ لوگ دیکھ کر ہنسیں۔ الغرض فیلڈن صاحب کتابوں کا ایک پلندہ اٹھا کر لائے اور کہا انہیں گھر لے جاؤ اور جا کر پڑھو۔

میں نے جب کتابوں کے ورق الٹ پلٹ کر دیکھے تو رنگ اڑ گیا۔ ان کتابوں میں آواز کے زاویوں کا ذکر تھا۔ ان چیزوں کا ذکر تھا، جن میں آواز دھنس جاتی ہے۔ ان چیزوں کا ذکر تھا جن سے ٹکرا کر آواز لوٹ آتی ہے۔ میں جوں جوں یہ کتابیں پڑھتا جاتا مجھے یقین ہوتا جاتا کہ یہ کام میرے بس کا نہیں۔ میں نے دل میں اپنی ہار مان لی۔ احساس شکست نے مجھے ملول اور دل شکستہ کر دیا۔ میں اپنے کمرے میں سر بکف بیٹھا تھا کہ نیازی آ گیا۔

نیازی ہز ماسٹرز وائس سے وابستہ تھا، اس لئے اسٹوڈیو کے اسرار میں اسے بہت دخل تھا۔ مجھے سر بکف بیٹھا دیکھا تو کچھ اس خلوص سے میری دلجوئی کی کہ میں نے اٹھ کر اسے سینہ سے لگا لیا۔ یوں نیازی کے ساتھ اس دوستی کی بنیاد پڑی جو آج تک ہمالیہ کی طرح اپنی جگہ پر قائم ہے۔ شام کو آغا اشرف سے ملاقات ہوئی۔ میرے نتھنے پھولے دیکھے تو کہا۔ بس اتنی ہی سکت تھی۔ اس کے بعد اپنا مخصوص اور مشہور قہقہہ لگایا۔ مجھے اپنے آپ پر سخت ندامت ہوئی۔ اس کے بعد آغا اشرف کے بغیر میں ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ خدا اسے غریق رحمت کرے۔ اس نے اپنے خلوص اور اپنی محبت کو آخری دم تک نبھایا۔ مجاز سے ملاقات ہوئی تو اٹک اٹک کر بولے، آپ کو منانے کا میں نے ایک حل سوچا ہے۔ یہ کہہ کر ایک کاغذ میرے ہاتھ میں دیا۔ اس پر میری ہجو لکھی ہوئی تھی۔ ہنستے ہنستے میرا برا حال ہو گیا۔

فیلڈن کی دی ہوئی کتابیں پڑھنے اور دوستوں سے دل صاف کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اسٹوڈیو بنانا انجینئروں کا کام ہے اور کارکنوں کا انتخاب کنٹرولر یا اسٹیشن ڈائریکٹر کا۔ میں کسی شمار ہی میں نہ آتا تھا۔ فیلڈن نے ایک خوبصورت حکم دے کر مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں اسٹوڈیو کو کھیل نہ سمجھوں۔ نیز دوستوں سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر بگڑ جانے کو انتہائی درجے کی پست اور ذلیل چیز قرار دوں۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆



آل انڈیا ریڈیو کو بخاری برادرز کارپوریشن کا خطاب دیا گیا

''بی بی سی'' کی نئی تشریح دیوان سنگھ مفتون کی اختراع تھی-حکومت نے ریڈیو کو محکمہ ڈاک کے ماتحت کر دیا تھا-جس کے سبب ٹھگی دفتر انٹیلی جنس بیورو کی مداخلت بڑھ گئی-سرکاری تحویل میں لئے جانے سے پہلے ریڈیو پارسی سیٹھوں کی ملکیت تھا- زیڈ اے بخاری کی کتاب ''سرگزشت'' سے اقتباس

وہ شہر کتنا بے حس ہوگا جس میں لڑکے بالے بھی ہوں، دیوانے بھی ہوں، پتھر بھی ہوں، مگر کوئی دیوانے کو پتھر نہ مارے۔

دیوانہ بہ راہے رود و طفل بہ راہے
یاران مگر این شہر شما سنگ ندارد

دیوانہ الگ اپنی دھن میں جا رہا ہے، لڑکے بالے الگ کھیل رہے ہیں۔ یارو یہ کیا ہوگیا۔ کیا تمہارے شہر میں پتھر نہیں رہے؟

شکر کا مقام ہے کہ ریڈیو سننے والوں کا شہر بے حس نہیں۔ اس شہر میں پتھر بھی ہیں اور پتھر برسانے والے لوگ بھی۔ ریڈیو کی زندگی اسی سے ہے کہ ریڈیو سننے والے اس کے شین قاف کو کسوٹی پر کسیں اور اس کی ہر صدا کو پرکھ کر دیکھیں کہ صدا ہے یا محض ہانک یا ہونک۔

اگر ریڈیو پر کڑی نظر رکھنے والے صرف وہی لوگ ہوتے جو ریڈیو خریدتے ہیں، ریڈیو کی فیس بھرتے ہیں تو ریڈیو والے انہیں آقاؤں کے اشارے پر چلتے اور دیکھتے کہ سننے والے کون سا پروگرام زیادہ چاہتے ہیں اور کون سا کم۔ کس پروڈیوسر کا کام انہیں پسند ہے اور کس کا ناپسند۔ کون سے اناؤنسر کی آواز ان کو مرغوب ہے اور کس کی آواز نامرغوب۔ ہر ناپسندیدہ پروگرام پر لوگ ریڈیو والوں کو پتھر مارتے۔ ریڈیو والے سننے والوں کے پتھر کھاتے، زخمی ہوتے اور کان پکڑتے کہ آئندہ کبھی ایسی غلطی نہ کریں گے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ ریڈیو کو سرکار کا محکمہ قرار دیا گیا اور سرکار بھی غیر ملکی۔ چنانچہ لوگ ریڈیو والوں سے کہتے ہیں ''کہ اے کشتۂ ستم تیری غیرت کو کیا ہوا؟'' فلاں ''جی حضوری'' پروگرام بند کرو۔ ورنہ ہم پتھر ماریں گے۔ مگر سرکار فرماتی ہے ''وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں'' تم سرکار کے ملازم ہو، پتھر کھاتے جاؤ، زخمی ہوتے جاؤ اور ''جی حضوری'' پروگرام چلاتے جاؤ۔ سننے والوں کو چلانے دو کب تک چلائیں گے، آخر تھک کر ہار جائیں گے۔

ریڈیو کے معاملے میں برٹش راج کی دخل اندازی کا ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔ ہم نے آصف علی مرحوم سے ''گزشتہ دہلی'' کے موضوع پر تقریریں نشر کرنے کی درخواست کی۔ میں خود یہ درخواست لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور منت سماجت کر کے ان کو راضی کر لیا۔ جب ریڈیو کے رسالے ''آواز'' میں جناب آصف علی کا نام آیا تو انٹیلی جنس بیورو نے جسے اس زمانے میں ٹھگی دفتر کہا جاتا تھا، ہمیں لکھا کہ آصف علی باغی قسم کا آدمی ہے، ملک کی آزادی چاہتا ہے، اس سے تقریر نہ کراؤ۔ ہم نے گزارش کی کہ اقرار نامے پر دستخط ہو چکے ہیں۔ اب ہم کس منہ سے اسے منسوخ کریں۔ اس پر سرکار نے حکم دیا کہ اچھا آئندہ را احتیاط مگر آصف علی کی تقریر کا مسودہ نشر ہونے سے پہلے ٹھگی دفتر میں محاسبے کے لیے بھیج دیا جائے۔

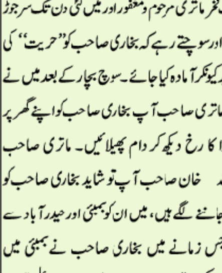
بھائی آصف علی نے اپنے مسودے میں ڈپٹی نذیر احمد کا ذکر کیا تھا اور لکھا تھا کہ ایک مرتبہ ڈپٹی صاحب کی ملاقات لارڈ کرزن سے ہوئی۔ باتوں باتوں میں لارڈ کرزن نے کہا، ہندوستانی بہت جھوٹے ہوتے ہیں۔ ڈپٹی صاحب بولے جی بجا اور آپ جھوٹوں کے بادشاہ۔ ٹھگی دفتر نے آصف علی کی تقریر کا یہ حصہ کاٹ دیا۔ اور مجھے تاکید کی کہ دیکھو آصف علی کو یہ خبر نہ ہونے پائے کہ تقریر کا یہ حصہ انٹیلی جنس بیورو نے کاٹا ہے۔ بھائی آصف علی سے کون سی بات چھپی رہتی تھی۔ انہیں معلوم ہو ہی گیا کہ پردہ زنگاری میں کون ہے۔ بس پھر کیا تھا، اسمبلی میں سرکار کو ایسا آڑے ہاتھوں لیا اور اخباروں نے وہ گوشمالی کی کہ سرکار دولت مدار کے افسر سر سہلاتے رہ گئے۔

ریڈیو کا سرکاری محکمہ ہونا انہونی بات تھی، مگر ہو کر رہی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ریڈیو چلا دیا جائے تو ریڈیو سیٹ دھڑا دھڑ بکیں گے اور ہمارے وارے نیارے ہوں گے۔ پیسہ خرچ کرنے کی عادت۔ ان حضرات نے کوئی ایک ڈیڑھ کلوواٹ کا چھوٹا سا ٹرانسمیٹر بمبئی میں اور ایک کلکتے میں۔ یہ دونوں ٹرانسمیٹر لگا کر مگن ہو بیٹھے کہ اب ہمارے ٹرانسمیٹروں کی آواز سے ہنا گے۔ ریڈیو کے پروگراموں کے لیے صرف تیس روپے روز کی رقم مقرر کی گئی۔ چالیس کلکتے کا اسٹیشن ڈائریکٹر ایک انگریز انجینئر مقرر رہا۔ یہ انگریز مارکونی کمپنی میں ملازم تھا اور اپنے فرائض منصبی میں سے دس پندرہ منٹ نکال کر ریڈیو پر بھی ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال لیا کرتا تھا۔ مقصد دراصل اس کا مارکونی کمپنی کا بنا ہوا ریڈیو کا سامان بیچنا تھا، پروگراموں سے اسے کیا سروکار۔

بمبئی کا اسٹیشن ڈائریکٹر ایک پارسی نو دولتیا تھا۔ شراب کا شوقین اور طوائفوں کے گانے کا رسیا۔ اس زمانے میں بمبئی کے سیٹھ ساہوکار اسٹیشن ڈائریکٹر سے کہہ سن کر اپنی داشتہ کا پروگرام ریڈیو پر کرایا کرتے تھے۔ ریڈیو کے خزانے سے ان گانے والیوں کو فیس نہیں دی جاتی تھی۔ یہ فیس سیٹھ کے گھر سے آتی تھی۔ البتہ ادا کی جاتی تھی، اسٹیشن ڈائریکٹر کے ہاتھ سے ہزار روپے دلوائے تو دوسرے سیٹھ نے ضد میں آ کر اپنی داشتہ کو ڈیڑھ ہزار عطا فرمائے۔ یہی نہیں، ہر پروگرام کے بعد اسٹوڈیو میں وہ رنگ جمتا تھا جو شراب، کباب کی فراوانی کے باعث محفل جمشید کو شرماتا تھا۔

ریڈیو اسٹیشن کے مالک اہل تجارت شریف لوگ تھے۔ انہوں نے یہ رنگ رلیاں دیکھ کر اپنی عزت اسی میں سمجھی کہ ریڈیو اسٹیشن بند کر دیئے جائیں۔ ان کا یہ فیصلہ سن کر بمبئی کے اسٹیشن ڈائریکٹر کے یہاں پٹس پڑ گئی۔ ہائے وہ ہزاروں روپے کا ہیر پھیر۔ ہائے وہ محفلیں۔ غریب نے ریڈیو کے الوداعی پروگرام میں رو رو کر دل ٹھنڈا کیا۔ حضرات بس رخصت الوداع الفراق۔

یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے



''حریت'' کی رسم بسم اللہ دسمبر 62ء کی تیسری تاریخ کو ہوئی اور ''حریت'' کا یہ پہلا پرچہ بخاری صاحب قبلہ کی سرگزشت کی پہلی قسط سے مزین تھا۔ قبلہ بخاری صاحب کو سرگزشت لکھنے پر کس طرح آمادہ کیا گیا؟ اس کا احوال ''آداب عرض'' کے مشہور مقالہ نویس اور لائق احترام جناب نصر اللہ خان یوں بیان فرماتے ہیں کہ ''جناب فخر ماتری مرحوم و مغفور اور میں کئی دن تک سر جوڑ کر بیٹھے رہے اور سوچتے رہے کہ بخاری صاحب کو ''حریت'' کی قلمی اعانت پر کیونکر آمادہ کیا جائے۔ سوچ بچار کے بعد میں نے صلاح دی کہ ماتری صاحب آپ بخاری صاحب کو اپنے گھر پر بلائیں اور ہوا کا رخ دیکھ کر دام پھیلائیں۔ ماتری صاحب بولے، نصر اللہ خان صاحب آپ تو شاید بخاری صاحب کو کراچی آ کر جاننے لگے ہیں، میں ان کو بمبئی اور حیدرآباد سے جانتا ہوں۔ جس زمانے میں بخاری صاحب نے بمبئی میں جھنڈے گاڑ رکھے تھے، میں اس زمانے میں طالب علم تھا اور دیگر بیشمار طالب علموں کی طرح بخاری صاحب کا پرستار۔ یہ شخص نہ اس وقت کسی کی باتوں میں آیا نہ اب آئے گا۔ اس کو زیر دام لانا مشکل ہے۔ آخر تجویز یہ ٹھہری کہ نصر اللہ خان صاحب پہلے بخاری صاحب کے پاس جائیں اور زمین ہموار کرنے کی کوشش کریں۔ خان صاحب کی زبان میں خدا جانے کیا جادو تھا یا فخر ماتری کے نام میں کیا طلسم تھا کہ بخاری صاحب ''حریت'' میں مضمون لکھنے پر آمادہ ہو گئے۔ مگر ساتھ ہی یہ پخ لگا دی کہ موضوع کا انتخاب ماتری صاحب کریں۔ اب فیصلہ یہ ہوا کہ ماتری صاحب اور بخاری صاحب چائے پر ملیں۔ تجدید ملاقات بھی ہو اور مضامین کا موضوع بھی طے پائے۔ فخری ماتری اور بخاری صاحب ملے۔ چائے پی گئی۔ احمد آباد کی باتیں ہوئیں۔ بمبئی کا تذکرہ ہوا۔ مسلم لیگ، پاکستان، ہندوستان، ہندو، مسلمان، غرض یہ کہ سب باتوں کا تذکرہ ہوا۔ فخر صاحب اس کوشش میں کہ مضمون کا ذکر بخاری صاحب کریں اور بخاری صاحب اس سعی میں کہ ماتری صاحب قصہ کا آغاز کریں!

جب ماتری صاحب بہت تنگ آ گئے تو تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر فرمایا، ارے بھائی مضمون کی بات بھی کرو گے یا نہیں۔ دونوں دوستوں کے قہقہے سے ہوٹل گونج اٹھا۔ اس کے بعد دونوں نہایت سنجیدگی سے موضوع پر غور کرنے لگے۔ جو مضمون بخاری صاحب تجویز کرتے، وہ ماتری صاحب رد کر دیتے۔ اور جو موضوع ماتری صاحب تجویز فرماتے وہ بخاری صاحب کو ناپسند ہوتا۔ آخر جب محفل برخاست ہوئی تو دونوں نے اتفاق رائے سے اس بات کو تسلیم کیا کہ دونوں کی تجاویز ناقابل تسلیم تھیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ دونوں الگ الگ سوچیں اور پھر مل کر ایک دوسرے کی تجاویز پر غور کریں۔ علیک سلیک کے بعد ماتری صاحب اپنی گاڑی میں سوار ہوئے اور بخاری صاحب قبلہ اپنی گاڑی میں۔ دونوں گاڑیاں چل پڑیں۔ اتنے میں ماتری صاحب نے اپنی گاڑی کا ہارن زور زور سے بجایا۔ بخاری صاحب نے سر موڑ کر ماتری صاحب کی گاڑی کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اشارے سے کہا کہ ٹھہر جایئے۔

ماتری صاحب بھی گاڑی سے اترے اور بخاری صاحب بھی۔ ماتری صاحب نے کہا موضوع مل گیا۔ بخاری صاحب نے کہا، کیا؟ فرمایا، اپنی سرگزشت لکھو۔ کچھ تامل کے بعد بخاری صاحب نے اس تجویز پر صاد کر دیا اور یوں یہ نادر روزگار سرگزشت شائع کرنے کا سہرا ''حریت'' کے سر رہا۔ یہ سرگزشت بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ اس میں دلچسپ خود کلامی

کلکتے کا اسٹیشن ڈائریکٹر ایک تو انگریز اور دوسرے کائیاں۔ سیدھا شملے پہنچا اور انگریزی تجارت کا واسطہ دے کر افسروں سے منوا آیا کہ ریڈیو کا محکمہ سرکار ہند خود سنبھالے۔ بس یوں ریڈیو کی باگ ڈور حکومت کے ہاتھ آئی۔ برطانوی استعمار کی عمارت کے لیے تو اتغاری ڈھونڈنے والے افسروں کو کیا معلوم کہ ریڈیو والے دید و شنید کے سانچے میں کیوں کر ڈھالتے ہیں۔ یہ افسر حضرات کیا جانیں کہ ریڈیو پروڈیوسر راتیں آنکھوں میں کاٹ کر گزارتا ہے، اپنا خون پسینہ ایک کرتا ہے، جب کہیں مائکروفون کے سامنے جا کر دو حروف زبان پر لاتا ہے۔ افسران صاحبان نے تو تیس روپے روز کے پروگراموں کو بھی خزانہ عامرہ پر بار گراں سمجھا اور ریڈیو کے جھنجھٹ کو ختم کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ مگر اسی دوران میں بی بی سی لندن نے ایک خاص پروگرام ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں کے لیے شروع کر دیا۔ اس پروگرام کے سننے کے لیے برصغیر کے انگریز دھڑا دھڑ ریڈیو سیٹ خریدنے لگے۔ چنانچہ ریڈیو بیچنے والے بڑے بڑے دکان دار سرکار ہند کے پاس پہنچے اور ان سے کہا کہ اب تو ریڈیو خوب بک رہا ہے، تم کو اچھی خاصی کسٹم کی آمدنی ہو رہی ہے۔ اب ریڈیو کیوں بند کرتے ہو۔ غرض یہ کہ تھمو کر کے انہوں نے ریڈیو کو بند کرنے کا حکم منسوخ کرا لیا۔

اب مارکونی کمپنی والوں نے سوچا کہ صرف کلکتے اور بمبئی کے ایک ایک کلوواٹ کے ٹرانسمیٹروں سے کام نہیں چلے گا۔ یہ ٹرانسمیٹر بہت چھوٹے ہیں اور پھر سرکار کی نگاہ سے دور۔ بہتر یہ ہوگا کہ دہلی میں ذرا بڑا سا ٹرانسمیٹر نصب کیا جائے۔ جب دہلی میں سرکار بڑا ٹرانسمیٹر لگانے پر روپیہ خرچ کر دے گی تو اس کے ہاتھ کٹ جائیں گے۔ اور پھر کبھی ریڈیو کو بند کرنے کا نام نہ لے گی۔ مارکونی والوں نے ادھر ادھر گھوڑے دوڑائے اور سرکار سے دہلی میں بیس کلوواٹ کا ایک ٹرانسمیٹر نصب کرنے کا ٹھیکہ لے آئے۔ سرکار کو کیا معلوم کہ بیس کلوواٹ کے ٹرانسمیٹر کی آواز صرف پچاس ساٹھ میل تک جاتی ہے۔ وہ تو سمجھے کہ بیس کلوواٹ کا ٹرانسمیٹر بمبئی اور کلکتے کے اسٹیشنوں سے بیس گنا طاقت کا ہے۔ اب اس سے زیادہ طاقت کا ٹرانسمیٹر ہو ہی نہیں سکتا۔

اس کے ساتھ ہی مارکونی والوں کے دماغ میں ایک اور بات آئی۔ وہ پشاور پہنچے اور وہاں اپنے خرچ سے دس کلوواٹ کا ٹرانسمیٹر نصب کر دیا اور سرحد کی حکومت سے کہا کہ قبائلیوں تک تمہاری آواز پہنچنا بہت ضروری ہے۔ لو یہ مفت کا تجربہ کرو۔ اگر تم کو اس تجربہ میں کامیابی ہوئی تو ہمیں ٹرانسمیٹر کے دام دے دینا ورنہ مابخیر شما بسلامت ہم اپنا ٹرانسمیٹر اٹھا کر لے جائیں گے۔

کسی انگریز کمپنی کے لیے انگریزی حکومت کے نمائندے سے اپنی بات منوا لینا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ چنانچہ ''مفت راچہ گفت''۔ انگریزوں نے مارکونی کمپنی کی بات مان لی اور دل میں یہ سوچ سوچ کر خوش ہوئے کہ چٹانوں پر بسیرا کرنے والا شاہین شاید اسی بہانے زیر دام آ جائے۔ توبہ ہے انسان کن کن خوش فہمیوں میں مبتلا رہتا ہے۔ اہل اقتدار کا کیا قصور۔ سات سمندر پار سے اقتدار کا چشمہ آنکھوں پر چڑھا کر آئے تھے۔ اس چشمے کی مدد سے انہیں قبائلیوں کے جسم تو نظر آ گئے قبائلیوں کے دل تک ان کی نگاہ نہ پہنچ سکی۔

مرکزی حکومت کی سمجھ میں نہ آیا کہ مرکزی ریڈیو کس وزارت کے سپرد کیا جائے۔ ریڈیو نہ تو پی ڈبلیو ڈی میں سمو سکتا ہے، نہ آبکاری کے محکمے سے لگا کھاتا ہے۔ اس کا کیا کیا جائے۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد اس بے چارے بیکس محکمے کو ڈاک خانے والوں کے سپرد کیا گیا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں نے دہلی ریڈیو کی گھڑی کو لندن ریڈیو کی کوک سے ملا کر دیکھا تو معلوم ہوا ہمارے ریڈیو کی گھڑی کوئی تین منٹ پیچھے ہے۔ فیلڈن بہت برہم ہوا اور دریافت کیا کہ دہلی ریڈیو اپنی گھڑی کس گھڑی سے ملاتا ہے۔ ہم نے عرض کیا ڈاک اور تار گھر کے محکمے کی گھڑی سے۔ فیلڈن نے گرونا تھ بیورو ڈائریکٹر جنرل پی اینڈ ٹی سے پوچھا کہ تمہارے محکمے کی گھڑی کس گھڑی سے ملائی جاتی ہے۔ جواب ملا ریل والوں کی گھڑی سے۔ اب مصیبت یہ آ پڑی کہ ریل والے ہم سے پوچھ کر اپنی گھڑی ملایا کرتے تھے۔

ہاں تو یہ میں عرض کر رہا تھا کہ ریڈیو ڈاک اور تار کے محکمے کا ایک حقیر اور بے مایہ جز و قرار دیا گیا۔ اسی ڈاک تار کے محکمے کے ایک کونے کھدرے سے مارکونی کمپنی کو تیار پور سے آگے علی پور روڈ پر بیس کلوواٹ کا ٹرانسمیٹر نصب کرنے کا ٹھیکہ ملا۔ اور اسی محکمے نے میڈن ہوٹل سے آگے 18 علی پور روڈ پر ایک اجاڑ سا بنگلہ اسٹوڈیو کے لیے کرائے پر لیا۔ جب ڈاک تار کا محکمہ یہ تیر مار چکا تو حکومت ہند نے انگلستان سے فیلڈن کو بلوایا اور فیلڈن نے آ کر مجھ کو، آغا اشرف کو، نیازی کو اور مجاز کو ریڈیو میں ملازمت دی۔ ہمارے آنے کے بعد اور لوگ بھی آتے گئے اور ریڈیو کے دیوانوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ رشید احمد، اشتین قطب، جی۔ کے۔ فرید، ن۔ م۔ راشد، حفیظ ہوشیار پوری، کرشن چندر، راجندر بیدی، ملک حسیب۔ یہ سب اسی زمانے کے لگ بھگ کی کھیپ ہیں۔ فیض ریڈیو میں آنے سے بال بال بچ گیا۔ ورنہ آج ہمارے پیارے عوام الناس کے لیے فلمی ریکارڈ بجا تا سنائی دیتا۔

ریڈیو کا نیا نیا فن اور ریڈیو کے نوگرفتاروں کا نیا نیا خون، وہ اودھم مچا کہ قصر حکومت کے در و دیوار ہل گئے۔ فیلڈن ایسا کنٹرولر اور رشید ایسا ذہین اور زیرک کارکن۔ بات بات پر وہ بحث ہوتی کہ سویرا ہو جاتا۔ فیلڈن خوش تھا کہ رشید ایسا قابل نوجوان ریڈیو میں آ شامل ہوا اور ہم فخر کرتے کہ فیلڈن کنٹرولر ہے تو ہوا کرے، رشید لگی لپٹی نہیں رکھتا تھا۔ 18 علی پور روڈ کے مالک شیوراج بہادر ساتھ کی کوٹھی میں رہتے تھے۔ ہمارا اودھم سن کر مان گئے کہ

پائے خوباں کوئی زنداں میں نیا ہے مجنوں
آتی آواز سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی

یہ آواز سلاسل برادر مرحوم سید احمد شاہ کے آنے پر کچھ اور تیز ہو گئی۔ ہاں میں یہ بتانا بھول ہی گیا کہ ریڈیو کے حلقے میں بھائی جان کیوں کر شامل ہوئے۔ بھائی صاحب جب ریڈیو کے پہلے سلیکشن بورڈ میں حکومت پنجاب کی جانب سے ممبر مقرر ہو کر آئے تو فیلڈن ان سے مل کر بہت خوش ہوا۔ ہر وقت انہیں کا کلمہ پڑھنے لگا اور اس دھن میں رہنے لگا کہ کسی نہ کسی طرح انہیں ریڈیو میں لے آئے۔ اتنے میں ڈپٹی کنٹرولر کی آسامی کی منظوری آئی۔ فیلڈن تو سمجھتا تھا کہ جیسے بی بی سی لندن کا ڈائریکٹر جنرل، ویسا میں آل انڈیا ریڈیو کا کنٹرولر۔ اس نے بھائی صاحب کو تار بھیجا کہ ڈپٹی کنٹرولر کا عہدہ سنبھالنے فوراً آؤ۔ بھائی صاحب نے محکمہ تعلیم کو جانے کس طرح الوداع کہا اور دہلی آئے۔ مگر یہاں اور ہی گل کھلا۔ حکومت نے فیلڈن کو لکھا کہ میاں گھاس کھا گئے ہو، تم کون ہوتے ہو احمد شاہ بخاری کو ڈپٹی کنٹرولر مقرر کرنے والے۔ ہم تمہارا حکم منسوخ کرتے ہیں اور احمد شاہ بخاری کو نہیں کاؤس جی بہرام جی سیٹھنا کو ڈپٹی کنٹرولر مقرر فرماتے ہیں۔

فیلڈن چیختا چلاتا وائسرائے کے پاس پہنچا۔ وائسرائے نے سمجھایا کہ میاں ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمتی۔ فی الحال تم سیٹھنا کو ترقی دے کر ڈپٹی کنٹرولر بنا لو اور اس کی جگہ احمد شاہ بخاری کو دہلی کا اسٹیشن ڈائریکٹر مقرر کر دو اور اس کے بعد سہج پکے سو میٹھا ہو کے زرین اصول پر عمل کرو۔ یوں سید احمد شاہ بخاری سابق پروفیسر انگریزی ادب، سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور، سابق سفیر پاکستان، سابق اسسٹنٹ سیکریٹری اقوام متحدہ، پطرس نامی اردو کا مشہور ادیب، بفیض چشم التفات سرکار انگلشیہ، دہلی ریڈیو اسٹیشن کا ڈائریکٹر مقرر ہوا۔

اللہ کرے جاہ حشم اور زیادہ

فیلڈن کو سخت ندامت ہوئی۔ آخر دوڑ دھوپ کے بعد سیٹھنا کو واپس بمبئی بھیجا۔ مجھے دہلی کا اسٹیشن ڈائریکٹر مقرر کیا اور بھائی صاحب کو ریڈیو کے صدر دفتر میں ڈپٹی کنٹرولر۔ بھائی صاحب کے اسٹیشن ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہونے سے قبل مجھے ترقی دے کر اسسٹنٹ ڈائریکٹر بنا دیا گیا تھا۔ چنانچہ ایک بھائی اسٹیشن ڈائریکٹر، دوسرا بھائی اسسٹنٹ ڈائریکٹر۔ فیلڈن دونوں کا دوست، پھر کیا تھا، بی بی سی کے حروف کو نئے معنی پہنائے گئے اور آل انڈیا ریڈیو کو بخاری برادرز کارپوریشن کا خطاب دیا گیا۔ اس خطاب کی ایجاد کا سہرا دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست کے سر ہے۔ ہائے سردار دیوان سنگھ آج تک نہ تم سا باہمت دشمن ملا نہ تم سا جوان مرد دوست۔ ظالم نے بخاری برادرز کارپوریشن کا فقرا ایسا چست کیا کہ بس چپک ہی گیا۔

میں نے فیلڈن کو بروقت آگاہ کر دیا تھا کہ صاحب یہ ہندوستان ہے، یہاں بھائی کی محبت کو دیکھ کر لوگ انگلیاں اٹھاتے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ یا تو مجھے واپس آرمی ہیڈ کوارٹرز میں بھیج دو یا بھائی کو ریڈیو میں آنے کی زحمت نہ دو۔ مگر وہ فیلڈن ہی کیا جو ہار مان لے۔ گھر کا رئیس، بی بی سی لندن کا فرستادہ، انگلستان کے وزیر اعظم مسٹر بالڈون کا دوست، ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ولنگڈن کا لاڈلا، اس پر من کا موجی، شملہ و صاعقہ کا ہم فطرت، وہ کب کسی کی سنتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فیلڈن صاحب قبلہ کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ اخباروں نے بم کے گولے برسانے شروع کر دیئے۔ کوئی کہتا تھا بی بی سی کے پرانے ٹرانسمیٹر بیچنے آیا ہے۔ کوئی کہتا بالڈون نے اسے ہندوستان کی جڑوں میں پانی دینے کو بھیجا ہے۔ کوئی کہتا یہ امیر کبیر صرف دو ہزار کی تنخواہ کے لالچ میں تو انگلستان چھوڑ کر ہندوستان آنے سے رہا۔ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ کوئی کہتا تنخواہ اس کی دو ہزار اور خرچ اس کا دس ہزار۔ یہ ضرور گانے والیوں سے رشوت لیتا ہوگا۔ ان قصیدوں میں ٹیپ کا بند بخاری برادرز کارپوریشن ہوا کرتا تھا۔

میرے ہر رفیق کو بخاری برادرز کارپوریشن کا رکن سمجھا گیا اور اس پر ہر طرح کے تیر برسائے گئے۔ ان تیروں کی زد میں بے چارہ نیازی بھی آ گیا۔ نیازی کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ مجھے اپنا نیاز مند سمجھتا تھا اور مجھے فخر تھا کہ میں نیازی کا نیاز مند ہوں۔ فخر بھی کیوں نہ ہوتا۔ نیازی نے، خدا اسے خوش رکھے، میرا ہمیشہ ساتھ دیا۔ اگر نیازی موسیقی کے پروگراموں کو وضع کرنے میں، میری دستگیری نہ کرتا تو میں ٹامک ٹوئیے مارتا رہتا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ریڈیو کے لیے موسیقاروں کا انتخاب کیوں کر کرنا چاہئے۔ البتہ نیازی گراموفون کمپنی کی ملازمت کے دوران میں ان مراحل سے گزر چکا تھا۔ اس نے مجھے اس کٹھن راستے کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا۔

میرا خیال تھا کہ جب اس بات کا شہرہ چاوڑی میں پہنچے گا کہ دہلی میں ریڈیو اسٹیشن کھل رہا ہے اور موسیقاروں کو اجرت پر پروگرام ملیں گے تو میرے دفتر کے سامنے گانے والوں اور گانے والیوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جائیں گے۔ مگر واہ رے دلی۔ ہر طرف سے یہی جواب ملتا کہ تم ہوتے کون ہو ہمارا امتحان لینے والے۔ مجرے سے پہلے ہمارا گانا سننا چاہتے ہو تو ہمارے کوٹھے پر آؤ اور شریفوں میں بیٹھ کر ہمارا مجرا سنو۔ گانا پسند آئے تو استاد جی سے بات کرو۔ مجرے کی رقم ٹھہرا کر سائی دے جاؤ۔ ہم جس دن کہو گے ڈولی میں بیٹھ کر تمہارے وہاں آ جائیں گے۔ یہ تھی اس زمانے کی دلی اور یہ تھیں اس دلی کی طوائفیں۔

جب گانے والیوں نے یہ تریاہٹ دکھائی تو ہمیں ہار ماننا پڑی۔ نیازی نے کہا، بھیا اس کے بغیر چارہ نہیں کہ طوائفوں کے کوٹھوں پر جا جا کر ان کا گانا سنا جائے اور ان سے بالمشافہ گفتگو کر کے پروگرام فیس مقرر کی جائے۔ میں نے کہا کسی نے دیکھ لیا تو۔ فرمایا رات کو چھپ چھپا کر جائیں گے۔

اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

میں راضی ہو گیا۔ رات کے کوئی گیارہ بجے فیلڈن کے گھر سے ڈنر کھا کر سیدھا ریڈیو اسٹیشن پہنچا۔ یہاں آرمی پریس شملے کے مظفر اور نیازی ایک نہایت دقیانوسی گاڑی میں بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ مظفر کو میں جانتا تھا۔ شملے کا رہنے والا تھا۔ میری طرح گاڑی چلانے کے فن سے ناواقف۔ رہا نیازی، وہ میری طرح غریب آدمی، کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ گاڑی کہاں سے آئی ہے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ گاڑی مظفر کے بھائی حاجی منظور احمد کی ہے اور چاوڑی پر رعب جمانے کے لیے حاجی صاحب کے گیراج سے چرائی گئی ہے۔ نیازی گاڑی چلانے لگا۔ مظفر اس کے ساتھ آگے بیٹھا اور میں سائیسوں کی طرح دبک کر پچھلی سیٹ پر۔ جوں جوں گاڑی چاوڑی کی طرف بڑھتی گئی میرا دل گھٹتا گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہوگا۔

گاڑی مچھلی والان میں سے ہوتی ہوئی چتلی قبر کے موڑ کے قریب پہنچی تو مجھے ایک ہوٹل نظر آیا۔ میں نے کہا نیازی یہاں ذرا گاڑی روک لو۔ چائے پینے کو جی چاہتا ہے۔ یہ صرف تامل کا بہانہ تھا۔ ورنہ ایسے سفر میں چائے پینے کو کس مردود کا دل چاہتا تھا۔ نیازی نے گاڑی روک لی اور ہم تینوں ہوٹل میں داخل ہوئے۔ ڈھیروں چائے منگوائی اور پیتے گئے۔ الغاروں انڈے منگوائے اور کھاتے گئے۔ آخر مظفر نے کہا ارے بھائی تمہارا پیٹ ہے یا نور محل کی سرائے۔ اب اٹھو بھی ورنہ گانے والیاں سو سلا جائیں گی۔ میں دل پر پتھر رکھ کر اٹھا۔ نیازی اور مظفر کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی پھر چاوڑی کی طرف روانہ ہوئی۔

ہم چاوڑی میں داخل تو ہو گئے لیکن کم بخت گاڑی چاوڑی کے عین بیچوں بیچ آ کر رک گئی۔ نیازی نے بہتیرے کل پرزے مروڑے مگر گاڑی زمین پکڑ کر بیٹھ گئی۔ چلنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ آخر نیازی نے کہا کہ دونوں نیچے اترو اور گاڑی کو دھکا دو۔ چاوڑی کا بھرا پرا بازار۔ میں ڈنر سوٹ میں ملبوس۔ سفید ریشمی مفلر زیب گلو۔ ماتھے پر پسینہ۔ ہاتھوں اور ٹانگوں میں رعشہ۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں نے مظفر کے ساتھ گاڑی کو دھکا دینا شروع کیا۔ ہم دھکا دے ہی رہے تھے کہ ایک صاحب آئے اور فرمایا، بابو جی یہی رہنے دیجئے گاڑی۔ یہ اوپر کی کوٹھے والی بائی بہت اچھی ہے۔ میں نے نیازی سے کہا بس ٹھیک ہے۔ اترو گاڑی سے اور چلو۔ نیازی نے کچھ تامل کے بعد اس اجنبی سے پوچھا، کیوں میاں تمہاری بائی جی گاتی ہیں۔ وہ بولا صاحب گاتی تو نہیں۔ قریب تھا کہ نیازی اس شخص سے دست و گریبان ہو جائے مگر میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور گاڑی کو بدستور دھکا دینے میں مصروف ہو گیا۔ آخر کار گاڑی چل پڑی۔ تھوڑی دور جا کر نیازی نے گاڑی روک لی۔ اور کہا اترو یہ ہے اختری بائی آگرے والی کا کوٹھا۔

نیازی اور مظفر کے پیچھے پیچھے میں اختری بائی آگرے والی کے کوٹھے کی سیڑھیوں پر چڑھا، یوں جیسے کوئی سولی پر چڑھ رہا ہو۔ اختری بائی کے کوٹھے کی سیڑھیاں ہوں گی کوئی بارہ پندرہ، لیکن پاؤں سو سو من کے ہو رہے تھے۔ ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھیں۔ آخر مر مر کر ختم کیں۔ ہم انگنائی میں پہنچے۔ دائیں جانب چار در کا دالان۔ فرش پر سفید بے سلوٹ کی چاندنی۔ سفید تکیئے۔ صدر کی جانب نیلے رنگ کی مخملی مسند۔ سرخ گاؤ تکیہ مخمل کی تکینیاں، بغیر شیڈ کے تیز روشنی والے بڑے بڑے بلب چھت سے آویزاں۔ ہر طرف چکا چوند، مگر فضا پھر بھی باسی باسی۔ اختری بائی فرش پر یوں پڑی تھی جیسے کسی نے رلائی کا ابرا گول کر کے زمین پر ڈال دیا ہو۔ سازندے بھی ادھر ادھر سو رہے تھے اور ان کی سارنگیاں بھی۔ گھر بھر کو کسی انتظار کے ناگ نے ڈس رکھا تھا۔ سب کے چہرے پر ایک کھچاؤ، ایک کرب، ایک تناؤ، ایک ناکام شام کی اداسی۔

ہماری چاپ سن کر ایک بھاری بھر کم شخص کی آنکھ کھلی۔ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بیٹھے بیٹھے اختری بائی کو لات مار کر جگایا۔ دھان پان پتلی دبلی مدقوق سی لڑکی، بادل ناخواستہ اٹھی اور اپنے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ بکھیر دی جس کی تہہ میں غم روزگار کے آنسو چھلک رہے تھے۔ میں پلٹ کر سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ اگر نیازی اور مظفر مجھے روک نہ لیتے تو میں زقند بھر کر چاوڑی میں اترتا اور جامع مسجد کی طرف یوں بھاگتا جیسے کوئی دہکتی ہوئی آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں سے بھاگے۔ میں رک گیا۔ یعنی میں نے اوکھلی میں سر دے دیا۔

اختری نے پاندان کھولا، گلوریاں بنائیں اور تھالی میں رکھ کر ہمارے پیش کیں۔ مظفر نے نیازی کی طرف اور نیازی نے میری طرف دیکھا۔ مظفر نے چپکے سے میرے کان میں کہا، دو روپے پان کی تھالی میں رکھ دو۔ میری جیب میں دس کا نوٹ تھا۔ میں نے وہی رکھ دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ باقی آٹھ روپے واپس نہیں ملیں گے۔ ایک سازندے نے سارنگی کے کان مروڑے۔ ایک نے طبلے کو مار مار کر درست کیا۔ اختری نے گانے کا پینترا جمایا اور داغ کی غزل شروع کی۔

راہ پر ان کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں
اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

میں تو خیر دو چار ملاقاتوں میں کھلتا یا نہ کھلتا، نیازی پہلی ہی ملاقات میں کھل گیا۔ اختری کے سامنے اور بالکل قریب ہو بیٹھا۔ کان اس کے ہونٹوں کے ساتھ لگا دیئے۔ یوں جیسے کوئی راز کی بات سن رہا ہو۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے ذرا ترش لہجے میں کہا، نیازی کیا کر رہے ہو۔ فرمایا سن رہا ہوں کہ اس کے گلے میں خراش تو نہیں۔ نیازی کا جواب سن کر مجھے سخت ندامت ہوئی اور مجھ پر سخت رعب پڑا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ کسی کے گلے کے خراش کا پتہ کیوں کر لگایا جاتا ہے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ کسی کے گلے کے خراش سے مائیکروفون کی طبع نازک کو کیا صدمہ پہنچتا ہے۔ نیازی کو اختری کے گلے میں کوئی خراش نہ ملا۔ مطمئن نظر آتا تھا۔ اختری کے پاس سے اٹھ کر میرے پاس آیا اور انگریزی میں کہا۔ اچھی ہے۔ پچاس روپے میں پروگرام کرنے میں تیار ہو جائے تو بات پکی کر لینا چاہئے۔ میں نے نیازی کے کان میں کہا، دو چار کا گانا سننے کے بعد معیار مقرر کرو۔ ابھی نہیں۔

ہمیں کھسر پھسر کرتے دیکھ کر اختری بولی۔ کان لگا کر کیا سن رہے ہیں؟ کیا ان کے گلے میں بھی خراش ہے؟ ہم سب ہنس پڑے۔ چلئے اجنبیت کے بادل چھٹ گئے۔ ہم نے اختری سے پوچھا، یہاں کوئی اور بھی گانے والی ہے۔ کہا ساتھ کے کوٹھے پر درگا بائی گاتی ہے۔ ہم نے کہا یہیں بلوا لو اسے۔ اختری بولی وہ یہاں کیوں آنے لگی؟ آپ ہی کو وہاں چلنا ہوگا۔ میں نے دل میں کہا، جیسی اختری ویسی درگا، جیسا ایک کوٹھا ویسا دوسرا، چلئے چلتے ہیں، ہرج ہی کیا ہے۔ مگر اختری سے کہا تم ساتھ چلو۔ کچھ اصرار کے بعد اختری ہمارے ساتھ درگا کے کوٹھے پر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ جب وہ چلنے لگی تو ایک سازندے نے کہا، چودھری کی بیٹی ہو۔ درگا کے استادوں کو نذر دینا ہوگی۔ دو چار روپے ساتھ رکھ لو۔ اختری تنک کر بولی، ارے واہ کیسی نذر۔ میں کون سے شریفوں کو اس کے کوٹھے پر لے جا رہی ہوں؟ یہ فقرہ سن کر ہمارے چہرے تمتما اٹھے۔ اختری ہمارے تیور بھانپ گئی۔ لجا کر بولی، برا نہ مانئے، ہمارے یہاں شریف ان کو کہتے ہیں جو دل بہلانے کے لیے گانا سننے آئیں۔ آپ تو کاروباری آدمی ہیں۔

صاحبو! طوائف کے کوٹھے پر چڑھتے وقت میرے پاؤں کی لڑکھڑاہٹ سے یہ گمان نہ گزرے کہ اس میں کوئی اشارہ میری پرہیزگاری کا پایا جاتا ہے حاشا وکلا۔

اس پہ گزرے نہ گماں ریو و ریا کا زنہار
غالب خاک نشین اہل خرابات سے ہے

مقصد میرا اس بیان سے یہ تھا کہ میں طرفہ بزدل قسم کا انسان ہوں۔ خدا سے ڈروں یا نہ ڈروں، خدا کے بندوں سے ضرور ڈرتا ہوں۔ کیوں ڈرتا ہوں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میری شادی ہو چکی تھی۔ اس وقت دو بچیوں کا باپ تھا۔ نیازی کنوارا تھا۔ جورو نہ جاتا اللہ میاں سے ناتا۔ مگر نیازی بے دھڑک اور میں ڈرپوک۔ ضرور میرے دل میں کوئی چور ہوگا جسے میں آج تک پکڑ نہیں سکا۔

اختری اور درگا کے کوٹھے پر جانے کی داستان اگلے دن شہر میں مشہور ہو گئی۔ خواجہ حسن نظامی نے مجھے چھپے رستم کا خطاب دیا۔ اکبر خان حیدری نے اپنی نوجوانی کے قصے سنا کر عبرت حاصل کرنے کی تلقین کی۔ سردار دیوان سنگھ مفتون نے طعنہ دیا کہ گرے بھی تو کہاں۔ دفتر والوں میں چہ میگوئیاں ہوئیں۔ دفتر کے ہوٹل میں چائے پینے جاؤں تو لوگ ایک دوسرے کے کان میں کھسر پھسر کرنے لگیں۔ غلطی دراصل میری تھی۔ میں شام کو تو اختری اور درگا کے کوٹھے پر گیا اور اگلے روز دفتر میں آ کر بل پیش کر دیا کہ دس روپے اختری کے وہاں پان کی تھالی میں رکھے اور دو روپے درگا کے وہاں۔ یہ بارہ روپے دلوائے جائیں۔ اس بل کی داستان سب دفتر نے پڑھی۔ دفتر سے اخباروں تک پہنچی اور اخباروں کی مہربانی سے میری اہلیہ تک۔ وہ بے چاری ابھی شملے ہی میں تھیں۔ اخبار میں میرے کرتوت کی داستان پڑھی اور مجھے خط لکھا کہ میں بچوں کو لے کر پشاور جا رہی ہوں۔ میں نے تار دیا کہ ٹھہریئے میں دہلی میں مکان کا بندوبست کر کے شملے آ رہا ہوں۔ مگر اس سے پہلے کہ میرا تار پہنچے وہ بچوں سمیت شملے سے پشاور روانہ ہو چکی تھیں۔

میں نے سارا واقعہ فیلڈن کو سنایا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ بات کا بتنگڑ کیوں بنایا جا رہا ہے۔ وہ انگریز آدمی، اس کو کیا معلوم کہ ہم لوگ ایسے معاملات میں چھوئی موئی کے پھول سے بھی زیادہ نازک ہوتے ہیں۔ میں چھٹی لے کر پشاور روانہ ہوا۔ راستے میں خیال آیا کہ بھائی احمد شاہ سے ملتا چلوں۔ لاہور اتر پڑا۔ گھر گیا تو بھابی نے بہت لعنت ملامت کی اور کہا عافیت درکار ہے تو سیدھے پشاور جاؤ اور دلہن کو منا کر لاؤ۔ بھائی سے ملنا ہے تو مل لو، لیکن یہ بتا دوں کہ ان کے تیور بہت بگڑے ہوئے ہیں۔

بھائی جان مجھ پر کئی مرتبہ ہاتھ چھوڑ چکے تھے۔ میں نے خیریت اسی میں سمجھی کہ پشاور جاؤں اور واپسی پر بیوی بچوں کے ساتھ قدم بوسی کے لیے لاہور ٹھہروں۔ پشاور پہنچا تو معلوم ہوا کہ بیگم سارا کچا چٹھا اور قصہ میرے اختری اور درگا کے کوٹھوں پر جانے کا والد کو سنا چکی ہیں۔ میں دو دن تک شرم کے مارے والد کے سامنے نہ گیا۔ بڑی بہن کے گھر گیا۔ ان کو سب حال سنایا۔ بڑی بھابی سے سارا قصہ بیان کیا۔ بیوی کو منایا۔ خدا خدا کر کے یہ طے پایا کہ یہ سب والد کے پاس جائیں۔ ان کا دل میری طرف سے صاف کر کے آئیں تو میں ان کے سامنے جاؤں۔ یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی۔ شام کی نماز کے بعد بڑی بہن، خدا اسے غریق رحمت کرے، میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے والد کے دالان میں لے گئیں۔ دست بوسی کے بعد میں دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔ والد کے سامنے قرآن پاک کھلا ہوا تھا۔ سورہ ختم کر کے میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا، قرآن حکیم کا یہ نسخہ مصر سے ایک مرید میرے لیے لائے ہیں۔ دیکھو کیا پاکیزہ خط ہے۔ معلوم ہوتا ہے آہنی قلم سے لکھا ہے۔ یہ کہہ کر قرآن پاک رحل سمیت میری طرف بڑھا دیا اور فرمایا پڑھو۔ میرا دل بھر آیا۔ میں پڑھتا گیا اور روتا گیا۔ آخر والد نے اٹھ کر سینے سے لگایا۔ نہ انہوں نے اس شکایت کے متعلق کچھ کہا جو ان تک پہنچی تھی اور نہ مجھے اس کا ذکر کرنے کی جرأت ہوئی۔

☆☆☆☆☆

بدھ 26 مارچ 2014ء
روزنامہ امت کراچی/حیدر آباد



’پامسٹ نے ہاتھ دیکھ کر مجھے مردہ قرار دیدیا تھا‘

واپسی پر ایک پرانے کنویں میں جا گرا- بڑی مشکلوں سے نکالا گیا تو ساتھیوں نے انا للہ پڑھ لی- معائنے کے بعد ڈاکٹروں نے بھی میری موت کی تصدیق کردی- صحت یابی کے بعد نیازی نے مجھے چھیڑا کہ نجومی سچا تھا- میں نے کہا وہ نہیں میرا اللہ سچا ہے- زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس

مجھے حضرت نظام الدین اولیاؒ اور حضرت امیر خسروؒ سے والہانہ عقیدت ہے۔ میں اکثر سلطان جی جایا کرتا تھا اور ان دونوں بزرگوں کی درگاہ پر حاضری دیا کرتا تھا۔ یہاں سلام کر کے حضرت خواجہ حسن نظامی کی خدمت میں حاضر ہوتا اور گھنٹوں ان کی صحبت سے فیض پاتا۔ خواجہ صاحب مرحوم کے مکان سے تھوڑی ہی دور غالب کا مقبرہ تھا۔

خواجہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اس مقبرے کے سرہانے گوندنی کا ایک درخت ہوا کرتا تھا، جس کی گوندنیاں میں توڑ توڑ کر کھایا کرتا تھا۔ خواجہ صاحب، غالب کے مقبرے کے سرہانے والے درخت کی گوندنیاں تو کیا شاید پتے اور ٹہنیاں بھی کھا گئے تھے۔ کیونکہ اب وہاں اس گوندنی کے درخت کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ اب صرف غالب کی قبر کی خاک تھی اور میری جبیں! غالب کی قبر پر حاضری کے وقت مجھے اکثر غالب کا یہ شعر یاد آتا تھا۔

زمن بجرم تپیدن کنارہ می کردی
بیا بخاک من وآرمیدنم بنگر

تم میرے اضطراب واضطرار، میری آہ وفغاں، میرے درد وکرب، میرے شور وشیون کے باعث مجھ سے دور دور رہا کرتے تھے۔ لو اب میری قبر پر آؤ اور دیکھو کہ کیسا چپ چاپ بے حس وحرکت پڑا ہوں۔ نہ اضطراب کی سکت ہے نہ اضطرار کی طاقت، نہ شور کا یارا نہ شیون کی ہمت!

غالب کہاں اور میں کہاں۔ میں زمین وہ آسمان۔ لیکن دعا ہے کہ اگر نظم ونثر لکھنے کا حکم دیا ہے تو اے آفتاب جہانتاب کو پیدا کرنے والے خدا، وہ تپش اور گرمی بھی قلب وجگر کو عطا فرما جو غالب کو ودیعت فرمائی تھی۔ غالب کو قبر بھی ملی تو کہاں! سلطان نظام الدین اولیاؒ اور حضرت امیر خسروؒ کی ابدی آرام گاہ کے قرب وجوار میں۔ ساری عمر رندی میں گزاری مگر جنت ہاتھ سے نہ گئی۔

خسرو کے بعد ہماری تاریخ میں غالب آتا ہے۔ درمیان کے صفحے سب خالی ہیں۔ خسرو کی زندگی تو زندگی، اس کی موت پر بھی رشک کرتا ہوں۔ اس کی موت موت نہ تھی بلکہ اپنے محبوب سے وصال تھا۔

حضرت امیر خسرو بنگال میں فراق کی گھڑیاں جھیل رہے تھے کہ دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کا وصال ہوا۔ وصال کے وقت حضرت نے فرمایا کہ میرا ترک آئے تو اسے میری قبر کے قریب نہ آنے دینا ورنہ میری قبر شق ہوجائے گی۔

جب حضرت نظام الدین اولیاؒ کے انتقال کی خبر بنگال میں حضرت امیر خسرو نے سنی تو بے حال ہوگئے۔ فوراً دہلی کا رخ کیا اور منزلیں مارتے ہوئے درگاہ پہنچے۔ محبوب کے مزار کے سامنے آئے تو لوگوں نے روک کر کہا، حضرت کا حکم ہے کہ آپ کو یہیں روک دیا جائے۔

یہ قرب اور یہ فاصلہ۔ یہ وصال اور یہ فراق۔ حضرت وہیں رک گئے۔ دل کا خون آنکھوں میں اتر آیا۔ روتے روتے یہ دوہا کہا۔

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چوندیس!

اس کے چہرے پر اس کے کالے کالے بال بکھر گئے۔ چل اٹھ خسرو، اب تو بھی اپنے گھر کی راہ لے۔

یہ دوہا کہا اور تیورا کر گرے۔ جہاں گرے تھے وہیں لوگوں نے سپرد خاک کردیا۔ کہاں خسرو اور کہاں میں۔ وہ پاک اور میں خاک۔ لیکن یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا۔ انہی کے راستے پر چلنے کی توفیق چاہتا ہوں اور انہی کی طرح محمل جاناں کو جا لینے کی آرزو ہے۔ بات تو مجھے چھوٹی سی کہنا تھی، مگر تمہید لمبی ہوگئی۔ کیا کروں۔

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لئے

خیر تمہید ہوچکی۔ اب اصلی مطلب کی طرف آتا ہوں۔

ریڈیو کے بارے میں معقولیت کی کوئی بات میں نے کی ہو یا نہ کی ہو، لیکن جوش و غوطے لگائے ہوں، غوطے کھائے بھی۔ میں نوجوان آدمی۔ پشاور سے نکلا تو شعلے جسے دیکھو اٹھا دو چولہا۔ آج ہے تو کل نہیں۔ دلی میں گھر بار والے لوگ، پشتوں سے کے در دولت پر حاضری دی اور بصد التماس انہیں ریڈیو پر تقریر کرنے کیلئے رضامند کر ڈاکٹر انصاری، خواجہ حسن نظامی، بھائی آصف علی، مرزا محمد سعید، نواب خواجہ عبدالمجید، مولوی عبدالرحمان، منشی پریم چند، مرزا فرحت اللہ بیگ، پرنسپل رشید احمد صدیقی۔ کس کس کا نام گناؤں۔ یہ تھے ہمارے مستقل طور پر تقریریں نشر کرنے والے حضرات۔ لاہور میں ابھی ریڈیو جاری نہ ہوا تھا، مگر سالک اور امتیاز علی تاج کے بغیر محفل سونی ہوجاتی۔ چنانچہ انتظام یہ کیا گیا کہ یہ حضرات لاہور سے ٹیلیفون پر بولیں اور ہم دہلی سے ان کی تقریر ریلے کریں۔

سالک صاحب ”افکار وحوادث“ اور امتیاز صاحب ”چچا چھکن“ لے کر اس بزم میں شریک ہوئے۔ موسیقی کے پروگراموں میں ایسے لوگ شامل تھے جن کا نام ہی سن کر آج کل کے گویوں کا رنگ اڑ جائے۔ عبدالوحید خان، فیاض خان، مشتاق حسین خان، عشاق علی خان، مبارک علی خان، حافظ علی خان، عنایت حسین خان، ستاریے، بابا ملنگ خان پکھاوجی، حیدر حسین خان ستاریے، عاشق حسین خان سارنگیے، عبدالعزیز خان بین کار، یہ سب اقلیم موسیقی کے بادشاہ تھے۔ سدا نام اللہ کا۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور گوہر شادانی ہمارے ڈراموں کی جان تھے۔ مگر پروگرام ہے اور بتاتا ہے کہ میں مرنے کے بعد زندہ کیوں کر ہوا؟

یکم جنوری 1936ء کو دہلی ریڈیو شروع ہوا اور ہم پر انکشاف ہوا کہ مائیکروفون کا پیٹ کبھی بھرتا ہی نہیں۔ ہر وقت ھل من مزید کا نعرہ لگاتا ہے اور پھر طرہ یہ کہ جو چیز ایک دفعہ کھالے دوبارہ وہ چیز نہیں کھاتا۔ نئی چیز کی فرمائش کرتا ہے اور اپنی فرمائش ضدی اور لاڈلے بچے کی طرح منوا کر رہتا ہے۔

مجھے اللہ نے سب کچھ دیا ہے مگر پھر بھی میں اپنے آپ سے بھاگتا رہتا ہوں۔ کتابوں میں مستغرق رہتا ہوں کہ کہیں اپنے آپ سے تنہائی میں باتیں نہ کرنے لگوں۔ دوستوں سے باتیں کرتا رہتا ہوں۔ کام میں جتا رہتا ہوں، تاکہ تنہائی میں اپنے آپ سے باتیں نہ کرنے لگوں۔ چنانچہ مائیکروفون کی جوع البقر مجھے پسند آئی۔ رات دن مائیکروفون کا پیٹ بھرنے کی تگ ودو تھی اور میں تھا۔ دیکھنے والے کہتے تھے دیکھو کتنا محنتی ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ یہ سب فرار تھا۔ زندگی سے فرار۔ اپنے آپ سے فرار۔

غرض یہ کہ زندگی عجب گہما گہمی اور ہما ہمی میں گزر رہی تھی۔ فیلڈن کی گھرکیوں، سرکار کی جھڑکیوں، سننے والوں کی دھمکیوں، اخباروں کے دھاکوں، سب سے بے نیاز ہوکر میں اپنی راہ پر گامزن تھا۔ دن کا کھانا گھر پر، شام کا کھانا فیلڈن کے وہاں، فیلڈن سے رخصت ہوکر نظام الدین اولیاؒ، خسرو اور غالب کی درگاہوں کا طواف۔ پرانی دلی سے نئی دلی جاتے وقت کوچہ چیلان میں بھائی آصف علی اور مرزا محمد سعید کے گھر پر حاضری، چھٹی کے دن قرول باغ میں ڈاکٹر ذاکر حسین سے شرف ملاقات۔ پروگراموں کے جھنجھٹ کے بعد یہ میرا معمول تھا۔ راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ بس پہلو میں ایک کانٹا تھا تو نیازی۔ اس کے سر پر ہر وقت شادی کی دھن سوار رہتی تھی۔ شادی ہائے شادی اس کا تکیہ کلام تھا۔

بھئی نیازی آج دفتر دیر سے کیوں آئے؟

دیر سے نہ آؤں تو کیا کروں۔ میرے گھر میں کوئی بیوی بیٹھی ہے کہ مجھے وقت پر ناشتا تیار کردے۔

بھائی نیازی فلاں پروگرام وقت پر تیار کیوں نہیں ہوا؟

وقت پر تیار کیوں کر ہو۔ مجھے گھر کا اطمینان ہی حاصل نہیں تو کام میں کیا جی لگے۔ شادی کے بعد دیکھنا کتنا کام کرتا ہوں۔

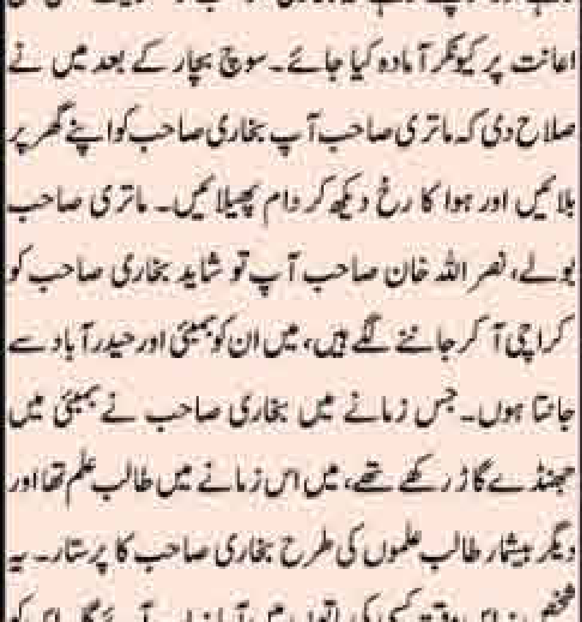
بھئی نیازی یہ دفتر میں آکر حجامت بنانے کی کیا تک ہے؟

میرے گھر میں کوئی بیوی بیٹھی ہے کہ حجامت کے لئے پانی گرم کردے؟

میں تو اس شادی کا ذکر سنتے سنتے زچ آگیا۔ مگر میری بیوی بڑی رحم دل اور فقیر منش ہیں۔ انہوں نے اپنے منہ بولے بھائی کی شادی کے لئے حضرت نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ پر حاضری دینا شروع کردی۔ ادھر تو درگاہوں پر منتیں مانی جارہی تھیں اور ادھر نیازی نے اپنی شادی کے چکر میں نجومیوں کے گھروں کا طواف شروع کردیا۔ میں دونوں کے ساتھ۔ کبھی بیوی کو نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ پر لے جاؤں اور کبھی نیازی کے ساتھ نجومیوں کی منت سماجت کرتا پھروں۔ درگاہوں کی حاضری تو درست، مگر نجومیوں پر میرا اعتقاد نہ تھا۔ میں نیازی کی ہم رکابی میں نجومیوں کے وہاں جاتا تو ضرور، مگر ان کی باتیں سن کر ہمیشہ لاحول پڑھا کرتا تھا۔ ایک دن نیازی بہت خوش خوش میرے کمرے میں آیا اور کہا، آج ایک ایسے شخص سے مل کر آیا ہوں جو واقعی ہاتھ باچنے میں کامل ہے۔ اس کی باتیں سن کر لاحول نہیں پڑھو گے۔ آمنا اور صدقنا کہو گے۔ کارونیشن ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ تم بھی اس سے جاکر ملو۔ میں نے سنی ان سنی کردی اور اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ اگلے روز فتح پوری کی طرف آیا تو کارونیشن ہوٹل کے بورڈ پر نظر پڑی اور خدا جانے جی میں کیا آئی کہ ہوٹل کی سیڑھیوں پر چڑھ گیا اور اوپر آکر نجومی کے کمرے کا نمبر پوچھا اور چق اٹھا کر کمرے میں داخل ہوگیا۔ نجومی بہت تپاک سے ملا۔ میں نے یونہی دفع الوقتی کے لئے اسے اپنا ہاتھ دکھایا۔ میرے ہاتھ کو دیکھ کر وہ شخص سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے دل میں کہا، یہ بناوٹ ہم سے نہ چلے گی، یہ نیازی نہ باشد۔ مگر جب اس کا پسینہ چھوٹ آیا، اس کے ماتھے پر شکن پڑ گئے تو میں کچھ گھبرایا۔ جی کڑا کر کے کہا فرمایئے کیا دیکھا؟ پہلے تو وہ چپ رہا۔ جب میں نے بہت اصرار کیا تو کہا، بخاری صاحب آپ تشریف لے جایئے۔ نیازی نے کہا تھا کہ بخاری بھول بھلیوں میں ڈال دینے والا آدمی ہے۔ آپ ویسے ہی نکلے۔ بس جایئے تشریف لے جایئے۔ اس کی باتیں سن کر میں سخت پریشان ہوا۔ میرے ایمان میں خلل آگیا۔ میں نے بہت اصرار سے کہا کہ جو کچھ ہے بتادو۔ وہ بولا بتاؤں کیا خاک۔ مجھے اپنے علم پر شک ہوگیا ہے۔ میرا علم بتاتا ہے کہ بخاری مر چکا ہے۔ مگر بخاری بہ نفس نفیس میرے سامنے بیٹھا ہے۔ بس آپ چلے جایئے۔ میں نجومی سے رخصت ہوکر ریڈیو اسٹیشن آیا اور سیدھا نیازی کے کمرے میں گیا۔ بہت زور سے لاحول پڑھی۔ نیازی نے کہا خیر باشد۔ میں نے سارا واقعہ ہنس ہنس کر سنایا اور نیازی کو خوب شرمندہ کیا کہ واہ اچھے نجومی کی تعریف کی تھی۔ نیازی کے کمرے سے نکل کر میں دفتر کے صحن میں آیا۔ مالی کو ساتھ لیا اور دفتر کے باغ کی دیکھ بھال میں مصروف ہوگیا۔ وہ جھاڑی چھانٹ دو۔ وہ درخت کاٹ دو۔ یہاں ایک کیاری بناؤ۔ وہاں ایک بیل چڑھاؤ۔ باغ کا چکر لگاتے لگاتے میں مالی کو لے کر ایک چبوترے پر کھڑا ہوگیا اور سارے باغ کا نقشہ اسے سمجھانے لگا۔ میں اس سے باتیں کر ہی رہا تھا کہ میرے پاؤں کے نیچے کی زمین پھٹ گئی۔ اور میں مالی سمیت زمین کے نیچے ایک اندھے کنویں میں گر کر مر گیا۔

میں اور مالی دونوں بیس سال پرانے چھتے ہوئے کنویں کی تہہ میں بے سدھ پڑے تھے۔ اور باہر کہرام مچا ہوا تھا۔ انجینئر مسٹر رائے نے شہر بھر کے ڈاکٹروں کو بلایا۔ آغا اشرف نے فیلڈن کو ٹیلیفون کیا۔ فیلڈن نے فائر بریگیڈ کو ٹیلیفون کیا اور کہا کہ رسے اور سیڑھیاں بھیج دو۔ دو آدمی کنویں میں گر گئے ہیں۔ وہاں سے ارشاد ہوا کہ چونکہ یہ واردات آگ کی واردات نہیں ہے، اس لئے رسے اور سیڑھی کے لئے حضور سیکریٹری صاحب بہادر میونسپل کمیٹی کو تحریری درخواست بھیجی جائے۔ علی پور روڈ پر ہزاروں آدمی جمع ہوگئے۔ ہر ایک کنویں میں جھانک کر دیکھے اور ہماری مغفرت کیلئے دعا مانگے۔ اب کنویں میں سے مردے نکالنے کی تدبیریں ہونے لگیں۔ آخر ایک تانگے والے نے گھوڑے کی راسیں کھول لیں اور میرے فوجی چپراسی کو ان سے باندھ کر کنویں میں لٹکا دیا۔ پہلے مالی باہر نکلا۔ اس کی سانس چل رہی تھی۔ مگر لبوں پر دم والا معاملہ تھا۔ اس کے بعد میری نعش نکلی۔ سانس بند، نبض بند، دل کی دھڑکن بند، پانچ ڈاکٹروں نے آلے لگا کر دیکھا اور انا للہ پڑھ کر پیچھے ہٹ گئے۔ اب چھٹے ڈاکٹر موقع پر پہنچے۔ یہ اب کراچی کے مشہور اور حاذق ڈاکٹر صغیر ہاشمی ہیں۔ اس وقت نوجوان اور نو آموز تھے۔ فتح پوری میں مطب کرتے تھے۔ میری محبت انہیں فتح پوری سے علی پور روڈ کھینچ لائی تھی۔ مجھے چارپائی پر مردہ پایا تو کچھ رنج ہوا، کچھ غصہ آیا کہ اتنی جلدی جان بچا کر بھاگ گیا۔ رنج اور غصے کے ملے جلے جذبات کی رو میں آکر میرے دل میں لمبی سی سوئی چبھودی۔ ایسے کئی نشتر میرے دل میں ٹوٹ چکے تھے، میں ٹس سے مس نہ ہوا۔ مزید رنج اور مزید غصے کے ساتھ ڈاکٹر ہاشمی نے ایک اور انجکشن کا وار کیا۔ یہ وار کارگر ثابت ہوا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میری نبض پھڑکنے لگی۔ میری سانس چلنے لگی۔ موت کے بعد پھر زندوں میں آشامل ہوا۔ کچھ تو دوسرے جہاں سے دور دراز کے سفر کی تکان اور کچھ سانس کی نالیوں میں کنویں کی زہریلی کیچڑ اور پانی، مجھے نمونیا ہوگیا۔ اس زمانے میں دلی میں گرمی کا موسم ہو تو اسپتال بھی بھائیں بھائیں کرتے تھے۔ انگریز شملے میں ہو تو دلی میں اسپتال کا کیا کام۔ چنانچہ اسپتال میں داخل ہونے کا خاطر خواہ انتظام نہ ہوسکا۔ تیمارداری کے لئے نرسوں کی تلاش ہوئی، مگر وہ بھی نہ ملیں۔ آخر فیلڈن نے لارڈ ولنگڈن کو شملے فون کیا۔ اس نے وائسریگل لاج کی دو نرسوں کو راتوں رات سرکاری موٹر میں دلی بھیجا۔ یہ دونوں صبح سویرے دلی پہنچیں اور میری وہ تیمارداری کی جو نرسوں ہی کا حصہ ہے۔ کوئی پندرہ سولہ دن کے بعد میں چلنے پھرنے کے قابل ہوگیا۔ نیازی کی چڑھ بن گئی۔ کہا کیوں، اب بتاؤ نجومی سچا تھا یا نہیں؟ میں نے کہا نجومی کیا سچا ہوتا، میرا خدا سچا ہے۔ میں سلام کے لئے حضرت نظام الدین اولیاؒ اور حضرت امیر خسروؒ کے دربار میں حاضر ہوا اور وہاں سے رخصت لے کر فیلڈن کے ساتھ المورے پہاڑ پر سادھوؤں کی گپھاؤں میں چلا گیا۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆



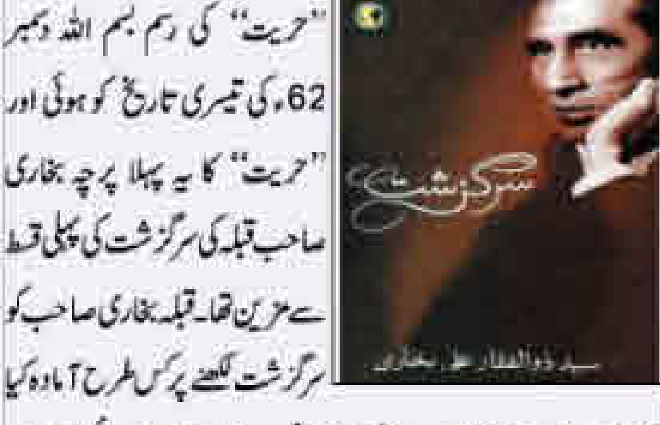
”حریت“ کی رسم بسم اللہ دسمبر 62ء کی تیسری تاریخ کو ہوئی اور ”حریت“ کا یہ پہلا پرچہ بخاری صاحب قبلہ کی سرگزشت کی پہلی قسط سے مزین تھا۔ قبلہ بخاری صاحب کو سرگزشت لکھنے پر کس طرح آمادہ کیا گیا؟ اس کا احوال ”آداب عرض“ کے مشہور مقالہ نویس اور لائق احترام جناب نصر اللہ خان یوں بیان فرماتے ہیں کہ ”جناب فخر ماتری مرحوم ومغفور اور میں کئی دن تک سر جوڑ کر بیٹھے رہے اور سوچتے رہے کہ بخاری صاحب کو ”حریت“ کی قلمی اعانت پر کیونکر آمادہ کیا جائے۔ سوچ بچار کے بعد میں نے صلاح دی کہ ماتری صاحب آپ بخاری صاحب کو اپنے گھر پر بلائیں اور ہوا کا رخ دیکھ کر دام پھیلائیں۔ ماتری صاحب بولے، نصر اللہ خان صاحب آپ تو شاید بخاری صاحب کو کراچی آکر جاننے لگے ہیں، میں ان کو بمبئی اور حیدرآباد سے جانتا ہوں۔ جس زمانے میں بخاری صاحب نے بمبئی میں جھنڈے گاڑ رکھے تھے، میں اس زمانے میں طالب علم تھا اور دیگر بیشمار طالب علموں کی طرح بخاری صاحب کا پرستار۔ یہ شخص نہ اس وقت کسی کی باتوں میں آیا نہ اب آئے گا۔ اس کو زیر دام لانا مشکل ہے۔ آخر تجویز یہ ٹھہری کہ نصر اللہ خان صاحب پہلے بخاری صاحب کے پاس جائیں اور زمین ہموار کرنے کی کوشش کریں۔ خان صاحب کی زبان میں خدا جانے کیا جادو تھا یا فخر ماتری کے نام میں کیا طلسم تھا کہ بخاری صاحب ”حریت“ میں مضمون لکھنے پر آمادہ ہوگئے۔ مگر ساتھ ہی یہ پخ لگا دی کہ موضوع کا انتخاب ماتری صاحب کریں۔ اب فیصلہ یہ ہوا کہ ماتری صاحب اور بخاری صاحب چائے پر ملیں۔ تجدید ملاقات بھی ہو اور مضامین کا موضوع بھی طے پائے۔ فخر ماتری اور بخاری صاحب ملے۔ چائے پی گئی۔ احمد آباد کی باتیں ہوئیں۔ بمبئی کا تذکرہ ہوا۔ مسلم لیگ، پاکستان، ہندوستان، ہندو، مسلمان، غرض یہ کہ سب باتوں کا تذکرہ ہوا۔ فخر صاحب اس کوشش میں کہ مضمون کا ذکر بخاری صاحب کریں اور بخاری صاحب اس سعی میں کہ ماتری صاحب قصہ کا آغاز کریں! جب ماتری صاحب بہت تنگ آگئے تو تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر فرمایا، ارے بھائی مضمون کی بات بھی کرو گے یا نہیں۔ دونوں دوستوں کے قہقہے سے ہوٹل گونج اٹھا۔ اس کے بعد دونوں نہایت سنجیدگی سے موضوع پر غور کرنے لگے۔ جو مضمون بخاری صاحب تجویز کرتے، وہ ماتری صاحب رد کردیتے۔ اور جو موضوع ماتری صاحب تجویز فرماتے وہ بخاری صاحب کو ناپسند ہوتا۔ آخر جب محفل برخاست ہوئی تو دونوں نے اتفاق رائے سے اس بات کو تسلیم کیا کہ دونوں کی تجاویز ناقابل تسلیم تھیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ دونوں الگ الگ سوچیں اور پھر مل کر ایک دوسرے کی تجاویز پر غور کریں۔ علیک سلیک کے بعد ماتری صاحب اپنی گاڑی میں سوار ہوئے اور بخاری صاحب قبلہ اپنی گاڑی میں۔ دونوں گاڑیاں چل پڑیں۔ اتنے میں ماتری صاحب نے اپنی گاڑی کا ہارن زور زور سے بجایا۔ بخاری صاحب نے سر موڑ کر ماتری صاحب کی گاڑی کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اشارے سے کہا کہ ٹھہر جایئے۔ ماتری صاحب بھی گاڑی سے اترے اور بخاری صاحب بھی۔ ماتری صاحب نے کہا موضوع مل گیا۔ بخاری صاحب نے کہا، کیا؟ فرمایا، اپنی سرگزشت لکھو۔ کچھ تامل کے بعد بخاری صاحب نے اس تجویز پر صاد کردیا اور یوں یہ نادر روزگار سرگزشت شائع کرنے کا سہرا ”حریت“ کے سر رہا۔ یہ سرگزشت بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ اس میں دلچسپ خودکلامی کے بعد اہم حصے قارئین کی خدمت میں پیش کیے جارہے ہیں۔

جمعرات/27مارچ 2014ء
روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد



ریڈیو کے انگریز افسر کی دوستی نے مخالفتوں کے در کھول دیئے

ہم وطنوں کی اکثریت مجھے فیلڈن کا خوشامدی ہونے کے طعنے دیتی-انگریز اس لئے خفا رہتے کہ میں نے ایک برطانوی افسر کو ناخلف بنادیا-جو کالوں سے دوستی کرتا پھرتا ہے-باغیوں سے میل جول پر فیلڈن سمیت ریڈیو کا عملہ سرکار کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا-سی آئی ڈی ٹوہ میں لگی رہتی تھی-زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



"حریت" کی رسم بسم اللہ دسمبر 62ء کی تیسری تاریخ کو ہوئی اور "حریت" کا یہ پہلا پرچہ بخاری صاحب قبلہ کی سرگزشت کی پہلی قسط سے مزین تھا۔قبلہ بخاری صاحب کو سرگزشت لکھنے پر کس طرح آمادہ کیا گیا؟اس کا احوال "آداب عرض" کے مشہور مقالہ نویس اور لائق احترام جناب نصر اللہ خان یوں بیان فرماتے ہیں کہ "جناب فخر ماتری مرحوم و مغفور اور میں کئی دن تک سر جوڑ کر بیٹھے رہے اور سوچتے رہے کہ بخاری صاحب کو "حریت" کی قلمی اعانت پر کیونکر آمادہ کیا جائے۔سوچ بچار کے بعد میں نے صلاح دی کہ ماتری صاحب آپ بخاری صاحب کو اپنے گھر پر بلائیں اور ہوا کا رخ دیکھ کر دام پھیلائیں۔ماتری صاحب بولے،نصر اللہ خان صاحب آپ تو شاید بخاری صاحب کو کراچی آکر جاننے لگے ہیں،میں ان کو بمبئی اور حیدرآباد سے جانتا ہوں۔جس زمانے میں بخاری صاحب نے بمبئی میں جھنڈے گاڑ رکھے تھے،میں اس زمانے میں طالب علم تھا اور دیگر بیشمار طالب علموں کی طرح بخاری صاحب کا پرستار۔یہ شخص نہ اس وقت کسی کی باتوں میں آیا نہ اب آئے گا۔اس کو زیر دام لانا مشکل ہے۔آخر تجویز یہ ٹھہری کہ نصر اللہ خان صاحب پہلے بخاری صاحب کے پاس جائیں اور زمین ہموار کرنے کی کوشش کریں۔خان صاحب کی زبان میں خدا جانے کیا جادو تھا یا فخر ماتری کے نام میں کیا طلسم تھا کہ بخاری صاحب "حریت" میں مضمون لکھنے پر آمادہ ہوگئے۔مگر ساتھ ہی یہ بیخ لگا دی کہ موضوع کا انتخاب ماتری صاحب کریں۔اب فیصلہ یہ ہوا کہ ماتری صاحب اور بخاری صاحب چائے پر ملیں۔تجدید ملاقات بھی ہو اور مضامین کا موضوع بھی طے پائے۔فخری ماتری اور بخاری صاحب ملے۔چائے پی گئی۔احمد آباد کی باتیں ہوئیں۔بمبئی کا تذکرہ ہوا۔مسلم لیگ،پاکستان،ہندوستان،ہندو،مسلمان،غرض یہ کہ سب باتوں کا تذکرہ ہوا۔فخر صاحب اس کوشش میں کہ مضمون کا ذکر بخاری صاحب کریں اور بخاری صاحب اس سعی میں کہ ماتری صاحب قصہ کا آغاز کریں!

جب ماتری صاحب بہت تنگ آگئے تو تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر فرمایا،ارے بھائی مضمون کی بات بھی کرو گے یا نہیں۔دونوں دوستوں کے قہقہے سے ہوٹل گونج اٹھا۔اس کے بعد دونوں نہایت سنجیدگی سے موضوع پر غور کرنے لگے۔جو مضمون بخاری صاحب تجویز کرتے،وہ ماتری صاحب رد کر دیتے۔اور جو موضوع ماتری صاحب تجویز فرماتے وہ بخاری صاحب کو ناپسند ہوتا۔آخر جب محفل برخاست ہوئی تو دونوں نے اتفاق رائے سے اس بات کو تسلیم کیا کہ دونوں کی تجاویز ناقابل تسلیم تھیں۔فیصلہ یہ ہوا کہ دونوں الگ الگ سوچیں اور پھر مل کر ایک دوسرے کی تجاویز پر غور کریں۔علیک سلیک کے بعد ماتری صاحب اپنی گاڑی میں سوار ہوئے اور بخاری صاحب قبلہ اپنی گاڑی میں۔دونوں گاڑیاں چل پڑیں۔اتنے میں ماتری صاحب نے اپنی گاڑی کا ہارن زور زور سے بجایا۔بخاری صاحب نے سر موڑ کر ماتری صاحب کی گاڑی کی طرف دیکھا۔انہوں نے اشارے سے کہا کہ ٹھہر جایئے۔

ماتری صاحب بھی گاڑی سے اترے اور بخاری صاحب بھی۔ماتری صاحب نے کہا موضوع مل گیا۔بخاری صاحب نے کہا،کیا؟فرمایا،اپنی سرگزشت لکھو۔کچھ تامل کے بعد بخاری صاحب نے اس تجویز پر صاد کر دیا اور یوں یہ نادر روزگار سرگزشت شائع کرنے کا سہرا "حریت" کے سر رہا۔یہ سرگزشت بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔اس میں دلچسپ خودکلامی کے بعد اہم حصے قارئین کی خدمت میں پیش کیے جارہے ہیں۔

کچھ تو بیماری کے بعد ویسے ہی طبیعت میں گداز آگیا تھا،پھر الموڑے کی خاموش فضا اور سادھوؤں کا گیان دھیان،مجھ پر سرور کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ہر شے سے محبت کرنے کو جی چاہتا تھا۔یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہمہ اوست۔

ہمارا میزبان بوشی سین تھا۔یہ اپنے زمانے کا بہت مشہور سائنسدان تھا،مگر تھا دل کا سادھو۔سائنس کے تجربے بھی کرتا اور گیان دھیان میں بھی مصروف رہتا۔اس کی انگریز بیوی اس کے ساتھ مرگ شالہ پر بیٹھ کر محو عبادت رہتی۔فیلڈن موسیقی کی دنیا میں کھو گیا۔بوشی سین کے ذخیرے سے چن چن کر ریکارڈ نکالتا اور دھیمی آواز سے گراموفون بجاتا۔

بوشی سین سائنس میں مگن،عبادت میں مصروف۔اس کی بیوی بندگی میں محو۔فیلڈن موسیقی میں گم۔میری وہ کیفیت جیسے روئی کے نرم نرم راستے پر ہولے ہولے قدم رکھتا ہوں۔کسی بے نام منزل کی طرف جا رہا ہوں۔

ریڈیو کی افراتفری اور دلی کی آپادھاپی کے شعلے بھسم ہوگئے۔فیلڈن کی طرف دل یوں کھنچ رہا تھا جیسے کسی ہلکی سی آہنی کو کوئی مقناطیسی طاقت اپنی طرف کھینچ رہی ہو۔میں دل میں سوچتا تھا کہ اس پردیسی اجنبی انگریز کی عنایتوں کا شکریہ کیوں کر ادا کروں۔اور آج تک سوچ رہا ہوں۔جس شخص نے اپنی زندگی کا اصول ہی بنا رکھا ہو کہ نیکی کر دریا میں ڈال،اس کے سامنے حساب دوستاں در دل کہہ کر چپ ہی سادھنا پڑتی ہے۔

دلی واپس آیا تو فیلڈن کا بندہ بے دام بن گیا۔اس کے گھر کا باغ ہو کہ اس کے نوکروں کی دیکھ بھال،اس کا سب نجی کام میں نے اپنے ذمے لے لیا۔اس پر کسی نے مجھے خوشامدی کہا،کسی نے کاسہ لیس،مگر یہ سب باتیں میرے نزدیک۔

این ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگروالی باتیں تھیں۔

ہندوستان کی اکثریت نے مجھے اس لئے اپنے پتھروں کا نشانہ بنایا کہ ایک تو میں مسلمان تھا اور دوسرے فیلڈن کا دست راست تھا۔انگریزوں نے مجھے اس لئے گھور گھور کر دیکھا کہ یہی ہے فساد کی جڑ،اسی نے ہمارے ایک انگریز بھائی بند کو ایسا ناخلف بنا دیا کہ کالوں سے دوستی کرتا پھرتا ہے۔

خدا جانے یہ کیسی دنیا ہے۔آپ کسی سے نفرت کریں تو اچھے اور محبت کریں تو برے!

حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے کا انگریز دل میں سمجھ چکا تھا کہ میں بتدریج گھٹ رہا ہوں اور ہندوستان کا ہندو،مسلمان میرے ہی میدان علم و ہنر میں مجھ سے بازی لے جارہا ہے۔اب کا انگریز وہ انگریز نہ تھا جو یہاں آکر کتابیں لکھتا تھا،اردو فارسی پڑھتا تھا،کالج آف فورٹ ولیم چلاتا تھا،لغات تالیف کرتا تھا۔اس کے بعد کا انگریز تو انگلستان کے کسی لال کرتی علاقے کا رہنے والا،کتابیں رٹ کر امتحان پاس کرکے کالوں پر حکومت کرنے آیا تھا۔اس کے پاس ان مسلمانوں پر حکومت کرنے کے لئے حشمت اور فراست کہاں،جو اس سے قبل آٹھ سو سال تک اسی ملک پر حکومت کر چکے ہوں۔

ان حویلیوں کو یاد کیجئے جن میں مسلمان رؤسا رہا کرتے تھے اور پھر ٹین کی چھت والے ان بنگلوں کو دیکھئے جو پی،ڈبلیو،ڈی نے ان مضافاتی صاحبوں کے لئے سڑک کے کنارے کنارے ٹھیکے پر بنوائے تھے۔اس خاصے کا تصور کیجئے جو مسلمان حاکم نوش جان فرمایا کرتے تھے اور پھر اس ملغوبے پر نظر ڈالئے جسے یہاں کے انگریز نے ڈنر کا خطاب دے رکھا تھا۔اس حریر و دیبا،اطلس و زربفت کا خیال کیجئے جو ہمارے یہاں کے وابستگان دربار زیب تن فرمایا کرتے تھے اور پھر انگریز حاکم کی اس فلالین کی پتلون اور اس شکاری کوٹ کو ملاحظہ فرمایئے جسے لباس کہنا ننگ برہنگی ہے۔

کچھ تو اس تقابل نے انگریز کو احساس کمتری میں ڈال رکھا تھا اور کچھ یہ بات ہوئی کہ محکوم قوم کے نوجوانوں پر جب سول سروس کے امتحان کا دروازہ کھلا تو مقابلے میں انگریز نے اکثر پٹخنی کھائی۔چنانچہ انگریز کھسیا گیا اور اس ذہنی خلفشار کے باعث اول جلول حرکتیں کرنے لگا۔

1857ء میں مسلمانوں کا جذبہ آزادی،آغا خان کا 1906ء میں لارڈ منٹو کے پاس مسلمانوں کا وفد لے جانا،مسلمانوں کی سیاسی اہمیت کو تسلیم کرانا،مسلم لیگ کا وجود میں آنا،منٹو مارلے اسکیم کا نفاذ،تقسیم بنگال کی تنسیخ پر مسلمانوں کا میدان میں آنا،پہلی جنگ عظیم کے دوران میں کانگریس کا مسلمانوں کے سامنے جھکنا اور میثاق لکھنو کا وجود میں آنا،مان ٹی گو چیمس فورڈ اسکیم کے ذریعے مسلمانوں کے سامنے اپنی شکست کا اعتراف کرنا،تحریک خلافت میں مولانا محمد علی کی آواز سے ڈر کر رولٹ ایکٹ کا نافذ کرنا۔پنجاب میں مارشل لا کی بربریت پر دنیا بھر کی لعنت سمیٹنا،گول میز کانفرنس کے دورے پڑنا،سائمن کمیشن اور نہرو رپورٹ کا شکست آشنا ہونا،قائد اعظم کے چودہ نکات کا ہند کے سیاست کے چودہ طبق روشن کرنا،1937ء میں قائد اعظم کا مسلم لیگ کی صدارت کو سنبھالنا اور پھر 1935ء کا ایکٹ نافذ ہونا۔یہ سب انگریز کی یاد سے محو نہیں ہو سکتا تھا۔ہندوستان میں بالعموم اور ہندوستان کے مسلمانوں میں بالخصوص آزادی کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔مسلمان نہ تو انگریزوں کی غلامی کر سکتا تھا اور نہ ان لوگوں کی جن پر آٹھ سو سال حکومت کر چکا تھا۔

1935ء میں دوسری جنگ عظیم کی آمد آمد تھی۔اسی آمد آمد کے خوف سے اس نے ہندوستان میں ریڈیو لگوایا کہ سرکار کی جے پکاری جائے۔اب یہ سرکار کی بدقسمتی کہ ریڈیو کی باگ ڈور فیلڈن جیسے آزادی پسند اور آزاد خیال کے ہاتھ میں آگئی اور فیلڈن کے ساتھ وہ لوگ ریڈیو کے کام میں شریک ہوئے،جن کے دلوں میں خوف کے بجائے آزادی کا جذبہ تھا۔چنانچہ سرکار ہمارے حال پر بھی کڑی نظر رکھنے لگی۔ہر وقت پوچھ گچھ کرتی رہتی،ہر وقت ہم کو نوکری سے برطرفی کی دھمکی دی جاتی۔سی آئی ڈی ہمارے خطوط کھول کر پڑھتی اور ہمارے ٹیلی فون کان لگا کر سنتی۔مختصر یہ کہ حکومت کے لئے ریڈیو اور ریڈیو کے لئے حکومت عذاب بن کر رہ گئی۔

ہم اپنے جذبہ آزادی کے ہاتھوں مجبور تھے اور سرکار اپنے جذبہ حکمرانی کے ہاتھوں۔نہ وہ ہار مانے نہ ہم۔مٹی کے مادھو بننا ہمارے بس کا روگ نہ تھا۔سرکار تو چاہتی تھی کہ ریڈیو والے ہمارے نام کی مالا جپیں،مگر ہم کو مائیکروفون لے کر اپنے ہم وطنوں یعنی اپنے ہم قسمت غلاموں کے دربار میں پیش ہونا تھا۔انگریز تو بوریا بندھنا سمیٹ کر جا رہا تھا،اس کا کیا تھا۔لیکن ہم کو یہاں رہنا تھا،یہیں کے لوگوں کے ساتھ جینا تھا اور انہیں لوگوں میں مرنا تھا۔

ہم مسلمانوں کو ایک اور مشکل بھی درپیش تھی۔وہ یہ کہ ہم کو دو محاذوں پر جنگ کرنا تھی۔ایک تو انگریز کے ساتھ اور دوسرے کانگریس کے ساتھ۔مگر یہاں یہ مصیبت آپڑی کہ فیلڈن کی طبیعت کا میلان کانگریس کی طرف ہوگیا۔ظاہر ہے کہ کانگریس میں اس وقت ایسے لوگ بھی شریک تھے جو سیاسیات سے قطع نظر بہت ذاتی خوبیوں کے مالک تھے۔بھائی آصف علی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کا تو ذکر میں کر ہی چکا ہوں،اب ہم نے فیلڈن کے ساتھ پنڈت جواہر لال نہرو،راج گوپال اچاریہ اور گاندھی جی کے درشن بھی کرنا شروع کر دیئے۔سروجنی نائیڈو سے تو مجھے ایک گونہ محبت سی ہوگئی تھی۔جس محفل میں آتیں گلزار کھل جاتے۔مولانا ابوالکلام آزاد الہلال کے زمانے میں علی برادران کے ساتھ پشاور آئے تھے۔نازک ایسے جیسے چمبیلی کی شاخ ہو،گورے ایسے کہ اندھیرے میں دکھائی دے جائیں۔آڑا پاجامہ،آدھی پنڈلی تک چوڑیاں۔پیٹنٹ کے چمڑے کا سیاہ پمپ دو تین پیچ کا سفید ریشمی گول عمامہ،کان پر شملہ چھٹا ہوا،کلائی پر سونے کی چھوٹی سی گھڑی،کالا تسمہ،سونے کی کمانی دار چشمہ،مگر آواز وہ کہ مسلم کلب میں بولے تو قصہ خوانی میں گونجی۔اس زمانے میں مائیکروفون ایجاد ہوا تھا۔جلسوں میں اس کی آواز کا بول بالا تھا جس کے سینے میں دم ہو۔مولانا سے کلکتہ میں ملاقات رہی اور پھر دلی میں بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔

یہ سب سرکار کے باغی تھے۔فیلڈن کا یا میرا ان حضرات سے ملنا سرکار کو گوارا نہ تھا۔سرکار اس تاک میں رہنے لگی کہ فیلڈن کا اور بخاری کا ساتھ چھوٹ جائے۔مگر مجھے فیلڈن سے جدا کرنے کا ایسا کوئی بہانہ ان کے ہاتھ نہ آتا جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

انہیں دنوں جارج پنجم کا انتقال ہوا۔ہمیں حکم دیا گیا کہ تمام پروگرام بند کر دو۔صرف خبریں سناؤ اور مغربی کلاسیکی موسیقی کے ریکارڈ بجاؤ۔دیکھو خبریں سناتے وقت بھی آواز میں خوش دلی نہ آنے پائے۔لہجہ ایسا اختیار کرو جیسے تمہارا اپنا کوئی مر گیا ہو۔میں نے ایک کارندے کو اس بات پر مقرر کیا کہ سارا دن بغیر کچھ کہے سنے اداس مغربی موسیقی کے ریکارڈ بجاتا رہے اور آغا اشرف کو خبریں پڑھنے پر مامور کیا۔

اس زمانے کے اسٹوڈیو میں ایک گھنڈی لگی ہوئی تھی۔اسے دائیں طرف گھماؤ تو اناؤنسر کی آواز سنائی دیتی تھی اور بائیں طرف گھماؤ تو موسیقی کے اسٹوڈیو کا پروگرام سنائی دینے لگتا تھا۔آغا اشرف کو سخت کھانسی آرہی تھی مگر اسی حالت میں بادشاہ سلامت کی علالت اور ان کی رحلت کا حال سنانے مائیکروفون کے سامنے آبیٹھے۔خبروں کے دوران میں اعلان کیا "حضور ملک معظم نے انتقال سے تقریباً پانچ منٹ پہلے فرمایا......"۔

یہاں ان کو کھانسی اٹھی،جھٹ گھنڈی بائیں طرف گھمادی۔موسیقی کے اسٹوڈیو کی آواز سنائی دینے لگی۔وہاں طبلہ نواز بابا ملنگ خان فرما رہے تھے۔"یہ میری ہتھوڑی کون حرام زادہ لے گیا ہے"۔

پورا فقرہ یوں بنا "حضور ملک معظم نے انتقال سے تقریباً پانچ منٹ پہلے فرمایا یہ میری ہتھوڑی کون حرام زادہ لے گیا"۔

چلئے صاحب اب خدا دے اور بندہ لے۔غضب تو یہ ہوا کہ سرکار تو غضبناک ہو کر استفسار کرے کہ یہ کیا حرکت ہے اور ہم کو بے اختیار ہنسی آجائے۔

خدا خدا کرکے سرجیمز گرگ اور لارڈ ولنگڈن نے معاملہ رفع دفع کرا دیا اور میں دلی کا دلی میں رہا۔(جاری ہے)

☆☆☆☆☆

جمعۃ المبارک/28 مارچ 2014ء
روزنامہ امت کراچی/حیدر آباد

وائسرائے کے ہمراہ سفر کیلئے مانگے تانگے کا سوٹ پہننا پڑا

مجھے ٹرین ہی میں لارڈ لن لتھگو کی تقریر کا ترجمہ کرنا تھا-بمبئی سے دہلی تک ریلوے لائن کے گرد سپاہی تعینات تھے-تمام اسٹیشن چمچماتے نظر آئے-ایوان وائسرائے میں لارڈ کی تقریر کے دوران لاؤڈ اسپیکر خراب ہو گئے-زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



"حریت" کی رسم بسم اللہ دسمبر 62ء کی تیسری تاریخ کو ہوئی اور "حریت" کا یہ پہلا پرچہ بخاری صاحب قبلہ کی سرگزشت کی پہلی قسط سے مزین تھا۔ قبلہ بخاری صاحب کو سرگزشت لکھنے پر کس طرح آمادہ کیا گیا؟ اس کا احوال "آداب عرض" کے مشہور مقالہ نویس اور لائق احترام جناب نصر اللہ خان یوں بیان فرماتے ہیں کہ "جناب فخر ماتری مرحوم و مغفور اور میں کئی دن تک سر جوڑ کر بیٹھے رہے اور سوچتے رہے کہ بخاری صاحب کو "حریت" کی قلمی اعانت پر کیونکر آمادہ کیا جائے۔ سوچ بچار کے بعد میں نے صلاح دی کہ ماتری صاحب آپ بخاری صاحب کو اپنے گھر پر بلائیں اور ہوا کا رخ دیکھ کر دام پھیلائیں۔ ماتری صاحب بولے نصر اللہ خان صاحب آپ تو شاید بخاری صاحب کو کراچی آ کر جاننے لگے ہیں، میں ان کو بمبئی اور حیدر آباد سے جانتا ہوں۔ جس زمانے میں بخاری صاحب نے بمبئی میں جھنڈے گاڑ رکھے تھے، میں اس زمانے میں طالب علم تھا اور دیگر بیشمار طالب علموں کی طرح بخاری صاحب کا پرستار۔ یہ شخص نہ اس وقت کسی کی باتوں میں آیا نہ اب آئے گا۔ اس کو زیر دام لانا مشکل ہے۔ آخر تجویز یہ ٹھہری کہ نصر اللہ خان صاحب پہلے بخاری صاحب کے پاس جائیں اور زمین ہموار کرنے کی کوشش کریں۔ خان صاحب کی زبان میں خدا جانے کیا جادو تھا یا فخر ماتری کے نام میں کیا طلسم تھا کہ بخاری صاحب "حریت" میں مضمون لکھنے پر آمادہ ہو گئے۔ مگر ساتھ ہی یہ شرط لگا دی کہ موضوع کا انتخاب ماتری صاحب کریں۔ اب فیصلہ یہ ہوا کہ ماتری صاحب اور بخاری صاحب چائے پر ملیں۔ تجدید ملاقات بھی ہو اور مضامین کا موضوع بھی طے پائے۔ فخری ماتری اور بخاری صاحب ملے۔ چائے پی گئی۔ احمد آباد کی باتیں ہوئیں۔ بمبئی کا تذکرہ ہوا۔ مسلم لیگ، پاکستان، ہندوستان، ہندو، مسلمان، غرض یہ کہ سب باتوں کا تذکرہ ہوا۔ فخر صاحب اس کوشش میں کہ مضمون کا ذکر بخاری صاحب کریں اور بخاری صاحب اس سعی میں کہ ماتری صاحب قصہ کا آغاز کریں!

جب ماتری صاحب بہت تنگ آ گئے تو تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر فرمایا، ارے بھائی مضمون کی بات بھی کرو گے یا نہیں۔ دونوں دوستوں کے قہقہے سے ہوٹل گونج اٹھا۔ اس کے بعد دونوں نہایت سنجیدگی سے موضوع پر غور کرنے لگے۔ جو مضمون بخاری صاحب تجویز کرتے، وہ ماتری صاحب رد کر دیتے۔ اور جو موضوع ماتری صاحب تجویز فرماتے وہ بخاری صاحب کو ناپسند ہوتا۔ آخر جب محفل برخاست ہوئی تو دونوں نے اتفاق رائے سے اس بات کو تسلیم کیا کہ دونوں کی تجاویز نا قابل تسلیم تھیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ دونوں الگ الگ سوچیں اور پھر مل کر ایک دوسرے کی تجویز پر غور کریں۔ علیک سلیک کے بعد ماتری صاحب اپنی گاڑی میں سوار ہوئے اور بخاری صاحب قبلہ اپنی گاڑی میں۔ دونوں گاڑیاں چل پڑیں۔ اتنے میں ماتری صاحب نے اپنی گاڑی کا ہارن زور زور سے بجایا۔ بخاری صاحب نے سر موڑ کر ماتری صاحب کی گاڑی کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اشارے سے کہا کہ ٹھہر جایئے۔

ماتری صاحب بھی گاڑی سے اترے اور بخاری صاحب بھی۔ ماتری صاحب نے کہا موضوع مل گیا۔ بخاری صاحب نے کہا، کیا؟ فرمایا، اپنی سرگزشت لکھو۔ کچھ تامل کے بعد بخاری صاحب نے اس تجویز پر صاد کر دیا اور یوں یہ نادر روزگار سرگزشت شائع کرنے کا سہرا "حریت" کے سر رہا۔ یہ سرگزشت بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ اس میں دلچسپ خود کلامی کے بعد اہم حصے قارئین کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

کسی غریب مسکین کا پاؤں چلتے چلتے رپٹ جائے تو لوگ لپک کر آگے بڑھتے ہیں اور اس بے چارے کو سہارا دے کر اٹھاتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی اکڑ باز قسم کا انسان زرق برق لباس میں ملبوس زمین کے سینے پر لاتیں مارتا ہوا چل رہا ہو اور چلتے چلتے کیلے کے چھلکے پر سے پھسل کر گر جائے تو دیکھنے والے کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔

انگریز حاکم بھی بڑا اکڑفوں والا تھا۔ زمین کے سینے کو روندتا ہوا چلتا تھا اور جب چلتے چلتے گر پڑتا تھا تو تمام رعایا میں سے کوئی بھی ایسا نمک حلال نہ نکلتا تھا جو اپنی ہنسی ضبط کر سکے۔ کیا کیا جائے مجبوری تھی۔ عام رعایا، کوئی رائے بہادر یا خان بہادر قسم کی رعایا نہ تھی کہ انگریز کو چاروں شانے چت پڑا دیکھ کر نہ خود ہنسے اور نہ کسی کو ہنسنے دے۔ انگریز رعایا کے دلوں پر حکومت نہ کر سکا۔ جسموں پر حکومت کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ جسم کی گرفت بھی کوئی گرفت ہے۔ گرفت وہ جو دلوں پر ہو۔ لارڈ ولنگڈن کی میعاد ملازمت ختم ہوئی اور ان کی جگہ لارڈ لن لتھگو ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے۔ فیلڈن نے کہا کہ اس موقع پر ریڈیو کو خاص پروگرام نشر کرنا چاہئے۔ ہم نے کہا صاحب ہمیں کیا معلوم کہ ایک وائسرائے جائے اور دوسرا آئے تو کیا ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک تو یہ گاؤ آمد و خر رفت والا معاملہ ہے۔ آپ ہی اس معاملے میں ہماری دستگیری فرمایئے۔

فیلڈن نے تار کھڑکانے شروع کئے۔ بی بی سی کو تار دیا، سیکرٹری آف اسٹیٹ کو تار، انگلستان کے وزیر اعظم کو تار، لارڈ لن لتھگو کو تار!

لارڈ لن لتھگو رشتے میں فیلڈن کے خالو تھے۔ وہاں سے فوراً جواب آیا کہ خاص پروگرام نشر کرنے کی اجازت ہے۔ اس کے بعد لندن سے متعدد تار آئے کہ خاص پروگرام ضرور نشر کیا جائے۔ بی بی سی نے جواب دیا کہ ہم اس خاص پروگرام کو دلی سے ٹیلی فون کے ذریعے لے کر لندن سے ریلے کریں گے اور نیز یہ کہ اس خاص پروگرام کی اہمیت کے پیش نظر، ہم مشہور کتاب بنگال لانسرز کے مصنف مسٹر براؤن کو کامنٹری کے لیے بذریعہ ہوائی جہاز دلی بھیج رہے ہیں۔

لن لتھگو سمندری جہاز سے آ رہا تھا، فیلڈن نے اس جہاز کے پتے پر لارڈ لن لتھگو کے نام تار بھیج کر چند معاملات کی وضاحت چاہی۔ فیلڈن اور لارڈ لن لتھگو کے درمیان تاروں کا تانتا بندھ گیا۔ اس طویل نامہ و پیغام کا لب لباب اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہوں۔

فیلڈن: آیا آپ دلی پہنچ کر رعایا کو ریڈیو کے ذریعے مخاطب فرمائیں گے۔

لارڈ لن لتھگو: ضرور مخاطب فرماؤں گا۔ شاباش تم کو خوب سوجھی۔

فیلڈن: شکریہ اس خاکسار کو جو سوجھتی ہے، خوب سوجھتی ہے۔ مگر وہ تقریر فوراً بذریعہ تار بھیج دیجئے گا تاکہ ہم اس کا اردو ترجمہ کرا رکھیں۔

لارڈ لن لتھگو: تمہاری تجویز کا مقصد سمجھنے سے مابدولت قاصر ہیں۔ اردو میں بہرہ ہیں۔

فیلڈن: جی نہیں، بے بہرہ تو نہیں، بعض تو آپ سے بھی اچھی انگریزی جانتے ہیں۔ تشریف لا رہے ہیں اس ملک کے عوام کی زبان انگریزی نہیں اردو ہے۔

لارڈ لن لتھگو: اچھا۔ شکریہ۔ مگر ابھی تقریر تیار نہیں ہوئی۔ عدن پہنچ کر تیار ہو گی۔

فیلڈن: شکریہ، آپ عدن سے بذریعہ تار اپنی تقریر ضرور ارسال فرمائیں۔

لارڈ لن لتھگو: ہرگز نہیں۔ تقریر کا مضمون بہت خفیہ ہے۔

فیلڈن: بندہ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ جو تقریر آپ ریڈیو سے نشر کریں گے

لارڈ لن لتھگو: تم کو ان باتوں میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں..... شٹ اپ۔

فیلڈن: گوشمالی کا شکریہ۔ مگر یہ ارشاد فرمایئے کہ اگر آپ کی تقریر ہم کو نہ ملی تو

لارڈ لن لتھگو: تمہاری بات سمجھ میں آ گئی۔ چنانچہ مابدولت حکم صادر فرماتے ہیں کہ ٹرین میں بمبئی سے دلی تک سفر کرے اور سفر کے دوران میں ہماری تقریر کا ترجمہ کرے۔

فیلڈن: آپ کے حکم کی تعمیل میں زیڈ۔ اے۔ بخاری کو بمبئی روانہ کیا جاتا ہے۔

لارڈ لن لتھگو: زیڈ۔ اے۔ بخاری کی محکمانہ حیثیت کیا ہے؟ اور تشریفات کی رو سے کس سلوک کا مستحق ہے؟

فیلڈن: زیڈ۔ اے۔ بخاری اسٹیشن ڈائریکٹر ہے اور سرکار کا اول درجہ کا غلام!

لارڈ لن لتھگو: زیڈ۔ اے۔ بخاری کی حیثیت سے اطلاع پائی۔ اس سے کہو کہ اپنا ڈنر سوٹ ساتھ لائے تاکہ ہماری میز پر بیٹھ کر ہمارے ساتھ کھانا کھا سکے۔

فیلڈن: زیڈ۔ اے بخاری اور بندے کی طرف سے التفات کریمانہ کا شکریہ! لیکن اطلاعاً عرض ہے کہ اگر گرمی کا موسم ہو تو ہندوستان میں بہت گرمی ہوتی ہے۔ ریل میں خطائیاں پکتی ہیں۔ ان حالات میں ڈنر سوٹ پہن کر کھانا نوش جان فرمانا حماقت ہو گی جس کا آپ کو اختیار ہے۔

لارڈ لن لتھگو: یہ ہم کو معلوم ہے، لیکن آداب حکومت اور روایات برطانیہ کا تقاضا ہے کہ ڈنر جیکٹ کے بغیر کھانا نہ کھایا جائے ورنہ ہاضمہ خراب اور سیاسی حالات پراگندہ ہو جاتے ہیں۔

فیلڈن: زیڈ۔ اے۔ بخاری ڈنر سوٹ لے کر حاضر خدمت ہو رہا ہے۔ کوئی مزید ہدایت؟

لارڈ لن لتھگو: مابدولت کے براڈ کاسٹ کے وقت وہی آداب ملحوظ رکھے جائیں جو ملک معظم کے براڈ کاسٹ کے وقت ملحوظ رکھے جاتے ہیں۔

فیلڈن: بسر و چشم۔ خاص پروگرام کی ترتیب یہ ہو گی اطلاعاً گزارش ہے:

نمبر 1: ایوان وائسرائے دہلی میں آمد پر حضور ان والیان ریاست سے ہاتھ ملائیں گے جو آپ کے استقبال کے لیے گھنٹوں پہلے سے دست بستہ کھڑے ہوں گے۔

نمبر 2: حضور براڈ کاسٹ کریں گے۔

نمبر 3: حضور کی تقریر کا اردو ترجمہ نشر کیا جائے گا۔ اس کے سننے سے بہتوں کا بھلا ہو گا۔

نمبر 4: آپ والیان ریاست اور دیگر حضرات کے ساتھ لیمنڈ نوش فرمائیں گے۔

نمبر 5: کھیل ختم پیسہ ہضم۔

لارڈ لن لتھگو: ہرگز نہیں سب سے پہلے براڈ کاسٹ کروں گا اس کے بعد ترجمہ نشر ہو گا۔ براڈ کاسٹ سے پہلے ہاتھ ہرگز نہیں ملاؤں گا۔

فیلڈن: آپ کی تقریر اور آپ کی تقریر کے ترجمے کے دوران میں والیان ریاست اور دیگر حضرات کی تواضع لیمنڈ سے کی جائے تو بہتر ہو گا۔ یہاں گرمی بہت ہے۔

لارڈ لن لتھگو: ہرگز نہیں۔ مابدولت کو اس بات سے سخت نفرت ہے کہ ہماری تقریر یا اس کے ترجمے کے دوران لیمنڈ کے گلاسوں کے ٹکرانے کی آواز آئے۔ ایسی آواز سے سننے والوں کی یکسوئی میں فرق آتا ہے۔

فیلڈن: جو حکم۔ اور کچھ ارشاد؟

لارڈ لن لتھگو: مابدولت کے براڈ کاسٹ کے وقت والیان ریاست اور دیگر بندگان درگاہ کہاں ہوں گے۔

فیلڈن: والیان ریاست اور دیگر حاضرین دربار ہال میں ہوں گے۔

لارڈ لن لتھگو: اور ہم کہاں ہوں گے؟

فیلڈن: آپ ایوان وائسرائے کے کتب خانے میں بیٹھ کر براڈ کاسٹ کریں گے۔

لارڈ لن لتھگو: تم خبطی ہو۔ اگر والیان ریاست اور دیگر حضرات دربار ہال میں ہوں گے اور ہم کتب خانے میں، تو ہماری آواز ان تک کیسے پہنچے گی؟

فیلڈن: والیان ریاست اور دیگر غلامان ازلی، درباری لباس میں ملبوس دست بستہ وصف آراستہ دربار ہال میں استادہ ہوں گے۔ آپ کے ارشادات عالیہ کتب خانے سے ان تک اس چیز کے ذریعے پہنچیں گے جسے عرف عام میں لاؤڈ اسپیکر یا بھونپو کہتے ہیں۔

لارڈ لن لتھگو: بہت خوب۔ یہ تو ہوا والیان ریاست اور دیگر مقربان خاص کا معاملہ۔ اب یہ بیان کرو کہ عوام تک وہ پھول کیسے پہنچیں گے جو دم گفتار ہمارے دہن مبارک سے جھڑیں گے۔

فیلڈن: بندہ جواب دینے سے قاصر ہے۔

لارڈ لن لتھگو: بازاروں، باغوں، کالجوں، اسکولوں اور باقی جس مقام پر تم چاہو، لاؤڈ اسپیکر لگاؤ۔

فیلڈن: حضور ہمارا ریڈیو ابھی ابھی شروع ہوا ہے، ہمارے پاس نہ تار ہے نہ مائیکروفون نہ لاؤڈ اسپیکر۔

لارڈ لن لتھگو: یہ تمام سامان فوراً خرید لو۔ ہماری طرف سے اجازت ہے۔

فیلڈن: شکریہ، لیکن یہ سامان دساور سے آتا ہے، ہندوستان میں نہیں بنتا۔

لارڈ لن لتھگو: لیکن پھر بھی کوشش کرو۔ ہماری تقریر بہت اہم ہے۔

فیلڈن: جو حکم۔

میں مانگے تانگے کا ڈنر سوٹ لے کر بمبئی پہنچا۔ گورنمنٹ ہاؤس گیا، تاکہ دیکھوں کہ یہ لوگ ایک وائسرائے کی آمد اور دوسرے کی شد کے لیے کیا بندوبست کرتے ہیں۔

لارڈ ولنگڈن دہلی سے بمبئی پہنچ چکے تھے اور بمبئی کے ہاؤس میں اپنی اہلیہ کو ساتھ لیے لوگوں سے مل رہے تھے۔ لن لتھگو کے جہاز کی آمد میں ابھی کوئی گھنٹہ بھر باقی تھا اور یہاں انتظامات کی آخری دیکھ بھال ہو رہی تھی۔ یہ رہا باڈی گارڈ، یہ رہا ترم بجانے والا، یہ رہا بادشاہ کی سلامتی کی دعا مانگنے والا بینڈ، نئے وائسرائے کی چھ گھوڑوں والی گاڑی یہاں آ کر رکے گی، یہ آدمی گھوڑوں کی لگام تھامے گا، یہ آدمی گاڑی کا دروازہ کھولے گا، اگر کسی گھوڑے نے کوئی بے تکلفی کی تو فلاں آدمی لید اٹھائے گا اور فلاں آدمی اس گھوڑے کا نام لکھ لے گا تاکہ بعد میں اس نالائق کے خلاف مناسب کارروائی کی جائے۔

اندر ایک بڑے ایوان میں دربار سجایا گیا تھا۔ بڑے بڑے آدمیوں کی کرسیوں کی نشستیں مخمل کی تھیں تاکہ بڑے آدمیوں کی پتلون کا کپڑا گھسنے نہ پائے۔ چھوٹے آدمی چونکہ ٹاٹ کی پتلون پہنتے ہیں اور ٹاٹ کا گھسنا مفید ہوتا ہے، اس لیے ان کی کرسیاں کھردرے بید کی تھیں۔

لارڈ لن لتھگو کی سواری آئی شادیانے بجے اور بج کر خاموش ہو گئے۔ ولنگڈن نے کہا ہندوستان دیا۔ لارڈ لن لتھگو نے کہا ہندوستان لیا۔ اس لے دے کے بعد ترم بجا اور خاموش ہو گیا۔ ماجیر شاہ بسلامت۔ اب جسے دیکھئے لارڈ لن لتھگو کے پیچھے پیچھے پھر رہا ہے۔ ولنگڈن ایک کونے میں الگ "کس نمی پرسد کہ بھیا کون ہو" کی مردہ مثال بنا ہوا کھڑا تھا۔ یہاں مجھے معلوم ہوا کہ بادشاہ گردی کے کیا معنی ہیں۔ توبہ۔

لارڈ لن لتھگو مع بھیر و بگاہ اسپیشل ٹرین میں بمبئی سے دہلی روانہ ہوئے۔ اس خاکسار کو بھی اس ٹرین کے ایک کونے کھدرے میں جگہ مل گئی۔ تقریر چھوٹی بھی تھی اور پھسپھسی بھی۔ لہٰذا ترجمہ کرنے میں کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ تکلیف اگر ہوئی تو یہ دیکھ کر ہوئی کہ بمبئی سے لے کر دہلی تک ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ دونوں جانب پولیس کے سپاہی کھڑے تھے۔ ان کے منہ ریل کی جانب نہ تھے، ریل کی جانب ان کی پشت تھی، اٹینشن شن۔

راستے میں چار چھ اسٹیشنوں پر گاڑی کوئلہ لینے اور پانی بھرنے کو ٹھہری۔ ان اسٹیشنوں کو دیکھ کر میں عش عش کر اٹھا۔ خوانچے والوں کے خوانچے سفید براق کلف دار جالی سے ڈھکے ہوئے، خوانچے والے خود اس قدر صاف اور ستھرے کپڑوں میں ملبوس جیسے عید کی نماز پڑھنے جا رہے ہوں۔ نہایت خاموشی کے ساتھ جتنے پیسے کوئی دیتا، صبر شکر کر کے لے لیتے۔ ہر ایک کے چہرے پر طہارت، پاکیزگی اور ایمانداری کا ملمع۔ قلی تندرز لال وردیوں میں استادہ، ہر کام پر آمادہ، حالانکہ یہاں نہ کسی کو اترنا تھا نہ اس گاڑی پر کسی کو چڑھنا تھا۔ اسٹیشن ماسٹر کی نیلی پتلون پر ایسا تاؤ جیسے پہننے کے بعد استری کی گئی ہو۔

وائسرائے بہادر نے اس صفائی کو بہت سراہا اور فرمایا کہ یہ صفائی تو انگلستان کے اسٹیشنوں پر بھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ ہم نے کہا، حضور کہاں انگلستان اور کہاں ہم غریب لوگ، آپ ہم کو کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں۔ بہر حال آپ کی ہمت افزائی کا شکریہ۔

وائسرائے بہادر کچھ دیر خاموش رہے پھر یک لخت فرمایا کتے کہاں ہیں؟ ہم بہت گھبرائے مگر کیا کرتے، صاف صاف کہہ دیا کہ حضور کتوں کا تو بندوبست نہیں کیا گیا، ویسے جو ارشاد ہو، ہم ہر خدمت کے لیے حاضر ہیں۔ فرمایا نہیں، تم ہمارا مطلب نہیں سمجھے۔ ہم نے سنا تھا کہ ہندوستان کے اسٹیشنوں پر آوارہ کتے بہت پھرتے ہیں وہ کہاں ہیں؟

ہماری جان میں جان آئی۔ سنبھل کر کہا، حضور وہ سب انتقال کر گئے۔ گاڑی بہ ہمہ تیزی و تندی، بہ ہمہ کر و فر، دہلی کے اس پلیٹ فارم پر آ کر رکی، جہاں فرشتوں کے پر جلتے ہیں۔ یہ پلیٹ فارم تقریباتی پلیٹ فارم کہلاتا تھا۔ اس پلیٹ فارم پر صرف وہی حضرات گاڑی سے اتر سکتے تھے یا گاڑی پر چڑھ سکتے تھے جنہوں نے ٹکٹ نہ خریدا ہو۔

جونہی گاڑی پلیٹ فارم پر آ کر رکی میں ایک چور دروازے سے چوروں کی طرح باہر نکلا اور بگٹٹ ریڈیو اسٹیشن کی طرف بھاگا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ مجھے دلی ریڈیو اسٹیشن سے نہیں، وائسرائے کے ایوان سے ترجمہ نشر کرنا ہے۔ ریڈیو اسٹیشن پرانی دلی میں اور وائسرائے کا ایوان نئی دلی میں، وقت کم، چھکے چھوٹ گئے۔ گاڑی تیزی سے بھگائی اور آن کی آن میں نئی دلی پہنچ گیا۔ اب یہاں راستے بند، میرے حواس باختہ ہو گئے۔ ایک پولیس والے سے کیفیت بیان کی، اس نے جواب میں سوالوں کی بھرمار کر دی۔ کون ترجمہ، کس کا ترجمہ؟ میں نے سوالات کا یہ پرچہ حل تو کیا مگر اس کا کیا علاج کہ میں شکل سے چور نظر آتا تھا۔ پولیس والے نے مجھے روک لیا اور حکم دیا کہ یہاں سے سرکے تو یاد رکھنا! عجب عذاب میں جان تھی۔ اتنے میں مجھے ایک جغادری قسم کا انگریز فوجی افسر دکھائی دیا۔ میں پولیس کی حراست سے رسہ تڑا کر اس انگریز کے پاس پہنچا۔ اسے ملکہ وکٹوریہ کی روح کا واسطہ دے کر کہا کہ میری گزارش سنو۔ اس نے میری گزارش سنی۔ اور مجھے ایک گورے موٹر سائیکل سوار کے پیچھے موٹر سائیکل پر بٹھا دیا۔ گورے کو حکم دیا کہ مردہ یا زندہ اس شخص کو وائسرائے کے ایوان میں پہنچا دو۔ جلدی کرو ورنہ سلطنت برطانیہ کی عظمت خطرے میں ہے۔

موٹر سائیکل سڑکوں پر لہریہ بناتی ہوئی وائسرائے کے ایوان میں داخل ہوئی۔ قبلہ گورے نے کہا میری کمر چھوڑ دو، لوگ دیکھ دیکھ کر ہنس رہے ہیں۔ میں نے کہا تم موٹر سائیکل روکو ورنہ خدا کی قسم اسی طرح کمر میں ہاتھ ڈالے رہوں گا۔ آخر موٹر سائیکل رکی، میں نے شکر کا کلمہ پڑھا، سیدھا اس کمرے میں گیا جہاں ریڈیو والوں نے عارضی طور پر اڈا ابھار رکھا تھا۔ علیک سلیک کے بعد وہ کامنٹری سننے لگا جو براؤن صاحب، مصنف بنگال لانسرز، براڈ کاسٹ کر رہے تھے اور جس کے لیے وہ خاص طور پر بذریعہ ہوائی جہاز بھیجے گئے تھے۔ براؤن صاحب ارشاد فرما رہے تھے۔

"وائسرائے کی سواری ابھی کافی دور ہے، مگر صاحب موصوف کی گاڑی کے گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دے رہی ہے۔ آپ بھی سنئے، دیکھئے کس باقاعدگی سے قدم اٹھا رہے ہیں۔ میرے سامنے قطب مینار ہے۔ یہ عمارت خالص لوہے کی بنی ہوئی ہے۔ مغل بادشاہ اورنگ زیب نے یہ عمارت تعمیر کرائی تھی۔ دور افق پر مسلمانوں کا سب سے بڑا گرجا نظر آ رہا ہے۔ یہاں والے اسے جامع مسجد کہتے ہیں۔"

یہاں کسی نے اس کے کان میں کہا اور کھسر پھسر کیا آواز دی کہ شاہ جہاں، شاہ جہاں۔ لاٹھ پتھر کی۔ پتھر کی۔

براؤن صاحب کی سمجھ میں بات آ گئی فرمایا۔

"ہاں، شاہ جہاں نے ایک مینار پتھر کا بنوایا تھا۔"

لارڈ لن لتھگو کا جلوس آخر کار ایوان وائسرائے میں داخل ہوا۔ لارڈ لن لتھگو گاڑی سے اترے اور سیدھے کتب خانے میں تشریف لے گئے۔ وہاں فیلڈن ان کا منتظر تھا۔ وہ آداب شاہی جس کے متعلق لارڈ لن لتھگو نے خاص ہدایت بھیجی تھی، صرف یہ تھا کہ براڈ کاسٹنگ کا سربراہ یعنی فیلڈن خود وائسرائے کی تقریر کا اعلان کرے۔ چنانچہ فیلڈن نے اعلان کیا اور تقریر شروع ہوئی۔

وائسرائے نے ابھی چند ہی جملے ارشاد فرمائے تھے کہ ریڈیو کے انجینئر مسٹر رائے نے کتب خانے کے دروازے کے شیشے میں سے جھانکا۔ فیلڈن نے ہاتھ کا اشارہ کر کے اس سے کہا کہ مت جھانکو، بھاگ جاؤ۔ وہ ہٹ گیا مگر پھر آیا۔ فیلڈن کو اشارہ کیا کہ باہر آؤ۔ فیلڈن نے اشارہ سے کہا، جہنم میں جاؤ۔ اس نے پھر اشارہ کیا کہ آؤ، اس نے پھر اشارہ کیا کہ جاؤ۔ آخر فیلڈن دبے پاؤں باہر نکلا، مسٹر رائے نے کہا مائی لارڈ سب دنیا میں آواز پہنچ رہی ہے، مگر دربار ہال کا لاؤڈ اسپیکر بگڑ گیا ہے۔ والیان ریاست کچھ نہیں سن سکتے سوائے اس کے کہ.....

خرزخر......خرخر......خرخوش

فیلڈن نے بھائی احمد شاہ کو وائسرائے کے پاس چھوڑا اور خود بھاگا۔ اور کچھ نہ سوجھا تو وائسرائے لاج کے تمام پنکھے بند کرا دیئے مگر آواز وہی

خرزخر......خرخر......خرخوش

فیلڈن نے فریج ڈیر بند کروا دیئے مگر آواز وہی۔

خرزخر......خرخر......خرخوش

وائسرائے کے بعد میں نے ترجمہ شروع کیا مگر آواز وہی۔

خرزخر......خرخر......خرخوش

فیلڈن چلایا۔ "پولیس پولیس" یہ کسی دشمن کا کام ہے؟ پولیس کو حکم کی دیر تھی، اس نے مائیکروفون، لاؤڈ اسپیکر اور دیگر تمام سامان پر قبضہ کر لیا۔ پنکھے بند، ہوا کا نام نہیں، والیان ریاست بند گلے کے درباری لباس میں ملبوس، پسینے کے مارے چوہے بنے ہوئے تھے مگر وفاداری دیکھئے کہ بغیر ماتھے پر شکن ڈالے لیمنڈ کے درجنوں گلاس پی گئے۔

وائسرائے نے فیلڈن سے پوچھا براڈ کاسٹ کیسا رہا۔

جواب ملا، امریکہ پہنچا، لندن پہنچا، مدراس پہنچا، بمبئی پہنچا، کلکتے پہنچا مگر وائسرائے کے دربار ہال میں

خرزخر......خرخر......خرخوش۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆



برطانوی بادشاہ نے محبت کی خاطر تاج ٹھکرا دیا

ایڈورڈ ہشتم ایک مطلقہ امریکی خاتون سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ وزیر اعظم بالڈون کے علاوہ چرچ بھی مخالفت پر اتر آیا۔ لندن کے اخبارات نے اس معاشقے کیخلاف اتنا لکھا کہ بکنگھم پیلس کی دیواریں ہل گئیں۔ آخر بادشاہ نے تاج سر سے اتار کر مسز سمسن کے قدموں میں ڈال دیا۔ زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس

ریڈیو کو شروع شروع میں وائرلس کہتے تھے۔ چنانچہ ہمارے یہاں اس کا ترجمہ بے تار یا لاسلکی ہوا۔ ریڈیو کو وائرلس کہنے کا سبب اور وائرلس کا ترجمہ لاسلکی کرنے کا باعث یہ امر ہوا کہ سننے والوں تک مائیکروفون کی آواز بغیر کسی تار کے پہنچتی ہے۔ اگر ان دونوں کے درمیان تار کا رشتہ قائم ہو تو یہ نہ تو ریڈیو ہے نہ براڈکاسٹنگ نہ وائرلیس نہ لاسلکی۔ یہ الف بے تے قسم کی بات ریڈیو والے سمجھاتے سمجھاتے تھک گئے ہیں، لیکن اب بھی اگر کسی جلسے میں لاؤڈ اسپیکر بگڑ جائے اور کوئی ریڈیو والا قسمت کا مارا عین اس وقت دکھائی دے جائے تو لوگ اس غریب کے لتے لے ڈالتے ہیں۔

لارڈ لن لتھگو کی تقریر کے دوران میں لاؤڈ اسپیکر بگڑ گیا تو لارڈ موصوف نے بھی ہماری ہی گردن ناپی اور اس طرح ناپی کہ اس برصغیر میں ریڈیو کوئی بیس برس پیچھے جا پڑا۔ ہم نے ان کی خدمت میں خود عرض کیا، لوگوں سے کہلوایا کہ صاحب لاؤڈ اسپیکر کے بگڑ جانے میں ریڈیو کا کوئی قصور نہیں۔ یہ کمبخت لاؤڈ اسپیکر اس جلسہ میں وائسریگل لاج کے مستری لائے تھے۔ وہی آپ کی تشریف آوری کے چھ دن پہلے سے اسے چلاتے رہے اور خوش ہوتے رہے کہ ٹھیک چل رہا ہے۔ آخر ساتویں دن یعنی عین حضور کے براڈکاسٹ کے وقت لاؤڈ اسپیکر چیں بول گیا۔ بے چارا کیا کرتا۔ اس غریب کی بیٹری کثرت استعمال سے ماند پڑ گئی تھی۔ لیکن وائسرائے بہادر نے ہماری ایک نہ سنی۔ لاؤڈ اسپیکر کے بگڑ جانے کا سانحہ گوش خراش انہیں 1936ء سے لے کر 1943ء تک یاد رہا اور شاید بعد میں بھی یاد ہو۔

وائسرائے نے اپنے براڈکاسٹ کی فضیحت کا بدلہ ہم سے یوں لیا کہ ہماری ہر گزارش ناقابل قبول قرار پائی اور ہماری ہر درخواست ردی کی ٹوکری کی نذر ہو گئی۔ وہ اقتدار اور وقار جو ہمیں ولنگڈن کے زمانے میں حاصل تھا، خاک میں مل گیا۔ پہلے تو ہم دندناتے ہوئے وائسریگل لاج میں چلے جاتے تھے مگر اب شاہی دربان سے ڈر لگنے لگا۔ ہماری درگت بنتے دیکھی تو ان زمام داران حکومت کی بن آئی، جن کو ہم گرداہ گردانتے ہوئے ایوان وائسرائے میں پہنچ جایا کرتے تھے۔ ان کے طعنوں نے دل چھلنی کر دیا۔ رات دن ایسے فقرے سننے میں آتے تھے کہ اب لاؤ نا جا کر ولنگڈن کو۔ بڑے آئے ولنگڈن کے چہیتے! بس لد گئے وہ دن! نظام سقے کی بادشاہی ختم ہوئی! خیر ان افسروں سے تو کسی نہ کسی طرح ہم نپٹ لیتے، لیکن غضب یہ آن پڑا کہ ملک کے عوام نے بھی ساتھ چھوڑ دیا!!

عوام کے اس عدم تعاون کا تجزیہ کیا جائے تو عوام حق بجانب ثابت ہوں گے۔ ریڈیو والوں کا چنداں قصور نہ تھا۔ واقعات ہی ایسے درپیش آئے کہ لوگ ریڈیو والوں کو شک کی نظر سے دیکھنے لگے۔ بھارتی گورنمنٹ کے کسی دفتر نے بھائی آصف علی کے مسودے میں جو قطع و برید کی تھی اس کی یاد ابھی تک دلوں سے محو نہ ہوئی تھی اور ہم اخت ملامت کے چھینٹوں کو اپنے چہروں سے پونچھ ہی رہے تھے کہ بادشاہ مر گیا۔ ہم نے بادشاہ سلامت کی موت پر آنسو بہانے شروع کئے اور بہاتے ہی چلے گئے۔ ابھی یہ آنسو بہہ ہی رہے تھے کہ ولنگڈن میعاد ختم ہونے پر واپس انگلستان سدھارا۔ ہم نے الوداعی پروگرام میں اس کے عہد زریں کی داستان مزے لے لے کر سنائی، حالانکہ لارڈ موصوف نے اپنے دور حکومت میں وہ وہ آرڈیننس جاری کئے تھے کہ ولنگڈن کی بجائے ان کا نام "ڈانگ والا" پڑ گیا تھا۔ ولنگڈن کی جگہ لارڈ لن لتھگو آئے تو ہم نے خوش آمدید کا ایسا بلند آہنگ نعرہ لگایا کہ سننے والوں کے کانوں کے پردے پھٹ گئے۔ بادشاہ ایڈورڈ جب تخت سے دستبردار ہوئے تو ہم نے پروگرام اس اہتمام سے پیش کیا گویا تخت برطانیہ کے پائے ہمیں نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھے ہوں۔ ایڈورڈ کی جگہ جارج ششم تخت نشین ہوئے تو ہم نے وہ درباری گائی کہ تان سین بھی ہوتا تو کان پکڑ کر الگ جا بیٹھتا اور کہتا......

نہ بھائی ہماری تو ہمت نہیں
تجھے سے انھیں میری یہ خواریاں

ادھر تو ہم ریڈیو والے یہ تماشے کر رہے تھے اور ادھر لوگ جنگ آزادی میں مصروف تھے۔ ان کو توقع تھی کہ ریڈیو ہمارے ساتھ طبل جنگ لے کر میدان میں نکلے گا اور ہم تھے کہ قصر برطانیہ کے کنگرے پر کھڑے ہو کر بے وقت کی راگنیاں کیا، شہنائیاں بجا رہے تھے۔ چنانچہ ریڈیو کو لوگوں نے سرکار کا ڈھنڈورا سمجھا اور بجا سمجھا۔ لارڈ لن لتھگو نے الگ تختے بچھا رکھے تھے۔ اپنے ہم وطن ہم سے الگ بددل تھے۔ اللہ دے اور بندہ لے "بخاری برادرز کارپوریشن" کا نعرہ اس زور سے بلند ہوا کہ ہمارے کان بھنا گئے۔

ہم نے حالات کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ادھر ادھر گھوڑے دوڑانے چاہئیں۔ بھائی آصف علی، پروفیسر ملکانی، خواجہ حسن نظامی، ڈاکٹر ذاکر حسین خان وغیرہ سے مشورہ کیا۔ ہر جگہ سے یہی جواب ملا کہ میاں میدان میں آمنے سامنے دو لشکر ڈٹے کھڑے ہیں۔ ایک لشکر سرکار برطانیہ کا ہے اور دوسرا ان غلاموں کا جو غلامی سے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ تم ادھر جاؤ یا ادھر آؤ۔ بیچ میں کھڑے رہو گے تو دونوں طرف سے پتھر پڑیں گے۔ ظاہر ہے کہ بات معقول تھی، مگر ہائے پیٹ۔ دل میں ایک ولولہ اٹھا بھی کہ سب کچھ تیاگ کر سیاست کے میدان میں اتر آؤں۔ لیکن ایک تو فیلڈن ظالم کی محبت اور دوسرے گھرداری کی ذمہ داری، دل کی دل ہی میں رہی۔

بے مروت بن کے اب کیا سوئے صحرا جایئے
لوٹتے ہیں پاؤں پر حلقے میری زنجیر کے

سوچتے سوچتے مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ ترکیب نہایت ہی بھونڈی تھی مگر دماغ کی یہ حالت تھی کہ اس وقت اس کا بھونڈا پن نظر نہ آیا۔ سوچا یہ کہ بادشاہ ایڈورڈ کی تخت سے دست برداری کا ذکر ریڈیو پر کرنا ہی ہے تو کیوں نہ اس انداز میں کیا جائے کہ جمہوریت کی فتح کا پہلو نکلے۔ ہمارا وطن جمہوریت کا دلدادہ ہے۔ اس انداز کے ذکر سے شاید ہمارے گناہوں کا ازالہ ہو سکے۔ یہاں چند جملوں میں ایڈورڈ کی داستان بیان کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

جارج پنجم کی وفات کے بعد اس کا بیٹا پرنس آف ویلز ایڈورڈ ہشتم کا لقب اختیار کر کے تخت نشین ہوا۔ یہ کنوارا تھا۔ شہزادہ تھا تو من چلا اور من کا موجی مشہور تھا۔ تخت نشینی کے وقت حضرت کو ایک امریکن خاتون سے محبت ہو گئی۔ یہ خاتون متوسط درجے کے گھرانے کی تھیں۔ ان کی رگوں میں وہ خون نہ تھا، جس کے بغیر کوئی عورت بادشاہ کے عقد میں نہیں آ سکتی۔ اس پر طرہ یہ کہ یہ محترمہ ایک نہیں دو خاوندوں سے طلاق لے چکی تھیں اور یہ دونوں مشٹنڈے زندہ و سلامت اہل برطانیہ کی چھاتی پر مونگ دلتے پھرتے تھے۔

وزیر اعظم بالڈون پرانے زمانے کا آدمی، قدامت پرستی کا پرستار، اسے یہ بات ایک آنکھ نہ بھائی کہ بادشاہ سلامت ایک معمولی خاندان کی عورت اور وہ بھی دو خاوندوں کی مطلقہ عورت کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھائیں۔ بادشاہ کے سر پر مسز سمسن کے عشق کا بھوت سوار اور بالڈون کی عقل و دانش پر قدامت پرستی کی سواری، نہ بادشاہ مانے نہ بالڈون اپنی ہٹ سے باز آئے۔ بالڈون نے کہا اگر بادشاہ سلامت ہمارا مشورہ نہیں مانتے یعنی مسز سمسن کے ساتھ شادی کرنے کا ارادہ ترک نہیں کرتے تو ہمارا سلام قبول ہو۔ ہم مع اپنی کابینہ کے استعفے دے کر اپنے گھر جا بیٹھتے ہیں۔ بادشاہ نے کہا میں ریڈیو کے ذریعہ لوگوں کے سامنے اپنے دل کی کیفیت بیان کرنا چاہتا ہوں۔ میری کیفیت سن کر لوگ جو فیصلہ کریں مجھے منظور ہوگا۔ بالڈون نے اس کی اجازت نہ دی اور اس بات پر اڑا رہا کہ بادشاہ مسز سمسن سے شادی کا خیال دل سے نکال دیں۔ بادشاہ نے کہا کہ ہم دونوں اقرار کرتے ہیں کہ ہماری اولاد تخت کی حقدار نہ ہوگی۔ بالڈون نے یہ تجویز بھی رد کر دی۔

یہ گفت و شنید ہر چند کہ پس پردہ ہو رہی تھی، مگر اخبار والے پھر اخبار والے ہوتے ہیں، ان کے کانوں میں بھنک پڑ ہی گئی۔ امریکہ کے اخبارات تو اس بات کو لے اڑے، لیکن انگلستان کے اخبارات نے شاہی وقار کے خیال سے اس خبر کو دبائے رکھا اور اس وقت کے انتظار میں صبر کئے بیٹھے رہے جب بالڈون اور بادشاہ کے درمیان دو ٹوک فیصلہ ہو۔ گفت و شنید آخری منزل تک پہنچنے ہی والی تھی کہ مضافات کے کسی گرجا گھر میں ایک پادری نے وعظ میں کہہ دیا کہ بادشاہ سلامت کلیسائے انگلستان کے دین کی پابندی نہیں کرتے اور باقاعدگی کے ساتھ عبادت کے لئے اتوار کے دن گرجے میں نہیں آتے۔ اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ انگلستان کا بادشاہ کلیسائے انگلستان کے دین کا محافظ ہوتا ہے۔ مئی کے مہینے میں تاج پوشی کے وقت اس کو قسم کھانی پڑے گی کہ دین کی راہ پر گامزن اور دین کی حفاظت کے لیے سر بکف رہوں گا۔ جس بادشاہ کی زندگی ہمارے سامنے ہے، اگر اس نے یہ قسم کھا بھی لی تو اس کی قسم کا کیا اعتبار۔

پندرہ سال بعد اسی پادری بلنٹ کا نام ایک خفیہ اشتراکی تحریک کے ضمن میں لیا گیا۔ آپ اس حوالے سے جو نتیجہ چاہیں اخذ کر لیں۔

چلئے پادری بلنٹ بھی بالڈون اور بالڈون کی کابینہ کے ساتھ جا ملے۔ بادشاہ کی طرف، انگلستان کے اخبارات کے بے تاج بادشاہ، لارڈ بیور بروک تھے۔ چرچل ڈف کوپر اور والٹر منکٹن بھی بادشاہ کے طرف داروں میں تھے۔ والٹر منکٹن تو خیر بادشاہ کے قانونی مشیر تھے لیکن حضرات بادشاہ کے حامی تو تھے مگر کھل کر سامنے آنے سے ہچکچاتے تھے۔ والٹر منکٹن کا ذکر چل نکلا ہے تو یہ عرض کر دوں کہ یہ وہی بزرگ ہیں جو 1947ء میں تقسیم ہندوستان کے وقت ہندوستان میں عموماً اور حیدرآباد دکن میں خصوصاً پس پردہ بیٹھے ہوئے تھے۔ سر ریڈ کلف اور ماؤنٹ بیٹن سے ان کا بہت یارانہ تھا۔ آپ اس حوالے سے بھی جو نتیجہ چاہیں اخذ کر لیں۔

بالڈون نے بادشاہ کے ارادے سے دولت مشترکہ کو بذریعہ تار مطلع کیا اور پوچھا کہ اس معاملے میں تمہاری رائے کیا ہے؟ اس تار کا مضمون بالڈون نے خود تیار کیا تھا اور کچھ اس ڈھب سے تیار کیا تھا کہ دولت مشترکہ کے مختلف ملکوں نے بادشاہ کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا۔ بادشاہ کی غلطی تو یہ کہ بالڈون کے تار کا مضمون خود نہ دیکھا اور بدقسمتی یہ کہ جب بالڈون سیاست کی بساط پر بادشاہ کو مات دینے کی چالیں چل رہا تھا، اس وقت بادشاہ کا یار عزیز بیور بروک امریکہ میں تھا۔ اگر وہ اس وقت انگلستان میں ہوتا تو پرانا شاطر، کوئی نہ کوئی ایسی چال ضرور چلتا کہ بالڈون زچ ہو جاتا۔ بیور بروک انگلستان پہنچا بھی تو اس وقت جبکہ بلنٹ کی رجز و توبیخ اخباروں میں چھپ چکی تھی اور دولت مشترکہ نے بالڈون کی ہاں میں ہاں ملا دی تھی۔ اب کیا ہو سکتا تھا۔ اخبارات نے چپ کا روزہ توڑا اور ایک دم بادشاہ کے خلاف مہم شروع کر دی۔ بیور بروک بہت سٹ پٹایا، مگر اس کو بھی اخبارات کی برادری کا ساتھ دینا ہی پڑا۔ لندن ٹائمز کا ایڈیٹر جافرے ڈاسن، جو ہر لفظ لکھنے کے بعد قلم کو قط لگانے میں مشہور تھا، اس موقع پر اس طرح کھل کر بادشاہ کی عشق بازی کے خلاف لکھنے لگا کہ بکنگھم پیلس کی دیواریں ہل گئیں۔ آخر بادشاہ نے تاج سر سے اتار کر مسز سمسن کے قدموں میں ڈال دیا۔

ایڈورڈ کے سر کا بوجھ ہلکا ہوا اور وہ نہایت طمانیت کے ساتھ مائیکروفون کے سامنے آئے اور وہ الوداعی تقریر کی، جو تقریروں کی دنیا میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔ تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ رخصت اے زنداں جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے۔

یہاں مجھے خواجہ فریدؒ کی ایک ملتانی کافی یاد آ گئی۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں:

یاد کیتم دلدار
وطن بیگانے دل نہیں جاوندا
یاد کیتم دلدار
پاروں دس دی جھوک سجن دی کیوں رہساں اروار
یاد کیتم دلدار
بھٹ پئی سندھڑی کیتم مولا
ملک ملیر ملہار
یاد کیتم دلدار

لوگو مژدہ ہو کہ مجھے میرے دوست نے بلایا ہے۔ اب دوست کے دیس کے سوائے سب شہر پردیس ہیں۔ جب دریا کے اس پار یار نے پڑاؤ ڈال رکھا ہو تو کون ہے جو دریا کے اس پار پڑا رہے۔

لوگو مژدہ ہو کہ مجھے میرے دوست نے بلایا ہے۔ میں چلا۔ لو بھاڑ میں گیا تمہارا اجاڑ صحرا اور تمہارا لق و دق ریگستان۔

میرے مولا نے ملیر کے ملک کو ملہار کر دیا ہے۔ میں چلا میرے دوست نے مجھے یاد فرمایا ہے۔

یہ براڈکاسٹ ہندوستان میں صبح کے تین بجے کے قریب سنائی دیا۔ نہ اخبار والے صبح کے اخبار میں اسے چھاپ سکتے تھے اور نہ ہمارے پاس ریکارڈ کرنے کا سامان تھا کہ اسے ریکارڈ کر لیتے اور صبح سننے والوں کو ریڈیو پر سناتے۔ جی نہیں مانتا تھا کہ کچھ نہ کریں۔ آخر یہ فیصلہ کیا کہ اس تقریر کو سن کر لکھ لیں اور پھر دھڑا دھڑ اس کی نقلیں کر کے پو پھٹنے سے پہلے اخباروں کے دفتروں، افسروں کے بنگلوں اور سیاسی لیڈروں کے گھروں پر پہنچا دیں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی ہمارے حسن کارکردگی کی داد دے۔

رات کے بارہ بجے ہم ایسے اسٹینوگرافر کی تلاش میں نکلے جو کسی تیز گفتار کی تقریر کو بھی عین مین لکھ لے۔ خوش قسمتی سے بھائی یوسف خان مل گئے۔ یہ اسمبلی کے چیف رپورٹر تھے، اب پاکستان میں ہیں۔ جب بھی ملتے ہیں وہ بادشاہ گردی کی رات یاد آ جاتی ہے۔ بھائی یوسف علی خان کو ہم مع بستر کے اٹھا لائے۔ ایک اسٹوڈیو کو ان کی خواب گاہ بنایا اور ان سے کہا کہ آپ سو جایئے، وقت پر ہم آپ کو جگا دیں گے۔ چنانچہ جگایا۔ ریڈیو کسایا۔ سر جان ریتھ کی آواز آئی۔

یہ ونڈسر کاسل ہے۔

ہز رائل ہائی نس ڈیوک آف ونڈسر۔

چلئے ایڈورڈ بادشاہ کا نام بدل کر ڈیوک آف ونڈسر ہو گیا۔

ڈیوک آف ونڈسر نے اپنی لاجواب آواز اور اپنے بے مثال لہجے میں تقریر شروع کی۔ کل پانچ منٹ کی تقریر تھی۔

اتنے بڑے تخت کو چھوڑنے پر اتنی مختصر تقریر، مزا دے گئی۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

"حریت" کی رسم بسم اللہ دسمبر 62ء کی تیسری تاریخ کو ہوئی اور "حریت" کا یہ پہلا پرچہ بخاری صاحب قبلہ کی سرگزشت کی پہلی قسط سے مزین تھا۔ قبلہ بخاری صاحب کو سرگزشت لکھنے پر کس طرح آمادہ کیا گیا؟ اس کا احوال "آداب عرض" کے مشہور مقالہ نویس اور لائق احترام جناب نصر اللہ خان یوں بیان فرماتے ہیں کہ "جناب فخر ماتری مرحوم و مغفور اور میں کئی دن تک سر جوڑ کر بیٹھے رہے اور سوچتے رہے کہ بخاری صاحب کو "حریت" کی قلمی اعانت پر کیونکر آمادہ کیا جائے۔ سوچ بچار کے بعد میں نے صلاح دی کہ ماتری صاحب آپ بخاری صاحب کو اپنے گھر پر بلائیں اور ہوا کا رخ دیکھ کر دام پھیلائیں۔ ماتری صاحب بولے، نصر اللہ خان صاحب آپ تو شاید بخاری صاحب کو کراچی آ کر جاننے لگے ہیں، میں ان کو بمبئی اور حیدرآباد سے جانتا ہوں۔ جس زمانے میں بخاری صاحب نے بمبئی میں جھنڈے گاڑ رکھے تھے، میں اس زمانے میں طالب علم تھا اور دیگر بیشمار طالب علموں کی طرح بخاری صاحب کا پرستار۔ یہ شخص نہ اس وقت کسی کی باتوں میں آیا نہ اب آئے گا۔ اس کو زیر دام لانا مشکل ہے۔ آخر تجویز یہ ٹھہری کہ نصر اللہ خان صاحب پہلے بخاری صاحب کے پاس جائیں اور زمین ہموار کرنے کی کوشش کریں۔ خان صاحب کی زبان میں خدا جانے کیا جادو تھا یا فخر ماتری کے نام میں کیا طلسم تھا کہ بخاری صاحب "حریت" میں مضمون لکھنے پر آمادہ ہو گئے۔ مگر ساتھ ہی یہ بیخ لگا دی کہ موضوع کا انتخاب ماتری صاحب کریں۔ اب فیصلہ یہ ہوا کہ ماتری صاحب اور بخاری صاحب چائے پر ملیں۔ تجدید ملاقات بھی ہو اور مضامین کا موضوع بھی طے پائے۔ فخری ماتری اور بخاری صاحب ملے۔ چائے پی گئی۔ احمد آباد کی باتیں ہوئیں۔ بمبئی کا تذکرہ ہوا۔ مسلم لیگ، پاکستان، ہندوستان، ہندو، مسلمان، غرض یہ کہ سب باتوں کا تذکرہ ہوا۔ فخر صاحب اس کوشش میں کہ مضمون کا ذکر بخاری صاحب کریں اور بخاری صاحب اس سعی میں کہ ماتری صاحب قصہ کا آغاز کریں!

جب ماتری صاحب بہت تنگ آ گئے تو تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر فرمایا، ارے بھائی مضمون کی بات بھی کرو گے یا نہیں۔ دونوں دوستوں کے قہقہے سے ہوٹل گونج اٹھا۔ اس کے بعد دونوں نہایت سنجیدگی سے موضوع پر غور کرنے لگے۔ جو مضمون بخاری صاحب تجویز کرتے، وہ ماتری صاحب رد کر دیتے۔ اور جو موضوع ماتری صاحب تجویز فرماتے وہ بخاری صاحب کو ناپسند ہوتا۔ آخر جب محفل برخاست ہوئی تو دونوں نے اتفاق رائے سے اس بات کو تسلیم کیا کہ دونوں کی تجاویز ناقابل تسلیم تھیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ دونوں الگ الگ سوچیں اور پھر مل کر ایک دوسرے کی تجاویز پر غور کریں۔ علیک سلیک کے بعد ماتری صاحب اپنی گاڑی میں سوار ہوئے اور بخاری صاحب قبلہ اپنی گاڑی میں۔ دونوں گاڑیاں چل پڑیں۔ اتنے میں ماتری صاحب نے اپنی گاڑی کا ہارن زور زور سے بجایا۔ بخاری صاحب نے سر موڑ کر ماتری صاحب کی گاڑی کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اشارے سے کہا کہ ٹھہر جایئے۔ ماتری صاحب بھی گاڑی سے اترے اور بخاری صاحب بھی۔ ماتری صاحب نے کہا موضوع مل گیا۔ بخاری صاحب نے کہا، کیا؟ فرمایا، اپنی سرگزشت لکھو۔ کچھ تامل کے بعد بخاری صاحب نے اس تجویز پر صاد کر دیا اور یوں یہ نادر روزگار سرگزشت شائع کرنے کا سہرا "حریت" کے سر رہا۔ یہ سرگزشت بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ اس میں دلچسپ خودکلامی کے بعد اہم حصے قارئین کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

اتوار/30مارچ2014ء
روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

لاؤڈ اسپیکر نے ہرایرے غیرے کو مقرر بنادیا

چڑیا جتنی آواز رکھنے والا بھی عطاء اللہ شاہ بخاری اور محمد علی جوہر کی صف میں کھڑا ہوگیا- یہ کمبخت آلہ تقریر کے دوران بگڑ جاتا تو سامعین کی شامت آجاتی -لاؤڈ اسپیکر کا ترجمہ آلہ مکبر الصوت کے بجائے آلہ کریہہ الصوت زیادہ مناسب تھا-زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس

جب ملک میں لاؤڈ اسپیکر نیا نیا آیا تو اپنے ہمراہ نئی نئی مصیبتیں لایا۔اس کے بل پر ہر وہ شخص تقریر کرنے کھڑا ہوگیا جو پہلے کسی جلسے میں دم بھی نہ مار سکتا تھا۔اب یہ چڑیا جتنی آواز رکھنے والا بھی ابوالکلام آزاد، عطاءاللہ شاہ بخاری، ظفر علی خان، بہادر یار جنگ، محمد علی جوہر، ایسے دم خم رکھنے والے حضرات کی صف میں آ کھڑا ہوا اور مُصر ہوا کہ ان شیروں کی گرج سنتے تھے، اب یہ بھی دیکھو کہ میں مائیکروفون کی کلیا میں کیا گڑ پھوڑتا ہوں۔

ایک تو ایسا مقرر اور پھر لاؤڈ اسپیکر ایسا، کہ آج تیس برس سے لاؤڈ اسپیکر پر تقریریں سن رہا ہوں اور حسرت ہی رہی کہ کبھی تو تقریر کے دوران میں یہ کمبخت لاؤڈ اسپیکر بگڑنے سے باز رہے۔خیر بگڑتا ہے تو بگڑے، مگر ایسا بے مروت ہے کہ بگڑ جائے تو مقرر سے نہیں کہتا کہ بھیا ٹھہر جاؤ، میری سانس اکھڑ گئی ہے، ذرا دم لینے دو۔ بے چارہ مقرر ہے کہ برابر بولے چلا جارہا ہے اور لوگ ہیں کہ کھڑے ہوگئے ہیں۔ ہاتھ ہلا ہلا کر کہتے ہیں کہ آواز نہیں آرہی۔ پہلے تو مقرر سمجھتا ہے کہ تقریر کی داد مل رہی ہے لیکن جب لوگوں کے ہاتھ بہت ہی ہلنے لگتے ہیں تو مقرر کی آنکھیں کھلتی ہیں۔حالات کا جائزہ لینے کے بعد پہلے خاموش ہوتا ہے پھر سراسیمہ ہوتا ہے۔مستری کو بلاتا ہے۔یہ مستری صاحب منہ میں بیڑی لیے اس انداز سے اسٹیج پر تشریف لاتے ہیں گویا مائیکروفون کے نہیں، مقرر کے کان مروڑیں گے۔مقرر پیچھے ہٹ جاتا ہے، مستری آگے بڑھتا ہے، بیڑی کا کش لگا کر مائیکروفون کو کچھ کرتا ہے، پھر چٹکی بجاتا ہے، مقرر کو اشارہ کرتا ہے کہ بسم اللہ آیئے بولیے۔ مقرر آگے بڑھتا ہے اور لوگوں سے پوچھتا ہے آواز آرہی ہے۔ وہاں سے ہاتھ ہلتے ہیں کہ نہیں۔ مستری پھر کچھ مستری پن کرتا ہے۔لوگ خوش ہوجاتے ہیں اور چلاتے ہیں کہ آرہی ہے، اب آرہی ہے۔

اب یہ مصیبت آن پڑتی ہے کہ مقرر بھول جاتا ہے کہ میں کیا کہہ رہا تھا۔اسے یہ بھی یاد نہیں آتا کہ وہ کون سا فقرہ تھا جس پر میں نے زور سے آواز نکالی تھی، وہ کیا مقام تھا جہاں میں نے میز پر مکا مارا تھا۔ بہت سوچتا ہے مگر یاد نہیں آتا۔آخر وہ مکا اپنے سر پر مار لیتا ہے اور جس طرح بھی بن پڑے تقریر شروع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

خدا جانے کس رو میں ہم نے لاؤڈ اسپیکر کا ترجمہ آلہ مکبر الصوت کیا تھا۔اس کا ترجمہ تو آلہ کریہہ الصوت زیادہ مناسب تھا۔

اس لاؤڈ اسپیکر نے ہمارے بڑے بڑے خان صاحب قسم کے گویوں کو پنگی خان بنادیا ہے۔اس نے ہمارے سازوں کی نزاکت کو ختم کردیا، اب طبلہ سنیئے تو یہ معلوم ہوتا ہے جیسے پھٹا ہوا ڈھول بج رہا ہو، ستار کی آواز ایسے معلوم ہوتی ہے جیسے پتلی پتلی پتیلیاں آپس میں ٹکرا رہی ہوں۔اسٹیج کے ایکٹروں کی عادت اس نے ایسی بگاڑ دی ہے کہ وہ دو ڈھائی سو کے مجمع میں بھی مائیکروفون لگا کر بولیں تو بولیں ورنہ خود ہی بولتے ہیں اور خود ہی سنتے ہیں۔

کراچی میں جہاں میں رہتا ہوں اس کے سامنے ایک وسیع میدان ہے۔ اس میدان کو پارک کہتے ہیں۔اس میں گھاس کا فرش نہیں کنکر بچھے ہوئے ہیں اور جہاں گھاس ہے وہاں لکھا ہے کہ گھاس پر چلنا منع ہے۔اس میدان میں تقریباً ہر روز کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے۔کبھی کوئی سیاسی جلسہ، کبھی کوئی مذہبی جلسہ، کبھی کوئی شادی بیاہ۔یہ جلسے شام کو شروع ہوتے ہیں اور رات گئے تک قائم رہتے ہیں۔ اگر آپ اس میدان کے اڑوس پڑوس میں رہتے ہوں تو آپ صرف اس صورت میں سو سکتے ہیں کہ اچھی خاصی مقدار میں افیون کھالیں۔ آپ فرمائیں گے، ایسا بھی کیا ہے، اگر رات کو لاؤڈ اسپیکر کے شور کے باعث سو نہیں سکتے تو دن کو سو کر کسر نکال لیا کرو۔لیکن میرے صاحبو! یہ بھی ممکن نہیں۔دن کے وقت شام کی روٹی مہیا کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی دھندا کرنا ہی پڑتا ہے۔ اگر دن کا وقت سو کر گزار دوں تو ''چہ خورد بامداد فرزندم'' اگر بالفرض پیٹ پر پتھر باندھ کر دن کو سونے کی کوشش بھی کروں تو لاؤڈ اسپیکر کو ٹیسٹ کرنے والے کہاں سونے دیتے ہیں۔صبح کے دس بجے سے لیکر شام تک یہ آواز سنائی دیتی ہے کہ ہلو، ہلو، ہلو ٹیسٹنگ۔ ٹیسٹنگ۔ ون۔ٹو۔تھری۔ فور......

جب لاؤڈ اسپیکر کے مستری صاحب اس جناتی زبان کی گردان کر چکتے ہیں اور تھک جاتے ہیں تو گراموفون ریکارڈ بجاتے ہیں۔ ہونے والا جلسہ چاہے مذہبی کیوں نہ ہو مگر ریکارڈ کہتا ہے مذہب وذہب کو چھوڑو اور دیکھو ''لال ڈوپٹہ ململ کا ہو جی ہو جی!''

چاہے جلسہ شادی خانہ آبادی کا ہو مگر ریکارڈ پکار پکار کر کہتا ہے۔

''بڑے بے مروت ہیں یہ حسن والے!''

یہ دیکھنا ہو کہ لاؤڈ اسپیکر ٹھیک کام کر رہا ہے یا نہیں، یہ مستری صاحبان ہمیشہ انگریزی بولتے ہیں۔

ٹیسٹنگ۔ ٹیسٹنگ۔ ون۔ٹو۔تھری۔فور...... اگر لاؤڈ اسپیکر کو پرکھنے کے لیے ون۔ٹو۔تھری۔فور کے بجائے ایک، دو، تین، چار کہا جائے تو لاؤڈ اسپیکر ساری عمر کے لیے بگڑ جاتا ہے۔ یہ بات مستری صاحبان کی آزمائی ہوئی ہے۔اور ان کے پاس اردو نہ بولنے کی دلیل بھی معقول ہے۔فرماتے ہیں کہ جب ہم خواب غفلت سے بیدار ہوئے اور اپنے ملک کی چیزوں کی طرف دھیان کیا، اپنی تہذیب اور اپنے تمدن کا چرچا کیا، اپنی زبان اور اپنے ادب کی طرف متوجہ ہوئے تو انگریز بگڑ گیا اور ایسا بگڑا کہ روٹھ کر چلا ہی گیا۔

ایک لاؤڈ اسپیکر پر کیا منحصر ہے، اگر ہم چوکیداری کے لیے کتا بھی پالیں تو اس کا نام بھی انگریزی رکھتے ہیں اور اسے بلانا ہو یا دفان کرنا ہو تو انگریزی میں حکم صادر فرماتے ہیں۔

ٹائیگر، ٹائیگر، کم آن۔کم آن

ٹائیگر، ٹائیگر، گو آن، گو آن

''حریت'' کی رسم بسم اللہ دسمبر 62ء کی تیسری تاریخ کو ہوئی اور ''حریت'' کا یہ پہلا پرچہ بخاری صاحب قبلہ کی سرگزشت کی پہلی قسط سے مزین تھا۔قبلہ بخاری صاحب کو سرگزشت لکھنے پر کس طرح آمادہ کیا گیا؟ اس کا احوال ''آداب عرض'' کے مشہور مقالہ نویس اور لائق احترام جناب نصر اللہ خان یوں بیان فرماتے ہیں کہ ''جناب فخر ماتری مرحوم ومغفور اور میں کئی دن تک سر جوڑ کر بیٹھے رہے اور سوچتے رہے کہ بخاری صاحب کو ''حریت'' کی قلمی اعانت پر کیونکر آمادہ کیا جائے۔ سوچ بچار کے بعد میں نے صلاح دی کہ ماتری صاحب آپ بخاری صاحب کو اپنے گھر پر بلائیں اور ہوا کا رخ دیکھ کر دام پھیلائیں۔ ماتری صاحب بولے، نصر اللہ خان صاحب آپ تو شاید بخاری صاحب کو کراچی آکر جاننے لگے ہیں، میں ان کو بمبئی اور حیدرآباد سے جانتا ہوں۔جس زمانے میں بخاری صاحب نے بمبئی میں جھنڈے گاڑ رکھے تھے، میں اس زمانے میں طالب علم تھا اور دیگر بیشمار طالب علموں کی طرح بخاری صاحب کا پرستار۔ یہ شخص نہ اس وقت کسی کی باتوں میں آیا نہ اب آئے گا۔اس کو زیر دام لانا مشکل ہے۔ آخر تجویز یہ ٹھہری کہ نصر اللہ خان صاحب پہلے بخاری صاحب کے پاس جائیں اور زمین ہموار کرنے کی کوشش کریں۔خان صاحب کی زبان میں خدا جانے کیا جادو تھا یا فخر ماتری کے نام میں کیا طلسم تھا کہ بخاری صاحب ''حریت'' میں مضمون لکھنے پر آمادہ ہوگئے۔مگر ساتھ ہی یہ پخ لگا دی کہ موضوع کا انتخاب ماتری صاحب کریں۔اب فیصلہ یہ ہوا کہ ماتری صاحب اور بخاری صاحب چائے پر ملیں۔تجدید ملاقات بھی ہو اور مضامین کا موضوع بھی طے پائے۔فخری ماتری اور بخاری صاحب ملے۔ چائے پی گئی۔احمد آباد کی باتیں ہوئیں۔بمبئی کا تذکرہ ہوا۔مسلم لیگ، پاکستان، ہندوستان، ہندو، مسلمان، غرض یہ کہ سب باتوں کا تذکرہ ہوا۔فخر صاحب اس کوشش میں کہ مضمون کا ذکر بخاری صاحب کریں اور بخاری صاحب اس سعی میں کہ ماتری صاحب قصہ کا آغاز کریں!

جب ماتری صاحب بہت تنگ آگئے تو تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر فرمایا، ارے بھائی مضمون کی بات بھی کرو گے یا نہیں۔ دونوں دوستوں کے قہقہے سے ہوٹل گونج اٹھا۔اس کے بعد دونوں نہایت سنجیدگی سے موضوع پر غور کرنے لگے۔ جو مضمون بخاری صاحب تجویز کرتے، وہ ماتری صاحب رد کر دیتے۔ اور جو موضوع ماتری صاحب تجویز فرماتے وہ بخاری صاحب کو ناپسند ہوتا۔آخر جب محفل برخاست ہوئی تو دونوں نے اتفاق رائے سے اس بات کو تسلیم کیا کہ دونوں کی تجاویز ناقابل تسلیم تھیں۔فیصلہ یہ ہوا کہ دونوں الگ الگ سوچیں اور پھر مل کر ایک دوسرے کی تجاویز پر غور کریں۔علیک سلیک کے بعد ماتری صاحب اپنی گاڑی میں سوار ہوئے اور بخاری صاحب قبلہ اپنی گاڑی میں۔دونوں گاڑیاں چل پڑیں۔اتنے میں ماتری صاحب نے اپنی گاڑی کا ہارن زور زور سے بجایا۔ بخاری صاحب نے سر موڑ کر ماتری صاحب کی گاڑی کی طرف دیکھا۔انہوں نے اشارے سے کہا کہ ٹھہر جائیے۔

ماتری صاحب بھی گاڑی سے اترے اور بخاری صاحب بھی۔ ماتری صاحب نے کہا موضوع مل گیا۔بخاری صاحب نے کہا، کیا؟ فرمایا، اپنی سرگزشت لکھو۔ کچھ تامل کے بعد بخاری صاحب نے اس تجویز پر صاد کر دیا اور یوں یہ نادر روزگار سرگزشت شائع کرنے کا سہرا ''حریت'' کے سر رہا۔یہ سرگزشت بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔اس میں دلچسپ خودکلامی کے بعد اہم حصے قارئین کی خدمت میں پیش کیے جارہے ہیں۔

سرگزشت
سید ذوالفقار علی بخاری

یقین نہ آئے تو کسی آج کل کے کتے کو ''دردر'' کہہ کر دیکھ لیجیے، دم ہلاتا ہوا آپ کے پاس آجائے گا اور متواتر دم ہلاتا رہے گا تاوقتیکہ آپ کی ''گو گو'' کا حکم سن کر وہ دم ہلائے گا نہیں بلکہ دبالے گا اور ایک کونے میں دبک کر جا بیٹھے گا۔

کتے کو انگریزی نام سے پکارا تو پکارا، لیکن ہم نے تو غلامی کے دور میں یہ غضب بھی کیا کہ اپنے اچھے خاصے اسلامی نام کو انگریزی نام بنا دیا۔اچھے خاصے سید ذوالفقار بخاری کو مسٹر زیڈ۔اے بخاری میں تبدیل کر دیا۔میں اس حادثے کا ذکر تفصیل سے کرتا ہوں۔

بھائی احمد شاہ اور میں دونوں پشاور کے گورنمنٹ اسکول میں پڑھتے تھے۔ان دنوں میں اسکول کے ہیڈ ماسٹر یورپ سے آیا کرتے تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میرا پہلا ہیڈ ماسٹر ہار گریوز تھا۔یہ وہی ہار گریوز ہے جس کا شمار آثار قدیمہ کے ماہرین میں ہوتا ہے۔اس کے بعد شروڈر صاحب آئے۔ یہ قوم کے جرمن تھے۔ 1914-18 کی جنگ عظیم چھڑی تو المانوی ہونے کے باعث حراست میں لے لیے گئے۔ان کے بعد واٹکنز صاحب ہیڈ ماسٹر ہوئے۔ان کے بعد ایک اور صاحب آئے اور پھر پروفیسر عنایت اللہ خان آئی۔ای۔ایس ہمارے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ یہ وہی صاحب ہیں جو بعد میں عنایت اللہ مشرقی اور پھر علامہ مشرقی کے نام سے برصغیر میں مشہور ہوئے۔واٹکنز کے زمانے کے بعد بھائی جان کالج میں داخل ہوگئے تھے۔ چنانچہ صرف مجھے علامہ مشرقی سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔

بھائی جان کا پورا نام پیر احمد شاہ ہے اور میرا پیر سید ذوالفقار علی شاہ۔ والد مرحوم کے بعد ہم دونوں بھائیوں نے بیعت کی صلاحیت اپنے آپ میں نہ پائی تو ہم نے پیر کے لفظ کو اپنے نام کا جزو رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ چنانچہ وہ ''پیر احمد شاہ'' سے ''احمد شاہ'' رہ گئے اور میں ''پیر ذوالفقار علی شاہ'' سے ''ذوالفقار علی''۔

ہمارے ہیڈ ماسٹر واٹکنز صاحب بھائی جان کو پیر کے نام سے پکارا کرتے تھے۔اور پیر کا لفظ کچھ اس انداز سے ادا کرتے تھے جیسے یہ لفظ فرانسیسی ہو۔ فرانسیسی لفظ ''پیر'' کا انگریزی ترجمہ ''پیٹر'' ہے اور انگریزی لفظ ''پیٹر'' کا یونانی ترجمہ ''پطرس''۔

بھائی جان شروع شروع میں انگریزی مضامین ''پیٹر'' کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ ''پطرس'' کا قلمی نام سب سے پہلے انہوں نے کہکشاں کے ایک سلسلہ مضامین کے لیے اختیار کیا۔مضامین کے اس سلسلے کا نام تھا ''یونانی حکما اور ان کے خیالات'' مضمون کی رعایت سے ''پطرس'' اچھا نام تھا۔اور پھر بھائی جان یہ نہیں چاہتے تھے کہ اس سلسلۂ مضامین کے مصنف کا اصلی نام کسی کو معلوم ہو۔لیکن کہکشاں کے عملے کی بے احتیاطی کہیے یا ہونہار بات، کسی کاتب نے مضامین کی ایک قسط میں پطرس کے ساتھ ان کا پورا نام بھی لکھ دیا۔پس اس دن سے انہوں نے اردو تصنیفات کے لیے اپنا قلمی نام پطرس رکھ لیا۔

بھائی جان نے پیٹر یا پطرس نام رکھا تو مجھے بھی شوق چرایا کہ اپنے نام میں کوئی انگریزیت پیدا کروں۔ چنانچہ یہ خاکسار ذوالفقار علی بخاری سے زیڈ۔اے بخاری بن گیا۔

ہماری جوانی اور نوجوانی کے زمانے میں سروں پر انگریزیت کا بھوت سوار تھا۔ پشاور کے ہر بازار اور ہر کوچے میں گھر کے بھیدی رہتے تھے، ان کے سامنے تو انگریزیت بگھارنے کی ہمت نہ پڑی البتہ جب ملازمت کے سلسلے میں آیا تو میں کھل گیا۔صرف چہرے پر گلٹ نہیں کرایا، باقی سب وضع انگریزوں کی اختیار کی۔

میرے اس بیان سے کہیں یہ اندازہ نہ لگایئے کہ میں مغربی طرز بود و باش کا مخالف ہوں۔ میں تو صرف اس غلامانہ ذہنیت کی مذمت کر رہا ہوں جس کے تحت، میں نے انگریزوں کے زمانے میں ان کے طور طریقے اختیار کیے تھے۔اب تو ہم آزاد ہیں خذ ما صفا ودع ما کدر کے زریں اصول پر آزادی کے ساتھ عمل پیرا ہوسکتے ہیں۔غلامی کے زمانے میں تو ہر وہ چیز صفا تھی جو انگریز اختیار کرتے اور ہر وہ شے کدر تھی جو وہ اختیار نہ کریں۔وہ زندگی نہ تھی، ایک ڈراؤنا خواب تھا۔خدا کا شکر ہے کہ ڈراؤنا خواب ہمارے بچوں نے نہیں دیکھا۔

لباس اور طرز زندگی کا ذکر آ گیا ہے تو اس لباس کا بھی ذکر کردوں جو ہمارے بعض نوجوان آج کل پہنتے ہیں۔ان بچوں نے نئی وضع کا لباس پہنا تو ہماری راتوں کی نیند حرام ہوگئی اور ہم نے ساری ساری رات بیٹھ کر ان بچوں کے خلاف نظم اور نثر میں صفحے کے صفحے سیاہ کیے اور اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ان بچوں کو خوب خوب کوسا اور کوئی جلی کٹی ایسی نہ چھوڑی جو ان بچوں کو ہم نے نہ سنائی ہو۔قصور ان کا فقط یہ ہے کہ انہوں نے تنگ مہری کی پتلون اور تنگ پائنچے کی شلوار پہننا شروع کردی۔ اچھا ہی ہوا کہ یہ بے چارے ہماری لعن طعن سنکر چپ ہوگے ورنہ اگر کہیں پوچھ بیٹھتے کہ صاحبو! کیا ہماری پتلون کی مہری اور ہماری شلوار کا پائنچہ آپ کے چوڑی دار پائجامے سے بھی زیادہ تنگ ہے، تو ہم کیا جواب دیتے!

خود ہم نے اپنے باپ دادا کا لباس ترک کر کے انگریزی لباس اختیار کیا تھا، اب اگر ہمارے بچوں نے انگریزوں کا لباس ترک کر کے امریکہ والوں کا یا اٹلی والوں کا لباس پہن لیا تو کیا غضب آ گیا۔تبدیلئ لباس کے جس گناہ عظیم سے ہم اپنی اولاد کو روک رہے ہیں، وہ گناہ کبیرہ تو خود ہم سے بھی سرزد ہو چکا ہے۔ہاں اگر ان بچوں کے اعمال وافعال میں کوئی بات عزت وآبرو کے معیار سے ساقط ہو، تو اس کی اصلاح کی کوشش کرنا ہمارا فرض ہے۔لیکن وہ بھی اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی پکار اٹھے......ع

''ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند''

نوجوان کے اعمال پر نظر رکھیے اور ان سے برملا کہیے کہ......ع

''در عمل کوش وہرچہ خواہی پوش''

لباس کا کیا ہے؟ لباس تو بدلتا رہتا ہے اور بدلتا رہے گا۔

دیکھیے میں کیسا بھٹک گیا ہوں کہاں کی بات کہاں لے گیا۔ ہاں میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جب ملازمت کے سلسلے میں شملے گیا تو انگریزوں سے بڑھ چڑھ کر انگریزیت کا پرستار ہوگیا۔فرش پر بیٹھ کر ہاتھ سے کھانا ترک کر دیا۔ میز کرسی چھری کانٹے مہیا کیے۔ بیرا خانساماں ملازم رکھا۔ بیرا کو وردی بنوا کردی۔اس کی کمر میں رنگین نواڑ کی پیٹی بندھوائی۔ پگڑی میں چپراس لگوائی اور اس پر بخاری کا پہلا حرف ''بی'' پیتل کا ڈھلوا کر لگوایا۔

میری انگریزیت نری میری حماقت نہ تھی اس میں کچھ محبت بھی شامل تھی۔ بھائی احمد شاہ کی محبت۔

یہ 1925ء یا 1926 کی بات ہے، بھائی احمد شاہ کیمبرج میں تعلیم پانے گئے اور بیوی بچوں کو میرے پاس چھوڑ گئے۔ میں نے دل میں سوچا بھائی پہلی مرتبہ انگلستان گئے ہیں، وہاں کی تہذیب سے ضرور متاثر ہوں گے۔اب دیکھیے واپسی پر کیسے گزارا ہو۔ ہماری بھابی پرانے فیشن کی خاتون ہیں، انگریزی سے نابلد، انگریزی طور طریقوں سے ناآشنا، خدا خیر ہی کرے۔ بھابی کی گود میں دو بچے ہیں، اگر خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہوگئی تو بھابی تو صبر وشکر کر کے بیٹھ رہیں گی، ان چھوٹے چھوٹے بچوں کا کیا ہوگا؟

میری بیوی بھی دیسی وضع کی اور میری بھابی بھی۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے بھابی اور اپنی اہلیہ کو انگریزی پڑھنے کے لیے ایک اسکول میں بٹھا دیا۔اسکول عیسائیوں کا تھا۔ میں نے یہ اسکول چنا ہی اس لیے تھا کہ عیسائیوں کا ہے اور نیز یہ کہ اس اسکول کی استانیاں ہرچند کہ سیاہ فام تھیں مگر انگریزیت میں گوریوں کے چراغ بھی ان کے سامنے نہ جل سکتے تھے۔صبح دفتر جاتے وقت ان دونوں خواتین کو اور دونوں بھتیجوں کو ساتھ لیکر جاتا اور اسکول میں پہنچاتا اور شام ہوتی تو اس قافلے کو لے کر گھر آتا۔

گھر میں سب سے کہہ رکھا تھا کہ گفتگو صرف انگریزی زبان میں کی جائے۔ بھابی کو خدا بخشے، ایک دن مجھے کسی بات پر اردو میں ڈانٹنے لگیں۔ میں نے کہا بھابی اگر ڈانٹنا ہی ہے تو انگریزی میں ڈانٹیے۔اس پر بھابی نے نہایت زور سے کہا۔یو۔اے۔بی۔سی۔ڈی۔ای۔ایف اور انگریزی کے تمام حروف تہجی فراٹے کے ساتھ پڑھ گئیں۔ بھابی کا تو یہ حال اور بیوی کا یہ احوال کہ گھڑی گھڑی باورچی خانے سے باہر آتیں اور طرح طرح کے لفظوں کی انگریزی پوچھتیں۔کبھی کہتیں سل بٹے کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں۔کبھی دریافت کرتیں ہلدی کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں۔کبھی ارشاد فرماتیں، میں دال بگھار رہی ہوں اس کی انگریزی بتاؤ۔میں بے چارا ڈکشنری کے ورق الٹ پلٹ کر دیکھتا، مگر وہاں یہ لفظ کہاں اور اگر ہینگ اور پھٹکری کے الفاظ کا ترجمہ ڈکشنری میں مل بھی جاتا تو چوکھا رنگ کہاں سے آتا...... ہائے غالب۔

''جتنی فرہنگیں اور جتنے فرہنگ طراز ہیں، یہ سب کتابیں اور یہ سب جامع، مانند پیاز ہیں، تہ در تہ اور لباس در لباس، وہم در وہم اور قیاس در قیاس۔ پیاز کے چھلکے جس قدر اتارتے جاؤ گے، چھلکوں کا ڈھیر لگ جائے گا، مغز نہ پاؤ گے۔''

خیر یہ معاملہ تو انگریزی زبان کا تھا۔اب سوال انگریزی آداب کا درپیش ہوا۔ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے میز کرسی کا بندوبست کرنا چاہیے تاکہ اس پر بیٹھ کر کھایا جائے۔ فرنیچر والوں کی دکان پر گیا اور میز کرسی کے دام پوچھے تو آہ بھر کر رہ گیا۔آخر کباڑیوں کے وہاں پہنچا۔اس زمانے کے انگریز کی کیا بات تھی، بات بات پر گھر کا سامان بیچ ڈالتا تھا۔شیرو کباڑی بڑی بڑی کوٹھیوں کا کباڑی تھا۔اس بے چارے نے دو چار ہی دن میں میرا گھر میز کرسیوں، تپائیوں اور صوفہ سیٹ سے بھر دیا۔ میں خود تو ہیٹ نہیں پہنتا تھا مگر آئے گئے کے لیے میں نے وہ چوکھٹا خریدا جس میں کھونٹیاں لگی ہوتی ہیں اور ہیٹ ٹانگنے کے کام آتا ہے۔ یہ مردود چوکھٹا باہر برآمدے میں چوبدار کی طرح کھڑا رہتا تھا اور منتظر رہتا تھا کہ کوئی اس کی کھونٹی پر اپنی ہیٹ ٹانگ دے۔

ہمارے یہاں شلغم کا موسم ہو تو شلغموں کے قتلے کاٹ کر ہار پرو لیتے ہیں اور دھوپ میں سکھانے ڈالتے ہیں۔ ان سوکھے ہوئے شلغموں کو پشاوری زبان میں کچری کہتے ہیں اور پنجابی میں ڈکرے۔ ایک دن بارش ہو رہی تھی، گھر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میری اہلیہ محترمہ نے شلغموں کے ہار اس ہیٹ اسٹینڈ پر سوکھنے کو ڈال رکھے ہیں۔ مجھے ہیٹ اسٹینڈ کی توہین پر بہت غصہ آیا۔ میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ میری بھابی اور میری بیوی دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور مجھے بھی کھسیانی ہنسی ہنسنا پڑی۔

چھری کانٹا مہیا کرنے کے بعد میں نے واقف کار لوگوں سے آلات خورونوش کو استعمال کرنے کا ڈھنگ سیکھا۔اس بارے میں جو کچھ میں باہر سیکھتا، گھر آ کر بھابی، بیوی اور بھتیجوں کو سکھاتا۔ میں نے تو یہاں تک بندوبست کیا کہ ایک چھوٹا سا گھنٹہ بھی خرید لایا اور ملازم سے کہا کہ میز پر پلیٹیں لگا کر اس گھنٹے کو بجایا کر۔ ہم اس کی آواز سن کر کھانا کھائیں گے، ورنہ تو ہزار سر پٹختا رہ جائے کہ کھانا تیار ہے، ہم کمرے کے اندر قدم نہ رکھیں گے۔ میں نے ملازم کو یہ بھی سمجھا دیا کہ جب ہم سب لوگ میز کے گرد بیٹھ جائیں تو باورچی خانے سے کھانا لا کر ہر ایک کے کندھے کے اوپر سے سالن کے ڈونگے لٹکایا کر۔

گھر کا ٹھاٹ اور اپنا باٹ درست کرنے کے بعد میں نے ہر لباس میں اور ہر زاویے سے اپنی تصویریں کھنچوانا شروع کردیں۔ ڈنر جیکٹ میں تصویر، برساتی میں تصویر، شکاری کوٹ میں تصویر، منہ میں پائپ لگا کر تصویر، پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر تصویر، تھوڑی کے نیچے ہاتھ کی ٹیک دیکر تصویر، سگریٹ کے اڑتے ہوئے دھوئیں میں تصویر، ہر تصویر کی ایک نقل بھائی کو کیمبرج بھیج دیتا تاکہ وہ میری ترقی سے باخبر رہیں۔ان تصویروں کی رسید میں انہوں نے مجھے لکھا۔ماشاءاللہ سبحان اللہ۔اب اپنا نام بھی ''ڈسوزا'' رکھ لو۔

1926ء کے موسم گرما میں مجھے سرکاری کام سے پشاور جانا پڑا۔ میں نے گھر والوں کے سامنے شملے کے موسم اور شملے کے مناظرِ قدرت کا حال وضاحت سے بیان کیا۔ والد نے کہا شملے کا نام بہت سنا ہے مگر کبھی گیا نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ اب کے گرمیوں کا موسم بجائے نتھیا گلی یا ایبٹ آباد کے، شملے گزاریے۔ فرمایا اچھا اور سفر کی تیاری شروع کردی۔

میں نے بیوی کو لکھ بھیجا کہ والد تشریف لا رہے ہیں۔ بیرے سے کہنا کہ اپنی بیوی کو گھر کے اندر کے کام پر لگا دے۔ نیز یہ کہ تم لوگوں کا اسکول جانا بند، صرف بچے اسکول جائیں گے۔

یہ انتظام تو خاطر خواہ ہوگیا۔لیکن میز کرسی کا کیا کرتا، چھری کانٹے کو کہاں دفان کرتا، اپنے انگریزی کپڑوں کو کہاں دریابرد کرتا!

والد نے ہمارے گھر کا کاٹھ کباڑ دیکھا تو ٹھٹکے مگر حسب عادت خاموش رہے۔ بار بار جی چاہا کہ بے حیا بن کر پوچھ ہی لوں کہ یہ سامان آرائش آپ کو پسند آیا مگر ہمت نہ پڑی۔ آخر انہوں نے خود ہی خاموشی کا قفل توڑا۔فرمایا۔

ذوالفقار میاں تم لوگ پاؤں لٹکا کر بیٹھے بیٹھے تھک نہیں جاتے؟ بھئی میں تو تھک گیا ہوں۔

یہ کہہ کر کفش اتارا اور صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد کہا، کاٹھ کباڑ پر خود متمکن اور ایرانی قالین پر جوتوں سمیت پاؤں!! یہ طریقہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔

میں جلدی میں ملازم سے یہ کہنا بھول گیا تھا کہ شام کو کھانے کے وقت گھنٹہ نہ بجانا۔ ظالم نے بجا دیا۔اب کیا ہوسکتا ہے۔ میں والد کو لیکر کھانے کے کمرے میں گیا۔ میز پر خالی پلیٹیں پڑی تھیں۔ والد نے ایک پلیٹ کو اٹھایا۔ دیر تک اسے الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے اور پھر میری بیوی سے کہا، بیٹا مہمانوں کے سامنے خالی برتن نہیں رکھا کرتے۔

☆☆☆☆☆

قسط نمبر 12

پیر/31 مارچ 2014ء

روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

انگریز افسر نے انسانی فضلے کے "فوائد" پر گیت نشر کرادیا

ہمارے انکار کے باوجود وائسرائے لارڈ لنتھگو نے ریڈیو پر "کھاد بناؤ مہم" شروع کرائی - ڈپٹی کمشنر ایف ایلبرین نے ہر گاؤں کی دیواریں تڑوا کر شیشے کی کھڑکیاں جڑوادیں - ان کے بھونڈے منصوبے کے سبب دیہات میں ریڈیو کو متعارف کرانے کی کوشش ناکام ہوئی - زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس

عورتوں کا خاصہ ہے کہ جب کبھی باہر جانے لگیں تو ان کو بیسیوں کام یاد آجاتے ہیں۔ آپ ایک بچے کو گود میں اٹھائے اور دوسرے کی انگلی پکڑے کھڑے ہیں اور خاتون ہیں کہ تجوری کی چابیاں کہیں رکھ کر بھول گئی ہیں۔ جب تک وہ نہ ملیں گھر سے کیوں کر نکلیں۔

ابھی تو تجوری بند کی ہے۔

شاید کمرے میں رکھ آئی ہوں۔

ذرا کھولنا کمرے کا تالا۔

نہیں یہاں تو نہیں ہیں۔

تو پھر کہاں گئیں؟

اور دیکھنا ننھے کا شلوکہ کہاں ہے؟

اے لو دیکھو کہاں پڑا ہے۔

ابھی مہترانی آتی تو اٹھا کر لے جاتی۔

عبدالغفور تم سے بیس دفعہ کہا کہ کپڑے سوکھنے کو یہاں نہ پھیلایا کرو۔ نیچے صحن میں گر جاتے ہیں۔

جاؤ لپک کر انگنائی سے وہ شلوکہ اٹھا لاؤ۔

ارے عبدالغفور ذرا خانساماں کو بلانا۔

دیکھو خانساماں کل ساگ میں نمک زیادہ تھا۔ ذرا خیال رکھا کرو اور دیکھنا آج آلو ٹوٹنے نہ پائیں۔

اور دیکھو عبدالغفور جھپک کر پانی تو پلاؤ۔ باہر کہاں پانی ڈھونڈتے پھریں گے۔

جب کبھی آپ اہل خانہ کو باہر لے کر جائیں تو مندرجہ بالا قسم کے حادثات کا پیش آنا ضروری ہے۔

جب میں انگلستان جانے کے لئے پر تول رہا تھا تو میرے ساتھ بھی اسی قسم کے حادثات پیش آئے۔ فیلڈن کو تمام بھولی بسری باتیں یاد آئیں۔ لاہور میں ریڈیو کے لئے مکان تلاش کرنا ہے، گھنشیام داس برلا سے ملنا ہے، مدراس جا کر راج گوپال اچاریہ سے ریڈیو کے متعلق گفتگو کرنا ہے، دیہاتی پروگرام کا انتظام کرنا ہے، دہلی کے قرب و جوار میں ریڈیو سیٹ لگوانا ہے۔ فیلڈن چاہتا تھا کہ انگلستان جانے سے پہلے یہ سب کام کرتا جاؤں۔ میں بے چارہ ایک اسٹیشن ڈائریکٹر، مجھے ان کاموں سے کیا واسطہ؟ لیکن فیلڈن اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ یہ جو صلاح دے گا وہ درست ہوگی یا کم از کم ایسی تو ہوگی جس پر بحث مباحثہ کیا جا سکے۔ میں بھی ایسا کہاں کا صوفی صافی کہ تعریف کا نشہ مجھے کبھی چڑھنے نہ پائے۔ چڑھ گیا اور میں نہایت انہماک سے فیلڈن کا ہاتھ بٹانے لگا۔ ادھر میں ریڈیو کے کاموں میں زیادہ دخیل ہوتا گیا، ادھر افسران بالا کی فہرست مجرمان سرکار میں میرا نام اوپر چڑھتا گیا۔

افسر کون تھے؟ ایک تھے سر فرینک نوئیس، نہایت فربہ، گال کپا، توند بے حد باہر کو نکلی ہوئی، سونے کے فریم والا چشمہ، مگر وہ جو کانوں پر نہیں ہوتا، صرف ناک کو پکڑتا ہے۔ بڑا موٹا سا سگار منہ میں، سر گھٹا ہوا۔ ہندوستان میں رہتے ہوئے انہیں کوئی چالیس برس ہوگئے تھے۔ دفتری کارروائی کے دقیانوسی طور طریقوں سے سر مو انحراف نہ کرتے تھے۔ کوئی کاغذ ایسا نہ تھا جو ان کے سامنے آئے اور اس پر دستخط نہ کریں۔ یہ دستخط گویا اس امر کی شہادت ہوتی تھی کہ یہ کاغذ حضور کی نظر سے گزر چکا ہے۔ ایک دفعہ ہوائی جہاز میں میرے اور فیلڈن کے ساتھ حیدرآباد دکن گئے۔ چھوٹا سا ہوائی جہاز، اس میں صرف چار فرد سوار تھے۔ تین ہم اور چوتھا جہاز چلانے والا پائلٹ۔ حفظ مراتب کے طور پر ڈرائیور کے پیچھے میں تھا۔ میرے پیچھے فیلڈن اور فیلڈن کے پیچھے سر فرینک نوئیس۔ راستے میں پائلٹ نے پنسل سے ایک رقعہ لکھ کر مجھے دیا۔ اس پر لکھا ہوا تھا، سامنے کی ہوا چل رہی ہے، ہم وقت پر لنچ کھانے نہ پہنچ سکیں گے۔ میں نے یہ رقعہ پڑھ کر فیلڈن کو دیا اور فیلڈن نے سر فرینک نوئیس کو۔ سر فرینک نے رقعہ پڑھا، جیب میں سے قلم نکالا، اسے کھولا، سیٹ کے پیچھے سے ایک کتاب نکالی، اس پر وہ رقعہ رکھا اور اس کے اوپر لکھا "افسوس"۔ اور نیچے "فرینک نوئیس" مع تاریخ و سنہ۔ اس "افسوس" اور "فرینک نوئیس" کو پڑھ کر فیلڈن بہت ہنسا اور ہنستے ہنستے اس نے وہ رقعہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں بھی پڑھ کر ہنسا۔ فیلڈن کو اور مجھ کو ہنستا دیکھ کر فرینک نوئیس کا رنگ سرخ ہو گیا۔ اس نے اپنے پھولے ہوئے گال اور پھلا لئے اور اتنے پھلائے کہ میں سمجھا پھٹ جائیں گے۔

دوسرے افسر ہمارے سر تھامس استوارٹ تھے۔ مزاج کے شکی، غصہ کے تیز۔ ان کا بھائی سیکریٹری آف اسٹیٹ لندن میں مستقل سیکریٹری تھا۔ کسی اخبار نے بخاری برادرز کارپوریشن کا پٹا ہوا نعرہ لگایا۔ تھامس استوارٹ کی نظر سے وہ اخبار گزرا۔ انہوں نے ہم سے کیفیت طلب کر لی۔ میں تو ایسے انگریزوں کے خلاف ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ میں نے کیفیت پیش کرتے وقت ہر ایک لفظ میں وہ نفرت بھر دی جو کسی غلام کے دل میں ہو سکتی ہے۔ دو باتیں اس تحریر کی مجھے خاص طور پر یاد ہیں۔ ایک تو میں نے یہ لکھا تھا کہ کارپوریشن کوئی بری چیز نہیں کہ اگر ریڈیو سرکاری محکمہ کی بجائے واقعی کارپوریشن ہوتا تو وہ لوگ جو آج ہمارے افسر ہیں اور ہم سے کوڑی پھیرے کراتے رہتے ہیں، ہم سے بات کرتے ہوئے بھی ڈرتے۔ جس طرح آج ملک کے ہر اخبار نے آپ کا مٹھو دبا رکھا ہے، اسی طرح ہم بھی آپ کو راہ راست پر لے آتے۔ دوسری بات میں نے یہ لکھی کہ ہم دو بھائی اگر ایک ہی محکمے میں ہیں تو اس میں مضائقہ کیا ہے؟ اور اگر دو بھائیوں کا ایک ہی محکمہ میں ہونا مضائقے کی بات ہے، تو پہلے آپ اپنے گریبان میں منہ ڈالئے۔ آپ کا بھائی بھی تو سیکریٹری آف اسٹیٹ کے دفتر میں فائز ہے اور آپ کا افسر ہے۔ فیلڈن نے میری تحریر روک لی، مگر میں نے اس کی نقل براہ راست سر تھامس استوارٹ کو بھیج دی۔

"حریت" کی رسم بسم اللہ دسمبر 62ء کی تیسری تاریخ کو ہوئی اور "حریت" کا یہ پہلا پرچہ بخاری صاحب قبلہ کی سرگزشت کی پہلی قسط سے مزین تھا۔ قبلہ بخاری صاحب کو سرگزشت لکھنے پر کس طرح آمادہ کیا گیا؟ اس کا احوال "آداب عرض" کے مشہور مقالہ نویس اور لائق احترام جناب نصر اللہ خان یوں بیان فرماتے ہیں کہ "جناب فخر ماتری مرحوم و مغفور اور میں کئی دن تک سر جوڑ کر بیٹھے رہے اور سوچتے رہے کہ بخاری صاحب کو "حریت" کی قلمی اعانت پر کیونکر آمادہ کیا جائے۔ سوچ بچار کے بعد میں نے صلاح دی کہ ماتری صاحب آپ بخاری صاحب کو اپنے گھر پر بلائیں اور ہوا کا رخ دیکھ کر دام پھیلائیں۔ ماتری صاحب بولے، نصر اللہ خان صاحب آپ تو شاید بخاری صاحب کو کراچی آ کر جاننے لگے ہیں، میں ان کو بمبئی اور حیدرآباد سے جانتا ہوں۔ جس زمانے میں بخاری صاحب نے بمبئی میں جھنڈے گاڑ رکھے تھے، میں اس زمانے میں طالب علم تھا اور دیگر بیشمار طالب علموں کی طرح بخاری صاحب کا پرستار۔ یہ شخص نہ اس وقت کسی کی باتوں میں آیا نہ اب آئے گا۔ اس کو زیر دام لانا مشکل ہے۔ آخر تجویز یہ ٹھہری کہ نصر اللہ خان صاحب پہلے بخاری صاحب کے پاس جائیں اور زمین ہموار کرنے کی کوشش کریں۔ خان صاحب کی زبان میں خدا جانے کیا جادو تھا یا فخر ماتری کے نام میں کیا طلسم تھا کہ بخاری صاحب "حریت" میں مضمون لکھنے پر آمادہ ہو گئے۔ مگر ساتھ ہی یہ پخ لگا دی کہ موضوع کا انتخاب ماتری صاحب کریں۔ اب فیصلہ یہ ہوا کہ ماتری صاحب اور بخاری صاحب چائے پر ملیں۔ تجدید ملاقات بھی ہو اور مضامین کا موضوع بھی طے پائے۔ فخری ماتری اور بخاری صاحب ملے۔ چائے پی گئی۔ احمد آباد کی باتیں ہوئیں۔ بمبئی کا تذکرہ ہوا۔ مسلم لیگ، پاکستان، ہندوستان، ہندو، مسلمان، غرض یہ کہ سب باتوں کا تذکرہ ہوا۔ فخر صاحب اس کوشش میں کہ مضمون کا ذکر بخاری صاحب کریں اور بخاری صاحب اس سعی میں کہ ماتری صاحب قصہ کا آغاز کریں!

جب ماتری صاحب بہت تنگ آ گئے تو تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر فرمایا، ارے بھائی مضمون کی بات بھی کرو گے یا نہیں۔ دونوں دوستوں کے قہقہے سے ہوٹل گونج اٹھا۔ اس کے بعد دونوں نہایت سنجیدگی سے موضوع پر غور کرنے لگے۔ جو مضمون بخاری صاحب تجویز کرتے، وہ ماتری صاحب رد کر دیتے۔ اور جو موضوع ماتری صاحب تجویز فرماتے وہ بخاری صاحب کو ناپسند ہوتا۔ آخر جب محفل برخاست ہوئی تو دونوں نے اتفاق رائے سے اس بات کو تسلیم کیا کہ دونوں کی تجاویز ناقابل تسلیم تھیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ دونوں الگ الگ سوچیں اور پھر مل کر ایک دوسرے کی تجاویز پر غور کریں۔ علیک سلیک کے بعد ماتری صاحب اپنی گاڑی میں سوار ہوئے اور بخاری صاحب قبلہ اپنی گاڑی میں۔ دونوں گاڑیاں چل پڑیں۔ اتنے میں ماتری صاحب نے اپنی گاڑی کا ہارن زور زور سے بجایا۔ بخاری صاحب نے سر موڑ کر ماتری صاحب کی گاڑی کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اشارے سے کہا کہ ٹھہر جایئے۔

ماتری صاحب بھی گاڑی سے اترے اور بخاری صاحب بھی۔ ماتری صاحب نے کہا موضوع مل گیا۔ بخاری صاحب نے کہا، کیا؟ فرمایا، اپنی سرگزشت لکھو۔ کچھ تامل کے بعد بخاری صاحب نے اس تجویز پر صاد کر دیا اور یوں یہ نادر روزگار سرگزشت شائع کرنے کا سہرا "حریت" کے سر رہا۔ یہ سرگزشت بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ اس میں دلچسپ خود کلامی کے بعد اہم حصے قارئین کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

تیسرے صاحب تھے اینڈرو کلو۔ پڑھے لکھے مذہبی آدمی تھے، مگر تھے دل کے بہت چھوٹے۔ یہ خدا واسطے ریڈیو کے خلاف ہو گئے۔ قصہ یہ ہوا کہ ایک دن بی بی سی سے ایک مذہبی پروگرام سن رہے تھے۔ یہ پروگرام لندن کے ایک گرجا گھر سے ریلے ہو رہا تھا۔ عیسائیوں کی نماز میں ایک مقام ایسا آتا ہے کہ جب لوگ گھٹنے ٹیک دیتے ہیں اور سر جھکا کر عبادت کرتے ہیں۔ جب بی بی سی کے پروگرام میں وہ مقام آیا تو جناب سر اینڈرو کلو نے بھی گھٹنے ٹیک دیئے اور نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ مصروف عبادت ہو گئے کہ اے خداوند یسوع مسیح مجھے بھی اپنی بھیڑوں کے گلے میں شریک کر لے۔ عبادت کے اختتام پر بی بی سی نے اعلان کیا کہ ابھی آپ لندن کے بڑے گرجا گھر سے عبادت کا پروگرام سن رہے تھے۔ یہ پروگرام کل ریکارڈ کیا گیا تھا۔ کسی ریکارڈ پر گھٹنے ٹیک دینا سر اینڈرو کو پسند نہ آیا اور ساری عمر کے لئے ریڈیو کے خلاف ہو گئے۔

ان کے علاوہ ایک اور صاحب سے بھی واسطہ آ پڑا تھا۔ ان کا نام تھا ایف ایل برین۔ یہ صاحب دیہاتی ترقی کے اعلیٰ افسر تھے۔ دیہاتی ترقی کے فن کے یہ ماہر مانے جاتے تھے اور زمین کا گز بنے ہوئے دیہات میں سفر کرتے رہتے تھے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ ان کی آنکھوں پر انگریزیت کی عینک چڑھی ہوئی تھی۔ ہر بات کو انگریزی انداز سے سوچتے تھے۔ مثلاً ان کو ہمارے دیہات میں سب سے بڑی خرابی یہ نظر آئی کہ ہمارے دیہاتی مکانوں میں کھڑکیاں نہیں ہیں۔ چنانچہ کھڑکیاں ان کا تکیہ کلام بن گیا۔ گڑگانویں میں ڈپٹی کمشنر تھے تو ضلع کے ہر گاؤں کی دیواریں تڑوا کر کھڑکیاں جڑوادیں اور دیہاتیوں کو حکم دیا کہ ہر صبح شام تازہ ہوا پھانکا کرو۔ صاحب بہادر کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہ آئی کہ انگلستان میں شیشے کی کھڑکیاں بنانے کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہاں ہر وقت بارش ہوتی رہتی ہے۔ گھنگور گھٹاؤں کے باعث گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا رہتا ہے۔ یخ بستہ ہوائیں چلتی ہیں۔ شیشے کی کھڑکیوں کے سبب انسان سردی سے بچتا ہے اور اتنی روشنی بھی چھن چھن کر آ ہی جاتی ہے کہ ہاتھ کو جام سجھائی دے جائے۔ وہاں کے لوگ بارش اور سردی کے مارے کمروں میں دبکے رہتے ہیں۔ ہمارے ملک کی بات اور ہے۔ اس کو تو اللہ نے دھوپ سے مالا مال کر رکھا ہے۔ ہزار روکو مگر روشنی کسی نہ کسی طرح اندر گھس ہی آتی ہے۔

مگر انگریز کو تو کھڑکیوں کی عادت پڑ گئی تھی۔ اس نے یہاں آ کر کھڑکیاں بنوائیں تو وہ بھی شیشے والی۔ اتنا نہ سوچا کہ اس کے بارانی ملک میں تو شیشے والی کھڑکیاں چل بھی جاتی ہیں، کیونکہ وہاں بارش کے باعث دھول نہیں اٹھتی اور کھڑکیوں کے شیشے صاف ستھرے رہتے ہیں۔ یہاں بارش کی کمی کے سبب گرد بہت اڑتی ہے۔ کھڑکیوں کے شیشے ہمیشہ غبار سے اٹے رہتے ہیں۔ ان کو صاف کرنے کے لئے بیکار آدمی کہاں سے آئیں؟ حد یہ ہے کہ ہم اب تک یہ شیشے والی کھڑکیاں بناتے ہیں اور پھر ان کو ہمیشہ کھلا رکھتے ہیں۔ اور اگر کبھی بند بھی کرتے ہیں تو ان کے آگے پردے ڈال دیتے ہیں۔ یعنی شیشوں کے شیشہ پن کا یہاں ہمارے ہاں کوئی مصرف ہی نہیں۔ آپ کہیں گے چلو اور کوئی مصرف نہیں تو نہ سہی، خوبصورت تو لگتے ہیں۔ مگر خوبصورت تو جب لگیں کہ صاف ہوں اور ظاہر ہے کہ ہر روز اتنے سارے شیشے کون صاف کرے۔ ہم تو یہاں تک ان شیشوں سے تنگ آئے ہوئے ہیں کہ بجائے شفاف شیشوں کے ہم نے اندھے شیشے لگوانے سے بھی دریغ نہ کیا، یا شفاف شیشوں پر رنگ پھروا دیا۔ عبرت کا مقام ہے کہ ہم تاج محل اور دلی کی جامع مسجد، الحمرا استنبول اور اصفہان کی مساجد بنانے والوں نے انگریز کی کھڑکیوں کے شیشوں کو آنکھوں سے لگایا۔

ریڈیو کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کی دھن تو ہمارے سروں پر سوار تھی ہی، ہم نے فیصلہ کیا کہ دیہاتی پروگرام شروع کرنا چاہئے۔ برین سے مشورہ کیا۔ انہوں نے ہماری تجویز کو بہت سراہا اور دلی اسٹیشن سے دیہاتی پروگرام شروع ہو گیا۔ تجویز یہ ٹھہری کہ برین صاحب مواد مہیا کریں اور ہم ریڈیو والے اسے ریڈیو کے روپ میں ڈھال کر پیش کریں۔ برین صاحب نے پہلا ہی پلندہ کھڑکیوں کے بارے میں بھیجا۔ میں نے جب اسے پڑھا تو جی چاہا کہ برین صاحب کو اپنے کمرے میں بلاؤں، تمام کھڑکیاں بند کروں اور ان کو خوب پیٹوں۔

کیسے باور آتا کہ ان صاحب کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہمارے دیہاتی مکانوں میں کمرے نہیں ہوتے۔ غسل خانے نہیں ہوتے۔ باورچی خانے نہیں ہوتے۔ ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم بھی نہیں ہوتے۔ کولکیاں اور کوٹھریاں ہوتی ہیں، جن میں اناج کی بوریاں پڑی ہوتی ہیں۔ بہت ہوا تو ایک آدھ چھپر ہوتا ہے، جس کے نیچے گائے بھینس کھڑی ہوتی ہے۔ باقی صحن کھلا، تاروں بھری رات، کھلی فضا، کھلا آسمان۔ ایسے مکان میں کھڑکیاں کہاں بنائی جائیں اور کیوں بنائی جائیں۔ مگر برین صاحب مصر کہ صحت کے لئے کھڑکیاں ضرور ہونا چاہئیں۔ ان کے خیال میں ہمارے یہاں کے دیہاتیوں کی صحت خراب تھی، یعنی وہ جسمانی طاقت میں شہریوں کے مقابلے میں پھسڈی تھے۔ برین صاحب تو یہاں تک کھڑکیوں کے دلدادہ تھے کہ انہوں نے کسی نائب تحصیل دار قسم کے شاعر سے ایک گیت بھی کھڑکیوں کے متعلق لکھوا کر ہمیں بھجوا دیا تھا۔ اس گیت کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

کھڑکیاں، کھڑکیاں
کھڑکیاں بناؤ
کھڑکیاں بناؤ
تازہ ہوا کھاؤ
کھڑکیاں بناؤ
کھڑکیاں، کھڑکیاں
کھڑکیاں، کھڑکیاں
(تیز لے میں) کھڑکیاں، کھڑکیاں کھڑکیاں، کھڑکیاں کھڑکیاں، کھڑکیاں
تازہ ہوا کھاؤ
کھڑکیاں بناؤ

کھڑکیوں کے علاوہ ان صاحب کو ایک اور بھی مراق تھا اور وہ تھا پاخانوں کا!

صاحب موصوف اس بات کو غلط سمجھتے تھے کہ گاؤں کے لوگ رفع حاجت کے لئے کھیتوں میں جایا کریں۔ ان کی تجویز تھی کہ ہر گاؤں میں دو کھائیاں کھودی جائیں، ایک کھائی کے کنارے بیٹھ کر مرد رفع حاجت کیا کریں اور دوسری کھائی کے کنارے مستورات۔ جب مواد معقول مقدار میں جمع ہو جائے تو اس پر راکھ ڈال دی جائے، تاکہ دھوپ میں پک کر مواد کا خمیر اٹھے اور کھاد تیار ہو جائے۔ اس موضوع پر بھی صاحب بہادر نے ایک گیت تصنیف کرایا!

روٹی کھا کر پیارے
کھاد بناؤ
پیارے کھائی کنارے
کھاد بناؤ
گاؤں میں اپنے کھودو کھائی
کھودو کھائی اے مرے بھائی
کھاد بناؤ
روٹی کھا کر پیارے
پیارے کھائی کنارے
کھاد بناؤ
کھاد ملے گی چھاجوں چھاجوں
کھیت کہاں کا کھاد کے باجوں
کھاد بناؤ
روٹی کھا کر پیارے پیارے کھائی کنارے
کھاد بناؤ
کھاد بناؤ کھاد بناؤ کھاد بناؤ کھاد بناؤ

میں نے ان فضولیات کو نشر کرنے سے انکار کر دیا۔ چلئے ایک اور شاخسانہ کھڑا ہو گیا۔

ہوتے ہوتے معاملہ لارڈ لن لتھگو تک پہنچا۔ وائسرائے دیہاتی کاموں میں بہت دخل دیتے تھے۔ انگلستان میں بھی بی بی سی پر دیہاتیوں کے لئے تقریریں کرنے کے لئے بے تاب رہتے تھے۔ جب ان کے پاس یہ قضیہ پہنچا تو بہت پیچ و تاب کھایا اور یہ حکم صادر فرمایا کہ یہ گیت جو نہایت اہم اور اعلیٰ خیالات کے حامل ہیں، ریڈیو سے ضرور نشر کئے جائیں۔

میرے لئے موقع بہت بونگا آ پڑا تھا۔ میری یہ حالت کہ ایک آنکھ سے ہنسوں اور ایک آنکھ سے روؤں۔ ہنسوں انگریز کی حماقت پر اور روؤں اپنی بے بسی پر۔ آخر مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ کھڑکیوں والا گانا ایک مشہور و معروف انگریزی دھن میں ایسے ویسوں سے یعنی خواجہ سراؤں سے گوا دیا اور کھائی کھاد والا گیت مہتروں سے۔

دلی کے اہل ذوق اشارہ تاڑ گئے اور اس قدر ہنسے کہ ہنسی کی آواز برین صاحب اور وائسرائے بہادر کے کانوں تک بھی جا پہنچی۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ ریڈیو کی بات تو ہونٹوں سے نکلی، کوٹھوں چڑھی ہوتی ہے۔ اس کھینچا تانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان تمام افسروں نے مل کر آواز بلند کی کہ ریڈیو والے آرٹسٹ لوگ ہیں، ایڈمنسٹریشن نہیں جانتے۔ انتظامیہ کے ہر دفتر سے صدا بلند ہوئی کہ ریڈیو والے ایڈمنسٹریشن سے نابلد ہیں۔ ان میں ایڈمنسٹرین ڈالو۔ بس اب کیا تھا۔ انجکشن تیار ہونے لگے، ایڈمنسٹریشن کے انجکشن، بڑی بڑی سوئیوں والے انجکشن۔

یہاں ہم نے ایک بھرپور وار کیا اور وہ یوں کہ سرکار کے نام ایک مراسلہ بھیجا، جس میں تحریر کیا کہ سرکاری محکموں میں ایڈمنسٹریشن کے بے حد نقائص پائے جاتے ہیں۔ ہمارا ارادہ ہے کہ ان نقائص کی طرف توجہ دلانے کے لئے ریڈیو سے دو چار پروگرام نشر کریں۔ چونکہ یہ معاملہ سرکار سے متعلق ہے، اس لئے پروگرام نشر کرنے کی اجازت طلب کی جاتی ہے۔ نیز اطلاعاً گزارش ہے کہ مجوزہ پروگرام مندرجہ ذیل باتوں پر مشتمل ہوں گے۔

1۔ ریڈیو کے سوائے سرکار کا کوئی محکمہ وقت کی پابندی نہیں کرتا، اس میں چاہے ڈاک اور تار کا محکمہ ہو یا ریل اور ہوائی جہاز کا ادارہ۔

2۔ سرکار کا کوئی محکمہ ایسا نہیں جہاں واجبات کی ادائیگی میں مہینوں بلکہ برسوں نہ لگ جاتے ہوں۔ اس کے برخلاف ریڈیو میں مزدور کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دی جاتی ہے۔ جب کوئی شخص اسٹوڈیو سے براڈ کاسٹ کر کے نکلتا ہے تو اس کا چیک اس کی خدمت میں اسی وقت پیش کر دیا جاتا ہے۔

3۔ ریڈیو کے دفاتر اور اسٹوڈیو صفائی کا نمونہ پیش کرتے ہیں اور سرکار کے باقی دفاتر غلاظت کا۔

4۔ ریڈیو کا ادنیٰ سے ادنیٰ ملازم بھی رشوت نہیں لیتا، حالانکہ سرکار کے دیگر محکموں سے تنخواہ کے علاوہ بھی آمدنی کی صورت نکل آتی ہے اور پکڑ دھکڑ کا بازار گرم رہتا ہے۔

سرکار نے یہ پروگرام نشر کرنے کی اجازت تو نہ دی البتہ ایڈمنسٹریشن کا شور ذرا کم کر دیا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ ریڈیو والے زلف پریشان، چاک گریبان، مست و سرشار و غزل خواں قسم کے لوگ ہیں، ان کو ایڈمنسٹریشن سے بھلا کیا واسطہ۔ مگر ان افسروں کو کیا معلوم کہ ایڈمنسٹریشن کے بغیر کوئی پروگرام ہو ہی نہیں سکتا۔ ان کو کیا معلوم کہ جب صبح سویرے اناؤنسر کہتا ہے کہ اب سات بجے ہیں۔ (سات بج کر ایک منٹ نہیں سات بجے ہیں) تو اس کے اس ایک اعلان کے پیچھے ایڈمنسٹریشن کے کتنے انبار لگے ہوتے ہیں۔ ریڈیو کے چوکیدار وقت پر پہنچ گئے، ریڈیو کے ڈائریکٹر وقت پر پہنچ گئے، ریڈیو کے انجینئر وقت پر پہنچ گئے، ریڈیو کے آرٹسٹ، گانے والے، ساز بجانے والے، روپیہ تقسیم کرنے والے اور کینٹین چلانے والے، سب وقت پر پہنچ گئے۔ اب خیال فرمایئے کہ یہ بے مثال وقت کی پابندی بغیر ایڈمنسٹریشن کے ممکن ہو سکتی ہے؟ یہی طبلے والے، یہی افسانہ نویس، آرٹسٹ، یہی انجینئر یہی ڈائریکٹر جب فلم میں چلے جاتے ہیں تو کیا ہوتا ہے۔ حالانکہ ریڈیو انہیں ڈھائی آنے دیتا ہے اور فلم والے ڈھائی ہزار۔ اگر ایڈمنسٹریشن حسن کارکردگی کا نام ہے تو اس سے ریڈیو والے بے خبر نہیں، بلکہ ایسے باخبر ہیں کہ بڑے بڑوں کو کئی برس تک ایڈمنسٹریشن سکھا سکتے ہیں۔ لیکن اگر ایڈمنسٹریشن سے مراد جلیانوالہ باغ میں نہتے لوگوں پر گولیاں چلانا ہے اور مزدور کو مزدوری یوں دینا ہے جس طرح زکوٰۃ دی جاتی ہے، تو خدا نہ کرے کہ ریڈیو والوں کو ایڈمنسٹریشن آئے۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا، اب برین صاحب کا حال سنئے۔ ان کے محکمے نے ریڈیو سیٹ خریدے اور فیصلہ یہ ہوا کہ دلی کے گرد و نواح کے دیہات میں یہ ریڈیو سیٹ نصب کر دیئے جائیں۔ ہم نے کہا بہت اچھا، ہم جا کر دیکھ آتے ہیں کہ کون کون سے گاؤں موزوں ہیں۔ جب ہمارا تمہارا تصفیہ ہو جائے تو ہمارے انجینئر جا کر ریڈیو لگا آئیں گے۔ فرمایا نہیں، میں بھی ساتھ چلوں گا۔ میں نے کہا اچھا بھائی چل۔ اگر تو یہی چاہتا ہے کہ ہم تمام راستے گھٹے بیٹھے رہیں تو تیری مرضی۔ صاحب بہادر نے حکم دیا کہ ایک بڑی گاڑی مہیا کی جائے، اس کے اندر ریڈیو رکھا جائے اور اس کے اوپر لاؤڈ اسپیکر۔ جب ہم کسی گاؤں میں پہنچیں گے تو ریڈیو کی آواز لاؤڈ اسپیکر سے نکلے گی، لوگ جوق در جوق گاڑی کے گرد جمع ہو جائیں گے اور جب یہ مجمع اکٹھا ہو جائے گا تو ہم کارخانے کی مشہوری کے لئے ریڈیو کے نسخے مفت تقسیم فرمائیں گے۔

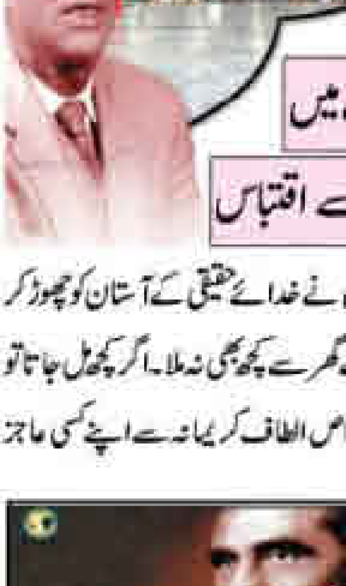
میں صبح کے وقت گاڑی کو ریڈیو اور لاؤڈ اسپیکر سے لیس کر کے برین صاحب کی کوٹھی پر پہنچا۔ صاحب بہادر پانی کا تھرمس، دوربین، فوٹو کا کیمرہ اور ایک سرخ وردی والا چپراسی اپنے ساتھ لے کر برآمد ہوئے۔ گاڑی پر سوار ہوئے اور گاڑی متھرا کی سڑک پر چل دی۔ راستے میں صاحب بہادر چونکے اور فرمایا انجینئر کو ساتھ نہیں لائے۔ میں نے کہا صاحب ریڈیو کی گھنڈی گھمانے کے لئے انجینئر کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے۔ فرمایا تم ریڈیو چلا لو گے۔ میں نے ان کے چپراسی سکھ دیو سے پوچھا، سکھ دیو ریڈیو چلا لیتے ہو؟ اس نے کہا ہاں حجور کیوں نہیں۔ صاحب بہادر کا رنگ نیلا پیلا ہو گیا۔

ہم دہلی سے کوئی چالیس میل دور ایک گاؤں میں پہنچے۔ میں نے ریڈیو چلا دیا۔ گاؤں کے لڑکے بالے، بچے، بوڑھے سب دوڑے آئے۔ جب لوگوں کا ٹھٹ لگ گیا تو صاحب بہادر نے اردو میں تقریر کرنا شروع کی۔ انگریز افسر کی اردو، بولنے والے کی زبان دانی کا ثبوت نہیں بلکہ سمجھنے والے کی ذہانت کی دلیل ہوا کرتی ہے۔ صاحب بہادر کی گل افشانی کا مطلب یہ تھا کہ آواز دلی کی ہے، وہاں بولو تو یہاں کھٹ سے پہنچتی ہے، کوئی تار نہ کچھ اور۔ اس کو ریڈیو کہتے ہیں۔ یہ ریڈیو تمہارے گاؤں میں لگائیں گے۔ اور مفت لگائیں گے۔ جب تقریر ہو چکی اور میں گاڑی سے باہر نکلا تو دیہاتیوں نے شور مچایا "یو بول رہا تھا" "یو بول رہا تھا"۔ صاحب نے فرمایا بولنے والا یہ نہیں تھا۔ آواز دلی سے آ رہی تھی۔ دیکھو ہم پھر ریڈیو چلاتے ہیں۔ یہ شخص ریڈیو چلا کر باہر آ جائے گا۔ گاڑی میں کوئی بھی نہ ہوگا۔ پھر بھی تم کو آواز آتی رہے گی۔

یہ کہہ کر مجھے حکم دیا کہ جاؤ ریڈیو پھر چلاؤ۔ میں اندر گیا گھنڈی گھمائی مگر آواز نہ آئی۔ گھڑی دیکھی تو دس بج چکے تھے۔ دلی سے ریڈیو کا پروگرام ختم ہو چکا تھا۔ صاحب بہادر نے مناسب یہی سمجھا کہ فوراً گاڑی میں بیٹھ کر چل دیا جائے۔ ہم سب پھلانگ کر گاڑی میں جا بیٹھے۔ گاڑی فوراً روانہ ہوئی اور چل دی۔ کچھ دور تک ہمارے کانوں میں بعض ایسے جملے پڑتے رہے، جنہیں لکھنا کوئی اچھی بات نہ ہوگی۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

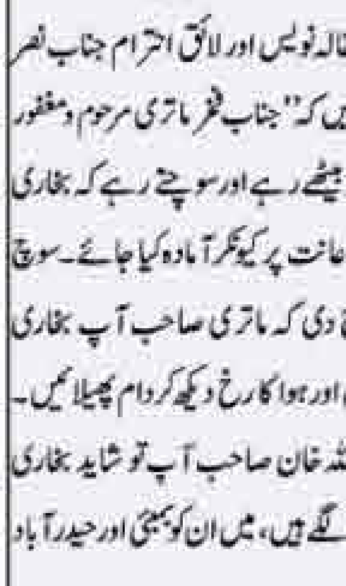
منگل یکم اپریل 2014ء
روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد



'داتا دربار میں حاضری نے پشاور جانے کا کرایہ پورا کر دیا'

تیرہ سال کی عمر میں پہلی بار لاہور پہنچا تو شہر دیکھنے میں پیسے خرچ کر ڈالے- واپسی کیلئے رقم کم پڑنے پر عزیز کی کتاب چرالی- بیچنے سے پہلے دیکھا تو وہ "کشف المحجوب" تھی- روتا ہوا داتا دربار جا پہنچا- فاتحہ کے بعد ایک پارک میں بیٹھا تھا کہ بینچ پر سے تین روپے مل گئے- زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس

ناامیدی کے کفر نے بارہا میرے ایمان پر حملہ کیا۔ کئی بار کفر کے لشکر نے میرے ایمان کو پسپا کر دیا۔ کئی بار میں نے خدائے حقیقی کے آستان کو چھوڑ کر خداوندان مجازی کی چوکھٹ پر سجدہ کیا۔ لیکن اس منعم حقیقی و برحق کا ہزار ہزار شکر ہے کہ مجھے مجازی خداوندوں کے گھر سے کچھ بھی نہ ملا۔ اگر کچھ مل جاتا تو عجب نہیں کہ میں بندوں کو خدا سمجھنے لگتا۔ بندوں سے کچھ نہ ملے تو سمجھ لیجئے کہ خدا کا خاص کرم ہے اور وہ اپنے خاص الطاف کریمانہ سے اپنے کسی عاجز بندے کو شرک کے گناہ سے بچا رہا ہے۔



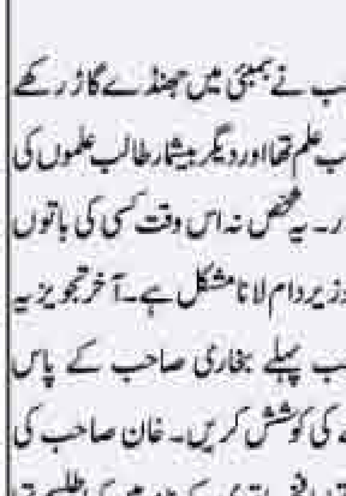
اس سے میری یہ مراد نہیں کہ مجھے دوستوں اور بزرگوں سے کوئی فیض نہیں پہنچا۔ وہ ہمیشہ میرے معاون و مددگار رہے۔ میں نے ہمیشہ ان سے محبت کی بھیک مانگی۔ ان میں سے اکثر نے میری جھولی بھر دی۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ کسی دروازے پر محبت کی خیرات مانگنے گیا تو میرا کاسہ گدائی توڑ دیا گیا۔ کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ کاسہ گدائی کے ساتھ ساتھ دل بھی ٹوٹ گیا۔ پیالے کا کیا ہے اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا۔ لیکن دل ٹوٹا تو ٹوٹا۔ اے ٹوٹے ہوئے دل سے صدا بھی نکلے تو کیسے؟

کب دل شکستہ لب پر بیان عرض حال آیا
ہے بے صدا وہ چینی جس میں کہ بال آیا

دل چینی کا پیالہ ہے۔ اس میں بال آ گیا تو ہزار کھنکاؤ صدا پیدا نہیں ہوتی۔

ہے بے صدا وہ چینی جس میں کہ بال آیا

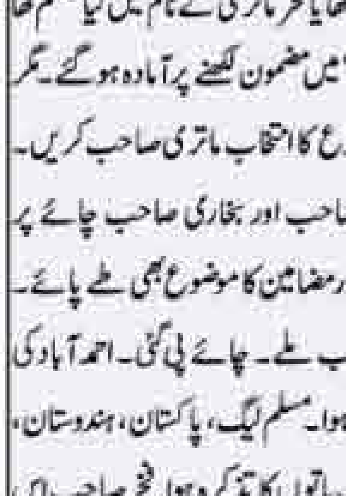
دل و دماغ میں رہ کر ہوک اٹھتی ہے، لیکن ٹوٹا ہوا دل یاری نہیں کرتا کہ وہ ہوک صدا بن کر باہر نکلے۔



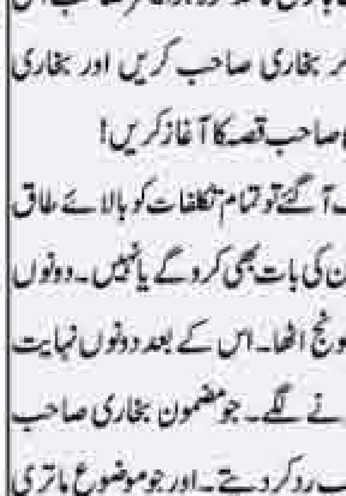
جب انسان کا دل ٹوٹ کر بے صدا ہو جائے تو اس کے ٹکڑوں کو جوڑنے کے لیے کیا کیا جتن کرنا پڑتے ہیں۔ دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لیے گلی گلی پھرنا پڑتا ہے۔ "شیشہ گراں" کی دکان کے پھیرے کرنے پڑتے ہیں۔ آواز لگانی پڑتی ہے۔

دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لیے پھرتا ہوں
کچھ علاج اس کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں
مگر ہر جگہ سے یہی جواب ملتا ہے کہ اگلا در دیکھو

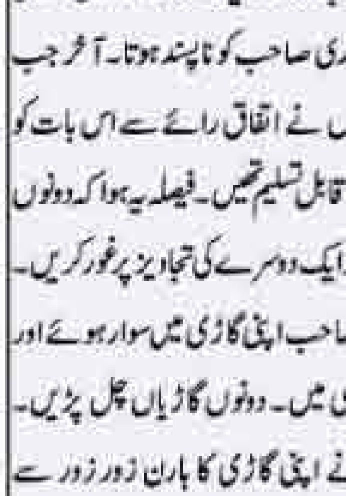
چلو اچھا ہوا کہ غریب دل کے ٹکڑوں کا کام گلی بازار میں بیٹھنے والے شیشہ گراں کے بس کا روگ نہ تھا۔ ورنہ کیا عجب کہ ہوتے ہوتے میں دنیا کی ثروت کو سرمایہ آخرت سمجھنے لگتا۔



دنیا میں روپے پیسے کی ضرورت کس کو نہیں ہوتی۔ پیٹ کے دوزخ کو بھرنے کے لیے اس دنیاوی حاجت روا یعنی روپے پیسے کی تلاش کرنا ہی پڑتی ہے۔ میں نے بھی جب سے ہوش سنبھالا ہے، نان شبینہ کے حصول کے لیے تگ و دو کر رہا ہوں۔ بسا اوقات میں نے قرض لیکر روٹی کھائی۔ نہ صرف روٹی کھائی بلکہ قرض لیکر فاقہ مستی بھی کی اور اب بھی کم و بیش یہی حال ہے۔ مگر میں خوش ہوں، بہت خوش ہوں۔ ایسا خوش ہوں کہ اگر آواگون کا قائل ہوتا تو خدا سے دعا مانگتا کہ اے خدا اس زندگی کے بعد بھی مجھے یہی زندگی عطا فرما۔



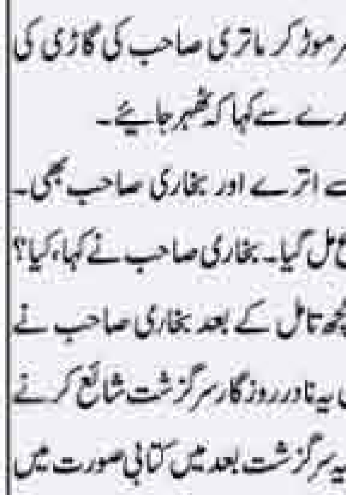
میری خوشی اور میرے اطمینان کا باعث میرے قلب کی ایک ایسی کیفیت ہے کہ جس کا میں کوئی نام نہیں رکھ سکتا۔ اس کو روحانیت کہتے ہوئے ڈرتا ہوں اور اس باعث ڈرتا ہوں کہ ایک تو مجھ ایسا گناہ گار، گرگ معاصی کا شکار، روحانیت کا دعویٰ کس منہ سے کرے اور دوسرے یہ کہ یہ زمانہ روحانیت کا نام لینے کا نہیں۔ جہاں آپ نے روحانیت کا نام لیا آپ کو کسی ماہر نفسیات کے سپرد کر دیا جائے گا۔ یا پھر یہ کہہ کر ٹال دیا جائے گا کہ میاں یہ اگلے وقتوں کے لوگ ہیں، ہمارے اس مشینی اور ایٹمی دور میں ایسوں کا کیا کام۔ چلیے صرف ایک جملہ، اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، کہہ کر لوگوں نے آپ کو از کار رفتہ، حواس باختہ قرار دے دیا۔ اب آپ گردن زدنی اور کشتنی ہیں۔ اور صرف اس قابل ہیں کہ آپ کو لوگ دیوانہ کہہ کر پکاریں اور پتھر ماریں۔



روحانیت تو بہت بڑی شے ہے۔ یہ تو وہ سعادت ہے کہ زور بازو سے حاصل نہیں ہوتی۔ فقط خدائے بخشندہ کی دین ہے۔ جسے مل گئی اسے مل گئی۔ میں اس قابل کہاں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ میں ان کے درباروں میں ضرور حاضر ہوتا ہوں، جن کو اللہ تعالیٰ نے روحانیت کے فیض سے نواز رکھا ہے۔ آج مجھے ایک ایسے ہی دربار کا ذکر کرنا ہے اور یہ دربار ہے حضرت سید مخدوم علی ہجویری المعروف بحضرت داتا گنج بخش لاہوری کا۔

پاسبان عزت ام الکتاب
از نگاہش خانہ باطل خراب

ام الکتاب کی عزت کے پاسبان حضرت داتا گنج بخش۔ وہ حضرت داتا گنج بخش جن کی ایک نگاہ پڑی اور باطل کا گھر مسمار ہو گیا۔



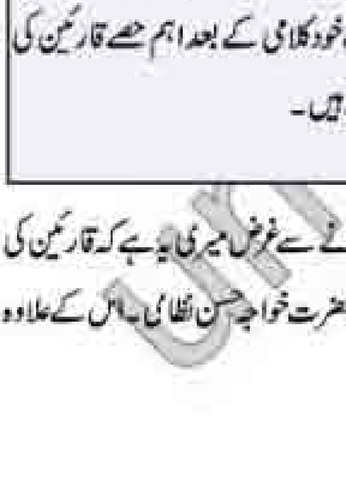
حضرت داتا گنج بخش کے دربار میں پہلی مرتبہ میں کیسے حاضر ہوا اور وہاں سے مجھے کیا فیض حاصل ہوا، اس کا ذکر ابھی کرتا ہوں۔ پہلے اجازت دیجئے کہ ایک نثری مناظرے کا اقتباس پیش کروں۔ یہ مناظرہ حضرت خواجہ حسن نظامی مرحوم و مغفور اور جناب نواب خواجہ محمد شفیع کے مابین 1936ء میں ہوا تھا۔ خواجہ صاحب روحانیت کے قائل اور نواب صاحب کو روحانیت کے تسلیم کرنے میں تامل۔ اس اقتباس کے پیش کرنے سے غرض میری یہ ہے کہ قارئین کی دونوں صفوں کی نمائندگی ہو جائے۔ ایک صف کی نمائندگی نواب صاحب فرمائیں گے اور دوسری صف کی نمائندگی حضرت خواجہ حسن نظامی۔ اس کے علاوہ اس اقتباس میں چند ایسی شخصیتوں کا بھی ذکر آتا ہے، جو تاریخی اعتبار سے ہمارے لیے بہت اہم ہیں۔

"حریت" کی رسم بسم اللہ دسمبر 62ء کی تیسری تاریخ کو ہوئی اور "حریت" کا یہ پہلا پرچہ بخاری صاحب قبلہ کی سرگزشت کی پہلی قسط سے مزین تھا۔ قبلہ بخاری صاحب کو سرگزشت لکھنے پر کس طرح آمادہ کیا گیا؟ اس کا احوال "آداب عرض" کے مشہور مقالہ نویس اور لائق احترام جناب نصر اللہ خان یوں بیان فرماتے ہیں کہ "جناب فخر ماتری مرحوم و مغفور اور میں کئی دن تک سر جوڑ کر بیٹھے رہے اور سوچتے رہے کہ بخاری صاحب کو "حریت" کی قلمی اعانت پر کیونکر آمادہ کیا جائے۔ سوچ بچار کے بعد میں نے صلاح دی کہ ماتری صاحب آپ بخاری صاحب کو اپنے گھر پر بلائیں اور ہوا کا رخ دیکھ کر دام پھیلائیں۔ ماتری صاحب بولے، نصر اللہ خان صاحب آپ تو شاید بخاری صاحب کو کراچی آکر جاننے لگے ہیں، میں ان کو بمبئی اور حیدرآباد سے جانتا ہوں۔

جس زمانے میں بخاری صاحب نے بمبئی میں جھنڈے گاڑ رکھے تھے، میں اس زمانے میں طالب علم تھا اور دیگر بیشمار طالب علموں کی طرح بخاری صاحب کا پرستار۔ یہ شخص نہ اس وقت کسی کی باتوں میں آیا نہ اب آئے گا۔ اس کو زیر دام لانا مشکل ہے۔ آخر تجویز یہ ٹھہری کہ نصر اللہ خان صاحب پہلے بخاری صاحب کے پاس جائیں اور زمین ہموار کرنے کی کوشش کریں۔ خان صاحب کی زبان میں خدا جانے کیا جادو تھا یا فخر ماتری کے نام میں کیا طلسم تھا کہ بخاری صاحب "حریت" میں مضمون لکھنے پر آمادہ ہو گئے۔ مگر ساتھ ہی یہ بیخ لگا دی کہ موضوع کا انتخاب ماتری صاحب کریں۔ اب فیصلہ یہ ہوا کہ ماتری صاحب اور بخاری صاحب چائے پر ملیں۔ تجدید ملاقات بھی ہو اور مضامین کا موضوع بھی طے پائے۔ فخری ماتری اور بخاری صاحب ملے۔ چائے پی گئی۔ احمد آباد کی باتیں ہوئیں۔ بمبئی کا تذکرہ ہوا۔ مسلم لیگ، پاکستان، ہندوستان، ہندو، مسلمان، غرض یہ کہ سب باتوں کا تذکرہ ہوا۔ فخر صاحب اس کوشش میں کہ مضمون کا ذکر بخاری صاحب کریں اور بخاری صاحب اس سعی میں کہ ماتری صاحب قصہ کا آغاز کریں!

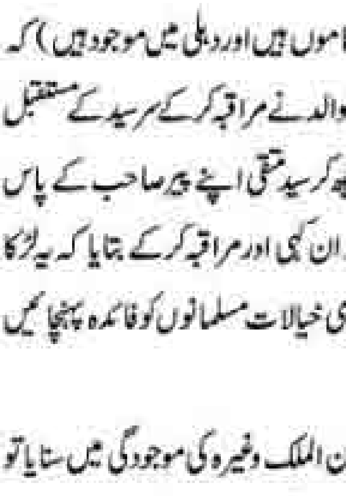
جب ماتری صاحب بہت تنگ آ گئے تو تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر فرمایا، ارے بھائی مضمون کی بات بھی کرو گے یا نہیں۔ دونوں دوستوں کے قہقہے سے ہوٹل گونج اٹھا۔ اس کے بعد دونوں نہایت سنجیدگی سے موضوع پر غور کرنے لگے۔ جو مضمون بخاری صاحب تجویز کرتے، وہ ماتری صاحب رد کر دیتے۔ اور جو موضوع ماتری صاحب تجویز فرماتے وہ بخاری صاحب کو ناپسند ہوتا۔ آخر جب محفل برخاست ہوئی تو دونوں نے اتفاق رائے سے اس بات کو تسلیم کیا کہ دونوں کی تجاویز ناقابل تسلیم تھیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ دونوں الگ الگ سوچیں اور پھر مل کر ایک دوسرے کی تجاویز پر غور کریں۔ علیک سلیک کے بعد ماتری صاحب اپنی گاڑی میں سوار ہوئے اور بخاری صاحب قبلہ اپنی گاڑی میں۔ دونوں گاڑیاں چل پڑیں۔ اتنے میں ماتری صاحب نے اپنی گاڑی کا ہارن زور زور سے بجایا۔ بخاری صاحب نے سر موڑ کر ماتری صاحب کی گاڑی کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اشارے سے کہا کہ ٹھہر جائیے۔

ماتری صاحب بھی گاڑی سے اترے اور بخاری صاحب بھی۔ ماتری صاحب نے کہا موضوع مل گیا۔ بخاری صاحب نے کہا، کیا؟ فرمایا، اپنی سرگزشت لکھو۔ کچھ تامل کے بعد بخاری صاحب نے اس تجویز پر صاد کر دیا اور یوں یہ نادر روزگار سرگزشت شائع کرنے کا سہرا "حریت" کے سر رہا۔ یہ سرگزشت بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ اس میں دلچسپ خود کلامی کے بعد اہم حصے قارئین کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔



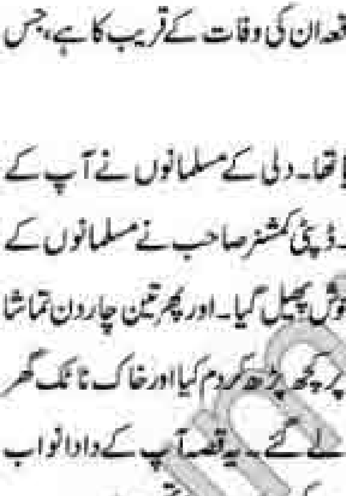
اقتباس.....نثری مناظرہ 1936ء

خواجہ صاحب..... میں نے نواب مصلح الدین صاحب سے سنا ہے (جو سرسید کے پوتے سر راس مسعود کے حقیقی ماموں ہیں اور دہلی میں موجود ہیں) کہ سرسید کے والد سید متقی صاحب، حضرت شاہ غلام علی صاحب کے مرید تھے اور جب سرسید پیدا ہوئے تو ان کے والد نے مراقبہ کر کے سرسید کے مستقبل کو دیکھا۔ ان کو مراقبے میں معلوم ہوا کہ یہ لڑکا انگریزی لباس اور انگریزی خیال اختیار کرے گا۔ یہ حالت دیکھ کر سید متقی اپنے پیر صاحب کے پاس گئے اور اپنے مراقبے کا ذکر کیا۔ تب ان کے پیر خود متقی صاحب کے گھر میں آئے اور سرسید کے کان میں آذان کہی اور مراقبہ کر کے بتایا کہ یہ لڑکا مسلمانوں کی بہت مدد کرے گا اور پکا مسلمان ہوگا اور اس کا خاتمہ بالخیر ہوگا۔ اس کا انگریزی لباس اور انگریزی خیالات مسلمانوں کو فائدہ پہنچائیں گے۔

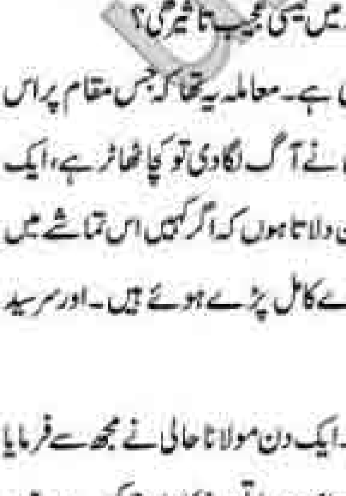


یہ واقعہ شاہ غلام علی صاحب کے ایک مرید نے جو مراقبہ مذکور کے وقت موجود تھا، سرسید کو علی گڑھ میں نواب محسن الملک وغیرہ کی موجودگی میں سنایا تو سرسید نے حضرت شاہ غلام علی صاحب کے روحانی کمالات اور مراقبہ کی طاقت کو سب کے سامنے تسلیم کیا۔ یہ واقعہ ان کی وفات کے قریب کا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سرسید مراقبے اور روحانی قوتوں کو مانتے تھے، اور آخری وقت تک مانتے رہے۔

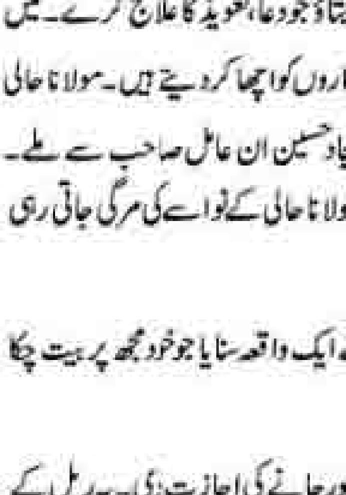
آپ کے مکان کے قریب نواب دوجانہ کی مسجد کے سامنے کاؤس جی پارسی نے ناٹک کے تماشے کا منڈوا بنوایا تھا۔ دلی کے مسلمانوں نے آپ کے نانا، نواب محمد کرم اللہ صاحب کو اپنی ناراضگی کا محضر دیا۔ نواب صاحب نے وہ ڈپٹی کمشنر صاحب دہلی کو بھیج دیا۔ ڈپٹی کمشنر صاحب نے مسلمانوں کے خلاف فیصلہ کیا اور آپ کے نانا صاحب کو امن و انتظام کا ذمہ دار بنا دیا، جس سے دہلی کے مسلمانوں میں بہت جوش پھیل گیا۔ اور پھر تین چار دن تماشا ہوتا رہا۔ اس کے بعد ایک فقیر آپ کے نانا کے پاس آیا اور اس نے زمین سے خاک مٹھی بھر کے اٹھائی اور اس پر کچھ پڑھ کر دم کیا اور خاک ناٹک گھر کی طرف پھینک دی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ دوسرے ہی دن کاؤس جی خود بخود اپنے تماشہ گھر کو یہاں سے اٹھا کر لے گئے۔ یہ قصہ آپ کے دادا نواب عبدالرحیم خان صاحب نے مجھ سے بیان کیا تھا۔ تو بتائیے کہ خاک کی چٹکی نے یہ کیا اثر کیا؟ اور فقیر کے دم کرنے میں کیسی عجیب تاثیر تھی؟



نواب صاحب..... آفت تو یہی ہے کہ ہمارا دماغ ہم کو غلط طرف لیے جاتا ہے۔ جب سوجھتی ہے اوندھی سوجھتی ہے۔ معاملہ یہ تھا کہ جس مقام پر اس نے منڈوا بنایا تھا، وہ جگہ مسلمانوں کی آبادی کے منجھ میں واقع ہے۔ سمجھدار آدمی تھا۔ ذرا کہ رات برات کو کسی نے آگ لگا دی تو کیا ٹھاٹر ہے، ایک پردہ بھی سلامت نہیں بچے گا۔ بے چارہ چلا گیا۔ یاروں نے فقیر صاحب کے سر سہرا باندھا، اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر کہیں اس تماشے میں آگ لگ جاتی تو فقیر صاحب ہی ذمہ دار ٹھہرائے جاتے کہ کہاں کا بزرگ تھا۔ دیکھا لگا دی۔ میاں بڑے بڑے کامل پڑے ہوئے ہیں۔ اور سرسید کے قصے سے تعویذ گنڈے کا ثبوت کہاں نکلا۔ آپ نے تو مراقبے کی ایک نئی خلاف عقل بات سنائی۔

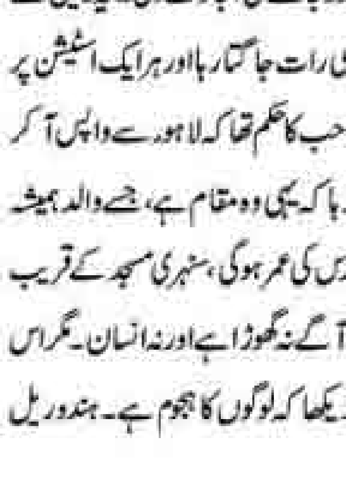


خواجہ صاحب..... مولانا حالی آپ کے یہاں دہلی میں آ کر ٹھہرا کرتے تھے اور میں ان سے ملنے جایا کرتا تھا۔ ایک دن مولانا حالی نے مجھ سے فرمایا کہ میرے نواسے کو مرگی ہے۔ نہ کوئی ڈاکٹری علاج سے فائدہ ہوتا ہے نہ یونانی علاج سے۔ اب کوئی درویش بتاؤ جو دعا، تعویذ کا علاج کرے۔ میں نے ضلع راولپنڈی کے ایک درویش کا ذکر کیا کہ وہ سورۃ مزمل کے عامل ہیں اور صرف "یا ایھا المزمل" پڑھ کر بیماروں کو اچھا کر دیتے ہیں۔ مولانا حالی کے لڑکے مولانا سجاد حسین صاحب راولپنڈی میں انسپکٹر تعلیمات تھے۔ مولانا حالی نے ان کو لکھا اور مولانا سجاد حسین ان عامل صاحب سے ملے۔ عامل صاحب نے پانی پت کی طرف رخ کر کے انگلی کا اشارہ کیا اور "یا ایھا المزمل" ایک دفعہ پڑھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا حالی کے نواسے کی مرگی جاتی رہی اور پھر کبھی دورہ نہ ہوا۔ کیا یہ روحانی کمال کی تاثیر نہ تھی؟ (اقتباس ختم)



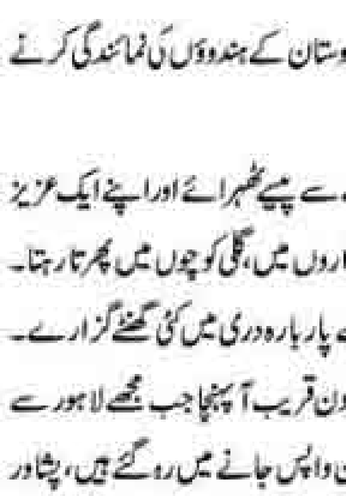
جب یہ مناظرہ ختم ہوا تو میں خواجہ صاحب کی ہم رکابی میں سلطان جی گیا۔ راستے میں خواجہ صاحب کو میں نے ایک واقعہ سنایا جو خود مجھ پر بیت چکا ہے۔ واقعہ یہاں عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے۔

1915ء کا ذکر ہے کہ والد مرحوم نے میری کسی خدمت سے خوش ہو کر مجھے انعام کے طور پر چند دن کے لیے لاہور جانے کی اجازت دی۔ یہ ریل کے ذریعے میرا پہلا سفر تھا۔ اس زمانے کی ریل پشاور سے لاہور تک 24 گھنٹے میں پہنچتی تھی۔ میں سارا دن اور ساری رات جاگتا رہا اور ہر ایک اسٹیشن پر اتر کر کچھ نہ کچھ خریدتا رہا۔ میں ایک کاپی میں ہر ایک اسٹیشن کا نام اور اس کے حالات بھی لکھتا جاتا، کیونکہ والد صاحب کا حکم تھا کہ لاہور سے واپس آ کر تم کو اپنے سفر کے حالات لکھ کر پیش کرنے ہوں گے۔ خیر میں لاہور پہنچا۔ اسٹیشن کو دیکھا تو ہوش اڑ گئے۔ سوچتا رہا کہ یہی وہ مقام ہے، جسے والد ہمیشہ سلطان کی سرائے کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ والد سنایا کرتے تھے کہ میں نوجوان تھا، کوئی اٹھارہ انیس برس کی عمر ہوگی، سنہری مسجد کے قریب دوستوں سے باتیں کر رہا تھا کہ کسی نے آ کر کہا، سلطان کی سرائے کے پاس ایک عجیب گاڑی آئی ہے۔ اس کے آگے نہ گھوڑا ہے اور نہ انسان۔ مگر اس قدر تیز چلتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ ہم سب لڑکے سنہری مسجد سے سلطان کی سرائے کی طرف بھاگے۔ یہاں آ کر دیکھا کہ لوگوں کا ہجوم ہے۔ ہندو ریل کے انجن پر پھول چڑھا رہے ہیں۔ اور زور زور سے نعرے لگا رہے ہیں کالی ماتا کی جے۔

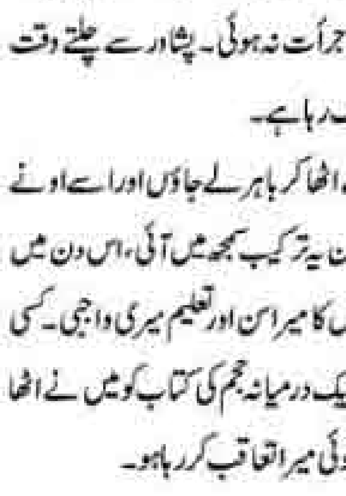


وہ تو خیر اگلے وقتوں کی بات ہے۔ پنڈت مدن موہن مالویہ جب راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے رکن کی حیثیت سے ہندوستان کے ہندوؤں کی نمائندگی کرنے لندن سدھارے تھے تو اپنے ساتھ گنگا جی کا پانی، مٹی کے تیل کے کنستروں میں بھر کر لے گئے تھے۔

لاہور کا اسٹیشن مجھے اتنا بڑا دکھائی دیا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ خیر یہاں سے سامان اٹھا کر باہر نکلا، تانگے والے سے پیسے ٹھہرائے اور اپنے ایک عزیز کے مکان کی راہ لی۔ لاہور میں میرا معمول یہ تھا کہ صبح کھانا کھا کر نکلتا اور شام کو گھر آتا۔ تمام دن لاہور کے بازاروں میں، گلی کوچوں میں پھرتا رہتا۔ لاہور کے عجائب گھر کو دو مرتبہ دیکھا۔ شالامار گیا۔ شاہدرے گیا۔ باغوں کے چکر لگائے۔ کشتی میں بیٹھ کر راوی کے پار بارہ دری میں کئی گھنٹے گزارے۔ قلعہ دیکھا۔ بادشاہی مسجد دیکھی۔ سنہری بازار کی سیر کی۔ غرض کہ چند ہی دنوں میں لاہور کو چھان ڈالا۔ اب وہ دن قریب آ پہنچا جب مجھے لاہور سے واپس پشاور جانا تھا۔ جیب میں دیکھا تو کرائے میں تین روپے کم پائے۔ ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔ صرف دو دن واپس جانے میں رہ گئے ہیں، پشاور سے تو روپیہ آ نہیں سکتا، یہاں کس سے مانگوں، کہاں جاؤں۔ جس عزیز کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا ان سے مانگنے کی جرأت نہ ہوئی۔ پشاور سے چلتے وقت والد نے کچھ سوغات ان کے لیے دی تھی، سوچا کہ اگر ان سے روپے مانگے تو شاید سمجھیں کہ سوغات کی قیمت مانگ رہا ہے۔

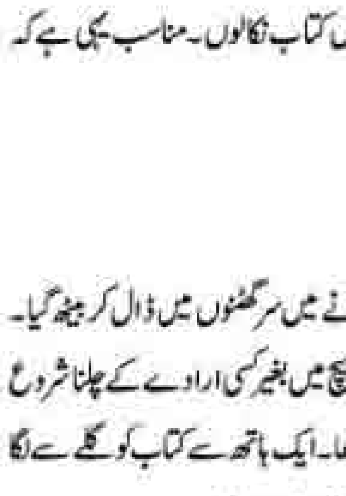


بہت سوچ بچار کے بعد صرف یہ ترکیب سمجھ میں آئی کہ اپنے میزبان کے طاق سے کوئی کتاب پڑھنے کے بہانے اٹھا کر باہر لے جاؤں اور اسے اونے پونے داموں بیچ کر کرایہ کی رقم پوری کر لوں۔ اگر انہوں نے پوچھا کہ کتاب کہاں گئی تو کہہ دوں گا کھو گئی۔ جس دن یہ ترکیب سمجھ میں آئی، اس دن میں صبح ناشتہ کر کے باہر نہ گیا۔ کتابوں کے طاق کے پاس کھڑا ہو کر کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ گیارہ بارہ برس کا میرا سن اور تعلیم میری واجبی۔ کسی موٹی کتاب کو ہاتھ لگانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ پتلی پتلی کتابوں کے داموں کے متعلق اطمینان نہ ہوتا تھا۔ آخر ایک درمیانہ حجم کی کتاب کو میں نے اٹھا لیا اور جھوٹ موٹ اسے دیکھتا ہوا گھر سے باہر نکل آیا۔ باہر نکل کر میں نے ایسی تیزی سے چلنا شروع کیا کہ جیسے کوئی میرا تعاقب کر رہا ہو۔



کتاب بغل میں لیکر میں لوہاری دروازے کے باہر پہنچا۔ یہاں پہنچ کر خیال کیا کہ یہ موقع ایسا تو نہیں کہ پہلے کہیں کتاب نکالوں۔ مناسب یہی ہے کہ باغ میں جا کر اطمینان سے کتاب دیکھ کر اندازہ کر لوں کہ اگر کسی نے پوچھا کیا لو گے تو کیا دام لگاؤں گا۔

باغ میں جا کر کتاب کھولی۔ نام پڑھا: کشف المحجوب
مصنف..... حضرت داتا گنج بخش۔



میرے آنسو نکل آئے۔ جی بھر کے رویا اور روتا روتا داتا کے دربار میں پہنچا۔ فاتحہ پڑھی دعا مانگی اور ایک کونے میں سر گھٹنوں میں ڈال کر بیٹھ گیا۔ جانے کتنی دیر بیٹھا رہا اور کیا کیا سوچتا رہا۔ آخر اٹھا۔ کتاب کو سینے سے لگائے ٹکسالی دروازے کی طرف باغ کے بیچ میں بغیر کسی ارادے کے چلنا شروع کیا۔ چلتے چلتے تھک گیا تو ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ مجھ پر ایک ہیبت طاری تھی۔ بہت دیر تک مبہوت بیٹھا رہا۔ آخر اٹھا۔ ایک ہاتھ سے کتاب کو گلے سے لگا لیا اور دوسرا ہاتھ بینچ پر ٹیک کر اٹھنے لگا۔ جب بینچ پر ہاتھ پڑا تو کوئی شے چبھنے لگی۔ دیکھا تو تین روپے پڑے ہیں۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

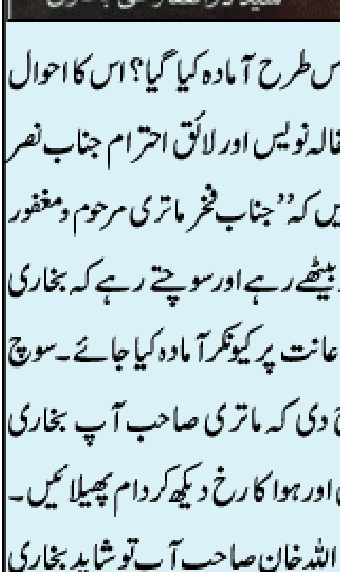
ریڈیو پر پہلا مشاعرہ داغ دہلوی کی برسی پر نشر کیا گیا

حضرت سیماب اور جوش ملسیانی سمیت تمام شاگردانِ داغ اپنے خرچ پر دہلی تشریف لائے۔شدید باہمی

اختلافات کے باوجود نواب سائل اور بیخود دہلوی نے بھی شرکت کی کامیاب مشاعرے پر نواب سراج الدین سائل کو

شعرا کے سفر خرچ کیلئے تین ہزار کا چیک دیا تو انہوں نے پھاڑ ڈالا۔زیڈ اے بخاری کی کتاب ''سرگزشت'' سے اقتباس

ایک اخبار میں یہ واقعہ بطور لطیفہ شائع ہوا کہ نواب سائل دہلوی کی آخری عمر میں ران کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ایک رکشا خرید لیا، اس پر سوار ہونے میں بھی ان کو دشواری ہوتی تھی۔ایک دن لال کنویں پر ٹرام کی لیکھ میں رکشا پھنس کر الٹ گیا۔لوگوں نے بڑھ کر نواب صاحب کو اٹھایا تو انہوں نے شکریہ ادا کیا اور کہا، ایک وقت تھا جب ابا حضور کا ہاتھی ڈیوڑھی پر آتا تو میں لپکتا اور اس کی دم پکڑ کر اوپر جا بیٹھتا اور اب یہ حال ہے۔ہت تیری زندگی کی ایسی تیسی!



''حریت'' کی رسم بسم اللہ دسمبر 62ء کی تیسری تاریخ کو ہوئی اور ''حریت'' کا یہ پہلا پرچہ بخاری صاحب قبلہ کی سرگزشت کی پہلی قسط سے مزین تھا۔ قبلہ بخاری صاحب کو سرگزشت لکھنے پر کس طرح آمادہ کیا گیا؟ اس کا احوال ''آداب عرض'' کے مشہور مقالہ نویس اور لائق احترام جناب نصر اللہ خان یوں بیان فرماتے ہیں کہ ''جناب فخر ماتری مرحوم ومغفور اور میں کئی دن تک سر جوڑ کر بیٹھے رہے اور سوچتے رہے کہ بخاری صاحب کو ''حریت'' کی قلمی اعانت پر کیونکر آمادہ کیا جائے۔سوچ بچار کے بعد میں نے صلاح دی کہ ماتری صاحب آپ بخاری صاحب کو اپنے گھر پر بلائیں اور ہوا کا رخ دیکھ کر دام پھیلائیں۔ ماتری صاحب بولے، نصر اللہ خان صاحب آپ تو شاید بخاری صاحب کو کراچی آ کر جاننے لگے ہیں، میں ان کو بمبئی اور حیدر آباد سے جانتا ہوں۔جس زمانے میں بخاری صاحب نے بمبئی میں جھنڈے گاڑ رکھے تھے، میں اس زمانے میں طالب علم تھا اور دیگر بیشمار طالب علموں کی طرح بخاری صاحب کا پرستار۔ یہ شخص نہ اس وقت کسی کی باتوں میں آیا نہ اب آئے گا۔اس کو زیر دام لانا مشکل ہے۔ آخر تجویز یہ ٹھہری کہ نصر اللہ خان صاحب پہلے بخاری صاحب کے پاس جائیں اور زمین ہموار کرنے کی کوشش کریں۔ خان صاحب کی زبان میں خدا جانے کیا جادو تھا یا فخر ماتری کے نام میں کیا طلسم تھا کہ بخاری صاحب ''حریت'' میں مضمون لکھنے پر آمادہ ہو گئے۔مگر ساتھ ہی یہ پخ لگا دی کہ موضوع کا انتخاب ماتری صاحب کریں۔ اب فیصلہ یہ ہوا کہ ماتری صاحب اور بخاری صاحب چائے پر ملیں۔تجدید ملاقات بھی ہو اور مضامین کا موضوع بھی طے پائے۔فخری ماتری اور بخاری صاحب ملے۔ چائے پی گئی۔ احمد آباد کی باتیں ہوئیں۔بمبئی کا تذکرہ ہوا۔مسلم لیگ، پاکستان، ہندوستان، ہندو، مسلمان، غرض یہ کہ سب باتوں کا تذکرہ ہوا۔فخر صاحب اس کوشش میں کہ مضمون کا ذکر بخاری صاحب کریں اور بخاری صاحب اس سعی میں کہ ماتری صاحب قصہ کا آغاز کریں!

جب ماتری صاحب بہت تنگ آ گئے تو تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر فرمایا، ارے بھائی مضمون کی بات بھی کرو گے یا نہیں۔ دونوں دوستوں کے قہقہے سے ہوٹل گونج اٹھا۔اس کے بعد دونوں نہایت سنجیدگی سے موضوع پر غور کرنے لگے۔ جو مضمون بخاری صاحب تجویز کرتے، وہ ماتری صاحب رد کر دیتے۔اور جو موضوع ماتری صاحب تجویز فرماتے وہ بخاری صاحب کو ناپسند ہوتا۔آخر جب محفل برخاست ہوئی تو دونوں نے اتفاق رائے سے اس بات کو تسلیم کیا کہ دونوں کی تجاویز ناقابل تسلیم تھیں۔فیصلہ یہ ہوا کہ دونوں الگ الگ سوچیں اور پھر مل کر ایک دوسرے کی تجاویز پر غور کریں۔علیک سلیک کے بعد ماتری صاحب اپنی گاڑی میں سوار ہوئے اور بخاری صاحب قبلہ اپنی گاڑی میں۔دونوں گاڑیاں چل پڑیں۔اتنے میں ماتری صاحب نے اپنی گاڑی کا ہارن زور زور سے بجایا۔بخاری صاحب نے سر موڑ کر ماتری صاحب کی گاڑی کی طرف دیکھا۔انہوں نے اشارے سے کہا کہ ٹھہر جایئے۔ ماتری صاحب بھی گاڑی سے اترے اور بخاری صاحب بھی۔ ماتری صاحب نے کہا موضوع مل گیا۔ بخاری صاحب نے کہا، کیا؟ فرمایا، اپنی سرگزشت لکھو۔ کچھ تامل کے بعد بخاری صاحب نے اس تجویز پر صاد کر دیا اور یوں یہ نادر روزگار سرگزشت شائع کرنے کا سہرا ''حریت'' کے سر رہا۔ یہ سرگزشت بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔اس میں دلچسپ خود کلامی کے بعد اہم حصے قارئین کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

لکھنے والے نے اپنی طرف سے یہ لطیفہ لکھا اور پڑھنے والوں نے یہ لطیفہ پڑھا۔ اس نے ہنسایا اور یہ ہنسے۔اب یہ کیا معلوم کہ ہنسانے والے کو وہ آنسو بھی نظر آیا یا نہیں جو اس لطیفے کی تہہ میں جھلک رہا ہے اور ہنسنے والوں نے وہ آہ بھی سنی یا نہیں جو اس تبسم کے پردے میں چھپی ہوئی ہے۔خیر محتسب را درون خانہ چہ کار۔ نواب سراج الدین سائل کے بارے مجھے تو اپنی بات سنانا ہے۔

نواب صاحب مرحوم کی خدمت میں مجھے شرف باریابی حاصل تھا۔شام کو اکثر مچھلی دالان میں جناب یوسف خوش نویس کے بھائی جناب قدیر کی دکان پر آیا کرتے تھے۔کسب فیض کے لیے میں بھی وہیں حاضری دیا کرتا تھا۔صدر الصدور کی حویلی کے مشاعروں میں بھی نواب صاحب کی ہم رکابی میں جایا کرتا تھا۔حویلی کے آگے چتلی قبر کے پاس ڈاکٹر مجیب کا مطب تھا، وہاں بھی نواب صاحب کبھی کبھی رک جایا کرتے تھے۔مطب کے برابر کی دکان ''مرزا چپاتی'' کی تھی۔ یہ شہزادگان دہلی میں سے تھے، مگر گردش روزگار کہ پتنگ بنا بنا کر پیٹ پالا کرتے تھے۔

جن کے طویلے بیچ کئی دن کی بات ہے
ہرگز عراقی وعربی کا نہ تھا شمار
اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانے کے ہاتھ سے
موچی سے کفش پا کو گٹھاتے ہیں وہ ادھار

نواب صاحب اس پٹے ہوئے مہرے یعنی مرزا چپاتی کے سامنے یوں کھڑے ہوتے تھے، جیسے بادشاہ وقت کے دربار میں حاجت مند سائل کھڑا ہو۔

بیخود دہلوی اور نواب سائل میں داغ کی جانشینی کے مسئلے پر یا کسی اور مسئلے پر آپس میں کچھ شکر رنجی تھی۔دونوں بزرگ ایک دوسرے سے کھنچے ہوئے تھے۔ چنانچہ بے خود کی ٹولی الگ اور نواب صاحب کے حاشیہ نشین الگ۔ میں بیخود صاحب کی ٹولی سے وابستہ ہو گیا۔ویسے تو نواب صاحب کو بہ لحاظ ان کی ذاتی اور خاندانی وجاہت کے جھک کر سلام کیا کرتا تھا، لیکن دل میرا بیخود کی طرف تھا۔

ایک دن نواب صاحب کی ایک غزل ''اثر جام شراب'' ''نظر جام شراب'' میری نظر سے گزری۔ میں نے قلم برداشتہ اس پر تنقید لکھ دی۔عزیز حسن بقائی کو ایسا موقع خدا دے۔اس نے وہ خرافات اپنے رسالے پیشوا میں چھاپ دی۔ گو یہ مضمون کسی فرضی نام سے شائع ہوا تھا، مگر تاڑنے والے تاڑ گئے کہ یہ مضمون کس کا ہے۔اس مضمون میں تنقید کم تھی اور گستاخی زیادہ۔اس لفظ پر پھبتی، اس مصرع پر فقرہ۔ مضمون چھپنے کو تو چھپ گیا۔مگر میری یہ حالت کہ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہا۔میں نے یہ مضمون محض یاروں میں اپنی چڑھ بنانے کے لیے لکھا تھا۔ میرا منشا ہرگز یہ نہ تھا کہ چھپ جائے۔

نتیجہ میری اس حماقت کا یہ ہوا کہ میں نے بھائی قدیر کی دکان پر روز کا بیٹھنا اٹھنا ترک کر دیا اور دہلی میں منہ چھپائے پھرتا رہا۔ایک دن محض اتفاق کہ مٹیا محل کے موڑ پر نواب صاحب سے آمنا سامنا ہو گیا۔آداب بجا لایا نواب صاحب نے حسب معمول خندہ پیشانی سے جواب دیا اور فرمایا کہاں رہتے ہو دکھائی نہیں دیتے۔ میرے سان گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ نواب صاحب یوں تلطف سے پیش آئیں گے۔ میں کچھ نہ کہہ سکا۔شرم کے مارے گردن جھکا لی۔نواب صاحب بھی خاموش اور میں بھی چپ۔آخر نواب صاحب نے فرمایا، چلو ہمارے ساتھ ہمیں ٹرام تک پہنچا دو۔

نواب صاحب آگے آگے اور میں پیچھے پیچھے۔ بارہا دل نے چاہا کہ نواب صاحب سے اپنی گستاخی کی معافی مانگوں۔ پھر سوچا کہ شاید نواب صاحب کی نظر سے وہ مضمون گزرا ہی نہ ہو، جس کو لکھ کر میں نے اپنا نامہ اعمال سیاہ کیا ہے۔ میں اسی کشمکش میں تھا کہ ہم ٹرام کے پاس پہنچ گئے اور نواب صاحب فرسٹ کلاس کے درجے میں سوار ہو کر تشریف لے گئے۔

اس واقعہ کے کوئی ایک سال بعد شملے میں سر رضا علی مرحوم کی صدارت میں مشاعرے کے انتظامات ہوئے۔ اعلانات سے معلوم ہوا کہ حضرت سائل بھی اس مشاعرے میں شرکت کریں گے۔ مشاعرے کے کچھ انتظامات میرے بھی سپرد تھے۔مگر کسی کام میں میرا جی نہ لگتا تھا۔رہ رہ کر یہ خیال ستاتا تھا کہ مجھ سے نواب صاحب کی شان میں گستاخی سرزد ہوئی ہے۔ان کو کیونکر منہ دکھاؤں گا۔ اور تو کچھ نہ سوجھا، جب نواب صاحب کی آمد کی اطلاع شملے میں پہنچی تو ان کے استقبال کے لیے کالکا پہنچا۔انبالے کی گاڑی سے اترے تو میں نے عرض کیا کہ میں اپنی حرکت پر سخت نادم ہوں، مجھے معاف فرما دیجئے، ورنہ آپ شملے تشریف لے جایئے اور بندہ اگلی گاڑی سے دہلی جا رہا ہے۔فرمایا دلی میں ہمارے سوا تمہارا ہے ہی کون۔

ان کا یہ فقرہ تیر کی طرح سینے میں لگا اور اب تک اس کی چبھن دل میں پاتا ہوں۔ یہ واقعہ 1930ء سے پہلے کا ہے۔اس کے پانچ چھ سال بعد جب دہلی میں ریڈیو کی بنیاد پڑی اور میں نے دہلی میں مستقل اقامت اختیار کر لی تو نواب صاحب کی خدمت میں اکثر حاضر ہونے کی سعادت نصیب ہوتی اور میں زبان بارے ان کے ارشادات عالیہ سے استفادہ کرتا تھا۔

اس زمانے میں ریڈیو سے مشاعرہ نشر کرنے کا ہم کو خیال بھی نہ آیا تھا۔ہم ریڈیو کو موسیقی، تقریروں، خبروں اور ڈراموں کے لیے استعمال کرتے تھے اور بس۔مشاعرے بہت بعد میں شروع ہوئے اور فیچر پروگرام بھی۔ان پروگراموں کا ذکر تو بعد میں ہوگا۔ پہلے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجیے کہ فنکاروں کو معاوضہ کیونکر دیا جاتا تھا۔

یہ وہ زمانہ ہے جب فنکاروں سے کنٹریکٹ پر دستخط کرانے کے معمول پر عمل درآمد شروع نہ ہوا تھا اور نہ اسٹاف آرٹسٹ کا نام وضع ہوا تھا۔آرٹسٹ روز کے روز اپنے پیسے لے جاتے تھے چاہے ان میں ایکٹر ہوں یا سازندے یا کوئی اور۔آرٹسٹ حضرات جس دن جی چاہا سارنگی اٹھا کر ریڈیو اسٹیشن آ گئے اور جب جی چاہا گھر پر سوتے رہے۔ان لوگوں کی بے نیازیاں ریڈیو کے کام میں خلل انداز ہوئیں تو میں نے ترکیب یہ سوچی کہ ان لوگوں کو روز پیسے نہ دیئے جائیں، بلکہ مہینہ بھر کی ساری رقم پہلی تاریخ کو دی جائے۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی اور سازندوں نے پابندی وقت کے ساتھ ریڈیو پر حاضری دینا شروع کی۔

گورنمنٹ آڈٹ کے محکمے کو یہ تدبیر پسند نہ آئی۔انہوں نے فرمایا کہ ماہ بہ ماہ تنخواہ پانے والا باقاعدہ سرکاری ملازم ہوتا ہے اور اسٹیشن ڈائریکٹر یا کنٹرولر آف براڈ کاسٹنگ کو بغیر وزارت مالیات کی منظوری کے باقاعدہ ملازم رکھنے کی اجازت نہیں۔ہم نے اس کا جواب یہ دیا کہ سرکاری حکم سر آنکھوں پر، لیکن ہر سازندے سے ہر روز رسید لینے میں اور ہر روز عارضی اقرار نامہ کرنے میں اور ہر روز اس کا اندراج کرنے میں بڑی قباحت ہے۔اس لیے اجازت دی جائے کہ ان لوگوں کے ساتھ ایک ہی دفعہ مہینہ بھر کا اقرار نامہ کر لیا جائے اور ان کو مہینے میں ایک ہی دفعہ تنخواہ دی جائے۔

آڈٹ نے اجازت دے دی مگر ساتھ ہی یہ پخ بھی لگا دی کہ ان لوگوں پر یہ امر بخوبی واضح کر دیا جائے کہ ان کو وہ مراعات حاصل نہ ہوں گی جو دیگر باقاعدہ ملازمین سرکار کو حاصل ہیں۔ میں نے آڈٹ کے اس فیصلے پر اعتراض کیا تو جواب ملا کہ پھر یوں کرو کہ......

1- ہر نوع کے سازندوں کی تعداد کا جواز محکمہ مالیات کے سامنے پیش کرو۔

2- ہر نوع کے سازندوں کی استعداد علمی وعملی ضبط تحریر میں لاؤ۔

3- ہر نوع کے سازندوں کا گریڈ تجویز کرو۔اور اس امر کا لحاظ رکھو کہ آیا وہ سازندہ گزیٹیڈ افسر ہوگا کہ نان گزیٹیڈ افسر۔ ہر دو حالتوں میں اس کے ساتھ اور کون سا عملہ وابستہ ہوگا۔مثلاً کلرک، چپراسی وغیرہ۔

4- ہر نوع کے سازندے کی استعداد فن کو پرکھنے کا معیار مقرر کرو اور نیز یہ بتاؤ کہ سازندہ میٹری کولیٹ ہوگا یا نہیں، اگر نہیں تو کیوں نہیں؟

5- یہ امر بھی واضح کرو کہ سازندوں کا انتخاب پبلک سروس کمیشن کرے گا یا نہیں۔ اگر نہیں تو کیوں نہیں؟

میں نے کان پکڑے اور سرکار کو لکھ بھیجا کہ بخشو بی بلی چوہا لنڈورا ہی جئے گا۔

ادھر سرکار تو یہ جواب پا کر خاموش ہو گئی اور ادھر میں نے سازندوں اور دیگر فنکاروں کا اقرار نامہ ایک مہینے سے دو مہینے کا کر دیا۔دو سے چار کا اور پھر رفتہ رفتہ سال بھر کا۔فنکاروں کی بھی جان میں جان آئی اور ہم بھی خوش ہوئے کہ روز روز کے جھنجھٹ سے چھوٹے......

آڈٹ کی عقابی نظر کا قائل ہونا ہی پڑتا ہے۔ان کے ہاتھ ہمارا کوئی اقرار نامہ آ گیا۔بس پھر کیا تھا۔وہ پوچھ گچھ کا طوفان اٹھا کہ ریڈیو کی کشتی ڈگمگا گئی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔اقرار ناموں کو تسلیم کرتے ہی بنی اور یوں اسٹاف آرٹسٹ کے عملے کی بنیاد پڑی۔

یہ حال تو آپ نے اسٹاف آرٹسٹ عملے کا سنا۔اب یہ سنئے کہ ان شاعروں کو کیا ملتا تھا، جن کا کلام ہم نشر کرتے تھے۔ صاحبو اس زمانے میں شاعر کو کچھ نہیں ملتا تھا۔ بلکہ معاملہ تو یہاں تک سادہ اور آسان تھا کہ شاعر خود اس بات کے خواہاں رہتے تھے کہ ان کا کلام کسی گویے سے گوایا جائے۔ کچھ عرصے تک تو یہ مفت راچہ گفت کا سلسلہ چلتا رہا، مگر اس کے بعد اکا دکا شاعر نے ہم سے کیفیت طلب کی کہ میرا کلام بغیر اجازت اور بغیر معاوضے کے کیوں نشر ہوا اور اصرار کیا کہ معاوضہ دلوایا جائے۔ جب ایسے خطوط کا تانتا بندھنے لگا تو ہم نے ایک ہمہ گیر قسم کا جواب لکھ کر چھپوا لیا۔ جو شاعر معاوضہ طلب کرے، اسے یہ چھپا خط بھجوا دیتے تھے۔اس خط کا مضمون یہ تھا: ''جناب عالی! آپ کا خط مؤرخہ فلاں موصول ہوا۔ازراہ کرم اندازہ لگا کر بتایئے کہ آپ کے کلام کے نشر ہو جانے سے آپ کو کیا مالی نقصان ہوا، تاکہ آپ کی شکایت پر مزید غور کیا جا سکے''۔

یہ خط پانے کے بعد شکایت کنندہ خاموش اور ہم خوش ہو جاتے تھے۔لیکن آخر کار ہمارے ضمیر نے ہم کو ملامت کرنا شروع کی۔ہم نے کہا ساری دنیا میں غریب شاعر کو کچھ نہ کچھ ریڈیو والوں سے مل جاتا ہے، دہلی ریڈیو ہی کیوں خست کرے۔ چنانچہ شاعروں کے ساتھ کنٹریکٹ کا سلسلہ جاری ہوا۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ دنیا بھری پڑی ہے۔کس کس شاعر سے کنٹریکٹ کیا جائے اور انتخاب کا معیار کیا مقرر کیا جائے۔ بہت غور وخوض کے بعد تجویز یہ قرار پائی کہ جو شاعر بھی نظر آئے، اس کے ساتھ کنٹریکٹ کر لو اور اس طویل فہرست میں سے جس کے کلام کی ضرورت ہو، نشر کیا کرو اور اس کا معاوضہ صاحب تصنیف کو دو۔ چلئے اس حساب سے کسی شاعر کو سال بھر میں دس روپے ملے، کسی کو سو اور کسی کو کچھ بھی نہیں۔اللہ بس باقی ہوس۔

کاپی رائٹ کا اصول یہ ہے کہ اگر مصنف مر بھی جائے تو بھی اس کی کتاب کے شائع ہونے کے بعد پچاس سال تک حق تصنیف اس کتاب کا قائم رہتا ہے اور مصنف کے لواحقین اس کتاب کے مالک متصور ہوتے ہیں۔ اس اصول کے رو سے حضرت داغ کا حق تصنیف ابھی قائم تھا۔اور وراثت میں یہ کلام حضرت نواب سائل کی ملکیت تھا۔ چنانچہ ہم کنٹریکٹ پر دستخط کرانے حضرت سائل کے پاس پہنچے۔وہ کنٹریکٹ ان کی خدمت میں پیش کیا، جس میں حضرت داغ کی ایک غزل کا حق نشر حاصل کرنے کے لیے آٹھ آنے کی خطیر رقم پیش کی گئی تھی۔

نواب صاحب نے اس کنٹریکٹ کو دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے۔ان کا عالم خاموشی، بلکہ سکتے کا عالم ہم کو کھائے جاتا تھا۔ بہت ڈرتے ڈرتے کہا کہ حضور اس حقیر رقم کا خیال نہ کیجئے۔سال بھر میں یہی قطرہ قطرہ دریا ہو جائے گا۔نواب صاحب ہم کو یوں دیکھنے لگے جیسے ہم پاگل ہو گئے ہیں۔ پھر فرمایا یہ سوال نہیں کہ دریا ہو جائے گا یا سمندر، یہ بتاؤ کہ تم داغ کے کلام کا معاوضہ لگانے والے کون ہوتے ہو۔ یہ فرما کر نواب صاحب نے ہم کو تشریف لے جانے کا حکم صادر فرمایا اور ہم اپنا سا منہ لے کر چلے آئے۔لیکن دل میں رہ رہ کر یہ سوال اٹھتا تھا کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ داغ کا کلام نشر نہ کیا جائے۔اور اگر بغیر کنٹریکٹ کے نشر کیا جائے تو کل کلاں کو ہزاروں لاکھوں کے دعوے ہو جائیں تو کیا ہوگا۔

آخر پھر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تمام کیفیت بیان کی اور التفات کی درخواست کی۔نواب صاحب نے ہماری معروضات کو سن کر فرمایا کہ ہمیں دو وہ اقرار نامہ اور جو کچھ ہم لکھیں اسے منظور کرو۔ ہم نے کانپتے ہاتھوں سے وہ اقرار نامہ نواب صاحب کے پیش کیا۔نواب صاحب نے آٹھ آنے کی رقم کاٹ دی۔ادھر انہوں نے آٹھ آنے کی رقم کاٹی ادھر ہماری یہ حالت کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ گمان گزرا کہ کیا معلوم سو ہزار یا لاکھ لکھ دیں۔ہم ان کا ہاتھ تھوڑا ہی پکڑ سکتے ہیں۔ کچھ دیر تامل کے بعد نواب صاحب کا قلم چلا۔ آٹھ آنے کی رقم تو کٹ ہی چکی تھی اور کٹی ہوئی رقم کے اوپر نواب صاحب نے لکھا ''مفت''۔

اس کے بعد نواب صاحب نے اس کنٹریکٹ پر اپنی بیگم صاحبہ کے دستخط کرائے اور ہم پرانے زمانے کے بزرگوں کا مقابلہ اپنے آپ سے کرتے ہوئے اور جبیں سے پسینہ پونچھتے ہوئے نواب صاحب سے رخصت ہوئے۔ ایک دن میں یوں ہی بیٹھا شعرا کے تذکرے کی کوئی کتاب دیکھ رہا تھا، اس میں حضرت داغ کی تاریخ وفات لکھی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ اس موقع پر حضرت داغ کی برسی منائی جائے اور مشاعرے کا بندوبست کیا جائے، جس میں حضرت داغ کے سب شاگرد مدعو ہوں۔

اس کے انتظام وانصرام کے لیے میں حضرت سائل کی خدمت میں حاضر ہوا۔انہوں نے میری تجویز پر صاد کیا۔اور حضرت داغ کے ان تمام شاگردوں کے نام لکھوائے جو اس وقت حیات تھے۔ان میں حضرت بیخود کا نام بھی تھا۔ یہ نام دیکھ کر میں ٹھٹھکا۔ کیونکہ حضرت بیخود ان مشاعروں میں تشریف نہیں لاتے تھے جن میں سائل آئیں۔اور حضرت سائل ان مشاعروں میں قدم رنجہ نہیں فرماتے تھے جس میں حضرت بیخود موجود ہوں۔ میں نے پوچھا بیخود صاحب تشریف لائیں گے۔ فرمایا وہ نہیں آئے گا تو مشاعرہ بھی نہیں ہوگا۔ یہ سن کر ہماری باچھیں کھل گئیں۔ہم سیدھے حضرت بیخود کے پاس پہنچے۔ساری کیفیت بیان کی۔سن کر فرمایا، دیکھا استاد کے نام کی برکت اتنے عرصے کے بچھڑے ہوئے بھائیوں کو پھر ملا دیا۔

حضرت نوح، حضرت شاعر، حضرت سیماب، حضرت جوش ملسیانی اور دیگر تمام شاگردان داغ کو دعوت نامے بھیجے گئے کہ فلاں تاریخ دہلی تشریف لایئے اور حضرت داغ کی یاد میں ریڈیو کے مشاعرے میں شرکت فرمایئے۔ یہ تمام حضرات اپنے اپنے خرچ پر دہلی تشریف لائے۔ داغ کی یاد میں مشاعرہ، حضرت سائل اور حضرت بیخود کا قرآن السعدین اور پھر تمام ہندوستان کے مانے ہوئے داغ کے شاگرد شاعر۔ وہ مشاعرہ جما کہ اس کی یاد اب تک دل سے محو نہیں ہوئی اور نہ کبھی محو ہوگی۔ یہ ریڈیو کا پہلا مشاعرہ تھا۔

مشاعرہ کے اگلے دن میں نے سوچا کہ ان حضرات کی خدمت میں کچھ نذرانہ ضرور پیش کرنا چاہیے، تاکہ کم از کم ان کے سفر کا خرچ تو پورا ہو جائے۔ یہ سوچا اور کچھ حساب لگا کر تین ہزار کا چیک حضرت سائل کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت نے چیک دیکھ کر کیفیت سنی اور چیک چاک کر ڈالا۔ شاعر اور شعر پڑھنے کا معاوضہ لے؟ یہ وہ بات ہے جو سائل صاحب کو ہم نہ سمجھا سکے اور نہ سائل صاحب سمجھ سکے۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

جمعرات/03 اپریل 2014ء
روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

برطانوی وزیراعظم بالڈون کو چٹکیاں بجانے کا مرض لاحق تھا

مجھ سے ملاقات کے دوران مسلسل یہی عمل دہراتے رہے- اس زمانے میں ہوائی جہاز کے مسافر کو بھی تولا جاتا تھا- بحری سفر کے دوران ایک خاتون بری طرح پیچھے پڑ گئیں- انگلستان میں طبقاتی فرق عروج پر نظر آیا- سوٹ سلوانے کیلئے فیلڈن سے سفارش کرانی پڑی- زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس

"حریت" کی رسم بسم اللہ دسمبر 62ء کی تیسری تاریخ کو ہوئی اور "حریت" کا یہ پہلا پرچہ بخاری صاحب قبلہ کی سرگزشت کی پہلی قسط سے مزین تھا۔ قبلہ بخاری صاحب کو سرگزشت لکھنے پر کس طرح آمادہ کیا گیا؟ اس کا احوال "آداب عرض" کے مشہور مقالہ نویس اور لائق احترام جناب نصر اللہ خان یوں بیان فرماتے ہیں کہ "جناب فخر ماتری مرحوم و مغفور اور میں کئی دن تک سر جوڑ کر بیٹھے رہے اور سوچتے رہے کہ بخاری صاحب کو "حریت" کی قلمی اعانت پر کیونکر آمادہ کیا جائے۔ سوچ بچار کے بعد میں نے صلاح دی کہ ماتری صاحب آپ بخاری صاحب کو اپنے گھر پر بلائیں اور ہوا کا رخ دیکھ کر دام پھیلائیں۔ ماتری صاحب بولے، نصر اللہ خان صاحب آپ تو شاید بخاری صاحب کو کراچی آکر جاننے لگے ہیں، میں ان کو بمبئی اور حیدرآباد سے جانتا ہوں۔ جس زمانے میں بخاری صاحب نے بمبئی میں جھنڈے گاڑ رکھے تھے، میں اس زمانے میں طالب علم تھا اور دیگر بیشمار طالب علموں کی طرح بخاری صاحب کا پرستار۔ یہ شخص نہ اس وقت کسی کی باتوں میں آیا نہ اب آئے گا۔ اس کو زیر دام لانا مشکل ہے۔ آخر تجویز یہ ٹھہری کہ نصر اللہ خان صاحب پہلے بخاری صاحب کے پاس جائیں اور زمین ہموار کرنے کی کوشش کریں۔ خان صاحب کی زبان میں خدا جانے کیا جادو تھا یا فخر ماتری کے نام میں کیا طلسم تھا کہ بخاری صاحب "حریت" میں مضمون لکھنے پر آمادہ ہو گئے۔ مگر ساتھ ہی یہ شرط لگا دی کہ موضوع کا انتخاب ماتری صاحب کریں۔ اب فیصلہ یہ ہوا کہ ماتری صاحب اور بخاری صاحب چائے پر ملیں۔ تجدید ملاقات بھی ہو اور مضامین کا موضوع بھی طے پائے۔ فخری ماتری اور بخاری صاحب ملے۔ چائے پی گئی۔ احمد آباد کی باتیں ہوئیں۔ بمبئی کا تذکرہ ہوا۔ مسلم لیگ، پاکستان، ہندوستان، ہندو، مسلمان، غرض یہ کہ سب باتوں کا تذکرہ ہوا۔ فخر صاحب اس کوشش میں کہ مضمون کا ذکر بخاری صاحب کریں اور بخاری صاحب اس سعی میں کہ ماتری صاحب قصہ کا آغاز کریں!

جب ماتری صاحب بہت تنگ آگئے تو تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر فرمایا، ارے بھائی مضمون کی بات بھی کرو گے یا نہیں۔ دونوں دوستوں کے قہقہے سے ہوٹل گونج اٹھا۔ اس کے بعد دونوں نہایت سنجیدگی سے موضوع پر غور کرنے لگے۔ جو مضمون بخاری صاحب تجویز کرتے، وہ ماتری صاحب رد کر دیتے۔ اور جو موضوع ماتری صاحب تجویز فرماتے وہ بخاری صاحب کو ناپسند ہوتا۔ آخر جب محفل برخاست ہوئی تو دونوں نے اتفاق رائے سے اس بات کو تسلیم کیا کہ دونوں کی تجاویز ناقابل تسلیم تھیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ دونوں الگ الگ سوچیں اور پھر مل کر ایک دوسرے کی تجاویز پر غور کریں۔ علیک سلیک کے بعد ماتری صاحب اپنی گاڑی میں سوار ہوئے اور بخاری صاحب قبلہ اپنی گاڑی میں۔ دونوں گاڑیاں چل پڑیں۔ اتنے میں ماتری صاحب نے اپنی گاڑی کا ہارن زور زور سے بجایا۔ بخاری صاحب نے سر موڑ کر ماتری صاحب کی گاڑی کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اشارے سے کہا کہ ٹھہر جائیے۔ ماتری صاحب بھی گاڑی سے اترے اور بخاری صاحب بھی۔ ماتری صاحب نے کہا موضوع مل گیا۔ بخاری صاحب نے کہا، کیا؟ فرمایا، اپنی سرگزشت لکھو۔ کچھ تامل کے بعد بخاری صاحب نے اس تجویز پر صاد کر دیا اور یوں یہ نادر روزگار سرگزشت شائع کرنے کا سہرا "حریت" کے سر رہا۔ یہ سرگزشت بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ اس میں دلچسپ خود کلامی کے بعد اہم حصے قارئین کی خدمت میں پیش کیے جارہے ہیں۔

ماخ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے پاؤں میں زنجیر نہیں

1937ء میں اچاریہ اور میں بی بی سی سے تربیت حاصل کرنے کے لئے انگلستان روانہ ہوئے۔ کام نے مجھے ادھ موا کر رکھا تھا۔ آرام کی اور تو کوئی صورت نہ تھی میں نے کہا جلدی کاہے کی ہے چلو سمندری جہاز سے سفر کریں۔ آرام کا آرام اور عیش کا عیش۔ اور پھر ہوائی جہاز میں سفر کرنا ان دنوں خاصا تکلیف دہ تھا۔ ولندیزی ہوائی جہاز تین دن میں اور برطانوی ہوائی جہاز پانچ دن میں ہندوستان سے انگلستان پہنچا کرتے تھے۔ اور وہ بھی یوں کہ دہلی سے کراچی آکر رات بھر دم لیا جاتا تھا۔ پھر صبح سویرے بصرہ، وہاں رات بھر قیام، وہاں سے قاہرہ، یہاں رات بھر کا قیام، قاہرہ سے روم، یہاں رات بھر کا قیام، روم سے خدا خدا کرکے لندن۔ ہر مقام پر سامان اتارنا پھر سامان چڑھانا، صبح منہ اندھیرے اٹھنا۔ ہاں اس وقت سامان ہی نہیں آدمیوں کو بھی تولا کرتے تھے۔ سامان تو اس لئے تولتے تھے کہ کوئی مقررہ وزن سے زیادہ سامان نہ لے جانے پائے لیکن نہ موٹے آدمی کا کرایہ زیادہ نہ دبلے کا کم، پھر بھی آدمیوں کو تولنے پر اصرار کرتے تھے۔ شاید یہ دیکھتے ہوں کہ سامان اور انسان ملا کر جہاز پر وزن کتنا لادا گیا ہے۔ کچھ بھی ہو تلنے کے لئے کانٹے پر جب آدمی کھڑا ہوتا تھا تو عجیب خفت سی ہوتی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے شادی بیاہ کے لئے قصائی کی دکان پر گوشت تل رہا ہے۔

کہنے کو تو ہم مساوات کے بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جہاں بھی موقع ملے ہم امیر اور غریب آدمی کے درمیان دیوار کھڑی کرتے چلے جاتے ہیں۔ ہوائی جہاز ہی کو لیجئے۔ پہلے ہوائی جہاز میں فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کی تخصیص نہ تھی۔ جہازوں میں صرف ایک ہی درجہ ہوا کرتا تھا۔ مسافر صرف چوالیس پاؤنڈ سامان مفت لے جاسکتے تھے۔ کھانا سب کو ایک ہی قسم کا ملتا تھا لیکن جب ہوائی جہازوں نے ترقی کی تو فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے درجے بنائے گئے۔ زمین سے ہزاروں فٹ بلندی پر بھی غریبوں کو غریبی اور امیروں کو امیری کا احساس دلایا گیا۔ غریبوں کی کرسیاں چھوٹی اور تکلیف دہ بنائی گئیں۔ امیروں کے لئے انتظام کیا گیا کہ جتنے چاہیں پاؤں پھیلائیں۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ یہ تفریق کسی ایک قوم نے نہیں، تمام دنیا کی قوموں نے مل کر پیدا کی ہے۔ تمام دنیا کی کمپنیوں نے مل کر یہ سازش کی کہ غریب اگر ہوائی جہاز پر سفر کرے تو اسے ہر قدم پر یہ ٹہوکا دو کہ اپنی قدر خود شناس۔

اس تفریق کا مزا تو جب آتا کہ مرد بکار سرکار سفر کر رہا ہو اور اپنی بیوی کو بھی طور پر اپنا ہم سفر بنالے۔

سرکار کی طرف سے اس بات کی اجازت نہیں کہ فرسٹ کلاس کا کرایہ لے کر کوئی سیکنڈ کلاس میں سفر کرے اور بدولت کو اتنی توفیق نہیں کہ بیوی کے لئے فرسٹ کلاس کا کرایہ بھریں۔ چنانچہ بیوی سیکنڈ میں اور میاں فرسٹ کلاس میں۔ راستے میں کبھی کبھی پردے کی اوٹ سے ایک دوسرے کو جھانک کر دیکھ لیتے ہیں ورنہ کھانا الگ، غسلخانہ الگ، اٹھنا بیٹھنا الگ غرض کہ سب کچھ الگ۔

ہاں تو اچاریہ اور میں سمندری جہاز سے انگلستان روانہ ہوئے۔ اچاریہ فیلڈن کا پرائیویٹ سیکریٹری تھا۔ پڑھا لکھا نوجوان، مدراس کا رہنے والا...... لالہ سری رام نے فیلڈن کے یہاں اس کو رکھوایا تھا۔

میں نے سرسری رام کو لالہ سری رام لکھا ہے۔ وہ اس لئے کہ اس وقت تک ان کو سر کے خطاب سے سرفراز نہیں کیا گیا تھا۔ لالہ صاحب کے سر کا خطاب پانے کے ساتھ ایک داستان وابستہ ہے جو میرے ذہن سے مٹائے نہیں مٹتی۔ لالہ صاحب دہلی کے امیر کبیر، مل کے مالک، سیاسی رہنماؤں کے میزبان، گاندھی جی پہلے پہل انہیں کے یہاں ٹھہرا کرتے تھے، بعد میں ہریجن کالونی میں قیام کرنے لگے۔ اپنے اثر و رسوخ کے باعث لالہ صاحب ریڈیو کی مشاورتی کمیٹی کے رکن بن گئے تھے۔ ایک دن ایک مسلمان لڑکے کو لائے اور فرمایا کہ اسے عارضی طور پر ریڈیو میں ملازم رکھ لو۔ اس وقت پکی ملازمت دینے سے پہلے ہم ہونہار امیدوار کو پچاس روپے ماہوار پر کچی ملازمت دیتے تھے۔ تین چار مہینے میں اس کچے ملازم کی صلاحیتوں کو پرکھتے تھے۔ اگر آدمی کینڈے کا نکلتا تو پکی ملازمت دیتے ورنہ رخصت۔

لالہ صاحب نے فرمایا کہ جس لڑکے کی میں سفارش کر رہا ہوں اس کو کچی ملازمت دے دو۔ تین چار مہینے اس کو ریڈیو میں اٹکائے رکھو۔ اس کے بعد نکال دینا۔ میں نے عرض کیا کہ لالہ صاحب وہ تو بجا لیکن ہم کچی ملازمت کے لئے بھی بی۔ اے پاس لڑکوں کو لیتے ہیں۔ اور یہ صاحب زادے تو انٹرنس پاس بھی نہیں۔ کہا وہ میں سب جانتا ہوں لیکن پھر بھی تم میری خاطر اس کو کچی ملازمت دے دو۔

ایک تو وہ لڑکا مسلمان دوسرے انٹرنس پاس بھی نہیں۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ لالہ سری رام اس شد و مد سے سفارش کیوں کر رہے ہیں۔ آخر معلوم ہوا کہ وہ برخوردار کسی ایسے انکم ٹیکس افسر کا بھتیجا بھانجا ہے جس نے ٹیکس کے معاملے میں لالہ صاحب کا ٹیٹوا دبا رکھا ہے۔

میں نے سارا واقعہ فیلڈن کو سنایا۔ وہ بہت جز بز ہوا۔ اور سیدھا سر جیمز گرگ، رکن مالیات کے پاس پہنچا۔ اس نے کہا میں تو لالہ صاحب پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا تم ولنگڈن سے اس کا ذکر کرو۔ فیلڈن بھاگا ہوا ولنگڈن کے پاس گیا اور اپنا سامنہ لے کر واپس آگیا۔

اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد نئے سال کے خطابات کا اعلان ہوا۔ سرفہرست لالہ سری رام کا نام تھا۔ سری رام صاحب، لالہ سری رام سے سرسری رام بنا دیے گئے۔

مایا تیرے تین نام پرسا، پرسو، پرس رام

اچاریہ ہندو تھا اور لالہ سری رام کا فرستادہ۔ لیکن اپنے خاندان اور اپنی تعلیم کے باعث عام ہندوؤں کی طرح متعصب نہ تھا۔ اس میں اگر کوئی خرابی تھی تو صرف یہ کہ جب تک یہاں کی بات وہاں نہ پہنچا لے اسے چین نہ آتا تھا۔

سمندری جہاز میں ایک مغربی خاتون بہت بری طرح میرے پیچھے پڑ گئیں۔ جہاں جاؤں سائے کی طرح میرے پیچھے۔ کھانے کی میز پر برابر والی کرسی ان کی تھی۔ جب خدمتگار ماحضر نامہ لاتا تو میں ان کی طرف بڑھا دیتا کہ پہلے آپ انتخاب فرمایئے کہ کیا نوش جان فرمائیں گی۔ مگر وہ اصرار کرتیں کہ پہلے تم انتخاب کرو۔ جو کچھ میں انتخاب کروں اس پر وہ اپنے لئے ایضاً کر دیتیں۔

ایک دن میں نے منہ کا مزہ بدلنے کے لئے تیز مسالے کے دیسی کھانے کی فرمائش کر دی۔ بی صاحب نے بھی میری ریس میں وہی کھانا منگوایا لیکن جب کھایا تو منہ بھک سے اڑ گیا۔ سارے جہاز میں سی سی کرتی پھریں۔ اسی جہاز سے ریکل صاحب بھی سفر کر رہے تھے۔ یہ زراعت کے ماہر تھے اور اپنی عمر کی آخری بہاریں دیکھ رہے تھے۔ بہ لحاظ ان کی بزرگی اور علم کے ہم سب ان کی عزت کرتے تھے۔ جہاز پر چہل قدمی کرتے ہوئے مل گئے فرمایا اچاریہ سے میں سارا واقعہ سن چکا ہوں۔ عورتوں کے ساتھ ایسا مذاق کرتے تمہیں شرم آنی چاہئے۔ اب میں بجز اس کے کیا کرتا کہ یقین دلاتا ہوں کہ حاشا و کلا میرا ارادہ ہرگز مذاق کرنے کا یا آزار دینے کا نہ تھا مگر میری کون سنتا ہے۔

جب بات یہاں تک پہنچی تو میں نے مناسب سمجھا کہ کم از کم اس خاتون کا دل تو اپنی طرف سے صاف کر لوں۔ چنانچہ اگلے دن جہاز کے عرشے پر ان سے بہت طویل گفتگو ہوئی۔ میری معذرت قبول ہو گئی۔ میرا حوصلہ بڑھا میں نے پوچھا آپ میرے حال پر اس قدر توجہ کیوں فرماتی ہیں۔ فرمایا ایک شخص کو میں چاہتی تھی، تمہاری شکل و صورت بالکل اس شخص سے ملتی ہے۔ میں نے کہا تو جناب وہ شخص نہایت ہی بھونڈی شکل و صورت کا ہوگا۔ فرمایا خاموش رہو وہ مر چکا ہے۔ یہ کہہ کر رونے لگیں۔

میں ان کو تسلی دے رہا تھا کہ اچانک اچاریہ آدھمکا اور زور کا قہقہہ لگا کر چلا گیا۔ چلئے یہ بازی بھی ہر گئی۔

ہم لندن پہنچے تو اچاریہ ایک ہوٹل میں چلا گیا۔ میں نے اپنے لئے فیلڈن کی وساطت سے ایک فلیٹ کا بندوبست کیا تھا۔ یہ فلیٹ پورٹ مین اسکوائر میں تھا اس میں مشہور اہل قلم آلڈس ھکسلے اور مشہور لکھ پتی کرسٹوفر ووڈ رہتے تھے۔ 1937ء کا زمانہ جنگ کی آمد کا تھا۔ آلڈس اور کرسٹوفر کی طرح اہل فکر یورپ اور انگلستان کو بجا طور پر آنے والی جنگ کا میدان سمجھتے تھے۔ ان کے دل میں یہ خیال گھر کر چکا تھا کہ امریکہ اس جنگ میں غیر جانبدار رہے گا۔ چنانچہ ایسے کئی لوگ جن سے میری جان پہچان تھی امریکہ کا ٹکٹ کٹوا رہے تھے۔ آلڈس اور کرسٹوفر تو دوستی کی بنا پر جاتے وقت اپنا فلیٹ مجھے دے گئے تھے مگر لوگوں نے یہ سمجھا کہ جو شخص آلڈس ھکسلے اور کرسٹوفر ووڈ کے فلیٹ میں آیا ہے، ضرور کوئی بڑا آدمی ہے۔ یہاں حیثیت یہ کہ میں ہزار ایک روپے ماہوار کا اسٹیشن ڈائریکٹر تھا اور بس۔ گلے پڑا ڈھول بجانا ہی پڑتا ہے۔ چنانچہ پورٹ مین اسکوائر کے اسی فلیٹ سے میری ملمع کی زندگی کا آغاز ہوا۔

میں کپڑوں کے معاملے میں ہمیشہ سے ایک خاص وضع کا پابند ہوں۔ نہ تو ایسی پتلون پہنتا ہوں جسے دیکھ کر معلوم ہو کہ پہننے کے بعد اس پر استری کرائی گئی ہو۔ اور نہ ایسا کوٹ پہنتا ہوں کہ معلوم ہو کہ ہینگر سمیت پہن لیا ہے۔

آلڈس ھکسلے نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "زندگی آرٹ کی پیروی کرتی ہے۔ اس لئے لازم آیا کہ آرٹ اعلیٰ قسم کا ہو اگر آرٹ برا ہوگا تو زندگی بھی اس کی پیروی میں بری ہو جائے گی۔"

یہی بات علامہ اقبال نے بھی کہی ہے۔ فرماتے ہیں:

غزل آں گو کہ فطرت ساز خود را پردہ گرداند
چہ آید زاں غزل خوانی کہ با فطرت ہم آہنگ است

آرٹ وہ ہے کہ اس کی پیروی میں فطرت اپنے آپ کو بدل ڈالے۔ وہ کیا آرٹ جو فطرت کی نقالی کرتا چلا جائے۔

اس موضوع پر اوسکر وائلڈ اور علامہ کے خیالات میں بے حد مطابقت پائی جاتی ہے اوسکر وائلڈ کا قول ہے کہ فطرت (نیچر) آرٹ کی پیروی کرتی ہے۔ اگر کسی فلم ایکٹر نے ہماری آنکھیں خیرہ کر رکھی ہیں تو ہم اس کے درزی کے یہاں شیروانی سلوانے جائیں گے۔ اور اگر فوق البھڑک لباس سے وحشت ہوتی ہے تو اس کی وضع سے اجتناب کریں گے، نہ ویسے بال رکھیں گے نہ ویسے کپڑے پہنیں گے۔

میرے نزدیک انسان کی وضع قطع میں اس کے درزی اور اس کے حجام کا بہت ہاتھ ہوتا ہے۔ اگر حجام کے گاہک باوضع لوگ ہیں تو ہمارے بال اس انداز سے کاٹے گا کہ معلوم ہو کہ بالوں کے نیچے بھی کچھ ہے۔ ورنہ ہم کسی فلمی کمار کی طرح ماتھے پر لٹ لٹکائے بازاروں میں پھرتے رہیں گے اور ہم پر ادھر ادھر سے دل پھینکنے والے یوں دل پھینکیں گے جس طرح کسی دیوانے پر پتھر برس رہے ہوں۔

آج کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہوں مگر کیا کروں۔ منہ آئی بات تو کبھی کبھی مجھ ایسا ڈرپوک انسان بھی کہہ ہی دیتا ہے۔

درزیوں کے یہاں عام طور پر ایسی کتابیں ہوتی ہیں جن میں نہایت چھچھورے قسم کے انسان مختلف وضع کے لباس پہنے دکھائی دیتے ہیں۔ درزی یہ کتاب ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے اور کہتا ہے پسند کرو، کس قطع اور کس وضع کا لباس تم کو پسند ہے۔ چلئے کتاب کے ورق کھلے اور ہمارا دماغ بند۔ ہم نے اس بیہودہ کتاب میں سے سوٹ پسند کر لیا اور فرمایا کہ ایسا بنا دو۔ ہم کو کیا معلوم کہ تصویر میں جس شخص نے وہ سوٹ پہن رکھا ہے وہ کس قماش کا ہے، بدمعاشوں کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے یا شریفوں کے گروہ سے۔ ہم کو تو انگریزی لباس پہننا ہے ہمارے لئے تو یہی کافی ہے کہ وہ تصویر کسی انگریز کی ہے اور ہم انگریزی وضع کا سوٹ پہننا چاہتے ہیں۔

لباس کے معاملے میں ہم سب نقال ہیں۔ خود لباس وضع نہیں کرتے۔ کسی نہ کسی کی نقل کرتے ہیں اور اکثر بھول جاتے ہیں کہ نقل کے لئے بھی عقل چاہئے۔

اگر ہم کو خدا نے عقل دی ہے تو ہم کسی اچھے آدمی کی نقل کریں گے اور اگر ہم عقل سے عاری اور ہر چمکتی ہوئی شے کو سونا سمجھنے کے عادی ہیں تو کسی ان پڑھ ان گھڑ فلمی کمار کی تصویر سامنے رکھ کر اپنی صورت بگاڑ لیتے ہیں۔

نقل میں معاملہ صرف شکل و صورت اور وضع تک محدود نہیں رہتا۔ اس کا اثر دماغ اور کردار پر بھی پڑتا ہے۔

میری عمر کے انسان جوانی اور نوجوانی میں جب کبھی عشق فرماتے تھے تو ان کے سامنے عشق کرنے کے لئے مجنوں اور فرہاد جیسے عشاق کے نمونے موجود تھے چنانچہ جب ہم کو جوانی کے زمانے میں عشق کا آزار ہوا تو ہم نے بال پریشان کر لئے، خط بڑھا لیا، گریبان چاک کر لیا، بھوکے رہنے لگے، رات کو آہیں بھریں اور دن کو کوئے جاناں کے چکر کاٹے، خط لکھا کہ ہم زہر کھا لیں گے۔ ادھر سے جواب آیا کہ خبردار اگر ایسی حرکت کی تو ہم قیامت کے دن بھی تم کو دیدار سے محروم کر دیں گے۔ ہم نے جو جواب میں خط لکھا اس کے اوپر تحریر فرمایا کہ......

کس سے محرومی قسمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

پھر لکھا کہ آہ......

میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

اور آخر میں لکھا...... اف

سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے

برخلاف اس کے کہ آج کل کا نوجوان عشق کے دوران میں گریبان نہیں پھاڑتا بلکہ اس پر ایک نہایت ہی بھڑکیلی نک ٹائی باندھتا ہے۔ بال پریشان نہیں کرتا بلکہ طرح طرح کے تیلوں سے ان کی پرورش کرتا ہے۔ خط نہیں بڑھاتا بلکہ گالوں پر گھوٹ گھوٹ کر استرا پھیرتا ہے۔ کوئے جاناں کے چکر نہیں کاٹتا بلکہ کافی ہاؤس میں جاکے بیٹھتا ہے۔ خط نہیں لکھتا بلکہ ٹیلیفون فرماتا ہے۔ غالب کے شعر نہیں پڑھتا، فلمی گانے گاتا ہے۔

اس میں نہ ہمارا کمال تھا نہ اس غریب کا قصور ہے۔ ہمارے زمانے میں آرٹ مجنوں اور فرہاد اور غالب تھا آج کل فلمی کمار اور شکیل بدایونی۔

میں جب پہلی مرتبہ انگلستان گیا تو یہ تہیہ کرکے گیا کہ جس طرح اپنے ملک کا لباس پہنتے وقت دیکھ لیتا ہوں کہ کس قماش کے لوگوں کا لباس ہے اسی طرح وہاں بھی دیکھوں گا کہ کس قماش کے انگریزوں کا لباس اختیار کرنا مناسب ہوگا۔

لباس کے معاملے میں مجھے صرف تین انگریز پسند تھے۔ ایک تو ڈیوک آف ونڈسر، دوسرے انتھونی ایڈن اور تیسرے لائینل فیلڈن۔ میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ تینوں ایک ہی درزی سے کپڑے سلواتے ہیں۔ میں اسی درزی کے یہاں پہنچا۔ بہت بڑی دکان مگر چھوٹا سا دروازہ اور اس پر چھوٹا سا بورڈ۔ اندر گیا سوٹوں کے لئے کپڑا پسند کیا اور چند سوٹوں کا آرڈر دیا۔ آرڈر دے چکا تو پتہ چلا کہ ایسی دکانوں پر گاہک براہ راست نہیں جایا کرتے، ہمیشہ کسی پرانے گاہک کی وساطت سے جایا کرتے ہیں۔ چنانچہ فیلڈن کو خط لکھا۔ اس نے تعارفی تار بھیجا۔ جب جا کر کہیں اس درزی کے گوشوارے کی خانہ پری ہوئی۔

انگلستان جا کر یہ بھی معلوم ہوا کہ جن لوگوں میں شامل ہونا چاہتا ہوں وہ نہ قمیض سلی سلائی پہنتے ہیں نہ بوٹ بنا بنایا۔ چنانچہ قمیض جرمن اسٹریٹ سے اور جوتے ڈور اسٹریٹ سے بنوائے۔ نک ٹائیاں، رومال اور بنیان بانڈ اسٹریٹ سے خریدے۔ اور بال بنوانے کے لئے اس دکان کا پتہ دریافت کیا جہاں جغادری قسم کے لوگ جایا کرتے تھے۔ یہاں عجیب منظر دیکھا۔ طاق پر بہت سی بوتلیں قطار میں رکھی ہیں۔ ہر ایک پر کسی نہ کسی مشہور آدمی کا نام لکھا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ہر ایک شخص کے بالوں کے لئے تیل اس کی پسند اور اس کے بالوں کی ساخت کے مطابق تیار کیا جاتا ہے۔ ہر شخص اپنا اپنا تیل استعمال کرتا ہے۔ یہی حال تمباکو فروش ڈن ہل کے یہاں دیکھا۔ وہاں ہر بڑے گاہک کے پائپ کا تمباکو الگ سے بنتا ہے۔ ہر گاہک کا ایک نمبر ہوتا ہے۔ آپ جا کر اپنے نمبر کا تمباکو مانگئے اور وہ خاص تمباکو آپ کے سامنے تیار کر کے اور مل دل کے آپ کو دے دیا جاتا ہے۔

جب میرے نئے کپڑے سل کر آئے تو میں نے ان لوگوں سے ملنا شروع کیا جن سے غائبانہ تعارف تھا یا جن کے نام تعارف نامے لے کر آیا تھا۔ جس کے یہاں ملنے کے لئے جاتا وہ مجھے کھانے کی دعوت ضرور دیتا۔ یہ دعوت اکثر ہوٹلوں میں ہوتی تھی۔ ان دعوتوں میں شریک ہوا تو مجھے پتہ چلا کہ کون سا ہوٹل کس درجے کے لوگوں کا ہے۔ توبہ! ایسی تفریق دیکھی کہ سان گمان میں بھی نہ تھی۔

ریجنٹ اسٹریٹ کے کیفے رائل میں لنچ کے وقت اہل قلم کھانا کھاتے تھے۔ یہیں میری ملاقات ایچ۔ جی۔ ویلز سے ہوئی، یہیں آگسٹس جان سے ملا، یہیں ڈراتھی ویلزلے اور ڈبلیو۔ بی ییٹس سے مڈبھیڑ ہوئی۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ مجھ سے بے حد خلوص سے پیش آئے۔ ڈراتھی ویلزلے نے مجھے اپنے یہاں دو دن مہمان رکھا۔ ییٹس بھی وہیں ٹھہرا ہوا تھا۔ رات کے دو دو تین تین بجے تک اس مشہور و معروف شاعر سے باتیں ہوئیں۔ وہ، سروجنی نائیڈو اور ٹیگور ایک ہی انداز میں شعر پڑھا کرتے تھے۔ اور وہ یوں کہ شعر کی بحر واضح ہوتی رہے اور آواز میں لہک پیدا ہو جائے۔ آج کل جس انداز میں شعر پڑھا جاتا ہے اس کی ذمہ داری مجھ پر بھی عائد ہوتی ہے۔ یہ انداز ان کو بالکل پسند نہیں تھا۔ اس انداز کے متعلق ان کا ارشاد تھا کہ یہ یا تو معمولی نثر ہے یا ڈرامہ کی نثر۔ شعر نہیں۔ شعر تو یوں پڑھنا چاہئے۔

سب کہاں کچھ -- لالہ و گل -- میں نمایاں -- ہو گئیں
خاک میں کیا -- صورتیں ہوں -- گی کہ پنہاں -- ہو گئیں

ییٹس تو اس معاملہ میں بہت مبالغہ کرتے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ تمہارے یہاں ڈھول اور طبلے کا بہت رواج ہے۔ تم کو لازم ہے کہ شعر پڑھتے وقت شعر کے رکنوں کے مطابق ڈھول پیٹا کرو تا کہ بحر واضح اور بحر کا کیف طاری ہو۔

لارڈ ولنگڈن کو اس وقت ریٹائر ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا جب وائسرائے تھے تو میرے حال پر بڑی توجہ کیا کرتے تھے۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ ان سے بھی جا کر ملاقات کروں۔ وکٹوریہ اسٹیشن کے پاس ایکلسٹن پلیس امرا کا ایک محلہ ہے اس میں رہتے تھے۔ میں ان کے مکان کے دروازے پر گیا۔ گھنٹی بجائی ایک ملازم آیا اور کہا کہ اوپر لارڈ ولنگڈن تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ چھوٹا سا مکان تھا اوپر گیا تو دو تین دروازے نظر آئے۔ کچھ پتہ نہ چلا کہ کون سے دروازے پر دستک دوں تیر ایک دروازے پر دستک دی اور اندر چلا گیا۔ ایک عورت ایپرن باندھے ہوئے جھاڑ پونچھ کر رہی تھی۔ غور سے دیکھا تو لیڈی ولنگڈن!! وائسریگل لاج میں رہنے والی لیڈی ولنگڈن کروڑوں انسانوں پر حکومت کرنے والی لیڈی ولنگڈن، سیکڑوں ملازم رکھنے والی لیڈی ولنگڈن۔

مجھے دیکھا تو بہت تپاک سے ملیں اور کہا کہ میرے میاں ساتھ کے کمرے میں ہیں۔ تم ان کے پاس جاؤ میں جھاڑ پونچھ کر کے ابھی آتی ہوں پھر کہا ارے ہاں میرا باغ تو دیکھتے جاؤ۔ یہ کہہ کر مجھے کھڑکی کے پاس لے گئیں۔ نیچے جھانک کر دیکھا تو تیس پینتیس فٹ کا ایک قطعہ زمین جس پر گھاس اگی ہوئی تھی اور اس کے کنارے کنارے پھولوں کی چند کیاریاں تھیں مجھے وائسریگل لاج کا وسیع باغ اور گلاب کے پھولوں کا وہ عریض تختہ یاد آیا جسے لیڈی صاحبہ مغل گارڈن کہا کرتی تھیں اور بعد میں یہی اس کا نام پڑ گیا تھا۔

لارڈ ولنگڈن سے ملا۔ ہندوستان کی سیاست پر دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ پھر انگلستان کی باری آئی۔ مجھ سے پوچھا بالڈون وزیر اعظم سے ملے۔ میں نے کہا جی ہاں۔ فرمایا کیا خیال ہے تمہارا ان کے متعلق۔ میں نے کہا صاحب اگر جلدی ریٹائر نہ ہوا تو پاگل ہو جائے گا۔ کہا کیوں؟ میں نے کہا صاحب کوئی بیس پچیس منٹ مجھ سے باتیں کیں اور ان دوران میں دونوں ہاتھوں سے متواتر چٹکیاں بجاتے رہے۔ کبھی ہاتھ میرے قریب لا کر چٹکی بجاتے، کبھی اپنے منہ کے قریب، کبھی میرے کان کے قریب، کبھی اپنے کان کے قریب، کبھی باری باری دونوں ہاتھوں سے چٹکیاں بجائے، کبھی دونوں ہاتھوں سے۔ ولنگڈن کی ہنسی کی آواز سن کر لیڈی ولنگڈن دوڑی آئیں۔ ان کے آتے ہی ولنگڈن نے کھڑے ہو کر چٹکیاں بجانا شروع کر دیں۔ لیڈی ولنگڈن ہنسیں اور فرمایا معلوم ہوتا ہے یہ بھی بالڈون سے مل آیا ہے۔

باتوں باتوں میں لارڈ ولنگڈن نے پوچھا یہاں کا کون آدمی تم کو پسند آیا۔ میں نے کہا لیڈی آکسفورڈ، جان ریتھ اور بی ییٹس۔ فرمایا، ییٹس تو بجا۔ لیکن سر جان ریتھ تم کو کیوں پسند آیا۔ میں نے کہا صاحب بہت بڑا آدمی ہے۔ فرمایا کیوں؟ میں نے کہا صاحب بی بی سی کا بانی ہے اس سے زیادہ اس کی عظمت کا اور کیا ثبوت چاہیے۔ فرمایا ہاں یہ درست ہے لیکن اب یہ کچھ نہیں کر سکے گا۔ میں نے کہا کیوں؟ کہا جان ریتھ بی بی سی کا بانی سہی مگر اس کی جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو بی بی سی بن کر رہتی۔ اگر جان ریتھ بڑا آدمی ہے تو دیکھیں ریٹائر ہونے کے بعد کیا تیر مارتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سر جان ریتھ (لارڈ ریتھ) بی بی سی سے ریٹائر ہو کر کوئی تیر نہ مار سکا۔

مجھے آج تک لارڈ ولنگڈن کی بات یاد ہے اور کیا معلوم کب تک یاد رہے گی۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

بی بی سی کی بنیاد دیو پیکر سر جان ریتھ نے رکھی تھی

انگلستان کی 5 کروڑ آبادی میں سے ایک کروڑ 45 لاکھ افراد کے پاس ریڈیو اور ٹیلی ویژن سیٹ تھے-10 کروڑ پاکستانیوں میں صرف 3 لاکھ کے پاس ریڈیو سیٹ تھے-1937ء میں برصغیر میں ریڈیو سیٹس کی تعداد صرف ایک لاکھ تھی-جارج ششم کی تقریب تاج پوشی سے برطانوی شہریوں نے خوب پیسے کمائے-زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



بستر بند کو انگریزی داں لوگ ہولڈال کہتے ہیں۔ ہولڈال کا لفظی ترجمہ ہے وہ چیز جو سب چیزوں کو سمیٹ لے۔ چنانچہ ہولڈال میں یعنی بستر بند میں گدے، تکئے اور لحاف کے علاوہ جوتے اور میلے کپڑے بھی ہوتے ہیں۔ چونکہ ریل والے بستر تولتے نہیں، اس لئے کبھی کبھی اس ہولڈال میں مسالہ پینے کی سل بھی رکھ لی جاتی ہے۔

ہماری زبان میں ہولڈال کے قبیل کا ایک اور جامع لفظ بھی شامل ہو گیا ہے۔ یہ لفظ ہے ٹیکنیکل ٹریننگ۔ جسے دیکھئے سمندر پار کے کسی ملک میں جا کر ٹیکنیکل ٹریننگ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ لفظ کچھ ایسا بستر بند قسم کا لفظ ہے کہ اس کی لپیٹ میں سب کچھ آتا ہے۔

میں بھی کچھ اسی ہولڈال قسم کی ٹریننگ حاصل کرنے بی بی سی گیا تھا۔ وہاں پہنچا تو سمجھ میں نہ آیا کہ جو کچھ دیکھ رہا ہوں یا جو کچھ اخذ کر رہا ہوں، اپنے وطن میں ان کو استعمال کیوں کر کروں گا۔

بی بی سی کے صدر دفتر کو لندن میں دیکھا تو انسانوں کا ایک جنگل پایا۔ ہر طرف عورتیں ہر طرف مرد، لفٹ ہو کہ ڈیوڑھی کا ہال، ہر جگہ انسانوں کا وہ ہجوم کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔

اس زمانے میں بی بی سی کے ڈائریکٹر جنرل سر جان ریتھ تھے۔ قد چھ فٹ پانچ انچ، سینہ 45 انچ، چہرہ بھاری اور بڑا۔ بھنویں گھنی، ایک اوپر کو اٹھی ہوئی ایک نیچے کو جھکی ہوئی۔ جس طرف کی بھوں اٹھی ہوئی اس طرف کے گال پر ہلال کی شکل کا ایک پرانے زخم کا نشان۔ چال ایسی جیسے زمین کو ٹھوکریں مار رہے ہوں۔ خاموش ہوں تو یوں جیسے گھٹا برسنے کو تلی کھڑی ہے۔ بولیں تو یوں جیسے مہاوٹ کے بادل گرج رہے ہیں۔

ان کے دفتر میں فرش کا کچھ حصہ باقی حصے سے کوئی 3 انچ اونچا تھا۔ مگر اس صفائی سے بنایا گیا تھا کہ اونچا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس اونچی جگہ پر ان کی میز لگی ہوئی تھی۔ جب وہ میز کے آگے کرسی ڈال کر بیٹھتے تو ان کا قد 6 فٹ پانچ انچ نہیں، بلکہ 6 فٹ 8 انچ نظر آتا تھا۔ میز سے دور مغرب کی طرف دیوار کے ساتھ انہوں نے ایک صوفہ ڈلوا رکھا تھا۔ یہ صوفہ مشکل سے فٹ بھر اونچا ہوگا۔ اس پر موٹے موٹے پھولے پھولے گدے پڑے رہتے تھے۔ جب مہمان ان پر بیٹھتا تھا تو یہ پھولے پھولے گدے ایسے دب جاتے تھے کہ مہمان ان میں ڈوب جاتا اور اپنے آپ کو اس کمرے کے ماحول میں بونا سمجھنے لگتا تھا۔

اس دیو پیکر انسان سر جان ریتھ نے بی بی سی کی بنیاد ڈالی تھی اور ایسی مستحکم بنیاد ڈالی تھی کہ بی بی سی کو کوئی سیاسی سماجی یا اقتصادی زلزلہ ہلا نہ سکا۔ حکومتیں بدل گئیں، اقتصادی بحران آئے، بادشاہ مر گئے، بادشاہ تخت سے دست بردار ہو گئے، ملک پر ہٹلر کے گولوں کی برسات ہوئی، مگر بی بی سی کا ہاتھی جھومتا جھامتا آگے ہی بڑھتا رہا۔

کہنے والے یہ کہہ گئے ہیں کہ مرا ہاتھی لاکھ کا، مگر بی بی سی کا زندہ ہاتھی لاکھ کا تو کیا اربوں کا ہے۔ ذرا اس کی کیفیت سنئے اور اندازہ لگایئے کہ اپنے حال کا مقابلہ بی بی سی سے کر کے میں نے کتنی آہیں بھری ہوں گی۔

انگلستان کی کل آبادی 5 کروڑ۔ ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے لائسنس ملا کر ایک کروڑ 54 لاکھ۔ یعنی ہر چار آدمیوں میں سے ایک آدمی کے پاس ٹیلی ویژن اور ریڈیو سیٹ۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر سالانہ خرچ دو کروڑ 80 لاکھ پاؤنڈ یعنی 2 ارب 91 کروڑ روپے۔ ٹیلی ویژن کا خرچ 4 ہزار پاؤنڈ فی گھنٹہ، یعنی 45 ہزار روپے فی گھنٹہ۔ ریڈیو کا خرچ 56 پاؤنڈ یعنی ساڑھے سات ہزار روپے فی گھنٹہ۔ لگے ہاتھوں یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ پاکستان میں ہمارے ریڈیو کا کیا حال ہے۔ ریڈیو پاکستان پر ہمارا سالانہ خرچ ڈیڑھ کروڑ، ملکی آبادی 10 کروڑ، سننے والوں کی تعداد 3 لاکھ، یعنی ساڑھے تین سو لوگوں میں سے ایک کے پاس ریڈیو سیٹ۔

بی بی سی کا خرچ ہم سے کئی سو گنا زیادہ ہے، لیکن پھر بھی ان کے سننے والوں کی تعداد اتنی ہے کہ اگر خرچ کو تمام سننے والوں پر پھیلا دیا جائے تو جواب یہ آئے گا کہ بی بی سی ہر سننے والے کے لیے سال میں 24 روپے خرچ کرتی ہے۔ اس لئے مقابلہ میں ہمارے سننے والوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ ہمیں ہر سننے والوں کے لئے سال میں 55 روپے خرچ کرنے پڑتے ہیں اور ملتے ہیں ہم کو کل دس روپے۔ اور وہ بھی قسمت سے۔

1937ء میں برصغیر میں ریڈیو سیٹ صرف ایک لاکھ تھے۔ باقی دنیا کی حالت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اس وقت صرف قاہرہ کے شہر میں ایک لاکھ سے زیادہ ریڈیو سیٹ تھے۔

جب کبھی مجھ سے انگلستان میں کوئی سوال کرتا کہ برصغیر میں کتنوں کے پاس ریڈیو لائسنس ہے، تو مجھے جواب دیتے وقت بڑی شرمندگی ہوتی۔ اس شرمندگی سے بچنے کے لئے میں نے بہت سوچ بچار کے بعد دل کو یوں تسلی دی کہ اگر تمام برصغیر میں صرف ایک لاکھ ریڈیو سیٹ ہیں تو کیا ہوا۔ ٹیلیفون بھی تو چالیس کروڑ کی آبادی میں ایک لاکھ ہیں اور موٹر کاریں بھی ایک لاکھ ہیں۔ یہاں ضمناً یہ بات عرض کر دوں کہ اس وقت تمام برصغیر میں ایک لاکھ موٹر گاڑیاں تھیں اور اب صرف پاکستان میں ڈیڑھ لاکھ ہیں۔ اس پر بھی اگر کوئی پچھلی بہاروں کو یاد کرتا ہے تو کرنے دیجئے۔ شاید پچھلی بہاروں کو یاد کرنا اس غریب کی صحت کے لئے مفید ہو۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اب میرا حال سنئے۔ انگلستان میں ہر وقت یہ سوال میرے دل میں اٹھتا تھا کہ ہمارے یہاں ریڈیو پنپتا کیوں نہیں؟ انگلستان میں کیوں پنپ رہا ہے؟ بہت سوچا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ انگلستان میں ریڈیو کی ترقی کا باعث یہ ہے کہ یہاں ریڈیو کا انتظام و انصرام ایک کارپوریشن کے ہاتھ میں ہے۔ اگر برصغیر میں بھی ریڈیو کا محکمہ سرکاری محکمہ نہ رہے، بلکہ ایک کارپوریشن کے ہاتھ میں آجائے تو یقیناً ترقی کرے گا۔ اس خیال کا آنا تھا کہ میں نے ایک لمبا چوڑا مضمون اس موضوع پر لکھا۔ فیلڈن ان دنوں انگلستان آ گیا تھا۔ میں نے یہ مضمون اس کو دکھایا۔ اس نے موضوع کو پسند کیا، لیکن طرز تحریر اس کی آنکھ میں نہ جچی۔ اس نے خود اس موضوع پر ایک طویل مضمون لکھ کر لندن ٹائمز میں چھپوا دیا۔ یہ مضمون دو قسطوں میں بطور اداریہ کے چھپا۔ جافرے ڈاسن ان دنوں ٹائمز کے ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے اس مضمون کو بہت سراہا اور بہت اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔

لندن ٹائمز میں سرکار کی کسی حکمت عملی کے خلاف اداریہ چھپے اور سرکاری حلقوں میں تہلکہ نہ مچے، یہ کیسے ممکن ہے۔ چنانچہ پکڑ دھکڑ شروع ہوئی۔ فیلڈن کو تو کوئی کچھ کہہ نہ سکا، الا بلا بہ گردن ملا، سرکار نے میری گدی ناپی۔ کیفیت پر کیفیت طلب ہونے لگی۔ سرکار کا خط اور اپنا جواب، ہمیشہ جافرے ڈاسن کو دکھا دیتا۔ سرکار کا جناتی زبان میں لکھا ہوا خط جس کے ہر لفظ سے رعب اور غرور ٹپکتا تھا، ہمارے لئے اچھا خاصا سامان تفریح مہیا کرتا تھا۔ میرے جوابات میں اچھے برے دلائل کی بھرمار کے ساتھ ساتھ نمک مرچ بھی کافی ہوتا تھا، جس کے باعث سرکار کے غصہ کا پارہ چڑھتا گیا اور میرے لئے طرح طرح کی سزائیں تجویز ہونے لگیں۔

اس مضمون کے چھپ جانے سے مجھے سرکار کی طرف سے جو گزند پہنچا سو پہنچا، مگر ایک فائدہ ضرور ہوا اور وہ یہ کہ اس مضمون کے بعد برصغیر میں ریڈیو کی سست رفتاری کا الزام ملک کے رہنے والوں کے کندھوں سے اتر کر سرکار کے کندھوں پر لد گیا اور ہم لندن میں سر اٹھا کر چلنے پھرنے لگے۔

میں نے لندن کا سفر ان دنوں اختیار کیا تھا، جب بادشاہ جارج ششم کی تاج پوشی ہو رہی تھی۔ ہر طرف گہما گہمی، ہر طرف رنگ و رونق، ہر طرف جھنڈے اور بیرقیں، ہر طرف خوشیوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر۔

اس گرجے میں جہاں تاج پوشی کی رسم ادا ہوئی تھی کوئی 26 مائیکروفون لگے تھے۔ بادشاہ کے دائیں بائیں، آگے پیچھے ہر جگہ مائیکروفون۔ 6 گھنٹے کی لمبی تقریب۔ سننے میں آیا ہے کہ ایسے موقعوں پر ڈاکٹر لوگ ایسی ترکیب کرتے ہیں کہ بادشاہ سلامت یا دیگر حاضرات و حضرات کو اس طویل عرصے کے دوران میں بول و براز کی حاجت نہ ہو۔

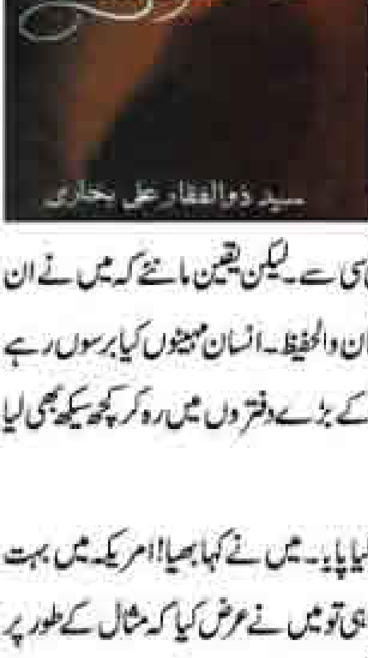
میں نے اپنی ڈیوٹی گرجے کے باہر لگوا رکھی تھی، تا کہ جلوس کا طمطراق دل کھول کر دیکھوں۔ جلوس گرجے سے نکل کر شہر کے مختلف بازاروں میں گشت کرنے لگا۔ دائیں بائیں مکان کے مالکوں نے اپنے چھجے اور اپنے بالا خانے تماشائیوں کے لئے وقف کر دیئے اور خوب پیسے کمائے۔ ایک نشست کے دام کم سے کم پانچ پاؤنڈ۔ چلئے بادشاہ کا دیدار دھڑا دھڑ بکنے لگا۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

ہفتہ/05 اپریل 2014ء
روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

"غیر ملکی اداروں کے صدر دفتر میں رہ کر کچھ نہیں سیکھ سکا"

اگر ہم وہاں گئے جہاں کام عروج پر پہنچ چکا ہے تو عش عش کرتے یا آہیں بھرتے لوٹیں گے۔ بی بی سی کے مضافاتی دفاتر میں تربیت ملی کہ کام چھوٹے پیمانے پر کیسے چلتا ہے۔ دہلی لوٹا تو برطانوی سرکار کی خفگی کا سامنا کرنا پڑا۔ فیلڈن کے اصرار پر بمبئی ٹرانسفر کیلئے ہامی بھرلی۔ زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



میں ایک مرتبہ وزارت خارجہ کے سیکریٹری اکرام اللہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بہت برہم بیٹھے تھے۔ میں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا "پاکستان کے لوگ بھی عجیب ہیں۔ خدا جانے ان کو اپنے ملک میں رہنا کیوں کھلتا ہے۔ جسے دیکھو خط بھیج رہا ہے کہ ہمیں کہیں باہر بھجوا دو"۔ اس بات کو کئی برس ہو چکے ہیں، لیکن آج بھی وہی حالت ہے۔ جسے دیکھو باہر کے ملک جانے کے لیے بے چین ہے۔ باہر جانے کا اور کوئی بہانہ نہ سوجھے تو ٹیکنیکل ٹریننگ کا بہانہ بنا رکھا ہے۔ چاہے اپنے ملک میں رہ کر گاڑی کے پہیے میں پنچر بھی لگانا نہ سیکھا ہو، لیکن پھر بھی باہر جا کر ٹیکنیکل ٹریننگ حاصل کرنے کی دھن سر پر سوار رہتی ہے۔

میں بھی باہر کے ملکوں میں جا کر ٹیکنیکل ٹریننگ حاصل کرنے کا گنہگار ہوں۔ میں نے بھی امریکہ میں فلم سازی اور انگلستان میں ریڈیو بازی کی تعلیم حاصل کی۔ امریکہ میں "ایم جی ایم" سے واسطہ رہا اور انگلستان میں بی بی سی سے۔ لیکن یقین مانیے کہ میں نے ان اداروں کے صدر دفتر میں رہ کر کچھ بھی نہ سیکھا۔ ایک تو یہ ادارے خود بہت بڑے اور پھر ان کے صدر دفتر، الامان والحفیظ۔ انسان مہینوں کیا برسوں رہے پھر بھی معلوم نہ ہو سکے کہ یہاں کون کیا کرتا ہے۔ یہاں رہ کر انسان کرے تو کیا کرے۔ اور اگر ان امیر ملکوں کے بڑے دفتروں میں رہ کر کچھ سیکھ بھی لیا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اپنے چھوٹے اور غریب ملک میں آ کر اس سے استفادہ کیوں کر کیا جائے۔

مجھ سے ایک دفعہ امریکہ کے ایک صحافی نے پوچھا کہ تم نے امریکہ میں اور اپنے ملک میں سب سے بڑا فرق کیا پایا۔ میں نے کہا بھیا! امریکہ میں بہت سی چیزیں ڈھانے کو جی چاہتا ہے اور اپنے یہاں بہت سی چیزیں بنانے کو دل تڑپتا ہے۔ اس نے وضاحت چاہی تو میں نے عرض کیا کہ مثال کے طور پر تم اپنے یہاں کے فلم کو دیکھو۔ ریڈیو کو دیکھو۔ ٹیلی ویژن کو دیکھو۔ یہ سب چیزیں اتنی ترقی کر گئی ہیں کہ اب ترقی کی مزید گنجائش نظر نہیں آتی اور بسا اوقات تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بہت کچھ ضرورت سے زیادہ ہے، اس لئے ڈھا دینا چاہئے۔ اس کے برخلاف ہمارے ملک میں ابھی اکثر چیزوں کی ابتدا ہے۔ ابھی یوں سمجھو کہ عمارت کی نیو پڑی ہے۔ دیوار کا پہلا ردا رکھا گیا ہے۔ اس دیوار کو ثریا تک پہنچانا ہے۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ بنیاد کا پتھر ٹیڑھا نہ پڑے، ورنہ ساری دیوار ٹیڑھی اٹھے گی۔

اس واقعہ کے عرض کرنے سے میری مراد یہ ہے کہ میری دانست میں ہمیں باہر کے ملکوں میں وہاں جانا چاہئے جہاں ہم یہ سیکھ سکیں کہ کام کی ابتدا کیوں کر کرنی چاہئے۔ اگر ہم وہاں گئے جہاں کام اپنی انتہا تک پہنچ چکا ہے تو ظاہر ہے کہ عش عش کرتے یا آہیں بھرتے واپس آ جائیں گے اور بس۔ میں نے بی بی سی کے مضافاتی دفاتر میں زیادہ وقت گزارا اور وہاں رہ کر یہ سیکھا کہ کام چھوٹے پیمانے پر کیوں کر چلتا ہے۔ کسی عمارت کی بنیاد کیوں کر ڈالی جاتی ہے۔ باقی رہی عمارت تو اس کا کیا ہے، عمارت تو رہتی دنیا تک بنتی ہی چلی جاتی ہے۔ میں نے انگلستان کی ٹریننگ سے کچھ حاصل کیا یا نہیں، البتہ ایک کام ایسا ضرور کیا جو تقریباً ہر ٹریننگ پر جانے والا کرتا ہے۔ یعنی یہ کہ ایک موٹر کار خرید لی۔ یہ میری پہلی نئی گاڑی تھی۔ اس کے بعد آج تک 27 برس ہونے کو آئے نئی گاڑی خریدنے کی توفیق نہ ہوئی۔ اب کہیں ٹریننگ کے لیے پھر کسی باہر کے ملک جانے کا زریں موقع ہاتھ آئے تو نئی گاڑی خریدوں۔ جب موٹر خرید لی تو خیال آیا کہ موٹر پر یورپ کا سفر کروں۔ ایک دو دوستوں کو ساتھ لیا اور بلجیم، فرانس ہوتا ہوا جرمنی کے شہر میونخ میں پہنچا۔ گاڑی دوستوں کو دے دی کہ انگلستان پہنچ کر سمندری جہاز سے دہلی بھیج دیں اور خود ہوائی جہاز میں کوہ ایلپس کے اوپر پرواز کرتا ہوا وینس پہنچا۔ وہاں سے بس پر سوار ہو کر فلارنس، فلارنس سے روم، روم سے ایتھنز اور ایتھنز سے آہیں بھرتا ہوا سمندری جہاز سے گوالیار پہنچا۔ یہاں میں نے ایک دوست کی موٹر منگوائی تھی، تاکہ دہلی کا سفر موٹر سے کروں۔

میں اکثر ریل ہی میں سفر کرتا ہوں مگر ریل کا سفر مجھے اچھا نہیں لگتا۔ ہوائی جہاز کا سفر، وقت تنگ ہو تو اختیار کرتا ہوں۔ ورنہ نہیں۔ یورپ میں تھا تو جب بھی موقع ملا بس کے ذریعے سفر کیا یا موٹر گاڑی میں۔ ہوائی جہاز کا سفر تو مجھے یوں اچھا نہیں لگتا کہ یہ سفر، سفر ہی نہیں ہوتا۔ کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ یہ تو ایسا ہے جیسے کوئی آپ کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر آپ کو گود میں اٹھائے اٹھائے پھرے۔

ریل کے سفر میں سب سے بڑی قباحت اجنبی ہم سفر ہوتے ہیں۔ ایک اجنبی ہم سفر سے تو ہمیشہ ریل میں سابقہ پڑتا ہے۔ یہ صاحب ریل کے سفر کے ماہر ہوتے ہیں۔ تمام کھڑکیاں اور ان کی تمام جھلملیاں اتارتے چڑھاتے رہتے ہیں۔ اگر کبھی ریل راستے میں اسٹیشن کے علاوہ کہیں اور ٹھہر جائے تو یہ صاحب ہمیشہ دروازہ کھول کر گاڑی کے بے جگہ رک جانے کا سبب دریافت کرتے ہیں اور باقاعدہ تفتیش کا دفتر کھول دیتے ہیں۔ کوئی بتی والا، جھنڈی والا نظر آ جائے تو اس سے کیفیت طلب کرتے ہیں کہ گاڑی راستہ میں کیوں ٹھہر گئی۔ دروازے میں کھڑے کھڑے آپ سے مخاطب ہوتے ہیں اور نہایت ماہرانہ انداز میں فرماتے ہیں کہ سگنل ڈاؤن نہیں ہے۔ جب انہیں دروازے میں کھڑے کھڑے بہت دیر ہو جاتی ہے تو اندر آ کر آپ کو اطلاع دیتے ہیں کہ این، ڈبلیو، آر کے معنی نارتھ ویسٹرن ریلوے نہیں بلکہ نمی واہیات ریلوے ہیں اور اس ظالمانہ مسخرگی کو اپنی ایجاد بتاتے ہیں۔

مطالعہ کے لیے یہ صاحب ہمیشہ ریل کا ٹائم ٹیبل اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور آپ کو باقاعدہ اطلاع بہم پہنچاتے رہتے ہیں کہ کون سا اسٹیشن آنے والا ہے۔ ٹائم ٹیبل میں آنے والے اسٹیشن پر پہنچنے کا وقت دیکھتے ہیں، پھر اپنی گھڑی دیکھتے ہیں اور جمع تفریق کا عمل کر کے بتاتے ہیں کہ گاڑی کتنی لیٹ ہے۔ غرض کہ ہر قدم پر آپ کی معلومات میں اضافہ کرتے جاتے ہیں۔

یہ صاحب اکثر انگریزی سوٹ میں ملبوس ریل گاڑی پر سوار ہوتے ہیں۔ ریل چل پڑے تو سوٹ اتار دیتے ہیں اور دھاری دار شب خوابی کا لباس زیب تن فرما لیتے ہیں۔ اس پر ریشمی ڈریسنگ گون چڑھاتے ہیں اور ڈریسنگ گون کے بندوں سے کھیلتے رہتے ہیں۔ راستے کے ہر چھوٹے بڑے اسٹیشن پر ڈریسنگ گون پہنے پلیٹ فارم پر اترتے ہیں اور مشتاقوں کے انبوہ کثیر میں دیدار کی دولت مفت لٹاتے ہیں۔ گارڈ جھنڈی ہلائے، سیٹی بجائے، اسٹیشن کی گھنٹیاں بجیں، ریل کا انجن چلائے کہ گاڑی روانہ ہونے والی ہے مگر ان کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ مذاق ہے یا پھر ان لوگوں کے لیے ہے جو ریل کے سفر کا تجربہ بہت قلیل رکھتے ہیں۔ ہاں جب ریل خراماں خراماں چل پڑے تو یہ صاحب لپک کر ڈبے میں سوار ہوتے ہیں اور جب تک گاڑی پلیٹ فارم سے آگے نہ نکل جائے بدستور دروازہ میں ڈریسنگ گون پہنے کھڑے رہتے ہیں۔ جب گاڑی پلیٹ فارم یا کوئٹہ کے شیڈوں سے بھی آگے نکل جائے تو یہ حضرت دروازہ بند کر کے اپنی جگہ بیٹھ جاتے ہیں۔ اور آپ کو اطلاع دیتے ہیں کہ اس بیہودہ اسٹیشن پر سنگترے مہنگے ہیں۔ رحیم یار خان پر سستے ملیں گے۔

یہ صاحب سگریٹ پیتے ہیں مگر ماچس کبھی اپنے پاس نہیں رکھتے۔ آپ ان کے ساتھ ماچس بردار کی حیثیت سے سفر کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح پرانے زمانے کے نوابوں کے ساتھ چوبدار ہوا کرتا تھا۔ ایسے حضرات کی خاطر میں ہمیشہ دو چار ماچسیں فالتو رکھتا ہوں جہاں انہوں نے ماچس طلب کی ایک بھری ماچس ان کی خدمت میں پیش کر کے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتا ہوں۔

یہ کوشش اکثر ناکام رہتی ہے کیونکہ یہ صاحب ماچس پا کر میرے اخلاق کے ایسے گرویدہ ہو جاتے ہیں کہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آ بیٹھتے ہیں اور اس زور سے بولتے ہیں اور بولتے چلے جاتے ہیں کہ ریل کے شور کو شکست ماننی پڑتی ہے۔

آخر کار جب میں آنکھیں بند کر کے خراٹے بھرنے لگتا ہوں تو یہ مجھے صید زیاں سمجھ کر اٹھتے ہیں اور اپنی جگہ پر بیٹھ کر کھڑکی میں سے باہر منہ نکالتے ہیں اور یوں گردن ہلا ہلا کر گانے لگتے ہیں جیسے حضرت پر وجد کی کیفیت طاری ہو۔

ایسے حضرات کی بلاوحتی سے بچنے کے لیے ہمیشہ ڈبے کے اوپر والے برتھ پر لیٹے لیٹے سفر کرتا ہوں۔ گاڑی کے روانہ ہوتے ہی اوپر کے برتھ پر دراز ہو جاتا ہوں۔ کتابیں اور سگریٹ اپنے پاس رکھتا ہوں اور توشہ دان کھونٹی کے ساتھ لٹکا دیتا ہوں۔ چاہے سفر چوبیس گھنٹے کا ہو، اوپر سے نیچے اترتا ہی نہیں۔ اوپر ہی ٹنگا رہتا ہوں۔ اگر کبھی بشری تقاضے سے مجبور ہو کر غسل خانے جاتا ہوں تو اس تاک میں رہتا ہوں کہ کب کوئی اسٹیشن آئے اور یہ صاحب ڈریسنگ گون پہن کر پلیٹ فارم پر چہل قدمی فرمانے جائیں اور میں غسل خانے میں جا کر فراغت حاصل کروں۔

اوپر والے برتھ پر یہ بھی آرام ہے کہ ٹکٹ چیکر یا ہوٹل کے ملازم کے لیے دروازہ کھولنے کی زحمت سے بچا رہتا ہوں۔ رات برات کوئی صاحب اندر آنے کے لیے دروازہ کھٹکھٹائیں تو اس سے تو نکار اوپر کے برتھ والا نہیں نیچے کی برتھ والا کرتا ہے۔ مہتر صفائی کرنے کے لیے آئے تو یہی نیچے کے برتھ والا اسے ہدایت فرماتا ہے کہ ڈبے کی صفائی کس طرح کرنی چاہئے اوپر کے برتھ والا مزے سے خراٹے بھرتا رہتا ہے۔

ریل کی ان قباحتوں سے بچنے کے لیے میں نے گوالیار سے موٹر کار میں جانے کا ارادہ کیا۔ ان دنوں مہاراجہ الور کی بہت دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ شملے تشریف لاتے تو زمین کو روندتے ہوئے چلتے۔

سردار سکندر حیات خان پہلے پہل گورنر پنجاب کے عہدے پر فائز ہوئے تو معززین کے لیے ضیافت کا انتظام کیا۔ اس ضیافت میں مہاراجہ الور بھی مدعو تھے۔ مہاراجہ صاحب گورنر کی دعوت کو رد تو کیا کرتے لیکن یہ بتانے کے لیے کہ ہم بھی کچھ ہیں، ضیافت میں ڈیڑھ گھنٹہ دیر سے پہنچے اور ان کی تشریف آوری پر سب کو استادہ ہونا پڑا۔

مہاراجہ گرمی کا موسم انگلستان میں گزارا کرتے تھے۔ اور وہاں ان کے یہ ٹھاٹ تھے کہ ہائیڈ پارک ہوٹل کی ایک پوری منزل اپنے لیے کرایہ پر لیتے تھے۔

ایک بہت بڑے آدمی کے یہاں ڈنر پر گئے۔ وہاں کوئی کتا آپ کو دکھائی دے گیا۔ ان کو کتے سے چڑ تھی۔ فوراً ڈنر چھوڑ کر ہوٹل آئے۔ اشنان کیا، کپڑے بدلے اور دو گھنٹے بعد پھر دعوت میں جا کر شریک ہوئے۔

چمڑے سے ان کو سخت نفرت تھی۔ ان کے محل میں، ان کی ریل گاڑی میں، ان کی موٹر کار میں کہیں بھی چمڑے کی کترن تک دکھائی نہ دیتی تھی۔ ایک دفعہ کہیں گوٹ پر گئے۔ ایک انگریز قسمت کا مارا شکاری کوٹ پہن کر آ گیا۔ اس کے کوٹ میں چمڑے کے بٹن لگے ہوئے تھے۔ حضور نے اس گستاخ انگریز کو گوٹ پر سے لوٹا دیا اور وہ بھی پیدل۔ غریب کی اچھی پکنک ہوئی۔ دس بارہ میل کی مسافت پیدل طے کرتا ہوا شہر واپس آیا۔ اور کان پکڑے کہ پھر کبھی الور نہ آؤں گا۔

غرض کہ مہاراجہ الور کا:

"بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا"

کے مصداق ہر جگہ چرچا تھا۔ مجھے بھی دو ایک مرتبہ ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع مل چکا تھا۔ ایک مرتبہ شملے کے سیسل ہوٹل میں اور دوسری مرتبہ لندن میں۔

میں نے دل میں کہا چلو الور کے راستے دہلی چلیں۔ ایک تو یہ راستہ نزدیک کا ہے۔ اور دوسرے الور بھی دیکھا نہیں، دیکھتے چلیں گے۔

گوالیار سے موٹر کوئی تیس چالیس میل چلی ہوگی کہ موٹر کے پہیوں نے باری باری پنچر ہونا شروع کیا۔ جب ایک ایک مرتبہ تمام پہیے پنچر ہو چکے تو ہر پہیے نے باری باری دوسری مرتبہ پنچر ہونا شروع کیا۔ اور جب الور شہر میں گاڑی پہنچی تو پہیوں میں مزید پنچر لگانے کی گنجائش نہ رہی۔

گاڑی کے ٹائر تو اچھے خاصے تھے مگر ٹیوب بہت پرانے اور پیوند زدہ تھے۔ میں نے کہا لاؤ ٹیوب نئے خرید لوں۔ ڈرائیور نے ادھر ادھر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ الور میں کوئی موٹروں کی دکان ہی نہیں۔ الور والوں کو ٹیوب وغیرہ خریدنے ہوں تو انہیں دہلی جانا پڑتا ہے۔ میں نے کہا ٹیکسی کرایہ پر لے لوں مگر وہاں ٹیکسی کا کوئی رواج نہیں تھا۔

پھر سوچا مہاراجہ کے محل میں کسی سے کہہ سن کر کوئی گاڑی مانگ لوں۔ مگر محل میں گویا تالا پڑا ہوا تھا۔ مہاراجہ انگلستان میں تھے تو یہاں محل میں کون ہوتا۔

ٹیلی فون کر کے دہلی سے کوئی گاڑی منگوانے کا ارادہ کیا تو معلوم ہوا کہ الور سے دہلی تک ٹیلی فون کا کوئی سلسلہ ہی نہیں۔

سوچا کہ رات کسی ہوٹل میں بسر کروں اور صبح کسی آتی جاتی گاڑی میں سوار ہو کر دہلی پہنچوں مگر پتہ چلا کہ الور میں کوئی ہوٹل ہی نہیں۔

اور کچھ نہیں سوجھا تو خیال آیا کہ پولیس کا کوئی محکمہ تو یہاں ہوگا، اس کے کسی افسر کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہئے۔ پھر جو ہو سو ہو۔

چنانچہ رات کی تاریکی میں کچی سڑکوں پر ٹھوکریں کھاتا ہوا اور مہاراجہ الور کے طمطراق پر لعنت بھیجتا ہوا ایک تھانے میں پہنچا۔ یہ تھانہ کیا تھا اجڑا ہوا جھنگڑ خانہ تھا۔ ایک اونگھتے ہوئے سپاہی کو ٹہوکا مار کر جگایا۔ یہ جاگا تو سہی مگر جاگتے ہی اس نے تحکمانہ لہجہ اختیار کر لیا۔

کیا ہے؟

کون ہے؟

چلے جاؤ؟

میں نے اپنے ڈرائیور کو بلایا اور اس کو افسرانہ انداز میں حکم دیا کہ اس گستاخ آدمی کا نام، نمبر لکھو اور فوراً انسپکٹر جنرل صاحب کو ٹیلی فون کرو کہ وہ پوری گارڈ لے کر ہمارے حضور میں حاضر ہوں۔

میری یہ ترکیب کارگر ہوئی۔ سپاہی فوراً ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے لگا مگر میں گٹ پٹ کرتا ہوا ٹیلی فون تک جا پہنچا۔

یہ ٹیلی فون پرانے زمانے کا ٹیلی فون تھا جس کی چرخی گھما کر آپریٹر سے کہنا پڑتا تھا کہ فلاں نمبر ملا دو۔ میں نے چرخی گھمائی تو ایک رونی سی آواز آئی۔

"کون نمبر؟"

اب مجھے کیا معلوم کہ انسپکٹر جنرل پولیس الور کا نمبر کیا تھا۔ میں نے "انسپکٹر جنرل صاحب بہادر سے ٹیلی فون ملا دو۔"

آپریٹر نے کہا۔

"خاں صاحب کا حکم ہے کہ رات کو کوئی ٹیلی فون نہ ملایا جائے۔"

میں نے کہا۔

"ہم خان صاحب کے چچا ہیں۔ فوراً ٹیلی فون ملاؤ۔" اس نے ٹیلی فون ملایا، بہت دیر تک گھنٹی بجتی رہی، آخر انسپکٹر جنرل صاحب کی خمار زدہ اور خواب آلودہ آواز آئی۔ لہجہ پٹھانوں کا! میری جان میں جان آ گئی۔ میں نے اپنا نام بتایا اور پشتو میں ان سے باتیں کرنے لگا۔ وہ مجھے جانتے تھے اور مجھے یقین ہے کہ میں بھی ان کو جانتا تھا مگر یہ کیسے پوچھتا کہ بھیا تمہارا نام کیا ہے۔ اس بے چارے نے کہا کہ فوراً میرے یہاں چلے آؤ۔ یہاں رات بسر کرو، میں گاڑی بھیجتا ہوں۔ میں نے کہا نہیں بھیا نہ تم آؤ نہ مجھے بلاؤ صرف گاڑی بھیج دو۔ مجھے صبح سویرے دہلی پہنچنا ہے۔ میرا انکار اس کے اصرار پر غالب آیا اور اس نے گاڑی بھیج دی۔

جب گاڑی تھانے کے باہر آئی تو یوں معلوم ہوا کہ کوئی زلزلہ یا طوفان آیا ہے۔ اس قدر شور، اس قدر چھک چھک، اس قدر چوں چوں، اس قدر پوں پوں کہ میں گھبرا گیا۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ سامان لادا اور انسپکٹر جنرل صاحب کے ڈرائیور سے کہا کہ چل بھئی دہلی۔

دہلی کا نام سن کر ڈرائیور کے ہوش اڑ گئے۔ بڑی لجاجت سے کہا کہ صاحب آپ کے خیال میں یہ گاڑی دہلی تک آپ کو پہنچا دے گی۔ میں نے کہا کہ تم چلو تو سہی اگر یہ ہم کو دہلی نہیں پہنچائے گی تو ہم اس کو دہلی پہنچائیں گے۔ یہ کہہ کر گاڑی میں سوار ہوا اور گاڑی دہلی کی جانب روانہ ہوئی۔

کیا بتاؤں یہ گاڑی کتنی تکلیف دہ تھی۔ میں تمام راستہ کباب سیخ بنا ہوا پہلو بدلتا رہا۔ آخر میں نے ڈرائیور سے پوچھا کہ کیوں بھئی یہ گاڑی قیدی ڈھونے کے لیے ہے۔ فرمایا نہیں یہ انسپکٹر جنرل صاحب کی گاڑی ہے۔ قیدی تو بیل گاڑی میں ڈھوئے جاتے ہیں۔

دھوئیں کے بادل اڑاتی، بھاپ کے فوارے چھوڑتی، یہ گاڑی اگلے دن سہ پہر کو دہلی پہنچی۔

میرا حلیہ دیدنی تھا۔ بال چکٹ، چہرہ موٹر کے دھوئیں سے کالا سیاہ، کپڑوں پر دھوئیں اور تیل کا پلستر، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بھرت پور کا کوئی رنجیت سنگھ جاٹ عقیدت کے مارے زمین پر لوٹتا ہوا کسی کالی ماتا کے درشن کے لیے دہلی آیا ہو۔

بھائی صاحب نے مجھے دیکھا تو چلا کر نوکر سے کہا کہ اسے لانڈری لے جاؤ۔ غرض کہ وہ جو ہم نے سوچا تھا کہ دہلی والے ہمارے "سے ول رو" کے بنے ہوئے سوٹ اور ہمارے اعلیٰ قسم کے سوٹ کیس کو دیکھ کر مرعوب ہوں گے اور عش عش کریں گے وہ سب غلط نکلا۔ ہمیں دیکھ کر اش اش تو کیا سب ہش ہش کرنے لگے۔

میں بھائی جان کے یہاں برآمدے میں یوں بیٹھا تھا جیسے کوئی جھاگ بیٹھ گیا ہو۔ میں نے ہر چند چاہا کہ غسل کروں کپڑے بدلوں مگر بھائی جان کو نقل محفل ہاتھ آیا۔ مجھے اس حلیے میں بٹھائے رکھا اور خود دنیا بھر کو ٹیلی فون کیا کہ آؤ اور دیکھو اور عبرت پکڑو۔

میری یہ حالت، ادھر ٹیلی فون پر ٹیلی فون آنے لگے کہ جلد آؤ اور ہم سے ملو ورنہ ہم آتے ہیں۔ بمشکل تمام بھائی جان نے اجازت دی اور میں انسانوں کا حلیہ بنا کر دہلی ریڈیو پہنچا۔ یہاں دیکھا کہ باسی پھولوں کے ہار ڈھیروں پڑے ہیں۔ باسی نہ ہوتے تو اور کیا ہوتے، ایک دن پہلے کے آئے رکھے تھے۔ میں نے ہنس ہنس کر پژمردہ پھولوں کے ہار گلے میں پہنے اور منہ لٹکائے فیلڈن کے یہاں پہنچا۔

ادھر ادھر کی باتوں کے بعد فیلڈن نے مجھ سے کہا کہ سرکار تم سے سخت ناراض ہے، کچھ تو لندن ٹائمز کے مضمون پر اور کچھ دہلی کے یار لوگوں کی ریشہ دوانیوں کے سبب۔ اب اس بات پر اصرار کیا جا رہا ہے کہ تم کو دہلی سے تبدیل کر کے کہیں اور بھیج دیا جائے۔ بتاؤ کہاں جانا چاہتے ہو، میں نے کہا میں تمہیں چھوڑ کر کہاں جاؤں۔ کہا تو پھر دونوں استعفیٰ دے دیتے ہیں اور اٹلی کے کسی شہر میں جا کر ٹھاٹ جماتے ہیں۔ میں نے کہا صاحب ایسی باتیں صرف پیسے والوں کو سوجھتی ہیں۔ میں غریب عیال دار آدمی ہوں، کیا ٹھاٹ جماؤں گا، اور کہاں ٹھاٹ جماؤں گا۔ مجھے تو اسی سرزمین پر رہنا ہے۔ مجھے جہاں جی چاہے بھیج دو۔ فیلڈن کا اصرار تھا کہ بمبئی جاؤ اور میں بمبئی سے بہت ڈرتا تھا۔ ان دنوں بمبئی میں کانگریس حکومت تھی۔ کھیر صاحب وزیر اعلیٰ تھے اور کابینہ میں مرار جی ڈیسائی اور کے، ایم، منشی جیسے کٹر ہندو۔ کھیر صاحب پرانے زمانے کے بھلے لوگوں میں سے تھے مگر مرار جی ڈیسائی اور کے، ایم، منشی جیسے سخت ہندوؤں کے نام سے ڈر لگتا تھا۔ لیکن پھر سوچا چلو ایک جنگ اور سہی۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

اتوار/06 اپریل 2014ء
روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

ریڈیو پر مختصر ڈرامے نشر کرنے پر مخالفین نے طوفان برپا کردیا

ناقدین نے کہا تین گھنٹے سے کم اور گانوں کے بغیر ڈرامہ نہیں ہوسکتا - خالص اردو لہجہ سن کر ہندو سامعین بلبلا اٹھے - زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس

دلی ایک نشہ ہے۔ چڑھ جائے تو ایسا چڑھتا ہے کہ ہزار ترشی کھاؤ اترتا ہی نہیں۔ جب مجھے حکم ملا کہ بمبئی جاؤ ہوگا تو دلی کی گلیاں پہلے سے بھی پیاری نظر آنے لگیں۔ پرخار سہی لیکن پھر بھی دلی میرا آشیانہ تھا۔ یہاں میرے دشمن بہت تھے اور دوست کم، لیکن انسانوں کو گننے سے کیا حاصل، اس جنس کو تولا کرتے ہیں اور وہ بھی دل کے ترازو میں۔

دلی میں لوگ میرے دشمن کیوں ہوئے اس میں کچھ قصور میرا تھا کچھ لوگوں کا اور کچھ تقدیر کا۔

میرا قصور یہ تھا کہ میں سرپھرا تھا، ہر معاملے میں اپنی منوانا چاہتا تھا۔ بچپن کے زمانے میں گھر میں میری کون سنتا تھا، اب جوانی میں جو مجھے موقع ملا تو بچپن کی ساری کسر نکالنے لگا۔ جو بات ہو منوا کر چھوڑوں اور اگر نہ مانی جائے تو مارنے مرنے پر تیار ہوجاؤں۔

میں نے کہا یہ اردو میں تین گھنٹے کے ڈرامے غلط بات ہے، ریڈیو پر اتنے لمبے لمبے ڈرامے نہیں ہونے چاہئیں اور پھر یہ کیا ضروری ہے کہ ہر ڈرامے میں گانوں کی بھرمار ہو۔ اسٹیج پر تو یہ گانوں کی بھرمار چل جاتی ہے لیکن ریڈیو پر نہیں۔ ریڈیو کے ڈرامے آدھ آدھ گھنٹے یا پون گھنٹے کے ہونے چاہئیں۔ اور وہ بھی بغیر گانوں کے۔

جب یہ مختصر ڈرامے ریڈیو سے نشر ہوئے تو ایک طوفان آ گیا۔ اخبارات نے یک زبان ہوکر کہا کہ ڈرامہ بغیر موسیقی کے ہو ہی نہیں سکتا اور پھر یہ بھی کہا کہ وہ ڈرامہ ہی کیا جو ڈھائی تین گھنٹے کا نہ ہو۔ مگر ہم اپنی بات پر اڑے رہے۔ اب کیا بتاؤں کہ یہ ہماری ہٹ دھرمی تھی یا وفاداری بشرط استواری، بہرحال ہم اپنی منوا کر رہے۔ اسی ہٹ کا نتیجہ کہیے یا کچھ اور کہ آج ریڈیو کا ڈرامہ مختصر ہوتا ہے۔ اور وہ بھی بغیر گانوں کے۔ جن لوگوں کو بغیر موسیقی کے ڈراموں پر اعتراض تھا وہ بھی ایک حساب سے سچے تھے۔

اردو ڈرامے کی ابتداء امانت کی اندرسبھا سے ہوئی جس میں گانے ہی گانے تھے۔ اندرسبھا کے بعد جو ڈرامے لکھے گئے ان میں بھی گانوں کی یہ روایت بہت حد تک برقرار رکھی گئی، یہاں تک کہ آج ہماری فلمیں بھی بغیر گانوں کے بنتی نہیں۔ کہتے تو ہیں کہ ہندوستان میں ایک فلم ایسی بنی ہے جس میں کوئی گانا نہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ فلم کامیاب رہی، اب دیکھئے پاکستان میں بھی کوئی فلم ساز ایسا سرپھرا ہوگا یا نہیں جو بغیر موسیقی کے کوئی کامیاب فلم بنا ڈالے۔

موسیقی کی جاذبیت سے مجھے انکار نہیں۔ میں تو موسیقی کا والہانہ حد تک دلدادہ ہوں لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ فلم کے گانے فلم کی کہانی کے قرام میں دخل انداز ہوتے ہیں۔ جہاں کہانی نے ذرا زور پکڑا، وہیں کھٹ گانا آ گیا اور بے چاری کہانی بیچ ہی میں دب دبا کر رہ گئی۔ مگر خیر اب کہیں کہیں ایسی کوشش ہورہی ہے کہ فلمی کہانی میں گانا ایسے مقام پر آئے کہ کہانی کو آگے چلائے، نہ یہ کہ چلتی ہوئی کہانی کو پیچھے لے آئے۔

ڈرامے میں گانے کا مقام کچھ ایسا ہی ہے جیسا کہ پرانی نثر میں اشعار کا مقام ہوا کرتا تھا۔ یہاں مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک بات یاد آتی ہے۔ ایک دن اپنی ایک کتاب کا ذکر کرنے لگے، فرمایا کہ میری اس کتاب کی طرز نگارش باقی کتابوں سے مختلف ہوگی۔ مولانا آزاد اور مختلف طرز نگارش! بات سمجھ میں نہ آئی، تو میں نے کہا اس مختلف طرز نگارش سے آپ کی کیا مراد ہے؟ فرمایا پہلی کتابوں کا تو یہ حال ہے کہ جہاں لکھتے لکھتے کوئی موزوں نظر آیا جھٹ کوئی موزوں شعر لکھ کر جان چھڑائی مگر جس کتاب کا میں تذکرہ کررہا ہوں اس میں شعر نہیں ہوں گے۔

شعر اور موسیقی ہماری گھٹی میں ہے۔ حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر دلپذیر شعروں سے مرصع ہوتی تھی اور جب حضرت کوئی شعر لحن سے پڑھتے تھے تو روح تازہ ہوجاتی تھی۔ ہائے وہ درویش نعرہ زن......

"خوش فکر و بذلہ سنج و ہنر پرور و غیور"

اب عطاء اللہ شاہ بخاری جیسا مقرر اور آغا حشر جیسا اپنے وقت کا کامیاب ڈرامہ نگار کہاں سے آئے۔ اور پھر ریڈیو وقت کا غلام، اتنا وقت کہاں سے نکالے کہ لمبے لمبے ڈرامے نشر کرے۔

سوال یہ پیدا ہوا کہ یہ مختصر ڈرامے لکھے کون، ان ڈراموں کو پیش کون کرے، ڈراموں میں پارٹ کون کرے؟ یہ ڈرامے لکھے گئے اور اردو میں لکھے گئے۔ اس لئے لازم آیا کہ وہی لوگ ڈراموں کے متعلق تمام کام کریں جو اردو زبان کی نوک پلک اور اردو زبان کے ادب سے واقف ہیں۔

وہ اردو ہی کیا جس میں عربی اور فارسی کی چاشنی نہ ہو۔ اردو ادب سے واقفیت صرف ان لوگوں کو ہوسکتی ہے جو عربی و فارسی میں بھی کچھ دسترس رکھتے ہوں۔ ان تمام ضروریات کو دیکھا تو ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ کام مسلمان نسبتاً بہتر کرسکتے ہیں۔ اردو کے ضمن میں فارسی عربی کی شدبد رکھنے والے کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے۔

ایک ڈرامے پر کیا موقوف ہے۔

"اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ"

جہاں اردو کا کوئی کام ہو نظر انتخاب عام طور پر مسلمانوں ہی پر پڑتی ہے۔ چنانچہ پروگرام کے کام کے لئے زیادہ تر مسلمان ملازم رکھے گئے۔ محکمہ کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعداد میں سرکاری توازن برقرار رکھنے کے لئے ہم نے انجینئروں کے شعبہ میں مسلمانوں کی نسبت ہندو زیادہ بھرتی کیے۔ مختصر یہ کہ پروگراموں کا کام زیادہ تر مسلمانوں کے سپرد ہوا اور انجینئری کا کام ہندوؤں کے۔

یوں بھارت کے دو بڑے فرقوں میں توازن قائم ہوگیا۔ لیکن پروگراموں میں اردو کے خاص لب و لہجہ سے ہندو حضرات بلبلا اٹھے۔ ہر طرف سے شور ہوا کہ ہندو دھرم خطرے میں ہے۔ دہلی ریڈیو کی زبان بڑی سخت ہے۔ ہندوؤں پر گراں گزرتی ہے۔ اس زبان کو نرم کرنا چاہئے۔ اردو زبان میں نہیں بلکہ پروگرام ہندوستانی زبان میں پیش کرنے چاہئیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب گاندھی جی نے اردو کی جگہ ہندوستانی زبان کا علم بلند کر رکھا تھا۔

اب اگر اس ہندوستانی زبان کی کوئی ڈکشنری ہوتی، ہندوستانی زبان میں کوئی ادب موجود ہوتا تو ہم بھی کہتے کہ چلو بھائی ہم ہندوستانی زبان ہی اختیار کرلیتے ہیں۔ لیکن اس مفروضہ زبان کو ہم کیوں کر اختیار کرتے جس کا نہ کوئی ادب تھا نہ کوئی فرہنگ، نہ کوئی باپ تھا نہ کوئی ماں۔

جو لوگ زبان کو آسان بنانے کے لئے برسوں سے چلا رہے ہیں ان کے شور پر ہنسی آتی ہے اور ان کی جہالت پر رحم۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ مشکل لفظ وہ ہوتا ہے جو ہم نہ جانیں اور جو لفظ ہم جانیں وہ مشکل نہیں رہتا۔

شاعر ہو یا ادیب، بہت ڈھونڈ کے ایسا لفظ لاتا ہے جو اس کے مفہوم پر حاوی ہو۔ اب یہ اس کے بس کا روگ نہیں کہ اس لفظ کو ہٹا کر کوئی کانگریسی لفظ بھی رکھ دے اور اپنا مطلب بھی ادا کر جائے۔

آج تیس برس سے ان لوگوں نے یہ رٹ لگا رکھی ہے کہ آسان زبان لکھو خود تو یہ حضرات نئے لفظ سیکھتے نہیں البتہ اہل قلم سے کہتے ہیں کہ جو لفظ تم نے سیکھ رکھے ہیں ان کو بھول جاؤ۔ یہ حضرات مہینہ بھر میں ایک نیا لفظ بھی سیکھ لیتے تو آج نو سو نئے الفاظ جانتے اور انہیں یہ کہنے کی نوبت ہی نہ آتی کہ آسان زبان لکھو۔

اہل علم اس بے انصافی کا رونا کس کے آگے روئیں۔ میرے انگلستان کے قیام کے دوران میں ٹی ایس ایلیٹ مجھ پر بہت مہربان تھے۔ یہ انگریزی زبان کے عظیم ترین شاعر ہیں اور ان کو نوبل پرائز مل چکا ہے۔ میرے یہاں کبھی کبھی تشریف لایا کرتے تھے۔ ان دنوں انہوں نے ایک نئی نظم لکھی تھی جس کا دنیا بھر میں چرچا تھا۔

ایک دن میرے پاس آئے تو میں نے عرض کیا کہ اس نئی نظم کے چند اشعار میری سمجھ میں نہیں آئے۔ ذرا ان اشعار کا مطلب بتا دیجئے۔ فرمایا مطلب بیان کرنے سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ میں نے ان اشعار میں کہا ہے اس کو مختلف الفاظ میں بیان کروں۔ اگر مختلف الفاظ مل سکتے تو وہ میں الفاظ کیوں استعمال کرتا جو ان اشعار میں استعمال کئے گئے ہیں۔ شعر تو ایک باغ ہے، باغ کو سمجھنا کیا، باغ تو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ وہ بس۔

لفظوں کی بحث بہت لمبی ہے اس کو کسی اور صحبت پر اٹھا رکھتا ہوں اور پھر اسی موضوع کی طرف لوٹتا ہوں جس کا تعلق ریڈیو کی زبان سے تھا۔

ریڈیو کے ڈراموں کی زبان کو آسان بنانے کے لئے کرشن چندر اور پندراشک کا تعاون حاصل کرنا آسان تھا مگر غزلوں کی زبان کو کیا کرتے۔ ایسا مائی کا لال شاعر کہاں سے آتا جس کے خیالات تو غالب کے ہوں مگر زبان راجندر سنگھ بیدی کی۔ کانگریسی ہندوستانی زبان کے حامیوں نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو غزل کو فارغ خطی دے دو اور غزل کے بجائے گیت نشر کرو۔

انہوں نے یہ کہہ تو دیا کہ گیت نشر کرو مگر یہ نہ فرمایا کہ گیت لکھے کون؟ اس تمام برصغیر میں حفیظ جالندھری کے سوا کون تھا جس کے گیت میں موسیقی بھی ہو اور شاعری بھی۔ اس سے میری مراد یہ نہیں کہ باقی لکھنے والوں کے گیتوں میں یا تو صرف شاعری ہوتی تھی یا صرف موسیقی۔ ان حضرات کے گیتوں میں کچھ بھی نہ تھا، نہ موسیقی نہ شاعری، نالے کو پابند نے کرنے کا سہرا حفیظ ہی کے سر رہا ہے۔

پروگرام کے شعبے میں مسلمانوں کی کثرت، زبان کا دزن، کانگریسی ہندوستانی کا کھوکھلا پن۔ سب نے مل کر مجھے بہت سے تیروں کا ہدف بنا دیا۔ اس پر اضافہ ہوا سرکاری ناراضی کا۔ بس پھر کیا تھا مجھے بوریا بستر سنبھال بمبئی جاتے ہی بنی۔

اب بمبئی کا حال سنئے۔ یہاں سیٹھنا صاحب اسٹیشن ڈائریکٹر تھے۔ یہ وہی سیٹھنا صاحب ہیں جو پہلے دہلی کے اسٹیشن ڈائریکٹر تھے، جنہوں نے مجھے دھتا بتا دی تھی کہ جاؤ تمہارے لئے کوئی نوکری نہیں۔ یہ وہ سیٹھنا صاحب ہیں جنہیں بھائی جان کی جگہ سرکار نے ڈپٹی کنٹرولر مقرر کیا تھا۔ یہ وہ سیٹھنا صاحب ہیں جنہیں آخر فیلڈن نے اسٹیشن ڈائریکٹر بنا کر واپس بمبئی بھیج دیا تھا۔ یہ وہ سیٹھنا صاحب ہیں جن کا استعفیٰ اس لئے طلب کر لیا گیا تھا کہ وہ بمبئی میں نااہل ثابت ہوئے تھے۔ اب ان کی جگہ میں جا رہا تھا۔

سیٹھنا صاحب ایک تو پہلے ہی سے میرے خلاف ادھار کھائے بیٹھے تھے اس پر نوکری سے برطرف ہونے کی خلش، جو کرتے تھوڑا تھا۔ حضرت نے میرے خلاف بمبئی شہر میں، ابھی میں پہنچا بھی نہ تھا کہ ایک زبردست محاذ قائم کر لیا۔ اخباروں کو میرے خلاف اکسایا اور اخبار بھی مرہٹی اور گجراتی۔ کانگریس کی صوبائی حکومت کو بھڑکایا کہ بخاری سخت مسلم لیگی قسم کا کٹر مسلمان ہے۔ دفتر کے ملازموں کے کان بھرے کہ اس شخص سے بچے رہنا، بہت افعی قسم کا انسان ہے۔

یہ سب باتیں مجھ تک پہنچ چکی تھیں۔ میں نے فیلڈن سے کہا کہ بھیا حالات یہ ہیں، تم مجھے درندوں کے غار میں دھکیل تو رہے ہو، اتنا کرو کہ مجھے کچھ اختیارات دے دو۔ فرمایا کیسے اختیارات، میں نے کہا نوکر رکھنے اور برطرف کرنے کے۔ کہا منظور ہے۔ بس مجھے یہی چاہئے تھا۔ میں نے بمبئی جانے کی تیاری شروع کردی۔ سامان تو میرے پاس واجبی تھا۔ اس کے باندھنے، سنبھالنے اور ساتھ لے جانے میں کوئی خاص دقت نہ ہوئی البتہ ان آدمیوں کو ساتھ لے جانے میں خاصی تگ و دو کرنی پڑی جو بمبئی کے کارزار میں میرا ساتھ دینے کی ہمت رکھتے تھے۔ ان میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ اہل قلم بھی تھے اور اہل فن بھی۔ موسیقار بھی تھے اور سازندے بھی۔

یہ سب انتظام کرنے کے بعد میں نے سوچا کہ بمبئی پہنچنا ہی ہے تو اس انداز سے پہنچا جائے کہ دھماکا ہو۔ چپکے سے بمبئی میں گھس جانا کیا معنی۔

اتفاق یہ ہوا کہ انہی دنوں دہلی سے پہلا ہوائی جہاز چلنے والا تھا، یعنی پہلی مرتبہ دہلی اور بمبئی کے درمیان ہوائی ڈاک کا سلسلہ قائم ہونے والا تھا۔ میں نے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مار کر اسی ہوائی جہاز میں سفر کی اجازت حاصل کرلی۔

صبح کا وقت ہے۔ دہلی کے ولنگڈن ایئرپورٹ پر بڑی گہما گہمی ہے، جے۔ آر۔ ڈی۔ ٹاٹا بھی آئے ہوئے ہیں اور وزیر مواصلات سر تھامس اسٹوارٹ بھی، شہر کے رؤسا بھی جمع تھے اور ڈاکخانے کے صاحب اقتدار افسر بھی، جھنڈیاں بھی تھیں اور باجے بھی۔ اس تمام برات میں بخاری بھی سوٹ کس لئے کھڑا ہوگیا اور مصداق "عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے۔"

بمبئی روانہ ہونے کے لئے تیار۔

تقریریں ہوئیں، ہاتھ ملائے گئے، باجے بجے، ایک پائلٹ ہوائی جہاز کی سیڑھیوں پر ہاتھ ہلاتا ہوا چڑھا، پیچھے پیچھے بخاری بھی، ہاتھ ہلاتے ہلاتے ہوئے سوار ہوئے۔ ہر تصویر میں بخاری موجود ہے، ہوائی جہاز کی روانگی کی ہر خبر میں بخاری کا ذکر، غرض کہ مزا آ گیا، یعنی یہ کہ نخوت نے تسکین پائی۔

یہ ہوائی جہاز آج کل کا ہوائی جہاز نہ تھا۔ اس میں صرف دو نشستیں تھیں اور ایک انجن۔ نشستیں بالکل ایسی جیسے کسی کنوئیں کے ڈول کو آدھا کاٹ دیا گیا ہو۔ ایک نشست پر ہوائی جہاز چلانے والا انگریز بیٹھا اور دوسری نشست پر میں۔

توبہ۔ اگر کوئی آج اس جہاز پر دہلی سے بمبئی تک کا سفر کرے تو لوگ کہیں خودکشی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

یہ ہوائی جہاز ہے پورا اور نہ جانے کہاں کہاں ہوتا ہوا بمبئی پہنچا۔ اس سفر کی ایک بات مجھے کل کے دن کی طرح یاد ہے، راستے میں جہاز نے ایک ایسا غوطہ لگایا یا پلٹی کھائی کہ میں جل تو جلال تو کہہ کر رہ گیا۔ میں نے پائلٹ سے اس اچھل کا سبب دریافت کیا تو نہایت بھولے پن سے فرمایا کہ سامنے ایک پرندہ آ گیا تھا، اس کی زد سے ہوائی جہاز کو بچانے کے لئے میں نے قلابازی لگائی تھی۔

ہمارا جہاز، جہاز کیا تھا اڑن کھٹولا تھا۔ کوئی ایک بجے بمبئی پہنچا۔ ڈاک کی پیشوائی کے لئے بمبئی کے ورزائی، بڑے بڑے افسر اور بڑے بڑے رؤسا آئے ہوئے تھے۔ فوٹوگرافروں کی بھرمار تھی، اخباری نمائندوں کا انبوہ تھا۔

اس ہوائی جہاز میں پہلی مرتبہ دہلی سے ڈاک بھی آئی اور بمبئی کا اسٹیشن ڈائریکٹر بخاری بھی۔ دونوں کی تصویریں لی گئیں اور کثرت سے شائع ہوئیں۔ اس کثرت سے کہ میں خود بھی یہ تمیز نہ کرسکا کہ میں ڈاک کا تھیلا ہوں کہ بخاری۔

لوگوں سے مل ملا کر میں سیدھا تاج ہوٹل پہنچا اور کھانا کھا کر سیدھا ریڈیو اسٹیشن۔

تمام اسٹاف کو اکٹھا کیا اور ان کو ایک دھواں دھار لیکچر پلایا۔ لب لباب اس لیکچر کا یہ تھا کہ خبردار، ہوشیار، ورنہ یاد رکھو۔ غرض جتنی بڑھا نک سکتا تھا ہانکی، جتنا بھی دھمکا سکتا تھا دھمکایا، جتنا بھی ڈرا سکتا تھا ڈرایا۔

میں کچھ ضرورت سے زیادہ تیز بول رہا تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ میرے پیٹ میں درد ہو رہا تھا۔ بہت شدید درد۔ ایک ہاتھ سے تقریر میں جوش پیدا کرنے کے لئے میز پر مکا مار رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے پیٹ کو پکڑے ہوئے تھا۔

آخر جب اسٹاف پر رعب ڈال چکا اور ان کو رخصت کرچکا تو اپنے پی اے مسٹر راؤ کو بلایا اور اس سے کہا کہ ڈاکٹر کو بلاؤ، میرے پیٹ میں درد ہے۔ ایک پارسی ڈاکٹر آیا۔ اس نے دیکھا بھالا اور کہا ہاضمہ خراب ہے، میگنیشیا کا مکسچر بھیجتا ہوں، ایک خوراک تو ابھی پی لو اور دوسری شام کو پینا۔

میں نے ایک خوراک تو پی لی مگر افاقہ نہ ہوا بلکہ درد اور بھی بڑھ گیا۔ آخر مجبور ہوکر ہوٹل چلا آیا۔ کوئی 6 بجے ہوٹل والوں نے ٹیلی فون کیا کہ خبررساں ایجنسی کے ڈائریکٹر، ٹرنر صاحب ملنے آئے ہیں۔ میں نے کہا انہیں اوپر بھیج دو۔

ٹرنر نے آتے ہی میری حالت دیکھی۔ دوا کی بوتل دیکھی، خدا معلوم میری حالت سے انہوں نے کیا اندازہ لگایا۔ فرمایا دوا مت پیو، میں پریزیڈنسی سرجن کو بلاتا ہوں۔ خدا جانے تم نے کس پارسی ڈاکٹر سے دوا لی اور اس نے کیا دوا دی۔

ٹرنر نے ادھر ادھر ٹیلی فون کیا اور ڈی سیل ڈرناف، مشہور سرجن کو بلایا۔ کوئی آدھ گھنٹے میں وہ تشریف لائے۔ مجھے دیکھ فرمایا کہ تعجب ہے تم پہلی ہی خوراک اس دوا کی پینے کے بعد مر کیوں نہ گئے۔ اور اگر کہیں دوسری خوراک بھی پی لیتے تو یقیناً اس بستر پر تمہارا مردہ پڑا نظر آتا۔

مختصر یہ کہ فوراً اسپتال کی گاڑی آئی اور مجھے سینٹ جارج اسپتال لے گئے۔ یہاں رات کے نو بجے میرا "اپین ڈی سائی ٹس" کا آپریشن ہوا۔

آج کی "اپینڈ سائٹس" کا آپریشن تو ایسا ہے کہ جیسے کسی کی انگلی میں سے پھانس نکال دی جائے مگر اس زمانے میں یہ آپریشن کرانا جان جوکھم میں ڈالنا تھا۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ سرجن نے مجھ سے کہا کہ آج کل ایک نئے قسم کی دوا نکلی ہے، یہ کلوروفارم نہیں، ایک انجکشن ہے۔ لگا دیا جائے تو جسم کا وہ حصہ سن ہوجاتا ہے جہاں آپریشن کرنا ہو، ویسے مریض کے ہوش و حواس درست رہتے ہیں۔ میں ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا ہی، میں نے کہا کیا مضائقہ ہے لگا دو یہ نیا انجکشن۔

ہنس ہنس کر یہ نیا انجکشن لگوایا اور لیٹے لیٹے پیٹ پر چاقو کی برش کو دیکھنے لگا۔ مگر کہاں تک دیکھتا آخر آنکھیں موند لیں اور بے ہوش ہوگیا۔ خدا جانے کتنی دیر تک آپریشن ہوتا رہا اور کب اسپتال والے مجھے آپریشن کے کمرے سے اٹھا کر کمرے میں ڈال گئے۔

اگلے دن جب ہوش آیا تو دیکھا کہ اخباروں میں میرے آپریشن کا ڈرامہ پورے زور و شور سے شائع ہوا ہے۔ اس کے بعد عیادت کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ ان میں شکاگو ریڈیو کے بانی مثوانی صاحب بھی تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ میرے اسپتال کے کمرے میں ٹیلی فون لگوا دو ایک ریڈیو سیٹ بھی۔

کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے اندر اندر میرے کمرے میں ٹیلیفون بھی لگ گیا اور ریڈیو بھی آ گیا اور اس کا ایریل بھی نصب ہوگیا۔

میں نے پروگرام سنا اور کسی غلطی پر دفتر ٹیلی فون کیا اور پروگرام والے سے پوچھ گچھ کی۔ اس شخص کی گھگھی بندھ گئی کہ کل رات اس کا آپریشن ہوا، اسپتال میں پڑا ہے یہ ٹیلی فون کہاں سے کررہا ہے۔

اگلے دن سو کر اٹھا تو دیکھا کہ میرا وفادار دوست فیلڈن ڈھیروں پھول لئے میرے پلنگ کے پاس کھڑا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور زبان پر گالیاں کہ ٹیلی فون کیوں لگوایا ہے اور یہ ریڈیو سیٹ کیوں منگوایا۔

کوئی بارہ دن اسپتال میں رہنے کے بعد سیدھا بلرڈ پیئر پہنچا اور ایک سمندری جہاز میں سوار ہوکر کولمبو کے راستے پی نینگ چلا گیا۔ یہ سب بندوبست فیلڈن نے کیا تھا اور وہ بھی مجھے اطلاع دیے بغیر۔ اس نے انتظام یہ کیا تھا کہ ایک جہاز سے میں پی نینگ جاؤں اور وہاں سے دو تین دن کے بعد دوسرے جہاز سے بمبئی لوٹ آؤں۔ آٹھ دن جانے کے آٹھ دن آنے کے اور دو دن پی نینگ میں، اٹھارہ دن کا جبری آرام کرلوں ورنہ میری قسمت میں آرام کہاں!

بمبئی کا ریڈیو اسٹیشن اسٹیشن نہ تھا، ایک کوٹھا تھا جس پر گانے بجانے کا کام ہوتا تھا۔

بلرڈ پیئر کے قریب ایک چھ منزلہ عمارت۔ ایک تیسری منزل پر دو بڑے کمرے۔ ایک میں ریڈیو کا دفتر اور دوسرے میں اسٹوڈیو۔ اسٹوڈیو کے پیچھے ایک تاریک سی گلی میں کنٹرول روم اور تقریریں کرنے کی کوٹھی۔ کوٹھی میں ریکارڈ بجانے کی دو فٹ چوڑی کالی میز۔ اسٹوڈیو میں جگہ جگہ چھپی ہوئی سیلن پائی۔ دیوار کے ساتھ لکڑی کا ایک تخت اس پر ایک غلیظ اور کثیف تکیہ، چپاتی بنا ہوا۔ پیچھے دیوار اس پر میل کے بڑے بڑے دھبے جو تخت پر بیٹھنے والوں کے بالوں کے بدبودار تیل نے ڈال رکھے تھے۔

تخت کے آگے ایک گھڑونچی پر ایک مائیکروفون، سارس کی طرح گردن نکالے ہوئے ڈیڑھ ٹانگ پر کھڑا۔ یہ مائیکروفون یوں گردش کرتا تھا جیسے کسی بھنگڑ خانے میں بھنگیڑیوں کا حقہ۔

ادھر ادھر دو چار ٹوٹی ہوئی کرسیاں مگر ایسی بے ترتیبی سے بکھری ہوئی جیسے کوئی ہارا ہوا جواری انہیں غصے میں آ کر پٹخ گیا ہو۔

اسٹوڈیو کے ساتھ ہی پاخانہ تھا۔ حکم اس پاخانے کے متعلق یہ تھا کہ پروگرام کے دوران میں کوئی شخص اس کو استعمال نہ کرے اور اگر کرے تو زنجیر نہ کھینچے کیونکہ دیوار ہم گوش دیوار۔

خان صاحب عبدالکریم خان ہوں یا سرچمن لال، ہومی موڈی ہوں یا سندرابائی، سب اس برآمدے میں جہاں سینگ سمائیں آ کر بیٹھ جاتے تھے اور باری باری اسٹوڈیو کے اندر جا کر مائیکروفون کی کلیا میں گڑ چھوڑ آتے تھے۔

دیسی گانے کا پروگرام ساڑھے نو بجے شروع ہوتا تھا اور گیارہ بجے جاکے ختم ہوتا تھا۔ سارے پروگرام میں گانے والا صرف ایک ہی گویا ہوتا تھا۔ اس گویے کے آگے مائیکروفون رکھ کر لوگ اپنے اپنے گھروں میں کھانا وانا کھانے چلے جاتے تھے۔ گیارہ بجے لوٹ کر آتے تھے اور اسٹوڈیو کی بزم شراب و کباب میں شریک ہوتے تھے۔

مجھے بمبئی کا اسٹوڈیو گرتی ہوئی دیوار نظر آیا۔ مرمت اس کی ناممکن تھی ہاں یہ ممکن تھا کہ یہ دیوار ڈھائی جائے اور اس کی جگہ نئی دیوار کھڑی کی جائے۔

اتفاق کی بات انہی دنوں کوئنز روڈ میرین ڈرائیو پر مرکزی حکمت کے زیر اہتمام اکاؤنٹینٹ جنرل کا دفتر بن رہا تھا۔ اکاؤنٹینٹ جنرل سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ عمارت اکاؤنٹینٹ جنرل کی ضروریات سے بڑی ہے۔ اب اگر کوئی اور مرکزی محکمہ بمبئی میں بے گھر ہو تو اس کی سمائی یہاں ہوسکتی ہے۔

میں نے فیلڈن کو بلا کر زیر تعمیر عمارت دکھائی۔ ہم دونوں اتنے خوش ہوئے کہ رات کو جشن مہتاب منایا اور اگلے دن سے کاغذی گھوڑے دوڑانے شروع کردیے۔

سرکار نے ہماری تجویز پر صاد کیا اور ہم کو اس وسیع اور عالی شان عمارت کے ایک بازو میں دو منزلیں براڈ کاسٹنگ ہاؤس کے لئے مل گئیں۔ اوپر کی منزل میں اسٹوڈیو اور نیچے کی منزل میں دفتر۔

اوپر کی منزل کی بغل میں دو عالی شان فلیٹ تھے ایک اکاؤنٹینٹ جنرل کے لئے تھا اور دوسرا خالی۔ خانہ خالی را دیوی گیرد، مجھے دوسرا فلیٹ مل گیا۔ بمبئی میں سمندر کے کنارے پر ایسا فلیٹ اور وہ بھی ایک ہزار روپے ماہوار پانے والے اسٹیشن ڈائریکٹر کو ملے اگر جسے اللہ دے۔

بس اب میں نے اسٹوڈیو کی تیاری میں رات کی نیند اور دن کا آرام اپنے اوپر حرام کرلیا اور آخر میں اسٹوڈیو بھی وہ بنا کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ پاکستان میں آکر میں نے جتنے اسٹوڈیو بنائے ان سب میں بمبئی کے اسٹوڈیو کا رنگ جھلکتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب آپ براڈ کاسٹنگ ہاؤس کے اسٹوڈیو میں جائیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی جہاز میں آ گئے ہوں اور جہاز سمندر کی لہروں کو چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔

اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ لندن میں بی بی سی کے صدر دفتر کا نقشہ دیسے تو لارڈ ریتھ نے منظور کیا تھا لیکن اس نقشے کی تیاری میں بی بی سی کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل، کاربن ڈیل کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ یہ صاحب نیوی کے ایڈمرل یعنی امیرالبحر تھے۔ ان کے دماغ میں ساری عمر کی جہازرانی کی مناسبت سے بی بی سی کی عمارت کا نقشہ جہاز کی شکل میں ڈھل کر آیا اور اسی نقشے کے مطابق بی بی سی کی عمارت تیار ہوئی۔

کچھ تو بی بی سی کی عمارت میرے دماغ پر مستولی تھی اور کچھ مجھے بمبئی کی بندرگاہ کی مناسبت کا خیال تھا، میں نے بھی بمبئی کے اسٹوڈیو کا جو نقشہ تیار کیا وہ جہازی شکل میں نمودار ہوا۔

نئے اسٹوڈیو کا تصور میرے دل کو خوش کررہا تھا لیکن جب میں لوگوں کی برسوں پرانی عادتوں کو دیکھتا تھا تو ساری خوشی زائل ہوجاتی تھی۔ پان کھا کھا کر جگہ جگہ تھوکنا، زور زور سے ڈکاریں لینا، اسٹوڈیو میں دھواں دھار سگریٹ پینا ان لوگوں کی عادت میں داخل ہوچکا تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی گانے بجانے والے بھی یہی حرکت کرتے تھے۔ دھوتی اٹھا کر ران کو کھجانا تو گویا ان کی صحت کے لئے مفید تھا۔ رفع حاجت کے وقت جنیو کو کان میں لپیٹنا اور پھر گھٹنوں لپیٹے رکھنا داخل عبادت تھا، گویے کا پروگرام کے انتظار میں بیٹھ کر چرس بھرا سگریٹ پینا گویا آداب موسیقی میں شامل تھا۔ آرٹسٹوں میں رشوت لینا گویا ریڈیو والوں کے لئے شیر مادر تھا۔ حق الخدمت وصول کرانے کیلئے آرٹسٹوں کا دس دس پھیرے کرنا گویا پروگرام کا ضروری حصہ تھا۔ آرٹسٹ کی مزدوری میں نصف کا حصہ دار اکاؤنٹینٹ، آرٹسٹ کے پلے روپے میں چار آنے پڑتے تھے۔

جب میں نے صفائی اور وقت کی پابندی پر زور دیا تو لوگوں نے کہا یہ انگریز بنتا ہے۔ سیٹھنا کے اکسانے پر اخبار تو میرے خلاف پہلے ہی سے بھرے بیٹھے تھے، انہیں موقع ہاتھ آیا۔ میرے خلاف مراسلات اور مضامین شائع ہونے لگے کہ یہ شخص بڑی انگریزیت بگھارتا ہے۔ اسے یہ نہیں معلوم کہ یہ ہندوستان ہے۔ ہندوستان کے ہندوستانیوں کو انگریز بنانا ملک اور قوم کے مفاد کے خلاف ہے۔

جب معاملہ حد سے گزر گیا اور ہارنی مین، ٹینٹس، کرنجیا، کراکا کے ساتھ ٹائمز آف انڈیا بھی میرے پیچھے پڑ گیا تو میں نے ایک پریس کانفرنس بلائی اور اپنے اعمال کی کیفیت پیش کی۔ ایک تو صحافی اور پھر اس زمانے کے بمبئی کے صحافی، ایسے ایسے سوال کئے کہ توبہ۔

ایک صاحب نے کہا، تم جانتے ہو کہ ہم ہندوستانی لوگوں کا رہن سہن کیسا ہے۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ ہمارے پاس سواری کا معقول بندوبست نہیں۔ اس کے باوجود تم وقت کی پابندی اور صفائی کے معاملے میں انگریز کو خوش کرنے کے لئے غریب ہندوستانیوں پر آفت کیوں ڈھا رہے ہو۔

میں نے عرض کیا کہ صاحب میں انگریز کو خوش کرنے کے لئے نہیں پابندی وقت اور صفائی کے معاملے میں اسلام کو خوش کرنے کیلئے کوشاں ہوں۔

یہ جواب سن کر غیر مسلم صحافیوں کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور میرے ہونٹوں پر تبسم رقص کرنے لگا۔

خدا "بے گھڑی موج" کے ایڈیٹر، شیدا کو جنت نصیب کرے، یہ مرد مجاہد اس بھرے مجمع میں اٹھا اور اس زور سے سبحان اللہ کا نعرہ بلند کیا کہ غیر مسلم صحافی دہل کر رہ گئے۔

پریس کانفرنس میں چائے ضرور پلائی جاتی ہے، چنانچہ چائے آئی اور پیالیاں گردش کرنے لگیں۔ ہر چند کہ چائے میں شکر کافی تھی پھر بھی اکثر ہندو حضرات کو چائے سخت پھیکی لگی۔

عام طور پر تو پریس کانفرنس میں اچھی خاصی گہما گہمی ہوتی ہے لیکن چائے پیتے وقت یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی سوگ منایا جارہا ہے۔ سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ کبھی لوگ میری طرف دیکھیں اور کبھی انکھیوں سے شیدا کی طرف اور کبھی آپس میں ایک دوسرے کی طرف۔

خدا خدا کرکے چائے ختم ہوئی اور پریس کانفرنس بھی۔ شیدا سب سے آخر میں رخصت ہوا اور رخصت ہوتے وقت مجھے گلے سے لگا لیا۔ شیدا کا جسم ٹھنڈا ہوچکا ہے مگر میں ابھی تک اس گرمی کو محسوس کررہا ہوں جو شیدا نے گلے لگا کر میرے جسم میں بھر دی تھی۔

اگلے دن اخباروں میں بخاری ہی بخاری تھا۔ متعصب بخاری، کٹر بخاری، مسلم لیگی بخاری، اورنگزیب بخاری، محمود غزنوی بخاری، ایک ٹائمز آف انڈیا تو چپ تھا مگر باقی اخباروں نے میرے لتے لے ڈالے۔ شور یہاں تک بلند ہوا کہ مرارجی ڈیسائی اور کنہیالال منشی بھی چونک اٹھے اور ہمیں دربار میں طلب کیا گیا۔

اس زمانے کی کانگریس کی حکومت میں یاسین نوری بھی وزیر تھے۔ میں نے انہیں ٹیلی فون کیا اور پوچھا کہ کیوں بھائی کفن سر پر باندھ کر آؤں یا سر ہتھیلی پر رکھ کر۔ کہا سر ہتھیلی پر رکھ کر۔ میں اشارہ پا گیا اور زمین کے سینے پر لاتیں مارتا ہوا منشی کے کمرے میں داخل ہوا۔

میں بہت عاجز انسان ہوں، محض مصلحت کی بنا پر رعب ڈالنے کیلئے یہ اکڑفوں اختیار کرلی تھی، مگر واہ رے منشی! میں دندناتا ہوا اس کے کمرے میں گیا مگر اس نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ کاغذات پڑھنے میں ہی مشغول رہا۔ پڑھتے پڑھتے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ بیٹھ جاؤ۔ میرا ایکٹنگ سب اکارت گئی اور میں یوں کرسی پر بیٹھ گیا جیسے کوئی بھیگا ہوا کپڑا پرات میں ڈال دیا جائے۔

کافی دیر میں خاموش بیٹھا رہا اور کافی دیر منشی صاحب کاغذات کو الٹتے پلٹتے رہے۔ آخر فرمایا سناؤ ریڈیو کیسا چل رہا ہے۔ میں نے کہا صاحب ابھی تو چل نہیں رہا مگر چلے گا۔ کہا ہاں، مگر دیکھو زبان آسان ہونی چاہئے، بالکل آسان، جواہر لال کی زبان نہیں ہونی چاہئے۔ وہ "ہم بات۔ ہم بات۔ ہم بات" بولتا ہے۔ میں نے کہا صاحب یہ "ہم بات" کیا؟ میں سمجھا نہیں، فرمایا جب بھی اس کو کہنا ہو "ضروری بات" تو وہ "ہم بات" بولتا ہے۔ اب میں سمجھا کہ منشی صاحب کو پنڈت جی کی "اہم بات" "ہم بات" سنائی دی۔

منشی صاحب نے لیکچر پلانا شروع کیا اور فرمایا کہ عربی کے الفاظ زبان سے نکال دینے چاہئیں تاکہ عوام زبان کو سمجھ سکیں۔ میں نے کہا عربی کے عام الفاظ سے آپ کو بیر نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اگر ہم نے عربی کے الفاظ زبان سے خارج کردیے تو کئی وزیروں کو اپنے نام بدلنے پڑیں گے۔ فرمایا کیا مطلب؟ میں نے عرض کیا کہ آپ کا نام عربی ہے۔ منشی عربی کا لفظ ہے۔

اس پر یاسین نوری ہنس پڑا اور میں بھی۔

ہمیں ہنستا ہوا دیکھ کر منشی جی کا پارا چڑھ گیا۔ میز پر مکے مار مار کر فرمانے لگے کہ تمہاری کل کی پریس کانفرنس کا حال میں نے اخباروں میں پڑھا ہے، تم نے بہت سے ہندوستانیوں کے مذہب کی توہین کی ہے۔ زبان سنبھال کر بولا کرو۔ میں گورنمنٹ آف انڈیا کو خط لکھ رہا ہوں کہ تم سے کیفیت طلب کرے۔ ہم کو بمبئی میں ایسے آدمی کی ضرورت نہیں جو نفرت پھیلائے۔

یہاں ہمارا انٹرویو ختم ہوا۔ میں نے اس کی تفصیل دہلی لکھ بھیجی اور ساتھ ہی ایک خط مولانا ابوالکلام آزاد کو لکھا کہ سنبھالئے اپنے یاجوج ماجوج کو۔ میں دل میں خوب سمجھتا تھا کہ منشی جی نے اعلان جنگ کردیا ہے اور یہ بھی جانتا تھا کہ منشی صاحب کے مقابلے میں میری کوئی حقیقت نہیں مگر کرتا کیا، مسلمان سے ہندو تو ہو نہیں سکتا تھا اور نہ منشی کے لفظ کو ہندی کا لفظ ثابت کرسکتا تھا۔

دفتر میں جب یہ بات پہنچی کہ منشی صاحب نے بخاری کو لتاڑا ہے تو مہاشے بہت خوش ہوئے کہ بس اب بلا ٹلی۔ منشی اس کے پیچھے پڑ گیا ہے تو سمجھو کہ بیڑا پار ہے۔ باہر والوں کو تو میں سنبھال لیتا مگر گھر کے بھیدی لوگوں کا کیا علاج کرتا۔

دکرراؤ جیسا آدمی دنیا میں مشکل ہی سے نظر آتا ہے، پارسا، اہل دل، اہل بصیرت، اپنے کام کا ماہر۔ لوگ اس کو دیوتا مانتے تھے اور مانتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ شخص ہے بھی اسی قابل۔ دکرراؤ اولیائے اسلام کا دل سے مدح ہے۔ قناعت اور صبر اس کا شیوہ ہے۔ میں نے بارہا چاہا کہ اس کو ترقی مل جائے۔ میرے بعد بھی اس کی ترقی کے احکام جاری ہوئے مگر اللہ بس باقی ہوس، اس نے معذرت چاہی اور جہاں تھا وہیں بیٹھا رہا اور اب تک وہیں بیٹھا ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

دھولے کر البتہ منفی شخص تھا۔ متقی بھی اور بددیانت بھی۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے ہم نوالہ و ہم پیالہ لوگ محفل سے ایک ایک کرکے اٹھ رہے ہیں تو سنبھلا اور سیدھا میرے پاس آیا اور کہا کہ معاف کردو۔

میں نے کہا کہ اچھا تم کو معاف کردوں گا مگر ایک شرط پر اور وہ یہ کہ تم اپنے تمام گناہوں کا تفصیل وار اعتراف کرو۔

اللہ سب کا پردہ رکھے۔ میں خود بہت گنہگار انسان ہوں۔ اس کا پردہ فاش نہیں کرنا چاہتا تھا، میں صرف دفتر کے اندرونی حالات دریافت کرنا چاہتا تھا۔ میں نے جب دھولے کر سے کہا کہ اپنے گناہوں کا اعتراف کرو تو وہ شخص سکتے میں آ گیا اور یوں دیکھنے لگا جیسے اس کی آنکھیں پتھرا گئی ہوں۔ آخر اٹھا اور بولا اگر یہی شرط ہے تو مجھے معاف نہ کرو۔ یہ کہا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

اب میں سکتے میں آ گیا۔ اب میری آنکھیں پتھرا گئیں۔ اب میں اٹھا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ دھولے کر کی میز کے سامنے کھڑا ہوگیا اور اس سے کہا کہ میں نے تمہیں معاف کردیا۔

اس واقعہ کے بعد سے دھولے کر ایسا بدلا کہ کوئی اس کو پہچان نہ سکا۔

یہ کار تھے باصفا ہوگئے ہم
ترے عشق میں کیا سے کیا ہوگئے ہم

اللہ سب کو صراط مستقیم پر چلانے کی ہدایت فرمائے۔

انہیں دنوں میں ایک گجراتی ڈرامہ دیکھنے گیا۔ اس ڈرامہ کا نام تھا "آگ گاڑی" مجھے یہ ڈرامہ بہت پسند آیا۔ اس کا مصنف چندرودن مہتا تھا میں مہتا سے ملا اور اس کو عجیب و غریب انسان پایا۔ کھدرپوش، کوئی پینتیس چالیس سال اس کی عمر تھی مگر رگوں میں گویا پارا دوڑ رہا تھا۔ ادبی اور سیاسی دنیا میں اس کا بہت نام تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں اس نے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ میں نے اسے اگلے دن دفتر میں بلایا، چائے پلائی، دھڑا دھڑی باتیں کیں اور کہا کہ یہاں ریڈیو میں ملازمت کرلو۔ میرا یہ کہنا تھا کہ چندرودن نے زور کا قہقہہ لگایا اور کہا میں ایک آزاد شخص ہوں ہرگز نوکری کرنے کے قابل نہیں ہوں اور پھر سرکاری نوکری! یہ کہہ کر وہ پھر ہنسا اور ہنستے ہنستے مجھ سے رخصت ہوکر باہر چلا گیا۔

اب میں چندرودن کے پیچھے پڑ گیا۔ بھائی شید سے کہا کہ اس وحشی کو رام کرو۔ شیدا ہنسے اور فرمایا تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہوگیا۔ چندرودن نوکری کے جھنجھٹ میں کبھی نہیں پڑے گا۔ اور اگر تم نے اسے نوکر رکھا تو خود ڈسمس ہوجاؤ گے۔ یہ تو انڈر گراؤنڈ کام کرنے والوں میں سے ہے۔

انگریزوں کی جڑوں میں پانی دینے والا، ادیب، غیر متعصب ہندو، ڈرامے کا رسیا، اہل قلم میں محترم، باذوق، باون ترپن کتابوں کا مصنف، میں نے دل میں ٹھان لی کہ اس شخص کو ضرور ریڈیو کے بندھن میں جکڑوں گا۔

میں نے چندرودن کے ساتھ دوستی کی پینگیں بڑھا دیں اور آخر ایک دن اس کو نوکری کے موضوع پر گفتگو کرنے کے لئے گھیر گھار کر لے آیا۔ چندرودن نے کہا اچھا نوکری کروں گا مگر ایک شرط پر۔ میں نے کہا کیا۔ فرمایا منگل کے دن دفتر نہیں آیا کروں گا۔

میں نے پوچھا کیوں؟ کہا یہ میرا راز ہے۔ اسے راز ہی رہنے دو۔

میں یہ تو سن ہی چکا تھا کہ چندرودن انڈر گراؤنڈ کام کرنے والوں میں سے ہے۔ معاً مجھے شک گزرا کہ منگل کے دن تحریکی کام کرنے والوں کی کوئی خفیہ مجلس ہوتی ہوگی جس میں چندرودن کی شرکت ضروری ہے۔ ذرا سنبھل کر پوچھا بھائی یہ انڈر گراؤنڈ ادارہ کون چلاتا ہے۔ فرمایا میں چلایا کرتا تھا مگر اب نہیں چلاتا۔ میں نے کہا کیوں، اب کیوں یہ کام چھوڑ دیا؟

چندرودن کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ جب "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک زوروں پر تھی تو بمبئی کے چند پڑھے لکھے نوجوانوں نے کہا اب انگریز بھاگ گیا ہے، ہم انڈر گراؤنڈ رہ کر کیا کریں گے۔

یہ لوگ چھپ چھپ کر اشتہار اور خطوط چھاپتے تھے۔ چندرودن کا کام یہ تھا کہ ان اشتہارات وغیرہ کا پلندا انبالے پہنچا دے۔ انبالے سے کوئی اور شخص یہ پلندا وصول کرکے شملے پہنچایا کرتا تھا۔ اور وہاں یہ مواد گھر گھر پہنچایا جاتا تھا۔

چندرودن مسلمانوں کا بھیس بدل کر سفر کرتا تھا۔ باقاعدہ داڑھی اور سر پر پھندنے والی ترکی ٹوپی۔ ایک سفر کا قصہ یوں بیان کرتا تھا کہ میں بمبئی سے تھرڈ کلاس میں انبالے روانہ ہوا۔ تسبیح میرے ہاتھ میں تھی اور مصلیٰ میری بغل میں۔ میں راستے بھر نماز پڑھتا رہا اور تسبیح پھیرتا رہا۔ میرے ساتھ ایک سی آئی ڈی والا سفر کررہا تھا۔ بار بار میری طرف دیکھے لیکن میری کوئی حرکت اس کو ایسی نظر نہ آئے جس سے اسے پتا چل جاتا کہ میں ہندو ہوں، مسلمان نہیں۔ معلوم بھی اسے کیونکر ہوتا، کم بخت خود بھی تو ہندو تھا اور میری طرح مسلمانوں کے بھیس میں سفر کررہا تھا۔ آخر خدا جانے اسے کیا سوجھی ایک اسٹیشن پر اتر کر کباب لے آیا۔ ظاہر ہے کہ یہ کباب بڑے گوشت کے تھے۔ رکابی آگے بڑھا دی اور فرمایا کھائیے مولوی صاحب۔ میں بہت چکرایا مگر کر بھی کیا سکتا تھا۔ اٹھا باقاعدہ ہاتھ دھوئے۔ کلی کی اور بسم اللہ کہہ کر کباب کھانے لگا۔ اس نے بھی اب شرم میں آکر کباب اٹھایا۔ منہ میں ڈالا ہی تھا کہ بڑے زور کی ابکائی آئی اور بیماری کا بہانہ کرکے ایک طرف کو ہو بیٹھا۔ اس کے بعد وہ سی آئی ڈی والے صاحب میرے قریب نہ آئے۔

چندرودن ملازم ہوگیا۔ صبح سے شام تک دفتر میں رہتا اتوار کا دن بھی دفتر میں گزارتا مگر منگل کو غائب رہتا۔ اب میں اس ٹوہ میں رہنے لگا کہ یہ شخص منگل کے دن جاتا کہاں ہے۔ ایک دن میں نے چندرودن سے کہا کہ بھائی منگل کے دن تمہارے پیچھے کسی آدمی کو لگا دینا اور دریافت کرلینا کہ تم کہاں جاتے ہو کوئی بڑی بات نہیں مگر اس طرح کسی کا راز معلوم کرنا بڑی پست حرکت ہے۔ تم خود ہی بتا دو کہ یہ منگل کے دن تم کہاں جاتے ہو اور کیا کرتے ہو۔

فرمایا مجھے ایک لڑکی سے محبت ہے، آٹھ سال سے محبت ہے۔ ہفتے میں صرف ایک دن یعنی منگل کے دن ہم دونوں ملتے ہیں اور سارا دن ایک ہوٹل میں چائے کی میز پر بیٹھے باتیں کرتے رہتے ہیں۔

میں نے کہا تم کو اس لڑکی سے محبت ہے، آٹھ سال سے محبت ہے، تو تم اس سے شادی کیوں نہیں کرلیتے؟ کہا اس لڑکی کی شادی ہوچکی ہے۔ میں نے حیران ہوکر پوچھا شادی ہوچکی ہے؟ کس سے؟ کہا چاند سے!

یہ لڑکی ویسے تو ایم اے پاس تھی مگر اس کے دماغ کی یہ کیفیت تھی کہ اپنے آپ کو چاند کی بیوی سمجھتی تھی۔ چاند کی چودھویں کو اپنے مکان کی چھت پر پلنگ بچھا کر بیٹھ جاتی تھی اور ساری رات چاند سے باتیں کیا کرتی تھی۔

میں یہ سن کر ہنسا مگر چندرودن کی آزردگی دیکھ کر میری ہنسی تھم گئی۔ وہ غریب عجب مصیبت میں تھا نہ اس لڑکی کی محبت ترک کرسکتا تھا نہ اس لڑکی کو رام کرسکتا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا کہ میں اسی میں خوش ہوں کہ وہ ہر منگل کو مجھ سے ملتی ہے۔ اور سارا دن میرے ساتھ باتیں کرتی ہے۔

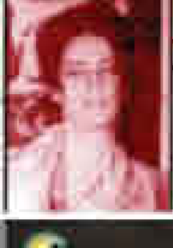
چندرودن اس لڑکی سے منگل کے دن ملنے جاتا تو کبھی کبھی اپنے ایک شاگرد کو بھی ساتھ لے جاتا۔ آخر ساڑھے نو سال کی منگلی ملاقات کے بعد وہ لڑکی چندرودن کے اس شاگرد کی بیوی بن گئی۔ اچانک۔ یہ نیک اور پاک لڑکی کنہیالال منشی کی صاحبزادی تھی۔ جی تو چاہا کہ منشی صاحب کے پاس جاؤں اور کہوں کہ صاحب یہ شادی "ضروری بات ہے" یا "اہم بات" مگر اس خیال سے نہ گیا کہ کہیں پھر "ہم بات" نہ کہنے لگیں۔ (جاری ہے)

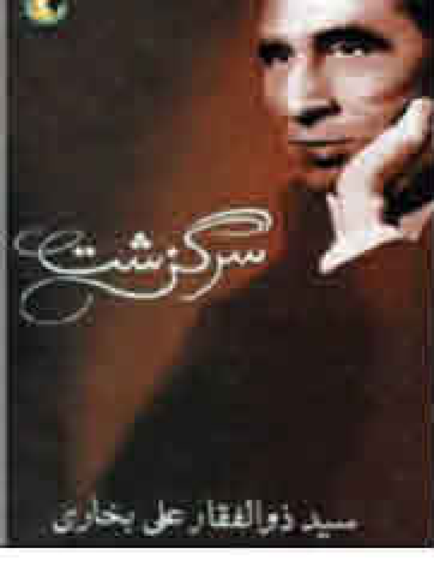
☆☆☆☆☆

پیر 07 اپریل 2014ء
روزنامہ امت کراچی / حیدر آباد

ریڈیو کی پہلی خاتون کارکن انگریز سرکار کی باغی تھی

مہرا مسانی ماہر تعلیم سر رستم مسانی کی بیٹی تھی - صحافیوں - قومی رہنماؤں اور ادیبوں سے میری دوستی اسی کی وساطت سے ہوئی - سروجنی نائیڈو ریڈیو پر فی البدیہہ تقریر کیلئے ہر وقت تیار رہتیں - "ہندوستانی کیا ہے" پروگرام میں اردو کا بول بالا رہا - زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس





ایک دن مجھ سے کسی نے کہا کہ ایک نوجوان لڑکی ریڈیو میں نوکری کرنا چاہتی ہے۔ لڑکی اور ریڈیو میں ملازمت! بات سمجھ میں نہ آئی۔ یہاں تو رات کے گیارہ بجے تک کام ہوتا ہے۔ رات کے گیارہ بجے تک ایک دوشیزہ گھر سے باہر کیوں کر رہے گی اور پھر کام ختم کرنے کے بعد رات کے گیارہ بجے اکیلی گھر کیسے جائے گی۔ میں نے کہا نا بابا۔ یہ انہونی بات ہے۔ کون جوان جہاں لڑکی کی ذمہ داری لے!

یہ زمانہ 1937ء کا ہے۔ اب زمانہ کتنا بدل گیا ہے کہ کسی لڑکی کا لڑکوں کے دوش بدوش کام کرنا اچنبھے کی بات نہیں۔ بلکہ اب تو کسی پڑھی لکھی کا گھر میں بیٹھے رہنا اچنبھے کی بات ہے۔

ایک پیڑھی میں اتنے نمایاں فرق کی مثال شاید تاریخ میں کہیں نہ ملے۔ مگر ہم کب تک اور ہماری رباعیاں کب تک؟ جو ہونا ہے ہو کر رہے گا۔ وقت کے بڑھتے ہوئے ریلے کو نہ قدامت پرستی کی دیواریں روک سکتی ہیں، نہ تاریخ کی بھاری زنجیریں۔

جب جانے پہچانے لوگوں نے بار بار اس لڑکی کا ذکر کیا تو میں نے اس کو انٹرویو کے لیے بلایا۔ اس لڑکی کا نام مہرا مسانی تھا۔ لندن کے مدرسہ اقتصادیات سے اعلیٰ درجہ کا امتحان پاس کر کے آئی تھی۔ پروفیسر ہیرلڈ لاسکی کے خاص شاگردوں میں سے تھی۔ ماہر تعلیم سر رستم مسانی کی بیٹی تھی اور مشہور مصنف اور مشہور سیاسی کارکن مینو مسانی کی بہن تھی۔ سی سی مہتہ کے ساتھ انگریزوں کے خلاف انڈر گراؤنڈ کام کرنے والوں میں پیش پیش رہی تھی۔ سادہ، سلیقہ مند، باذوق، سانولا رنگ، چھریرا جسم، سوتی ساڑھی میں ملبوس، ہونٹ لپ اسٹک کے لیپ سے بے نیاز، گالوں پر غازے کی تمتماہٹ کے بجائے شرافت کی تمازت!

یہ لڑکی کمرے میں داخل ہوئی تو میں رسمی طور پر نہیں بلکہ واقعی احتراماً کھڑا ہو گیا۔ اس کو کرسی پر بٹھایا اور چھوٹتے ہی پوچھا تمہارا نام کیا ہے؟ کہا کہ مہرا مسانی۔ میں نے کہا اچھا مہرا۔ میں تم کو مہرا ہی کے نام سے پکاروں گا۔ میں تم سے کوئی خاص بات پوچھنا نہیں چاہتا۔ جو کچھ مجھے پوچھنا تھا اس کا جواب مجھے مل گیا۔ اب صرف یہ بتاؤ کہ تم یہاں مردوں میں اپنے آپ کو سنبھال لو گی یا تمہیں کسی انا کی ضرورت ہوگی؟ فرمایا یہاں ریڈیو میں بہت سی ذمہ داریاں مجھ پر ڈالی جائیں گی، انا کو اٹھائے اٹھائے پھرنے کی ذمہ داری کا اضافہ کیوں کرتے ہو؟ - مہرا مسانی ریڈیو میں ملازم ہو گئی۔ آج شاید آل انڈیا ریڈیو میں ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل ہے۔

انگریزی تقریروں کا شعبہ مہرا مسانی کے سپرد کیا گیا۔ بہت خوب کام کرتی رہی۔ تقریر کرنے والے اس کی رائے کا بہت احترام کرتے تھے۔ اور تقریر کے مسودے میں جو تبدیلی مہرا مسانی کر دے، قبول کر لیتے تھے۔ حقیقت ہے کہ وہ تبدیلی ہوتی بھی مناسب تھی۔

ایک مرتبہ ہم نے انگریزی میں تقریروں کا ایک سلسلہ "دوبدو" کے نام سے شروع کیا۔ اس کے ذیلی عنوان کچھ ایسے تھے: "ساس کی طرف سے بہو کے نام" - "بہو کی طرف سے ساس کے نام" - "اشتراکی کی طرف سے اعتدال پسند کے نام" اور "اعتدال پسند کی طرف سے اشتراکی کے نام" وغیرہ وغیرہ۔ اشتراکی خیالات رکھنے والا بہترین مقرر ہماری رائے میں مینو مسانی تھا اور اعتدال پسندوں کی نمائندگی کرنے والا بہترین شخص سر چمن لال سیتلواد۔ سر چمن لال نے پہلے تقریر کی اور اس کا جواب شعلہ جوالہ مینو مسانی نے دیا۔ مینو نے چمن لال کو سامنے رکھ کر اعتدال پسندوں کو خوب کھری کھری سنائیں۔ ایسی کھری کھری کہ سر چمن لال بلبلا اٹھے اور نہایت سخت شکایت کا خط سرکار دہلی کو لکھا۔

اتفاق سے میں ان دنوں دورے پر دہلی گیا ہوا تھا۔ اس لیے مینو مسانی کے مسودے کے قابل نشر قرار دینے کی تمام تر ذمہ داری مہرا مسانی پر عائد ہوئی۔ سرکار نے مہرا مسانی سے پرسش کی تو اس نے ایسا زنانے کا جواب دیا کہ جناب سر فریک نائس کے کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکیاں خود بخود بند اور بند کھڑکیاں خود بخود کھل گئیں۔ مہرا کا جواب یہ تھا کہ تقریر میں کہیں بھی سر چمن لال کا ذکر نہیں۔ اعتدال پسندی کا ذکر ہے۔ اگر سر چمن لال اپنے آپ کو مجسم اعتدال پسند سمجھتے ہیں تو اور بات ہے۔ ورنہ ان کو ایک غیر مرئی، ایک غیر مجسم شے، ایک تصور، ایک خیال، ایک نظریہ کی درگت پر اس قدر تیخ پا نہیں ہونا چاہئے۔ مزید یہ کہ میرے سیاسی خیالات وہی ہیں جو میرے بھائی کے ہیں۔ اگر سرکار کو یہ خیال پسند نہیں تو آئندہ میرے سپرد کوئی سیاسی تقریر نہ کی جائے۔

سی سی مہتہ اور مہرا مسانی کا ریڈیو کے زمرے میں شامل ہونا میرے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ ان کی وساطت سے شہر کے صحافیوں، قومی رہنماؤں، اور ادیبوں میں میری دوستی ہوئی اور اخبارات نے میرے خلاف جو طوفان اٹھا رکھا تھا، جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

ریڈیو کی تقریروں کا پروگرام چھ چھ مہینے پہلے سے تیار ہو جاتا تھا۔ ریڈیو والوں کو یہ اندازہ لگانا پڑتا تھا کہ چھ مہینے کے بعد لوگوں کا موڈ کیا ہوگا۔ سیاسی حالات کیا ہوں گے۔ سماجی مسائل کیا ہوں گے؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ اندازہ اکثر غلط نکلتا ہے۔ ملک میں سیلاب آ گیا ہے اور تقریر نشر فرما رہے کہ ہمارے یہاں پانی کی کمی کی وجہ سے زراعت کا کام حسب دل خواہ نہیں ہو سکتا۔ ملک میں وزارتیں دھڑا دھڑ یکے بعد دیگرے بدل رہی ہیں اور ہم تقریر نشر کر رہے ہیں کہ ملک کے استحکام کے لئے ہم کو زیادہ سے زیادہ انکم ٹیکس دینا چاہئے۔ مشرقی پاکستان میں نمک کا قحط پڑا ہوا ہے اور ہم اس بات پر سارنگیاں، طبلے اور بغلیں بجا رہے ہیں کہ تجارتی معاہدے کی رو سے پاکستان جاپان کے ہاتھ دس لاکھ ٹن نمک فروخت کرے گا۔

سنا ہے علی گڑھ مرحوم کے ریلوے اسٹیشن پر ایک شخص دال روٹی بیچا کرتا تھا۔ کسی نے اس کو صلاح دی کہ مسافروں کو پوسٹ کارڈوں کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ دال روٹی کے ساتھ پوسٹ کارڈ بھی بیچا کرو۔ اس غریب نے صلاح مان لی اور دال روٹی کے ساتھ پوسٹ کارڈ بھی رکھ لئے اور صدا لگائی "دال روٹی پوسٹ کارڈ"۔

ریڈیو کی تقریر یا اور کوئی پہلے سے وضع کیا ہوا پروگرام اگر وقتی ماحول کے ساتھ لگا کھائے تو مزہ دے جاتا ہے، ورنہ سخت بے ہنگم معلوم ہوتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ "دال روٹی پوسٹ کارڈ" ہو کر رہ جاتا ہے۔

جناب خواجہ ناظم الدین کو ایک مرتبہ ملک کے سربراہ کی حیثیت سے ڈھاکہ عام جلسے میں تقریر کرنی تھی۔ شامیانے، جھنڈیاں، کرسیاں، صوفے، شہ نشین اور پولیس ریلنگ غرض کہ تمام انتظامات مکمل ہو گئے تھے کہ اتنے میں کالے کالے بادل افق سے اٹھے اور تمام آسمان پر چھا گئے۔ بادل کی گرج اور بجلی کی چمک سے سب کے دم خشک ہو گئے تھے۔ میں خواجہ صاحب کی تقریر کے سلسلے میں ڈھاکہ گیا ہوا تھا اور خواجہ صاحب کی سرگرمیوں کی رپورٹ ریڈیو پاکستان کے خبروں کے محکمے کو کراچی بھیج رہا تھا۔ میں نے خبر بھیجی کہ جلسے کے تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ خواجہ صاحب تشریف لانے والے ہی ہیں، لیکن گھٹا برسنے کو تلی کھڑی ہے، بادل گرج رہے ہیں، بجلی چمک رہی ہے، کوندا لپک رہا ہے۔ اگر بارش ہو گئی تو سب پروگرام درہم برہم ہو جائے گا۔ لوگ باگ دعائیں مانگ رہے ہیں کہ بادل چھٹ جائیں یا کم از کم جلسے کے اختتام تک برسنے کا ارادہ ملتوی کر دیں۔

ریڈیو کی گھنڈی گھمائی کہ سنو کراچی سے یہ خبر نشر ہو رہی ہے یا نہیں۔ وہاں سے میری بھیجی ہوئی خبر تو کیا نشر ہوتی، عباس الدین مرحوم کے گانے کا ریکارڈ نشر ہو رہا تھا۔

اللہ میگھ بھیج دے اللہ پانی بھیج دے

تقریروں کا پروگرام وضع کرنے میں ایک اور بھی دقت ہوتی ہے اور وہ یہ کہ قومی ضروریات کے پیش نظر زراعت اور مالیت اور اقتصادیات وغیرہ پر تقریروں کا پروگرام مرتب کیا جاتا ہے۔ یہ موضوعات بہت اچھے ہیں۔ ان موضوعات کو پروگراموں میں دیکھ کر اخبارات داد تو نہیں دیتے، لیکن خاموش ضرور ہو جاتے ہیں اور ویسے بھی ریڈیو والوں کا راج دربار میں بڑا نام ہوتا ہے کہ دیکھو کیسے اچھے مضمونوں پر تقریر کر رہے ہیں۔ لیکن ریڈیو والوں کو وقت یہ آن پڑتی ہے کہ وہ تقریریں کرائیں کس سے؟ لامحالہ قرعہ فال ان افسروں کے نام پڑتا ہے جو متعلقہ وزارت میں کام کر رہے ہوں۔ یہ حضرات مضمون سے تو واقف ہوتے ہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ ریڈیو کی تقریر لکھنے میں اور دفتری نوٹ لکھنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ یہ حضرات عام طور پر اہل قلم دان تو ہوتے ہیں لیکن اہل قلم نہیں ہوتے۔ ریڈیو کیلئے بھی ایک دفتری قسم کا نوٹ لکھ کر لے آتے ہیں۔ ایسا نوٹ جسے لکھنا آسان ہوتا ہے مگر پڑھنا مشکل۔ اور سننا اس سے بھی زیادہ دشوار۔ اب مائیکروفون پر بھری مجلس میں گوشوارہ کون پڑھ سکتا ہے اور اگر پڑھ بھی لے تو ایسے جیوٹ کہاں سے آئیں جو اس گوشوارے کو سن بھی لیں۔

خیر یہ تو ہوا تحریر کا قضیہ۔ تقریر کرنے والے کی آواز اور اس کے لہجے کا مسئلہ اس سے بھی زیادہ پیچیدہ ہوتا ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ افسر حضرات اپنے نادر خیالات مائیکروفون پر پڑھتے وقت یا تو روتے ہیں یا گاتے ہیں۔ بے چارہ پروگرام اسسٹنٹ کرے تو کیا کرے۔ سر پر کھڑے اس غریب کی زبان سوکھتی ہے۔ ڈرتا ہے کہ کل کلاں کو یہی ٹھوس مائع گیس کے محکمے کا افسر ہماری وزارت کا افسر بن گیا تو کیا ہوگا۔

تقریروں کا پروگرام وضع کرنے کی دقتوں کے پیش نظر ہم نے یہ انتظام کیا کہ تقریروں کا یہ مصلحتی پروگرام تو چلتا رہے اس کے ساتھ ہی تقریروں کا ایک اور پروگرام بھی چلایا جائے جو مصالحتی ہو۔ یعنی اس دوسرے پروگرام میں پہلے موضوع تلاش نہ کئے جائیں بلکہ ایسے مقرر تلاش کئے جائیں جو لکھ بھی سکیں اور بول بھی سکیں۔ اور پھر یہ لوگوں میں مشہور بھی ہوں۔

اب ہم نے ناموں کی فہرست بنانا شروع کی۔ سروجنی نائیڈو، ڈاکٹر راجندر پرشاد، اے کے دہلوی، قائد اعظم، جواہر لال نہرو، اچاریہ کرپلانی۔ یہ سب اس فہرست میں شامل تھے۔

سب سے آسان کام سروجنی نائیڈو کو تقریر کے لئے آمادہ کرنا تھا۔ ایک تو اس لئے کہ ان کو اکثر پیسوں کی ضرورت رہتی تھی۔ دوسرے اس لئے کہ فی البدیہہ بولتی تھیں۔ ان کی تقریر ریکارڈ کر لی جاتی تھی اور کیا مجال کہ ایک لفظ ادھر سے ادھر کرنے کی ضرورت پڑے۔ ایک مرتبہ اسٹوڈیو میں تشریف لائیں تو تابڑ توڑ تین تقریریں ریکارڈ کرا ڈالیں۔ ایک گاندھی جی کے جنم دن کے لئے، ایک عورتوں کے لئے اور ایک اسکول کے بچوں کے لئے۔

پنڈت جواہر لال نہرو کو رام کرنا البتہ مشکل کام تھا۔ ایک دن میں کرشنا ہاتھی سنگھ کے یہاں ان سے ملنے گیا اور گھیر گھار کر ان کو اسٹوڈیو میں لے آیا۔ کنٹرول روم والوں سے میں نے کہہ دیا تھا کہ ریکارڈ کرنے کا بندوبست کر رکھیں اور جس جس اسٹوڈیو میں پنڈت نہرو جائیں، اس کی آواز کان لگا کر سنتے رہیں۔ اگر پنڈت جی تقریر کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو تقریر ریکارڈ کر لیں۔

جس وقت پنڈت جی اسٹوڈیو میں آئے، اس وقت اسکولوں کے لئے پروگرام براڈ کاسٹ ہو رہا تھا۔ میں انہیں ہر کمرہ میں گھماتا رہا اور آخر اس اسٹوڈیو میں لے آیا جہاں سر رستم مسانی بیٹھے تقریر کر رہے تھے۔ آنکھوں آنکھوں میں سر رستم اور پنڈت نہرو میں علیک سلیک ہوئی اور پھر میں نے تقریر کے ایسے مقام پر جہاں تقریر رک سکتی تھی، سر رستم کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا اور خود مائیکروفون پر جا کر اعلان کیا کہ پنڈت نہرو ہمارے اسٹوڈیو میں موجود ہیں، ہم ان سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ سے مخاطب ہوں۔ پنڈت جی سخت گھبرائے مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ کرسی پر بیٹھ گئے اور اٹک اٹک کر اور سوچ سوچ کر کوئی دس منٹ کی تقریر کی۔

کانگریسی حلقوں میں سروجنی نائیڈو کی تقریر کا تو پہلے ہی سے چرچا ہو چکا تھا، اب جو پنڈت نہرو نے تقریر کی تو اکثر اخبارات نے ریڈیو کی جے کا نعرہ لگایا۔ سروجنی اور پنڈت نہرو کا ریڈیو سے تقریر کرنا تھا کہ ہم کانگریسی حلقے میں مقبول ہو گئے۔ وہی اخبارات جو ہماری پگڑی اچھالتے تھے اب وہ ہمارے سر پر سہرے باندھنے لگے۔

کانگریسی زبان یعنی ہندوستانی کے خلاف تو میرا خون کھول ہی رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ ہندوستانی زبان پر تقریریں کرائی جائیں۔ کانگریسی تو اس موضوع پر ضرور بولیں گے، ان کے مقابلے میں ہم اردو کے حامیوں کو لا کھڑا کریں گے اور دیکھیں گے کہ میدان کس کے ہاتھ رہتا ہے۔

منگل/08اپریل 2014ء
روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

یوم اقبال پر سردار جعفری نے مشاعرہ لوٹ لیا



آپ نے یہ مشہور شعر ضرور سنا ہوگا:

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

لیکن اب عمر یوں ہی تمام نہیں ہوتی۔ اب تو:

سکوت شام سے تا نغمہ سحر گاہی
ہزار مرحلہ ہائے فغان نیم شبی

میری زندگی بھی کچھ ایسی ہی رہی ہے۔ یعنی مجھے بھی سکوت شام سے نغمہ سحر گاہی تک فغان نیم شبی کے ہزاروں مرحلے طے کرنے پڑے ہیں۔ لیکن خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ آخر کار نغمہ سحر گاہی سننا نصیب ہوا۔

چوں عشق حرم باشد سہل است بیابانہا

حرم تک پہنچنے والے کو لق و دق صحراؤں سے گزرنا ہی ہوتا ہے۔ اس کا شکوہ کیا اور شکایت کیسی؟

وہ بدو لوگ مجھے اب یاد بھی نہیں آتے جنہوں نے سفر کے دوران میں مجھے لوٹا۔ صرف ان لوگوں کی یاد سے دل گرم ہے جنہوں نے مسافر نوازی برتی۔ مجھے بدوؤں سے کوئی شکایت نہیں، ان لوگوں کی یاد میں آنکھیں پرنم ہیں جنہوں نے زندگی کے صحرا میں میری رہنمائی کی۔ خدا ان کا بھلا کرے۔ ورنہ کیا معلوم کہاں کہاں بھٹکتا پھرتا۔

جب میں بمبئی کے سینٹ جارج اسپتال میں بیمار پڑا تھا تو میری عیادت کو بہت سے مسافر نواز آئے۔ ان میں ایک صاحب ایم ای اے قزلباش بھی تھے۔ میں ان کو جانتا نہیں تھا۔ مگر خدا جانے ان کے نام کے کارڈ میں کیا جاذبیت تھی کہ میں نے ملازم سے کہا کہ بلا لو۔ ان کے کارڈ پر قزلباش "کیو" سے نہیں بلکہ "کے" سے لکھا تھا۔ چنانچہ ان کے نام کے پہلے حروف اور قزلباش کا "کے" مل کر لفظ "میک" بنتا تھا، جس کے معنی کمزور اور نحیف کے ہیں۔ شاید مجھے نحیف اور کمزور کا انگریزی ترجمہ دیکھ کر ہی خیال گزرا کہ ان صاحب سے ضرور ملنا چاہیے۔ خیر یہ صاحب آئے ان کو دیکھتے ہی میں نے سمجھ لیا کہ بھول ہوئی۔ یہ نہ تو نحیف تھے نہ کمزور۔ سخت قسم کے پٹھان اور پٹھان نما شخص تھے۔ رنگ گورا، قد لمبا، آنکھیں ہرن کی، ناک ایسی کہ دیکھتے ہی رہئے، کبھی ختم نہ ہونے میں نہ آئے۔ چال ایسی جیسے چھریرے جسم کا بھولو ہو، لباس ایسا جیسے درزی کے یہاں سے ابھی ابھی سل کر آیا ہو۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھ پر آنکھیں نکالیں اور فرمایا یہ کیا لغویت ہے، بمبئی آتے ہی بیمار ہوگئے اور آپریشن کرا بیٹھے۔ تم بمبئی میں آپریشن کرانے آئے ہو یا نوکری کرنے۔ بس جلدی ٹھیک ہو جاؤ اور دیکھو تم ہم سے ضرور ملنے آنا۔ ورنہ تم کو پھر اسپتال آنا پڑے گا۔ یہ کہا، میری پیشانی کو بوسہ دیا اور چلے گئے۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ تیز ہوا کا جھونکا کہاں سے آیا کہ اتنے میں دروازہ کھلا اور حضرت پھر وارد ہوئے۔ اب کے ان کے ہاتھ میں پھولوں کا گلدستہ تھا۔ فرمایا کہ یہ لو، یہ مرجھا جانے والے بیکار پھول تمہاری جاہل بھابی نے بھیجے ہیں۔ ان کو کسی گلدان میں رکھوا لو۔ یہ کہا اور دروازہ بند کر کے یہ جا وہ جا۔

اسپتال سے نکل کر میں پینگ چلا گیا اور واپس آ کر کام میں اس قدر محو ہوگیا کہ بیماری اور بیمار پرسی کرنے والے سب میرے ذہن سے اتر گئے۔ ایم۔ ای۔ اے قزلباش بھی۔ اب میری دنیا میں ریڈیو تھا اور اخبارات تھے۔ مولانا شوکت علی کے فرزند، بھائی زاہد سے مجھ رند کی پرانی ملاقات تھی۔ ایک دن ان سے ملنے کے لیے خلافت اخبار کے دفتر میں گیا اور وہیں عثمان سبحانی سے بھی متعارف ہوا۔ سبحانی خاندان کا نام خلافت کے زمانے سے سنتا چلا آ رہا تھا۔ اور یہ بھی جانتا تھا کہ سیٹھ عمر سبحانی نے اپنا سب کچھ خلافت کے نام پر لٹا دیا تھا۔ عثمان کو دیکھا تو مسلمانوں کے ایثار کی ساری تاریخ یاد آ گئی۔ بھائی عثمان نے باتوں باتوں میں کہا کہ میاں تم کو قزلباش بہت یاد کرتا ہے۔ اب مجھے وہ بیمار پرسی کرنے والا اکھڑ قزلباش یاد آیا۔ عثمان نے کہا، قزلباش کا نام سنتے ہی تمہاری حالت غیر کیوں ہوگئی۔ میں نے اپنی بیماری اور اسپتال میں قزلباش کے نزول اجلال کا سارا واقعہ سنایا اور بھائی زاہد اور بھائی عثمان بہت دیر تک ہنستے رہے۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ ہم سب اٹھ کر قزلباش کے یہاں چلیں۔

ہم کو دیکھ کر قزلباش نے اس قدر شور مچایا کہ پڑوس سے ڈاکٹر حمید (سپلا والے) اور ان کی بیگم، بھائی عثمان کی بیگم، دو چار ہمسائے، سب جمع ہو گئے۔ بس پھر کیا تھا، محفل جمی اور ایسی جمی کہ اب تک جمی ہوئی ہے۔ اللہ بھائی عثمان کو غریق رحمت کرے ان کی جگہ خالی ہے۔

ان سب لوگوں نے ریڈیو کے لتے لینے شروع کر دیے۔ ان میں پیش پیش بیگم گوہر قزلباش تھیں۔ ان حضرات کو ریڈیو پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ ریڈیو پر کلاسیکل موسیقی کی بھر مار ہوتی ہے۔ جس وقت یہ لے دے ہو رہی تھی، وہ وقت کلاسیکل موسیقی کا نہ تھا بلکہ غزل کا تھا۔ میں نے ان حضرات کو جھٹلانے کے لیے ریڈیو کی گھنڈی گھمائی، آواز آئی "اب آپ چھپے ہوئے پروگرام کے بجائے شری منگیشکر سے مرہٹی پدی سنیئے"۔ میں نے ہزار کوشش کی کہ ڈھیٹ بن جاؤں مگر نہ بن سکا۔ اپنی خفت کا اعتراف کرنا ہی پڑا۔ سزا میرے لیے یہ مقرر کی گئی کہ سارے مجمع کو خود کوئی غزل گا کر سناؤں۔

قزلباش فارسی بولتے تھے۔ گوہر قزلباش کی مادری زبان فارسی تھی۔ ان کی والدہ، خدا انہیں غریق رحمت کرے، ہز ہائی نس محمد شاہ آغا خان کی والدہ کے ساتھ ہندوستان آئی تھیں اور مزگاؤں میں رہتی تھیں۔ میں نے موقع شناسی سے کام لیا اور سعدی کی مشہور غزل، سرو سیمینا بصحرا می روی، ترنم سے پڑھ کر سنائی۔ میں کیا اور میرا ترنم کیا لیکن وقت کی بات، خوب ہی رنگ جما۔ مگر اس پر بھی میری خفت ابھی مٹی نہ تھی۔ جی چاہتا تھا کہ فوراً اٹھ کر جاؤں اور پوچھ گچھ کروں کہ چھپے ہوئے پروگرام میں تبدیلی کیوں ہوئی اور اگر ہوئی تو غزل کی جگہ غزل کیوں نہ نشر کی گئی۔ یہ مرہٹی پدی کیوں ٹھونس دیا گیا۔ لیکن پھر خیال کیا، چلو رہنے دو، دیکھو شاید دہلی سے کوئی غزل نشر ہو رہی ہو۔ ریڈیو کا رسالہ اٹھا کر دیکھا تو اس کے مطابق عین اس وقت مشہور قوال ولایت خان غالب کی غزل گا رہے تھے۔

سینہ کہ ہے دفینہ گہر ہائے راز کا

میری چڑھ بن گئی۔ میں نے کہا حضرات آپ لوگ بہت بے صبرے ہیں، بہت سست ہیں، ریڈیو کا رسالہ آپ کے یہاں آتا ہے مگر آپ دیکھتے نہیں کہ اس میں کیا کیا لکھا گیا ہے۔ اگر آپ رسالہ دیکھ لیں تو کسی نہ کسی اسٹیشن سے آپ کو اپنے مطلب کی چیز سننے کا موقع مل جائے۔ مثلاً دیکھئے اس وقت دہلی سے ولایت علی خان غزل گا رہے ہیں اور غزل بھی کس کی، غالب کی۔ سنئے یہ کہہ کر میں نے ریڈیو پر دہلی اسٹیشن لگایا وہاں ولایت علی خان کی آواز آئی۔

سنیہ کہ ہے دفینہ، گھر...... ہائے راز کا۔

ہاں ہاں گھر...... ہائے راز کا۔ اوہو ہو گھر...... ہائے راز کا۔ توبہ کیا عرض کروں پٹتے پٹتے بچا۔

یہ تھی قزلباش کے یہاں میری پہلی نشست، اس کے بعد تو یہ حالت ہوگئی کہ صبح شام کبھی وہ میرے یہاں اور کبھی میں ان کے یہاں۔ انہیں کی وساطت سے میں پہلی مرتبہ مہالکشمی گیا اور انہیں کے ساتھ پہلی مرتبہ ولنگڈن کلب اور سی سی آئی کے درشن ہوئے۔ ولنگڈن کلب تو ہم کبھی کبھی جاتے تھے لیکن سی سی آئی کا دورہ تقریباً ہر روز رہتا تھا۔ یہیں میری ملاقات بمبئی کے بڑے بڑے سیٹھوں سے ہوئی۔ یہ لوگ رمی اور برج کے بڑے رسیا تھے۔ کلب میں آتے تو ہلو ہلو کرنے کے فوراً بعد تاش کی میز پر بیٹھ جاتے اور ایسے محو ہوتے کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہتی۔ انہوں نے بہت چاہا کہ یہ بھی ہمارا تاش میں ساتھ دے مگر میری طبیعت اس طرف کبھی راغب نہ ہوتی تھی۔ میری سمجھ میں نہ جب آیا اور نہ اب آتا ہے کہ تاش کھیلتے وقت اگر ایک دوسرے کے پتے تاڑے نہ جائیں، اگر ایک دوسرے کو گپت اشارہ کر کے نہ بتائیں کہ اس موقع پر کونسا پتہ چلنا ہے تو کھیل کیوں کر ممکن ہو۔ میرے نزدیک یہ بہت ضروری ہے کہ تاش بانٹتے وقت ایسی ترکیب کی جائے کہ اچھے اچھے پتے اپنی طرف آ جائیں اور گھٹیا پتے حریف کے پلے پڑیں۔ میں نے یہ بھی سنا کہ جو لوگ اس فن میں مہارت رکھتے ہیں وہ اس مہارت کے لیے برسوں مشق کرتے ہیں۔ میں کہاں اور یہ وبال کہاں، چنانچہ آج تک کبھی تاش کھیلنے والوں نے مجھے اپنے قریب نہیں آنے دیا۔ ان سب کو یہ شکایت ہے کہ یہ پتے تاڑتا ہے یا اپنے پاڑی کو اشارے کرتا ہے۔ خدا لگتی کہتا ہوں کہ یہ شکایت ان کی جائز ہے!

سی سی آئی میں یہ حضرات تاش کھیلتے تھے اور میں بے کار مباش کچھ کیا کر والا کھیل کھیلتا تھا۔ اس میز پر بلایا جاتا تھا کبھی اس میز پر، کبھی اس کی چائے میں شریک اور کبھی اس کے شربت کا ساجھی۔ ایک دن شام کے وقت سی سی آئی کے چمن میں ایک بہت بڑا مجمع لگا ہوا تھا۔ میں بھی اس میں شریک تھا۔ اکل و شرب کی ان محفلوں میں قاعدہ ہے کہ آپ کا منگوایا ہوا دور ختم تو آپ کے ساتھ والا بیرے کو دوسرے دور کا حکم دے اور یوں یکے بعد دیگرے سب میزبانی کا حق ادا کریں۔ دور چلتا گیا لیکن ہر دور میں جب میری باری آتی تو میں چپکا ہو جاتا اور میرے ساتھ والا بیرے کو حکم دیتا۔

جی ایک دو دور ایسے چلے اور میں ٹس سے مس نہ ہوا تو سیٹھ مفت لال گگن لال نے مجھے مخاطب کر کے خالص بمبئی کے لہجے میں کہا، تو کیوں چپکا بیٹھا ہے۔ نہ کچھ کھاتا ہے نہ کھلاتا ہے نہ پیتا ہے، نہ پلاتا ہے۔ میں نے کہا، سیٹھ میں اس کلب کا ممبر نہیں ہوں۔ مجھے تو دوست اپنے مہمان کے طور پر یہاں لے آئے ہیں۔ پوچھا، تو ممبر کیوں نہیں؟ میں نے کہا، ظاہر ہے کہ ایک معمولی تنخواہ پانے والا سرکاری ملازم ہوں، مجھے یہ توفیق کہاں کہ کب کا چندہ دوں اور پھر روز کا سو پچاس خرچ کروں۔ ابو جسن والا اس زمانے میں کلب کے سیکریٹری تھے اور میرے خاص مہربان۔ انہوں نے میری طرف یوں دیکھا جیسے مجھے کچا کھا جائیں گے۔ مطلب ان کا یہ تھا کہ یوں اپنا بھانڈا پھوڑنا کہاں کی دانائی ہے۔

خیر بات آئی گئی ہوگئی مگر کوئی دو چار دن کے بعد مجھے ابو جسن والا کی طرف سے خط ملا کہ تم کلب کے ممبر منتخب ہو گئے ہو۔ میں نے ابو کو ٹیلی فون کیا کہ بھائی یہ کیسے۔ میں نے نہ تو درخواست دی اور نہ چندہ بھرا، پھر تم نے مجھے کیوں کر ممبر بنا لیا۔ کہا، کلب آؤ گے تو بات ہوگی۔ جب میں کلب گیا تو معلوم ہوا سیٹھ مفت لال گگن لال نے میرا چندہ بھرنا چاہا، مگر ابو نے ان سے کہا کہ بخاری نے چندہ بھر دیا ہے۔ بخاری کہاں سے چندہ بھرتا۔ یہ چندہ ابو نے اپنی جیب سے ادا کیا تھا۔ سیٹھ مفت لال نے یہ سنا تو ابو جسن والا سے کہا کہ میں سمجھ گیا۔ اب ایسا کرو بخاری کے تمام بل میرے نام بھیج دیا کرو۔ میں سیدھا مفت لال کے پاس گیا اور کہا یہ بوجھ وہ کیوں برداشت کرے گا؟ فرمایا ارے میں ہر روز رمی میں دو چار ہزار روپے کا ہیر پھیر کرتا ہوں، اگر تم کلب میں آ کر سو پچاس خرچ کر جاؤ گے تو کیا آفت آ جائے گی۔ اس کے بعد میرا کلب جانا چھوٹ گیا۔ میں نے پھر سی مہتہ اور دنکر راؤ کے دامن اور بیگم قزلباش کے قدموں میں پناہ لی۔

قزلباش صاحب کے گھر میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ بمبئی میں کسٹم کلکٹر تھے۔ پھر یہاں کراچی میں بھی کلکٹر رہے۔ عجیب شریف النفس انسان ہیں۔ ریٹائر ہو چکے، مگر دوست پروری میں فرق نہیں آیا۔ علم الدین صاحب کو اقبال سے والہانہ عقیدت ہے۔ چنانچہ انہوں نے بمبئی میں یوم اقبال منانے کا انتظام کیا۔ اس انتظام میں حکیم مرزا حیدر بیگ دہلوی کو پیش پیش رکھا۔

حکیم صاحب نے زندگی کے ساتھ ایسی حکمت عملی کی ہے کہ ایک نہ دو چار بیویوں کے خاوند ہیں۔ ضعیف ہیں مگر کیا مجال کہ خضاب کا استعمال چھٹے۔ اگر چہرے کے رنگ کی سرخی میں فرق آ جائے تو ایسی دوا کھاتے ہیں کہ بلڈ پریشر بڑھ جائے اور کالی خضاب دار داڑھی کے اوپر پچکے ہوئے گال تانبے کی طرح تپتے دکھائی دیں۔ حکیم صاحب نے دہلوی کا لفظ اپنے نام کے ساتھ محض اس لیے لگا رکھا تھا کہ ان کو دہلی سے محبت ہے۔ ورنہ اچھے خاصے پنجابی ہیں اور انداز گفتگو، لب و لہجہ سب کے سب سابق پنجاب کا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت جوش میرے غریب خانے پر تشریف فرما تھے۔ شام کا وقت تھا، غروب آفتاب کا نظارہ، سمندر کی لہریں، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ جوش صاحب ایسے کیف کے عالم میں شعر پڑھ رہے تھے کہ خود ان پر بھی کیفیت طاری تھی۔ بس جوش اور میں، میں اور جوش۔ اور کیفیت میں ڈوبے ہوئے شعروں کی بارش، کہ اتنے میں حکیم صاحب مرزا حیدر بیگ حیدر دہلوی تشریف لے آئے۔

جوش صاحب کی طبیعت کا دریا طغیانی پر ہو تو محفل میں زبان کھولتے ہوئے بڑوں بڑوں کا زہرہ آب ہوتا ہے۔ مگر حکیم صاحب پھر حکیم صاحب ہیں۔ فرمایا جوش صاحب میرا بھی ایک شعر سنئے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے خاص اسی مجلس کے لیے لکھا ہو۔ عرض کرتا ہوں۔ ہیں جی، بخاری صاحب عرض کرتا ہوں۔ ہیں جی، جوش صاحب، عرض کرتا ہوں۔ عرض کیا ہے:

"نگاہ و کلب میں جب تک سرور ہوتا ہے"

جی جوش صاحب۔

"نگاہ و کلب میں جب تک سرور ہوتا ہے"

ملاحظہ فرمائیے بخاری صاحب۔

"نگاہ و کلب میں جب تک سرور ہوتا ہے"

عرض کرتا ہوں جوش صاحب۔

"نگاہ و کلب میں جب تک سرور ہوتا ہے"

ہیں جی۔

"نگاہ و کلب میں جب تک سرور ہوتا ہے"

جوش بولے۔

"یہ بندہ والدِ عبدالغفور ہوتا ہے"

ہائے اے مرحوم و مغفور شام۔ اب تجھے کوئی کہاں ڈھونڈے!

خیر، یوم اقبال بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ بھائی علم الدین نے یہ جشن تین دن تک جاری رکھا۔ پہلے دن تقریریں، دوسرے دن قوالی، تیسرے دن مشاعرہ۔

علم الدین کی فہم و فراست کی داد دینی پڑتی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ تقریریں سننے کے لیے بہت کم لوگ آئے اور مشاعرہ سننے کے لیے صرف اردو زبان کے دلدادہ اور شعر کے شیدا، مگر قوالی کا انتظام کر کے بھائی علم الدین نے بمبئی شہر کو لوٹ لیا۔ گجراتی، میمن، کچھی، سب جوق در جوق قوالی سننے آئے اور اپنے بیوی بچوں کو ساتھ لائے۔ ہجوم کا یہ عالم کہ شاید اتنا بڑا جلسہ کبھی کسی سیاسی لیڈر کے لیے چوپاٹی پر بھی نہ ہوا ہو۔ قوال تھے مبارک علی فتح علی، کلام تھا اقبال کا اور سننے والے تھے بمبئی کے وہ لوگ جو گجراتی لکھتے ہیں، گجراتی بولتے ہیں، گجراتی اوڑھتے ہیں اور گجراتی بچھاتے ہیں۔ بمبئی کے غیر اردو داں طبقے تک اقبال کا نام پہنچانے میں علم الدین کا بڑا ہاتھ ہے اور سچ پوچھئے تو ریڈیو پاکستان کا اقبالیات کا پروگرام بھی اسی پروگرام کی نقل ہے۔ اب اس کا گلہ کس سے کیا جائے کہ اقبال کی قبر کے بعض مجاوروں نے ریڈیو پاکستان کے اقبالیات کے پروگرام کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ شاید ان کے ذہن میں اقبال کو عوام تک پہنچانے کی کوئی اور ترکیب ہو، لیکن آج تک وہ اس ترکیب پر خزانے کا سانپ بن کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کا بس چلے تو شہر شہر منادی کرا دیں کہ اگر کوئی شخص بلھے شاہ، وارث شاہ، شاہ عبداللطیف بھٹائی اور اقبال کا کلام گائے گا تو اسے سرمہ کھلایا جائے گا۔

میں کیفی اعظمی، سردار جعفری اور ان کی وساطت سے تمام کمیونسٹ پارٹی کے ممبروں کو جانتا تھا۔ میں ان کے دفتر اور ان کے گھروں پر اکثر جایا کرتا تھا۔ بنے ظہیر کے یہاں کی اتوار والی مجلس تو مجھ سے کبھی چھٹتی ہی نہ تھی۔ یہاں میں کیفی اور جعفری کا کلام اکثر سنتا تھا مگر یوں اقبال والے مشاعرہ میں اسٹیج پر جب انہیں دیکھا تو ہوش اڑ گئے۔ سردار جعفری تو خیر، مگر کیفی اعظمی اس دھڑلے سے شعر پڑھتا ہے کہ الامان والحفیظ۔ مجھے خود تحت اللفظ شعر پڑھنے کا دعویٰ ہے، مگر جوان سال کیفی شعر کیا پڑھتا ہے، آگ برساتا ہے۔ ایک تو اس کے شعر کمیونسٹ خیالات کے جو اس زمانے کے فیشن میں داخل ہو چکے تھے اور اس پر کیفی کی آواز، کیفی کے ہاتھ پاؤں، کیفی کے سانولے رنگ پر جوانی کا غازہ، دل میں قیامت برپا ہوگئی۔

کیفی کے بعد سردار جعفری نے نظم پڑھی۔ اہرام مصر، اس نظم کا موضوع تھا۔ بات اس نظم سے یہ نکلتی تھی کہ جابروں کی قبروں کا گارا بھی مزدوروں کے پسینے سے بنتا ہے۔ نظم مشاعرے میں خوب چمکی۔ مگر اگلے دن اردو کے ایک اخبار نے، نام اس اخبار کیا لوں، مشاعرے کی روداد پر یہ جلی سرخی لگائی کہ: "سردار جعفری کی زبان درازی، اہرام مصر کی بے حرمتی، مسلمان سلاطین کی توہین"۔ چلئے مصر کے فرعون بھی مشرف بہ اسلام ہو گئے۔

یوں اقبال کے اس جشن کے ذریعہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، بمبئی میں اقبال کی یادگار قائم کرنے کے لیے کوئی اسی ہزار روپیہ جمع ہوا تھا۔ 1947ء کے بعد کراچی میں بھی اسی قسم کا ایک جشن منایا گیا تھا۔ اس جشن کے موقع پر بھی تقریباً اتنی ہی رقم فراہم ہوئی تھی۔ خدا جانے یہ سب رقم اب کہاں ہے۔ شاید کسی بینک میں جمع ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

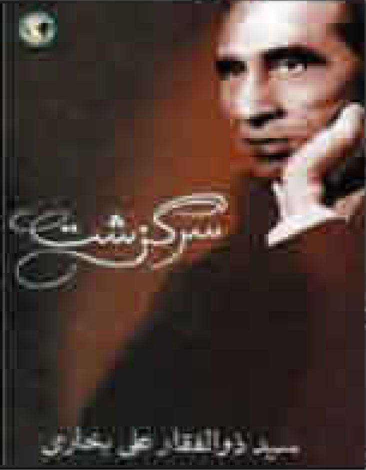
اب بھی یوم اقبال منایا جاتا ہے مگر اب یاران نکتہ داں کو صلائے عام نہیں دی جاتی۔ اب سختی سے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ اقبال عوام تک نہ پہنچے۔ یہ اہل علم اور وہ بھی خاص اہل علم کا شاعر ہے۔ اگر یہ شاعر عوام تک پہنچ گیا تو اہل علم کو کون پوچھے گا۔ چنانچہ اقبال کے سجادہ نشینوں نے پہلے پہل اقبال کا یوم وصال گورنر جنرل کے دولت کدے پر منایا اور جب بیک گردش چرخ نیلوفری گورنر جنرل نہ رہے، تو کسی انگریزی ہوٹل کے ڈانس ہال میں گھنٹے دو گھنٹے کے لیے اقبال کے نعرے لگا کر اپنی ساکھ قائم رکھنے کی کوشش کی اور جی میں خوش ہوئے کہ کوشش کامیاب رہی۔

☆☆☆☆☆

بدھ/09 اپریل 2014ء

روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

ریڈیو بمبئی سے بچوں کے اردو پروگرام نے مقبولیت کے ریکارڈ توڑ دیئے



داستان ان دوستوں کی مجھے بیان کرنی ہے جن کی بانہوں میں اتنا کس بل تھا کہ دہلی سے تیر چلاتے اور بمبئی میں مجھے آکر لگتا۔

قصہ اثر ہوتا ہے۔ میرے عیب مجھ پر کھلے ہوئے ہیں۔ کوئی اور میرے عیب کیا کھولے گا اور کیا ذاتی حملے کرے گا۔

قصہ دراصل تہذیب کا تھا۔ میں اس تہذیب کا دلدادہ ہوں، جو ہمارے بزرگ اس برصغیر میں لائے تھے۔

اس سے میری مراد یہ نہیں کہ اس برصغیر کی دیگر تہذیبوں کا دشمن ہوں۔ ہرگز نہیں۔ عیسیٰ بدین خود موسیٰ بدین خود۔ مجھے دوسروں سے کیا غرض۔ یہاں اپنی ہی نبیڑنے کی فرصت نہیں تو پرائی آگ میں کیا کودنا۔

میرے بمبئی جانے سے پہلے ریڈیو سے السلام علیکم یا آداب عرض یا خدا حافظ کسی نے سنا ہی نہ تھا۔ ریڈیو چلانے والوں کے نزدیک بمبئی میں مسلمان رہتے ہی نہ تھے۔ بس گجراتی تھے اور مرہٹے، مرہٹے اور گجراتی۔

مرہٹہ قوم کے سر پر شیواجی کا بھوت سوار تھا۔ ایک نہیں کوئی بارہ فلمیں اس موضوع پر بنا ڈالیں کہ اورنگ زیب ظالم اور جابر تھا اور شیواجی آزادی کا دیوتا۔ مسلمان چپ تھے اور اب تک چپ ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کسی مسلمان نے آج تک کوئی فلم ایسی نہیں بنائی جس میں شیواجی کو اس کے اصلی روپ میں دکھایا گیا ہو اور جس میں یہ بتایا گیا ہو کہ ملک کو انگریزوں کی یورش سے بچانے کا وہی ایک طریقہ تھا جو اورنگ زیب نے اختیار کیا تھا۔ یعنی یہ کہ تمام ہندوستان مرکزی حکومت سے عہد وفاداری باندھے اور یوں تمام ہندوستان مرکزی افواج کے ساتھ مل کر انگریزوں کا مقابلہ کرے۔ اگر شیواجی کی سمجھ میں یہ بات آجاتی تو انگریز ہندوستان میں قدم نہ جما سکتے۔ مگر وہاں تو حالت یہ تھی کہ مسلمان ہزار سال تک ہندوستان میں رہے، لیکن شیواجی نے انہیں پھر بھی غیر ہی سمجھا۔

میں نے ان حالات میں، غور کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ تمام سننے والوں کی خدمت میں ایک سوال نامہ بھیجا جائے اور ان سے دریافت کیا جائے کہ وہ کون سی زبان میں پروگرام چاہتے ہیں اور کس کس قسم کے پروگرام ان کو پسند ہیں۔

عام طور پر سوال نامے چند لوگوں کے نام بھیجے جاتے ہیں اور چند جوابات کو باقی لوگوں کی تعداد کے ساتھ ضرب دے کر اوسط نکال لیتے ہیں۔ لیکن ہم نے مناسب یہی سمجھا کہ سوال نامہ ہر سننے والے کے پاس بھیجا جائے۔ چنانچہ ہر اس شخص کے نام سوال نامہ بھیجا جس نے ریڈیو کا لائسنس خرید رکھا تھا۔

جوابات بڑے دلچسپ تھے۔

-1 گجراتی اور اردو......30 فیصد

-2 مرہٹی اور اردو......20 فیصد

-3 صرف گجراتی......25 فیصد

-4 صرف مرہٹی......15 فیصد

-5 صرف اردو......10 فیصد

اب ان جوابات کے ساتھ وہ کچھ ہونے لگا جو مداری گیندوں کے ساتھ کرتا ہے۔ کسی نے ایک دو اور پانچ کو جمع کر کے کہا کہ اردو پروگرام سننے والے ساٹھ فیصد ہیں۔ کسی نے ایک اور تین کو جمع کر کے کہا گجراتی کے سننے والے پچپن فیصد ہیں۔ کسی نے دو اور پانچ جمع کر کے کہا مرہٹی سننے والے 35 فیصد ہیں۔ کسی نے کہا اردو سننے والے صرف دس فیصد ہیں۔

اگر لوگوں کو اتفاق تھا تو صرف اس بات پر کہ سننے والوں کی اکثریت قوالی اور گراموفون ریکارڈ سننا چاہتی ہے۔

میں بے چارہ اسٹیشن ڈائریکٹر، ششش و پنج میں پڑ گیا۔ میں نے سوال نامے کے جوابات کا خلاصہ اخبارات میں چھپوا دیا۔ بس اس خلاصے کا چھپنا تھا کہ مرہٹہ اور گجراتی ایک دوسرے کے خلاف میدان میں اتر آئے۔ اردو والے بے چارے خاموش تھے اور خاموش نہ رہتے تو کرتے بھی کیا۔ نقار خانے میں طوطی کی کون سنتا ہے۔

ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ بمبئی اسٹیشن کا اناؤنسر اردو میں پروگراموں کا اعلان کرے۔ ہاں اگر مرہٹی یا گجراتی میں کوئی تقریر یا ڈرامہ نشر ہو تو اعلان اردو کے علاوہ گجراتی مرہٹی میں بھی ہوا کرے۔

پروگرام چلا تو سہی مگر مزہ نہ آیا۔ مرہٹی، گجراتی کا پروگرام ہو تو کئی سو خط آجائیں۔ مگر اردو کا پروگرام ہو تو ایک دو خط آئیں تو آئیں ورنہ خاموشی۔

آخرکار میں نے خطوں کے جوابات مائیکروفون پر دینے کا فیصلہ کیا اور بمبئی خان کے نام سے یہ کام خود اپنے ذمے لیا۔ اب جو خط آنے لگے ان کا کوئی اندازہ نہیں۔ ایک دن تو سات سو خط میں نے خود گنے تھے۔ خطوط کے جواب کا پروگرام ہفتے میں صرف ایک دن اور خط ہزاروں کی تعداد میں۔ مائیکروفون پر اعلان کر دیا گیا کہ پانچ سو خطوں میں سے صرف ایک خط جواب کے لیے چنا جائے گا اور وہ بھی یونہی تھیلے میں ہاتھ ڈال کر۔

کمال کی بات یہ ہے کہ بمبئی خان کے نام تقریباً تمام خط اردو میں آئے تھے اور کسی زبان میں نہیں۔

اس پروگرام کی مقبولیت دیکھی تو میں نے بچوں کا اردو پروگرام بھی بمبئی خان کے ذمہ کر دیا۔ اتوار کے دن یہ پروگرام کوئی تین بجے ہوتا تھا اور کوئی دو گھنٹے رہتا تھا۔ اس پروگرام میں شریک ہونے کے لیے بچے حیدرآباد دکن تک سے آتے تھے۔ بچے کیا بڑے بھی۔ نانا، فاضل بھائی، امبالال، چندو لال شاہ، سارا بھائی، مفت لال گگن لال، چمن لال ڈیسائی۔ سب اس پروگرام میں آتے اور ایک طرف بیٹھ کر یہ پروگرام سنتے۔ بچے اس پروگرام میں مرہٹی بھی تھے اور گجراتی بھی تھے، میمن بھی تھے اور بوری بھی، دہلوی بھی تھے اور پنجابی بھی۔ نتا، مدن، نرگس، نمی، راج کپور کس کس کے نام گنواؤں سب اس پروگرام کی گود میں پلے۔ پروگرام میں سریندر اور پرتھوی راج، کاردار، چارلی بھی شریک ہوتے تھے۔ اس پروگرام میں کوئی بات لکھی ہوئی نہیں ہوتی تھی۔ سب زبانی بولتے تھے۔ بچے باری باری مائیکروفون پر آتے تھے۔ کبھی کبھی میرے ساتھ مل کر گاتے، کبھی ڈرامہ بولتے، کبھی بحث کرتے، کبھی لطیفے سناتے۔

اس پروگرام کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ یہاں تک کہ دہلی میں بھی پہنچی۔ یہاں لوگوں نے ان پروگراموں کو بند کرانا چاہا اور یہ کہہ کر بند کرانا چاہا کہ یہ پروگرام بخاری نے اپنی ذاتی شہرت کے لیے جاری کیا ہے۔ بمبئی کے اخبارات تو خاموش تھے، مگر دہلی کے اخبارات نے اودھم مچا دیا۔

میرے پاس اس اودھم کا جواب اگر تھا تو یہی تھا کہ اگر پروگرام مقبول ہوگا تو پروگرام پیش کرنے والے کی شہرت ضرور ہوگی۔ اب یہ کیونکر ممکن ہے کہ پروگرام تو مقبول ہو اور پروگرام پیش کرنے والا غیر مقبول۔

دہلی نے کہا کہ یہ پروگرام ذاتی شہرت کے لیے شروع کیا گیا ہے۔ مسلمان متشرع بزرگوں نے کہا کہ یہ پروگرام فلمی زبان کو ترویج اور بچوں کو فلمی تربیت دینے کے لیے شروع کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جے کر اور ڈاکٹر امید کر نے کہا یہ پروگرام کانگریسی زبان کو ملک میں پھیلانے کے لیے شروع کیا گیا ہے۔ مجھ سے کسی نے نہ پوچھا۔ اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو عرض کرتا ہوں کہ یہ پروگرام محض محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر شروع کیا گیا ہے۔ لیکن محبت کو کون پوچھتا ہے۔ یہ لفظ تو کھوکھلا سا ہو کر رہ گیا ہے۔ (جاری ہے)

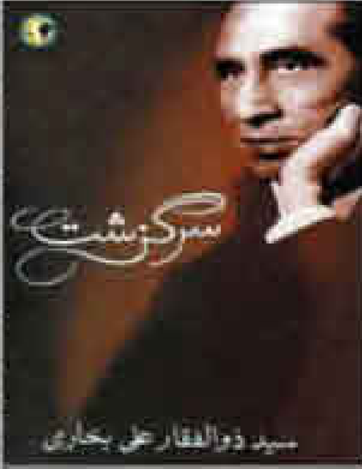
☆☆☆☆☆

جمعرات/10 اپریل 2014ء
روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

نامور ادیب حبیب تنویر بمبئی فلم نگری میں قسمت آزمانے آئے تھے



حبیب تنویر



آپ نے اسکولوں کی کتابوں میں اکثر دیکھا ہوگا کہ کسی بڑے آدمی کے تذکرے میں یہ ضرور لکھ دیا جاتا ہے کہ انہوں نے یہ کیا، وہ کیا اور دنیا بھر میں نام پایا۔ بچوں کو یہ لالچ دینا کہ فلاں کام کرو گے تو تمہارا نام ہوگا، کہاں تک درست ہے۔ بچہ بھی کبھی سوچتا ہوگا کہ اگر نام ہی پانا ہے تو گریٹا گاربو کیوں نہ بنوں۔ ایلوس پریسلے کی پیروی کیوں نہ کروں۔

پل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا

تک تو درست ہے۔ لیکن "نام منظور ہے" محل نظر ہے۔



میں نے دہلی سرکار کے ان لوگوں کا نام نہیں لیا، جو بمبئی خان پروگرام کے خلاف تھے۔ آپ ان کو اہمیت کیوں دیں۔ وہ اس قابل بھی نہیں کہ ان کو اہمیت دی جائے۔ اہمیت ہمیشہ کام کرنے والوں کو دینی چاہئے۔ ان کو نہیں جو چلتی میں روڑے اٹکاتے ہیں۔

دہلی میں تو کھچڑی پکتی رہی مگر میں اپنے کام میں مشغول رہا۔ اب مجھے ایسے لوگوں کی تلاش ہوئی جو اس اہم کام میں میرا ہاتھ بٹائیں۔ بی سی مہتہ جیسے غیر متعصب لوگوں کو تو میں نے اپنے ساتھ اس پروگرام میں شامل کر لیا تھا، مگر ان میں کمی یہ تھی کہ اردو لکھ نہیں سکتے تھے۔ سارا کام زبانی تو ہو نہیں سکتا تھا۔ ڈرامے وغیرہ کو لکھ کر ہی پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے اب میں نے ایسے لوگوں کو ڈھونڈنا شروع کیا جو اردو لکھ بھی لیں اور ریڈیو پر بول بھی سکیں۔

ایک دن میں منہ اندھیرے میرین ڈرائیو پر اپنے خیالوں میں غرق جا رہا تھا۔ ریل کی پٹری کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ ایک شخص میلی کچیلی برساتی اوڑھے سو رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ سوتا رہا تو شاید ریل کی زد میں آجائے۔ میں نے اس کو جگایا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئیں، بال چکٹ، چہرہ سخت میلا، کپڑے بوسیدہ اور میلے، ناخن گندے، انگلیاں سگریٹوں کے دھوئیں سے زرد، میری آواز سن کر یہ لڑکا اٹھا۔ برساتی پہنی۔ کھڑا تو ہو گیا مگر اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ بھوکا ہے۔ میں نے کہا میرے ساتھ چلو۔ یہ بغیر کچھ کہے میرے ساتھ آ گیا۔

گھر آکر میں نے اسے ناشتہ کرایا۔ اس کی جان میں جان آئی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اس سے کہا چلو غسل کر لو۔ پہلے تو یہ بہت ہچکچایا مگر آخر اس نے خط بنایا، غسل کیا اور میرا کرتہ پاجامہ پہن کر صحن میں آ بیٹھا۔

اب اس کا حلیہ ہی بدل گیا تھا۔ شریف چہرہ، تعلیم یافتہ لوگوں کا انداز گفتگو، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ رائے پور کے رہنے والے ہیں، بی اے پاس ہیں، شاعر ہیں۔ فلم کے چکر میں بمبئی آئے تھے، تین دن کا فاقہ ہے۔

یہ اپنا قصہ سناتے سناتے لرزنے لگے اور ان کو اس زور کا بخار چڑھا کہ میں گھبرا گیا۔ میں نے ان کو فوراً بستر پر لٹایا اور ان کے علاج معالجے میں لگ گیا۔ ساتویں دن کہیں جا کر ان کا بخار اترا۔ یہ یار عزیز وہ ہے، جو آج ادبی دنیا میں اور تھیٹر کے میدان میں حبیب تنویر کے نام سے مشہور ہے۔ تھیٹر کا کام سیکھنے کے سلسلے میں یہ روس بھی گئے اور انگلستان بھی۔ فلم میں گئے تو سہی مگر وہاں کی فضا کو ناساز گار پایا۔ ریڈیو سے بہت عرصے تک وابستہ رہے۔

حبیب نے آواز غضب کی پائی ہے۔ میں شام کے وقت اکثر صحن میں بیٹھ جاتا تھا۔ یہ حافظ کا کلام ترنم سے پڑھتے اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا تھا۔ انہوں نے فارسی مجھ سے سیکھی مگر حافظ کے کلام سے مکمل حظ اٹھانا میں نے ان سے سیکھا۔

حبیب کی شعر خوانی کا یہاں تک چرچا ہوا کہ بھائی جان مرحوم اور فیض ان سے حافظ کا کلام سننے بمبئی آئے۔ بھائی جان مرحوم مرتے دم تک کہتے رہے کہ حافظ کا کلام اور حبیب کا ترنم یوں معلوم ہوتا ہے جیسے عرفان کی بارش ہو رہی ہو۔ فیض اور میں تو اب تک وجد میں ہیں۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

جمعۃ المبارک/ 11 اپریل 2014ء

روزنامہ امت کراچی/ حیدرآباد

افیون نے فیلڈن اور کرکٹ کمنٹیٹر طالع یار خان کو انٹا غفیل کر دیا

بمبئی کے بھنڈی بازار میں بنسری نما نلکی کا ایک سرا منہ میں اور دوسرے پر افیون کے گولے کو آگ دکھا کر کش لگائے جاتے تھے۔ لتا منگیشکر کے والد ''پی'' کر گاتے تھے۔ ایک مرتبہ ریڈیو کے سازندے ساز بجاتے رہے اور وہ ''ٹن'' ہو گئے۔ زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



حبیب اور رفعت سروش نے بچوں کے پروگرام میں بہت کام کیا۔ بچوں کے پروگرام کے لئے یہ دو صاحب جب کچھ لکھنے لگے تو ان کو پتہ چلا کہ سیدھا فقرہ کیوں کر لکھنا چاہئے۔ بچوں کے لئے لکھنا بڑوں کے لئے لکھنے سے کہیں زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ حضرت آزاد کی اردو کی پہلی کتاب کا جواب اب تک کسی سے نہیں بن پڑا۔ اسماعیل میرٹھی کے رتبے کو کون پہنچا ہے۔

آج کل جو کتابیں بچوں کو پڑھائی جاتی ہیں، انہیں دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔

گاندھی جی نے جیل میں ایک بیان دیا تھا کہ قرآن اور گیتا میں کوئی فرق نہیں۔ اس پر اقبال نے کہا تھا:

یہ آیہ نو جیل سے نازل ہوئی مجھ پر
گیتا میں ہے قرآن تو قرآن میں گیتا

اس شعر کی تشریح میں فرمایا گیا کہ ''نو جیل'' کے معنی ہیں ''نئی انجیل''۔ توبہ۔ بچوں کے لئے تصنیف و تالیف کا معیار اب یہ رہ گیا ہے۔

حبیب اور رفعت سروش کی تحریروں پر میں بڑی کڑی نظر رکھتا تھا۔ خود مجھے کچھ لکھنا آئے یا نہ آئے، لیکن دوسروں کی غلطی فوراً نظر آ جاتی ہے۔ یہ دونوں جوہر قابل رکھتے تھے۔ انہوں نے وہ مشق بہم پہنچائی کہ باید و شاید۔ حبیب نے تو ''آگرے کا بازار'' لکھ کر اردو ادب میں اضافہ کیا ہے۔

حبیب تنویر اور سروش نے موسیقی کے پروگراموں میں بھی دخل دینا شروع کیا۔ یہ دخل صرف غزل، نظم اور گیت لکھنے تک محدود نہ تھا۔ یہ دونوں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے گانے والوں کو تلاش کرتے تھے، جو ان کی لکھی ہوئی چیز کو درست گا سکیں۔ نظر ان کی ہمیشہ ایسے لوگوں پر پڑتی تھی جو پھٹے حال ہوں، چرسی ہوں یا شراب کے متوالے۔

لتا منگیشکر کے والد ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔ ان کو دیکھا تو حبیب ان پر لٹو ہو گئے۔ میں نے ہزار کہا کہ بھیا یہ تو مرہٹہ ہے، اردو کیا گائے گا۔ کہا نہیں، ضرور گائے گا۔ ایک دن چپکے سے منگیشکر کو میرے گھر لے آیا اور بازار سے شراب منگوا کر اس کو پلائی۔ ان کی محفل حبیب کے کمرے میں گرم تھی کہ اتفاقاً میں پہنچ گیا۔ حبیب کا رنگ اڑ گیا، مگر منگیشکر ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا، کس کی سنتا تھا۔ پیتا رہا اور گاتا رہا، گاتا رہا اور پیتا رہا۔ پروگرام کا وقت آیا تو اسے اٹھا کر مائیکروفون کے سامنے لے گئے۔ مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد ساز بج رہے تھے اور منگیشکر خاموش تھا۔ آخر اسے پھر اٹھایا گیا۔ اس کو لے کر جائیں کہاں، میرا گھر تو موجود ہی تھا، وہیں لے آئے، وہیں ڈاکٹر آیا، وہیں اس کو ہوش میں لانے کی تدبیریں ہونے لگیں۔

رات کے کوئی بارہ بجے اس کی طبیعت کچھ سنبھلی اور وہ سو گیا۔ حبیب نے میری طرف دیکھا اور میں نے حبیب کی طرف۔ ہم دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ ہم دونوں کو وہ دن یاد آیا جب حبیب سے میری ملاقات ہوئی تھی۔

حبیب اور رفعت دونوں اشتراکی قسم کے لوگ تھے۔ میں نے ہزار چاہا کہ یہ ان ''سرپھروں'' سے ملیں جن سے میں ملتا ہوں، مگر یہ الگ الگ رہتے تھے۔ ان کا قول تھا کہ یہ سردار جعفری، بنے ظہیر، ڈاکٹر اشرف کے قبیل کے لوگ کمیونسٹ تو ہیں لیکن درباری قسم کے۔ ان سے مل کر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اشتراکیوں کو صرف مزدوروں سے ملنا چاہئے اور ان کی بود و باش اختیار کرنی چاہئے۔ بجلی کے پنکھوں کے نیچے بیٹھ کر دماغ ٹھنڈا کرنے والے لوگوں کے لئے اشتراکیت ذہنی عیاشی ہے اور بس۔

رفتہ رفتہ یہ لوگ مجھے اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گئے۔ اب یہ تھے اور میں اور مزدوروں کے چالوں کا چکر، چرس خانوں اور بھنگڑ خانوں کا طواف۔ ہوتے ہوتے بات فیلڈن تک پہنچی۔ بمبئی آئے تو مجھے خوب ڈانٹا۔ فرمایا مزدوروں کی چالوں کا چکر تو خیر، بات سمجھ میں آتی ہے، مگر یہ چرس خانوں اور بھنگڑ خانوں کا طواف کیا معنی؟

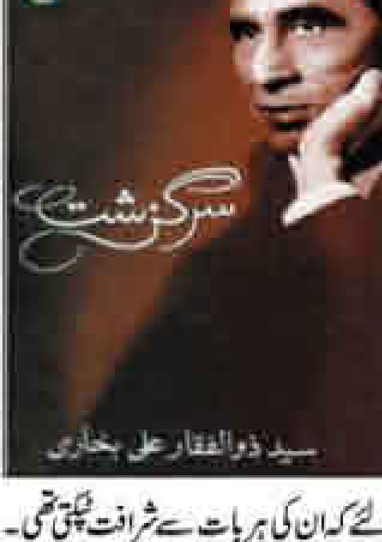
میں نے ان مقامات کا ذکر کچھ اس انداز میں کیا اور ان کا نقشہ کچھ اس ڈھب سے کھینچا کہ فیلڈن توجہ سے سننے لگا اور آخر میں کہا کہ اچھا ایک شام کو مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔

میں بہت چکرایا کہ انگریز کو کہاں لے کر جاؤں۔ اس کو دیکھتے ہی لوگ بھاگ جائیں گے۔ میں نے اس گھبراہٹ کا تذکرہ کرکٹ کے مشہور کمنٹیٹر طالع یار خان سے کیا۔ یہ صاحب پارسی ہیں اور بمبئی کے گلی کوچوں سے خوب واقف ہیں۔ فرمایا میں تم کو ایسی جگہ لے جاؤں گا جہاں افیون کا دور رہتا ہے۔

فیلڈن جھٹ تیار ہو گیا۔ شام کو فیلڈن، طالع یار خان اور میں بھنڈی بازار سے آگے، کہیں گلیوں میں گھس گئے۔ گاڑی ہم نے ایک جگہ کھڑی کر دی اور خود پیدل چلنے لگے۔ رات کا وقت اور وہ بھی گلیوں میں، خدا جانے کہاں نکل گئے۔ آخر ایک جگہ سیڑھیاں نظر آئیں۔ ہم نیچے اتر گئے۔ تنگ سیڑھیاں، سخت اندھیرا، سڑاند ایسی کہ ہم نے ناک پکڑ لی۔ آخر ایک ڈیوڑھی میں پہنچے۔ دروازہ کے اندر داخل ہوئے تو ایک وسیع کمرہ۔ اس میں جابجا تخت بچھے ہوئے تھے۔ یہاں ایک بوڑھا چینی ملا۔ سلام کرنے کے لئے اتنا جھکا کہ اس کی پشت دہری ہو گئی۔ یہ بوڑھا ہم کو اپنے ساتھ اگلے کمرے میں لے گیا۔ یہاں دو چار آدمی تخت پر دراز تھے اور ناک ہی ناک میں کچھ گنگنا رہے تھے۔ ہم اس کمرے سے نکل گئے۔ آگے اس سے بھی ایک کشادہ دالان۔ اس میں بھی تختوں پر لوگ دراز۔ اس سے بھی آگے بڑھے اور ایک کمرے میں آ گئے۔ یہاں ایک اور چینی بزرگ نے ہماری پیشوائی میں اپنی پشت دہری کی۔ ہم تینوں کو تین تختوں پر لٹا دیا۔ ایک ایک بنسری نما نلکی ہمارے منہ پر رکھ دی۔ نلکی کا ایک سرا ہمارے منہ میں اور دوسرے پر افیون کا گولہ۔ اس گولے کو اس نے آگ دکھائی اور ہم سے کہا کش لگاؤ۔ میں نے پہلا ہی کش لگایا تھا کہ زور کا استفراغ ہوا، مگر فیلڈن اور طالع یار خان مرد میداں نکلے۔ کش پہ کش لگاتے گئے۔ یہ کش لگاتے اور چینی ساقی نلکی پر ایک پتلی سی چھڑی سے کھٹ کھٹ کرتا جاتا۔ کچھ دیر کے بعد یہ دونوں حضرات انٹا غفیل ہو گئے اور میں نے کمرے کے چکر لگانے شروع کئے۔ وہ چینی میری زبان نہ سمجھے اور میں اس کی بولی نہ جانوں۔ بڑی مشکل سے اشارہ کر کے میں نے پوچھا کہ یہ لوگ ہوش میں کب آئیں گے؟ چینی نے کچھ اشارہ کیا، جو میری سمجھ میں نہ آیا۔ آخر اس نے گھڑی کی سوئیوں کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ صبح سات آٹھ بجے تک یہ حضرات بخیریت سوتے رہیں گے۔ لاحول ولا قوۃ۔ فیلڈن کے منہ پر چھینٹے دیئے تو وہ واہی تباہی بکنے لگا۔ طالع یار خان کو جگایا تو وہ مارنے مرنے پر اتر آیا۔ آخر بڑی مشکل سے ان دونوں کو ایک ایک کر کے کندھے پر اٹھایا اور موٹر میں ڈال کر گھر لایا۔ صبح ہوئی تو یہ حضرات جاگے، مگر شدید قبض کی شکایت میں زیر و زبر اور میں گلقند کی تلاش میں سرگرداں۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

پشاور میں تھیٹر کا انتظام دس نمبری بدمعاش سنبھالتے تھے



والد مرحوم کو فارسی نعت اور پنجابی کافی سننے کا بہت شوق تھا۔ ہمیشہ ایک نہ ایک ایسا خوش الحان ان کی خدمت میں حاضر رہتا، جس کی آواز گھر بھر کے لئے فردوس گوش ہوتی۔ ایک دن مردانے سے ایک ایسے خوش الحان کی آواز آئی کہ ہم سب سکتے میں رہ گئے۔ الفاظ صاف، تلفظ گمبھیر، بلند اور سُر میں ڈوبی ہوئی نکھری صاف، تان والے وار، ایسی کہ ایک ایک پردہ شمار میں آئے، راگ کی خالص سنگتیں ایسی اور وادی سموادی کا ایسا رکھ رکھاؤ کہ راگ اپنا نام خود پکار اٹھے۔

یہ بزرگ خوش الحان بابا شہاب تھے۔ اصلی نام ان کا شہاب الدین تھا۔ مگر اپنے زہد و اتقا اور اپنے علم و فضل کی بدولت بابا شہاب کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ عمر کوئی پچاس سال، خضاب دار ترشی ہوئی داڑھی، سانولا رنگ، قد لانبے سے کچھ کم اور درمیان سے کچھ زیادہ، سینہ چوڑا، ہاتھ پاؤں میں سکت۔ بابا شہاب کو دیکھا تو حیرت ہوئی۔ کچھ تو اس لئے کہ اس سے پہلے ہم نے کسی ایکٹر کو دیکھا ہی نہ تھا۔ اور کچھ اس لئے کہ ان کی ہر بات سے شرافت ٹپکتی تھی۔ ہر لفظ ان کے علم اور فضل کی گواہی دیتا تھا اور یہاں ہم نے ایکٹروں کے متعلق کچھ اور ہی سن رکھا تھا۔

معلوم ہوا کہ جوانی کے زمانے میں انہوں نے والد مرحوم سے قرآن و حدیث کی تعلیم پائی تھی اور سعدی کی گلستان بوستان پڑھی تھی۔ والد ان کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ان کی خوش الحانی سے بہت خوش تھے۔ بابا شہاب کی خوش الحانی کا اتنا چرچا ہوا کہ نانک چند کی مشہور و معروف تھیٹر کمپنی گھیر گھار کر ان کو اپنے حلقے میں لے آئی، جہاں انہوں نے بحیثیت ایکٹر اور موسیقار کے بہت نام پایا۔ جن دنوں کا ذکر کر رہا ہوں ان دنوں نانک چند کی کمپنی پشاور آئی ہوئی تھی۔

پشاور میں جو بھی کمپنی آتی، باجوڑی دروازے کے باہر دھنپت رائے کیس رائے میں کچا منڈوا باندھتی اور اس میں مہینوں کھیل کرتی۔ کچے منڈوے سے میری مراد یہ ہے کہ تھیٹر کے لئے کوئی پکی عمارت کھڑی نہیں کی جاتی تھی۔ بس لمبی لمبی بلیاں زمین میں گاڑی جاتی تھیں اور ان پر قینچی دار چھت ٹین کی یا لوہے کی چادروں کی ڈالی جاتی تھی۔ منڈوے کی دیواریں ٹاٹ کی ہوتی تھی۔ یہ منڈوا مستطیل ہوتا تھا، جس کے چھوٹے ضلعوں پر آمنے سامنے اینٹوں اور گارے کے اونچے نیچے چبوترے بنائے جاتے تھے۔ ایک چبوترے سے اسٹیج کا کام لیا جاتا اور دوسرے پر چونی کلاس والے تماشائی بیٹھتے تھے۔ دونوں چبوتروں کے بیچ کی خالی جگہ میں صوفے، کرسیاں اور بنچیں ڈال دی جاتی تھیں۔ منڈوے میں کوئی ڈیڑھ دو ہزار تماشائیوں کی نشست کا بندوبست ہوتا تھا۔ اور ایکٹر وہ رکھا جاتا تھا، جس کی آواز اسٹیج سے نکل کر چونی کلاس تک پہنچے۔

بابا شہاب نے والد مرحوم کو کوئی آٹھ دس تھیٹر کے پاس دیئے اور درخواست کی کہ کھیل دیکھنے تشریف لائیں۔ اس زمانے میں تھیٹر کو تھیٹر نہیں، بلکہ ناٹک یا زیادہ تر اندر سبھا کہتے تھے۔ ٹریجڈی کو ڈرامہ کہتے تھے، اور کھیل کے مزاحیہ حصے کو کامیڈی۔ اگر یہ دریافت کرنا ہو کہ فلاں ایکٹر ٹریجڈی کرتا ہے یا کامیڈی تو یوں پوچھتے تھے کہ کیوں بھائی ڈرامہ کرتا ہے یا کامیڈی۔ کامیڈی کے ایکٹر کو مسخرا یا جوکر کہتے تھے اور کامیڈی میں عورت کا پارٹ کرنے والے مرد کو چنچل پارٹ کرنے والا۔ لگے ہاتھوں دیگر ایکٹروں کے خطابات بھی سن لیجئے۔ ٹریجڈی میں معمر کردار کرنے والے کے متعلق کہتے تھے کہ فلاں آدمی بادشاہی لائن کا پارٹ کرتا ہے۔ ہیرو کا پارٹ شہزادہ لائن کا پارٹ تھا اور ویلن کا پارٹ، جلادی لائن کا پارٹ۔ چنانچہ ایکٹروں کی تعریف میں ایسے جملے استعمال کئے جاتے تھے ”فلاں شہزادہ لائن کا ایکٹر ہے۔ فلاں جلادی لائن کا ایکٹر ہے“۔ اس زمانے میں عورتیں اسٹیج پر نہیں آتی تھیں۔ مرد ہی عورتوں کا پارٹ کرتے تھے۔

یہ بھی سن لیجئے کہ یہ انتظام کون کرتا تھا کہ تھیٹر میں لوگ ٹکٹ کے بغیر نہ گھس آئیں۔ یا لوگ کھیل کے وقت ہلڑ نہ مچائیں۔ یہ انتظام شہر کے دس نمبر کے بدمعاشوں کے سپرد ہوتا تھا۔ آج ایک بدمعاش کی ٹولی کے سپرد یہ انتظام ہے تو کل دوسرے بدمعاش کی ٹولی کے سپرد۔ پشاور جیسے شہر میں اندر سبھا یعنی تھیٹر کا انتظام پولیس کے بس کا روگ نہ تھا۔ وہاں تو فوری کارروائی کی ضرورت تھی۔ پولیس والوں کی قانونی کارروائی کے انتظار کی فرصت اندر سبھا والوں کو نہ تھی۔

بابا شہاب نے کچھ اس محبت اور خلوص سے پاس پیش کئے کہ والد مرحوم کا دل پسیج گیا اور تھیٹر دیکھنے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ یہ تیاری کچھ ایسی تھی کہ جیسی ریل کے سفر کے وقت ان کا خاصہ تھا۔ انہیں جب کبھی ریل کا سفر کرنا ہوتا، دنوں پہلے ٹرنک نکلوائے جاتے تھے اور ان کے تالوں کے متعلق اطمینان کر لیا جاتا تھا۔ بستر بند کر کے چمڑے کو تیل دیا جاتا تھا تاکہ بین باندھتے وقت کھینچا تانی میں ٹوٹ نہ جائے۔ کپڑوں کو دھوپ میں ڈال دیا جاتا تھا۔ توشہ دان کو نئے سرے سے قلعی کرائی جاتی تھی۔ غرض یہ کہ گھر بھر صبح سے شام تک اسی سفر کے انتظامات پر مامور رہتا۔ گاڑی چاہے شام کو چھ بجے چلتی ہو، مگر والد صاحب صبح ہی سے تمام سامان کی دیکھ بھال میں مصروف ہو جاتے۔ سائیس کو حکم دیا جاتا کہ چار ہی بجے سے گاڑی لا کر لگا دے۔ ہم ہزار کہیں کہ صاحب یہاں سے ریل کا اسٹیشن کوئی دس منٹ کا راستہ ہے، مگر والد اسٹیشن پر کم از کم ایک گھنٹہ پہلے پہونچنا ضروری سمجھتے تھے۔ کچھ اس قسم کی تیاری والد مرحوم تھیٹر جانے کیلئے بھی کرنے لگے۔ فلاں لڑکا کیا پہنے گا، کون سے کمبل اور کون سی چادریں ساتھ جائیں گی۔ کھانا سر شام تیار ہو جانا چاہئے، تانگہ آٹھ ہی بجے سے آ کر لگ جائے۔

ہماری والدہ کے لئے آج کی تیاری نئی تھی۔ آج سے قبل نہ والد کبھی ناٹک دیکھنے گئے تھے، نہ والدہ کو انہیں تھیٹر بھیجنے کے لئے انتظام کرنا پڑا تھا۔ دن بھر والدہ اندر سبھا اور بابا شہاب کا نام سنتے سنتے تنگ آ گئیں، مگر کچھ نہ بولیں۔ ہاں جب ہم کھانا کھا کر اور عشا کی نماز پڑھ کر تھیٹر جانے کے لئے کمبل اور چادریں اٹھائے گھر سے باہر نکلنے لگے تو اماں نے کہا کہ ماشا اللہ سب بچے جا رہے ہیں، ان کے ٹکٹوں پر روپیہ کافی خرچ ہوگا، سو پچاس روپے ساتھ رکھنا چاہئیں۔ والد بولے ہم پیسے نہیں خرچیں گے۔ شہاب نے مفت ٹکٹ دیئے ہیں۔ والدہ نے فرمایا بچوں نے آج اندر سبھا کا تماشا دیکھا تو کل بھی دیکھیں گے۔ روز روز مفت ٹکٹ کون دے گا۔

اگلے دن کے ٹکٹوں کے لئے تو پیسے درکار ہوں گے۔ والد یہ سن کر بیٹھ گئے، بالکل خاموش۔ خاموشی سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سب مفت کے ٹکٹ نکال کر پھاڑ دیئے۔ چلئے، تھیٹر جانے کا پروگرام ختم ہوا۔ اور ہم سب دبے پاؤں جا کر اپنے اپنے لحافوں میں دبک گئے۔ اوروں کی کیفیت کیا بیان کروں، مگر میری اپنی کیفیت یہ تھی کہ رات بھر نیند نہ آئی۔ رات بھر تھیٹر کے خواب دیکھتا رہا۔ یہ خیال کرتا رہا کہ اگر اماں آج کے بجائے کل تھیٹر کے متعلق یہ وعظ فرماتیں تو کیا حرج تھا۔ بابا شہاب کی شکل رہ رہ کر آنکھوں پر پھرتی کہ آخر وہ کیا کہیں گے۔ ٹکٹ بھی دیئے اور پھر بھی یہ لوگ نہ آئے۔

دوسرے دن بابا شہاب پھر آئے۔ ہم نے سوچا کہ آج تو کسی نہ کسی طرح والد کو تھیٹر لے ہی جائیں گے، مگر والد انہیں دیکھتے ہی برس پڑے کہ خود تو تھیٹر کے ہو کر رہ گئے اور ہمیں بھی تھیٹر کی چاٹ لگانا چاہتے ہو۔ بابا شہاب چپ تھے اور ہم سب دبکے ہوئے۔ خیر جب والد کا غصہ ٹھنڈا ہوا اور چائے کا دور چلنے لگا تو میں نے بابا شہاب کی خوب خدمت کی۔ کبھی پھل ان کے سامنے رکھوں، کبھی حقہ بھر کر لاؤں۔ کبھی مزید چائے پینے پر اصرار کروں۔ جب بابا شہاب رخصت ہونے لگے تو میں ان کی گاڑی تک پہنچانے گیا اور ان سے کہا کہ ہم تھیٹر دیکھنا چاہتے ہیں۔ بابا شہاب نے کہا ہاں، جب جی چاہے آنا۔

اگلے دن جب سب سو گئے تو میں اور بھائی جان مرحوم، ملازم کی خوشامد کر کے منہ لپیٹے رات کی تاریکی میں سیدھے تھیٹر پہنچے۔ ہمارے لئے یہ تھی تھیٹر کی ابتدا۔ بھائی جان آخر دم تک تھیٹر کے رسیا رہے اور میں آخر دم تک رہوں گا۔ بھائی جان تو صرف شوقیہ طور پر کالج کے اسٹیج پر آتے تھے، مگر میں نے تو پیشہ ور اسٹیج کے تختے بھی توڑے ہیں۔ بس میرا اور تھیٹر کا ساتھ اسی دن چھوٹا، جب اسٹیج پر ایسی ویسی عورتوں نے یورش کی۔ اب تو زمانہ بدل گیا، مگر اس زمانے میں اسٹیج کی عورتیں ایسی نہ تھیں کہ انسان ان کے ساتھ پارٹ بھی کرے اور اپنی پگڑی بھی سنبھالے رکھے۔

اسٹیج چھوٹا تو میں نے ریڈیو پر اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ زیادہ تر دہلی، بمبئی اور کراچی میں۔ بمبئی میں ڈرامہ پیش کرنا ہنسی کھیل نہیں۔ تھیٹر وہاں کے بچے بچے کی گھٹی میں پڑا ہے۔ اور پھر فلم ایکٹروں اور فلم کمپنیوں کی بھرمار۔ مگر میں نے ہمت نہ ہاری اور نہایت انہماک سے ڈرامے کئے۔ دہلی سے کچھ ایکٹر ساتھ لے گیا تھا۔ ان میں شکیل احمد اور رونق کا نام قابل ذکر ہے۔ شکیل ریڈیو پاکستان کے مشہور اور ہر دلعزیز اناؤنسر ہیں اور خبریں پڑھتے ہیں۔ رونق بے چارا جوانی میں مر گیا۔ عجیب و غریب ایکٹر تھا۔

خیر یہ ڈرامے تو ہوتے رہے مگر مجھ پر ان کے ساتھ ساتھ یہ دھن بھی سوار رہی کہ عورتوں کے پروگرام میں مختصر ڈرامے پیش کئے جائیں۔ اور وہ بھی ایسے جو خاص عورتوں کے لئے لکھے گئے ہوں۔ ایسے ڈرامے کہاں سے آئیں جو خاص عورتوں کے لئے لکھے گئے ہوں۔ انگریزی ادب بھی ان سے خالی ہے اور اردو ادب بھی۔ سوچ بچار کے بعد ایک دن مجھے خیال آیا کہ علامہ راشد الخیری کی کتابوں کو ڈرامائی انداز میں کیوں نہ پیش کیا جائے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ یوں محسوس ہونے لگا جیسے بہت بڑی دولت ہاتھ آ گئی۔ میں علامہ مرحوم سے ڈرتا تھا۔ جب کبھی دہلی میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، مرعوب ہو کر آیا۔ ہر چند کہ وہ شفقت سے پیش آتے تھے اور مجھے اپنا نیازمند گردانتے تھے مگر ان کے علم و فضل کی ہیبت مجھ پر طاری ہو جاتی تھی۔

مجھے اب یہ ڈر ستانے لگا کہ اگر علامہ مرحوم کی کسی کتاب کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا تو حضرت بگڑ نہ جائیں۔ چنانچہ محض علامہ کے خوف سے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ ان کے ناول کو ڈرامے میں تبدیل نہ کیا جائے۔ اس کے بجائے ان کا ناول مناسب تدوین کے بعد پڑھ کر سنایا جائے۔ کچھ تو اس عقیدت کے باعث جو میں مولانا سے رکھتا تھا اور کچھ دلی کی زبان سے وابستہ رہنے کی خاطر، میں نے یہ کام اپنے ذمہ لیا۔ یعنی ہر ہفتے عورتوں کے پروگرام میں علامہ راشد الخیری کے ناول کا مناسب حصہ خود مائیکروفون پر پڑھتا۔

اس پروگرام کی اتنی شہرت ہوئی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ مولانا کے نام کی عظمت کے طفیل میں نے بھی بہت نام پایا۔ علامہ کے ناولوں نے مجھے ٹریجڈی کی مشق، ہم پنجابی اور بمبئی خان کے کردار نے کامیڈی کی۔ بمبئی کے فلمی حلقوں میں میرا چرچا ہونے لگا اور کئی لوگ مجھے فلم میں لینے کے مشتاق ہوئے۔ مگر میں نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ ساحل ہی پر بیٹھ کر خیر و شر کا تماشا دیکھتا رہوں۔

مرد عام طور پر عورتوں کا پروگرام نہیں سنتے۔ اس میں ان بے چاروں کا کوئی قصور نہیں۔ نہ ان کے دل میں کوئی تعصب کار فرما ہے۔ اب کون مرد بیٹھ کر سنے کہ بچوں کو دودھ کیوں کر پلانا چاہئے اور جب بچہ کچی نیند سے جاگ اٹھے تو اسے دوبارہ سلانے کے لئے کون سی لوری مفید ہوتی ہے یا یہ کہ بنائی کی سلائی کس خانے میں سے کس خانے میں جائے تو سوئٹر کا خانہ خراب ہوگا۔ مردوں کو ان باتوں سے کیا سروکار۔ لیکن جب میں نے علامہ راشد الخیری کے ناولوں کے اقتباسات پڑھ کر سنائے تو کیا عورتیں اور کیا مرد بھی یہ پروگرام سننے لگے۔

اس پروگرام سے ہمارا حوصلہ بڑھا اور ہم نے شرر مرحوم کے ناولوں کے اقتباس بھی پیش کرنا شروع کئے۔ کسی ناول کا اقتباس پیش کرنا یا کسی کتاب کا کوئی حصہ چھانٹ کر مائیکروفون پر پڑھنا آسان کام نہیں۔ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے رفعت سروش، حبیب الرحمان شاہ اور حبیب تنویر جیسے اردو ادب کے رسیا مل گئے تھے۔ یہ میرے لئے اقتباس تیار کرتے اور میں پڑھتا۔ یقین مانئے کہ ہم لوگ اقتباس پر گھنٹوں بحث کیا کرتے، جب کہیں جا کر اقتباس تیار ہوتا تھا۔ اقتباس پیش کرنے سے قبل ہم پورا ناول پڑھتے تھے۔ اس کے پلاٹ اور اس کی روح سے کما حقہ واقفیت حاصل کرتے تھے اور پھر اقتباس میں پورے ناول کی روح ڈالنے کے لئے بسا اوقات اگلے پچھلے حصوں سے مناسب فقرے اٹھا کر ڈالتے تھے، تاکہ اقتباس ناول سے بے تعلق نہ معلوم ہو۔

سننے والوں کو راشد الخیری اور شرر کے ناولوں کے اقتباس سن کر دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا چسکا پڑ گیا۔ اور جب ہم نے منشی پریم چند کے افسانے ریڈیو پر پیش کئے تو لوگوں کو مزا نہ آیا۔ پکار اٹھے کہ

”ہم کو جو پلائی ہے تو دنیا سے منگا دے“

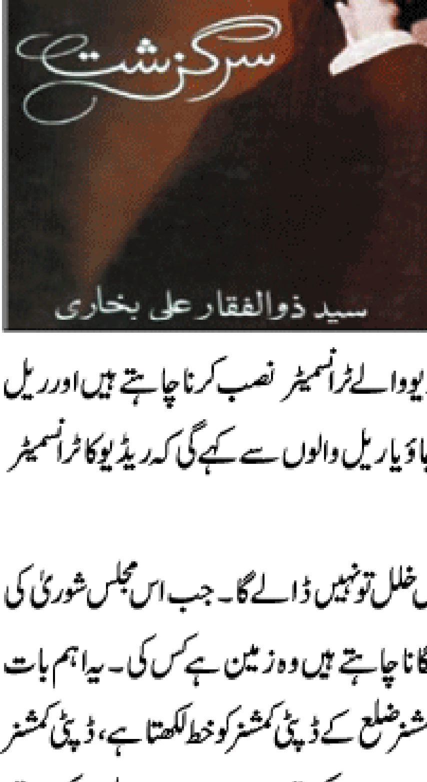
اور حقیقت بھی یہ ہے کہ داستان کا جو رنگ راشد الخیری اور شرر کی تحریروں میں پایا جاتا ہے وہ منشی پریم چند کے یہاں کہاں۔ منشی جی میں اور بہت کچھ ہے مگر داستان نہیں۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

اتوار/13 اپریل 2014ء
روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

نئے ریڈیو ٹرانسمیٹر کی اجازت انتہائی مشکل سے ملتی تھی

سرکاری افسروں سے مراسلت میں کئی سال لگ جاتے-فیلڈن ان معاملات سے بہت چڑتا تھا-مدراس کے چیف منسٹر کے پاس میں خود اس کے ساتھ گیا-راجہ گوپال منہ پھٹ تھے اور فیلڈن منہ زور-لیکن خوش قسمتی سے کوئی بدمزگی نہیں ہوئی-زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



ریڈیو ٹرانسمیٹر دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو وہ جو براڈ کاسٹنگ والے استعمال کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو پولیس والے استعمال کرتے ہیں، ہوائی جہاز والے، سمندری جہاز والے، فوج، تار اور ٹیلیفون والے استعمال کرتے ہیں۔یعنی ایک وہ ٹرانسمیٹر جن پر موسیقی کی نازک آواز نہایت درستی سے دور دور پہنچتی ہے اور دوسرے وہ ٹرانسمیٹر جن پر بات کرنے والوں کا زیادہ تر وقت ہلو ہلو میں گزر جاتا ہے۔

ٹرانسمیٹر استعمال کرنے والے اداروں نے اپنی ایک مجلس شوریٰ بنا رکھی ہے۔کسی ادارے کو کہیں ٹرانسمیٹر لگانا ہو تو درخواست پہلے اس مجلس شوریٰ کے پاس آتی ہے۔یہ مجلس کہے کہ ہاں ٹرانسمیٹر لگاؤ، تو ٹرانسمیٹر لگ سکتا ہے ورنہ نہیں۔

اس جھنجھٹ کی وجہ نہایت معقول ہے۔فرض کیجیے کہ ملتان، لاہور کی سڑک پر ملتان سے دو میل دور ریڈیو والے ٹرانسمیٹر نصب کرنا چاہتے ہیں اور ریل والے وہیں نئی ریل گزارنا چاہتے ہیں۔اب یہ مجلس یا تو ریڈیو والوں سے کہے گی کہ تم ذرا آگے سرک جاؤ یا ریل والوں سے کہے گی کہ ریڈیو کا ٹرانسمیٹر تو یہیں لگے گا تم کوئی اور راستہ ناپو۔

اس کے علاوہ یہ مجلس شوریٰ یہ بھی دیکھتی ہے کہ نیا ٹرانسمیٹر کسی پرانے لگے ہوئے ٹرانسمیٹر کی آواز میں خلل تو نہیں ڈالے گا۔جب اس مجلس شوریٰ کی طرف سے ٹرانسمیٹر لگانے کی اجازت مل جائے تو یہ دریافت کرنا ہوتا ہے کہ جس زمین پر ہم ٹرانسمیٹر لگانا چاہتے ہیں وہ زمین ہے کس کی۔یہ اہم بات معلوم کرنے کے لیے آپ صوبے کی حکومت کو خط لکھتے ہیں، صوبے کی حکومت کمشنر کو خط لکھتی ہے۔کمشنر ضلع کے ڈپٹی کمشنر کو خط لکھتا ہے، ڈپٹی کمشنر تحصیلدار کو خط لکھتا ہے، تحصیلدار نائب تحصیلدار کو، نائب تحصیلدار نمبردار کو اور نمبردار پٹواری کو۔پٹواری اپنا بستہ کھولتا ہے اور بہت سی مسلوں کی ورق گردانی کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ مطلوبہ زمین میرے علاقے میں نہیں ہے۔نمبردار نائب تحصیلدار کو لکھتا ہے کہ مطلوبہ زمین میرے نمبردار کے پٹواری کے علاقے میں نہیں ہے۔تحصیلدار ڈپٹی کمشنر کو لکھتا ہے کہ مطلوبہ زمین میرے نائب تحصیلدار کے نمبردار کے پٹواری کے علاقے میں نہیں ہے۔ڈپٹی کمشنر، کمشنر کو لکھتا ہے کہ مطلوبہ زمین تحصیلدار کے نائب تحصیلدار کے نمبردار کے پٹواری کے علاقے میں نہیں ہے۔کمشنر صوبے کی حکومت کو لکھتا ہے کہ مطلوبہ زمین متعلقہ ڈپٹی کمشنر کے، تحصیلدار کے، نائب تحصیلدار کے، نمبردار کے پٹواری کے علاقے میں نہیں ہے۔چونکہ یہ معاملہ ٹرانسمیٹر لگانے کا ہوتا ہے اس لیے یہ تمام خط و کتابت سرعت اور تعجیل سے ہوتی ہے اور ڈیڑھ دو سال کے قلیل عرصے میں مکمل ہو جاتی ہے۔فیلڈن ایسی باتوں پر بہت کڑھتا تھا اور واہی تباہی بکنے لگتا تھا۔میری ساری عمر اس کو یہ سمجھاتے گزر گئی کہ دیکھو تمہاری زندگی تمہیں عزیز ہو یا نہ ہو، مجھے بہت عزیز ہے۔تم افسروں سے الجھا نہ کرو۔جب وہ کسی طرح نہ مانا تو میں نے مناسب یہی سمجھا کہ سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہوں اور جہاں کہیں وہ چلانے لگے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دوں۔چنانچہ اسی قسم کی خدمت سرانجام دینے کے لیے میں فیلڈن کے ساتھ مدراس اور ترچناپلی گیا۔یہاں ٹرانسمیٹر لگنے تھے اور ان کے لیے زمین ڈھونڈھنی تھی۔اس زمانے میں مدراس کے چیف منسٹر راجہ گوپال اچاریہ تھے۔وہ منہ پھٹ اور فیلڈن منہ زور۔میں جی میں بہت ڈر رہا تھا، لیکن وقت وقت کی بات ہوتی ہے، فیلڈن کی دریدہ دہنی راجہ جی کو پسند آئی اور راجہ جی کے طنز کے تیکھے تیر فیلڈن نے ہنس ہنس کر کھائے۔اس بات کو پچیس سال ہو گئے مگر ان دونوں کی دوستی قائم ہے اور ایسی قائم ہے کہ روز بروز بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔فیلڈن اور میں مدراس کے کانی مارا ہوٹل میں مقیم تھے۔اس ہوٹل کے باہر جوتے صاف کرنے والے چھوٹے چھوٹے بچے اپنا اپنا ٹھیا جمائے بیٹھے تھے۔ان میں ایک بارہ چودہ برس کا چھوٹا سا بچہ تھا۔سر پر گھنگھریالے بالوں کی گٹھری، رنگ کالا سیاہ، دانت سفید چمکتے ہوئے۔ہنستا رہتا تھا۔قمیص کی آستین سے ناک پونچھتا رہتا تھا اور جوتے صاف کرتا رہتا تھا، جوتے پر برش مارتا تو ساتھ ساتھ سر بھی ہلاتا۔سر کے ساتھ اس کے گھنگھریالے بالوں کی گٹھری بھی ہلتی۔یہ بچہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بھی بولتا تھا۔اس کو جب معلوم ہوا کہ ہم راجہ گوپال اچاریہ کو جانتے ہیں اور ان کے یہاں آتے جاتے ہیں تو بہت مرعوب ہوا اور اپنی بڑھیا ماں کے سامنے ہمارے اثر و رسوخ کے کمالات بہت بڑھا چڑھا بیان کیے۔ماں بیوہ غریب اور معمر، زندگی کے لیے آسرا ڈھونڈھتی پھرتی تھی۔فیلڈن کے پاس آئی اور اس سے کہا کہ میرے بیٹے کو کوئی اچھی سی نوکری دلوا دو، یہ آخر کب تک لوگوں کے جوتے پالش کرتا رہے گا۔فیلڈن نے کہا، بی بی میں اور تو کیا کر سکتا ہوں، ہاں اس کو کہیں چپراسی رکھوا دوں گا۔وہ بولی چپراسی سے تو زیادہ جوتے پالش کر کے کما لیتا ہے۔چپراسی کی نوکری نہیں، کوئی اور نوکری دلواؤ۔فیلڈن جب کبھی شش و پنج میں پڑتا ہے، تو میری طرف رحم طلب نظروں سے دیکھا کرتا ہے۔اس موقع پر بھی میری طرف مظلومانہ انداز میں اس نے دیکھا۔یعنی بزبانِ حال مجھ سے کہا کہ اب تم بھی کچھ منہ سے پھوٹو، دیکھتے نہیں کہ اس بڑھیا نے میری زبان بند کر رکھی ہے۔مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی اور فیلڈن کو بے اختیار غصہ۔اس بڑھیا کے سامنے ہوٹل کے دروازے کے آگے وہ مجھ پر برس پڑا۔تمہارے ملک میں کچھ نہیں، تم لوگ جاہل ہو، یہ لڑکا بہت ذہین ہے، اس کی تربیت ہونی چاہیے، اس کو پڑھنا چاہیے، اس کو اسکول میں داخل ہونا چاہیے۔اس تقریر کے دوران میں وہ بڑھیا کی طرف پلٹا اور کہا، میں اس لڑکے کو دہلی لے جاؤں گا اور اس کو پڑھاؤں گا، میں خود پڑھاؤں گا، یہ میرے مکان کے باغ میں کھیلتا رہے گا، میں تم کو ہر مہینے روپے بھیجتا رہوں گا، یا تم بھی چلو میرے ساتھ۔میرے منہ سے بے اختیار نکلا کہ ہاں تم بھی چلو۔صاحب تم کو بھی دہلی لے جائیں گے، تم کو بھی پڑھائیں گے، خود پڑھائیں گے، تم بھی ان کے مکان کے باغ میں کھیلتی رہو گی۔فیلڈن کھسیانا ہو کر ہوٹل کے اندر چلا گیا۔اور اس کے پیچھے پیچھے میں بھی۔مدراس سے ہماری گاڑی چلنے ہی والی تھی کہ میں نے فیلڈن سے کہا کہ ذرا ادھر دیکھنا۔اس نے پلٹ کر جو دیکھا تو بڑھیا اور اس کا بیٹا کپڑوں کی گٹھری بغل میں دبائے چلے آ رہے ہیں۔فیلڈن کچھ گل افشانی کرنے ہی والا تھا کہ میں بھاگ کر ان دونوں کی طرف گیا اور انہیں لیکر اسٹیشن کے باہر آیا۔بڑھیا کو کچھ روپے دیکر رخصت کیا اور لڑکے کا ٹکٹ خرید کر اسے نوکروں کے ڈبے میں بٹھا دیا۔فیلڈن بالکل خاموشی سے دیکھتا رہا۔کوئی گھنٹہ بھر خاموش رہا پھر ایک دم کتاب پٹخ کر میری طرف متوجہ ہوا اور پوچھا اس لڑکے کا نام کیا ہے؟ میں نے کہا داس۔فرمایا مذہب؟ میں نے کہا عیسائی۔کہا ٹھیک ہے۔میں نے کہا کیا مطلب؟ کہا کتے رکھنا چاہتا ہوں، داس کو ان کی دیکھ بھال پر متعین کروں گا۔مہتر کتوں پر ظلم کرتے ہیں اور مسلمان کتوں کو ناپاک سمجھتے ہیں۔داس عیسائی ہے اور ذہین ہے، یہ کتوں کو خوش رکھے گا۔میں نے کہا مگر کتے کہاں ہیں تمہارے پاس۔کہا خرید لوں گا۔میں نے کہا تم بلڈاگ کتے رکھنے کے شوقین ہو، یہ کتے یہاں نہیں ملتے۔فرمایا انگلینڈ سے منگوا لوں گا۔یقین مانئے انگلستان تار بھیجا گیا کہ دو بل ڈاگ ذات کے چاق و چوبند کتے، ہوائی جہاز کے ذریعہ دہلی ارسال کیے جائیں۔ہمارے دہلی پہنچنے کے کوئی دس بارہ دن بعد دو بل ڈاگ ذات کے پلے انگلستان سے تشریف لائے۔اس زمانے میں ریڈیو کا ادارہ انڈسٹریز اینڈ لیبر منسٹری کے ماتحت تھا۔سر فرینک نوئس اس منسٹری کے سربراہ تھے۔ان کو چڑانے کے لیے فیلڈن نے ایک کتے کا نام انڈسٹری رکھا اور دوسرے کا لیبر۔جب اس پر بہت لے دے ہوئی تو فیلڈن نے ایک کا نام فرینک اور دوسرے کا نوئیس رکھ لیا۔یہ کتے داس کی تحویل میں دیئے گئے، مگر کچھ عرصے کے بعد یہ کتے بڑے ہو گئے اور انہیں داس کی نگہداشت کی ضرورت نہ رہی۔اب داس نے گھر کے ملازموں کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا۔یہ ایماندار آدمی تھا، بیروں کے ساتھ اس کی نہ بنی۔فیلڈن کا اور میرا اکثر وقت داس اور دیگر ملازموں کے جھگڑے نپٹانے میں گزرتا تھا۔اِدھر فیلڈن ان جھگڑوں سے تنگ آیا ہوا تھا اور اُدھر میرا تبادلہ بمبئی ہو گیا تھا۔صلاح یہ ٹھہری کہ میں داس کو اپنے ساتھ بمبئی لے جاؤں اور اپنے یہاں ملازم رکھوں۔چنانچہ داس میرے ساتھ بمبئی آیا۔اور میری بیوی اور بچوں کی ایسی خدمت کی کہ اب تک ہم سب اسے محبت سے یاد کرتے ہیں۔ہم ملک کے شمالی حصے کے رہنے والے لوگ اور داس مدراس کا باشندہ، لیکن اس ذہین شخص نے بہت جلد ہمارے طور طریقے اور ہمارے یہاں کے آداب سیکھ لیے۔ہمارے یہاں مہمان اکثر تشریف لاتے ہیں اور ہمیں نوازتے ہیں۔داس ہر مہمان کو دیکھ کر فوراً اندازہ لگا لیتا تھا کہ ان کی خاطر تواضع کس طرح کرنی چاہیے۔کیا مجال کہ کسی سکھ دوست کے سامنے سگریٹ رکھے یا کسی ہندو دوست کے سامنے گوشت کی پکی ہوئی کوئی چیز۔اسے معلوم تھا کہ سی سی مہتہ کیا پسند کرتے ہیں اور مینو مسانی کو کیا مرغوب ہے، فیاض علی خان کی تواضع کیسے کی جائے اور سندرا بائی کی کیونکر۔ایک مرتبہ دہلی سے استاد بندو خان مرحوم بمبئی تشریف لائے اور میرے یہاں مقیم ہوئے۔استاد بندو خان کو چانڈو کا بہت شوق تھا۔اس کے بغیر نہ رہ سکتے تھے اور یہاں بمبئی میں یہ حالت کہ چانڈو کی فروخت قانوناً بند تھی۔مگر داس نے کسی نہ کسی طرح چانڈو کا بندوبست کر ہی دیا اور مجھے اس کی خبر بھی نہ ہوئی۔داس کے اس حسن انتظام کا علم مجھے اس وقت ہوا جب استاد بندو خان کے چانڈو کا بل ادا کرنا پڑا۔ایک رات میں اپنے کمرے میں سو رہا تھا کہ داس نے مجھے آ کر جگایا اور انگریزی میں کہا، استاد بندو خان بہت برے آدمی ہیں۔ویری بیڈ مین، ویری بیڈ مین، میں یہ سن کر بہت گھبرایا اور پوچھا کیا ہوا۔داس بولا ان کے کمرے میں کوئی عورت ہے۔میں نے ان کی باتوں کی آواز سنی ہے۔میری سٹی گم ہو گئی۔بہت غصہ آیا کہ یہ استاد بندو خان کو بڑھاپے میں کیا سوجھی۔اپنے کمرے سے اٹھ کر استاد بندو خان کے کمرے میں قریب آ گیا۔کان لگا کر سنا۔استاد کہہ رہے تھے اری سو جا یہاں میرے قریب آ کر سو جا۔سو جا۔لے بس سو جا۔خاموشی۔پھر آواز آئی، ارے پھر نیچے کو سرک گئی۔یہاں اوپر آ۔یہاں سو لے۔سو جا۔مجھے ہنسی آ گئی۔میں نے دروازہ کھولا۔بتی جلائی۔استاد بندو خان مرحوم اپنی سارنگی کو گلے سے لگائے سو رہے ہیں۔استاد بندو خان کے ساتھ کمرے میں مرزا یگانہ مقیم تھے۔مرزا صاحب کا میں پرانا نیازمند تھا اور وہ میرے ہمیشہ کے محسن۔میرے شعر پر بڑی کڑی نگاہ رکھتے تھے۔اصلاح کبھی نہ فرماتے تھے۔نہ کبھی کوئی مشورہ دیتے تھے۔کوئی شعر پسند نہ آیا یا اس میں کسی قسم کا سقم دیکھا تو ہنستے تھے اور فرماتے تھے، ہونا آخر غالب کے پیروکار۔غلچیئے کہیں کے۔معنی پر غور نہ کیا، الفاظ کی رو میں بہہ گئے اور الفاظ بھی کیسے "آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے" اس کے بعد ایک زور کا قہقہہ لگاتے اور میں شرمندہ ہو کر رہ جاتا۔میں "گنجینہ" کی تدوین میں ان کا ہاتھ بٹاتا رہا، وہ یوں کہ شام کو حبیب تنویر، مرزا صاحب اور میں صحن میں بیٹھ جاتے، مرزا صاحب غزلیں سناتے اور ہم جھومتے۔جہاں کہیں کوئی شعر ہمارے نزدیک غزل کے باقی شعروں کے مقابلے میں نرم دکھائی دیتا، ہم داد نہ دیتے، بس خاموش رہ جاتے۔ہماری خاموشی پر مرزا صاحب کبھی تو فرماتے، ارے جاؤ تم کیا سمجھو گے یا کہتے اچھا بھائی یہاں ہم فیل ہو گئے۔

مرزا صاحب نے اپنی ایک نئی غزل سنائی جس کا مطلع ہے۔

بندہ وہ بندہ جو دم نہ مارے
پیاسا کھڑا ہو دریا کنارے

میں نے اس شعر کی بہت داد دی اور ساتھ ہی فارسی کا یہ شعر پڑھا۔

تشنہ لب بر ساحل دریا ز غیرت جاں دہم
گر بموج افتد گمان پیشانی مرا

یہ شعر سن کر مرزا صاحب کی حالت غیر ہو گئی۔آنکھوں میں آنسو آ گئے۔رندھی ہوئی آواز میں پوچھا کس کا شعر ہے۔میں نے عرض کیا غالب کا۔فرمایا جھوٹ۔

ایسے ہی ایک دو لطیفے مرزا صاحب کے اور بھی سنا دینے کو جی چاہتا ہے۔مرزا صاحب پنجاب کے تمام شعرا میں سے ن، م، راشد کو اچھا سمجھتے تھے اور ان کی بالغ النظری کے قائل تھے۔ایک دن مرزا صاحب سے بحث چھڑ گئی۔مرزا صاحب جدید شاعری کے قائل نہ تھے۔فرماتے تھے یہ جدید شاعری پنجابیوں کی اختراع ہے اور ضرورت اس اختراع کی یہ لاحق ہوئی کہ پنجابی لکھنو والوں کے مقابلے میں جب غزل لکھ نہ سکے تو انہوں نے کہا لاؤ جدید شاعری کا ڈھونگ رچاؤ۔یہ میدان خالی ہے اور ہرگز ایسا نہیں کہ لکھنو والے اس میں اتریں۔جب بحث نے بہت طول کھینچا تو میں نے کہا حضرت آپ ن، م، راشد کو اچھا شاعر سمجھتے ہیں۔فرمایا ہاں۔میں نے کہا اس جدت کے موجد بھی ن، م، راشد ہیں۔مرزا صاحب یہ سن کر چلائے کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔یہ بہتان ہے۔یہ غریب ن، م، راشد پر غلط الزام ہے۔وہ شخص شعر کو سمجھنے والا، پرکھنے والا ہے، اس قسم کی لغویت ہرگز نہیں کر سکتا۔میں نے ماورا کا نسخہ ان کے سامنے رکھ دیا۔مرزا صاحب نے کبھی صفحے الٹ پلٹ کر دیکھے، کبھی جلد دیکھی، کبھی سرورق دیکھا، آخر فرمایا بس سمجھ گیا راشد نے رشوت لے لی ہو گی۔مرزا صاحب سے آخری ملاقات کراچی میں ہوئی تھی۔علامہ رشید ترابی کے یہاں فروکش تھے۔مجھے بلا بھیجا کہ جلد آؤ بیمار ہوں۔میں بھاگا بھاگا علامہ کے مکان پر گیا۔اس مہمان نواز، دوست پرور انسان نے مرزا صاحب کے لیے ایک بہت بڑا کمرہ آراستہ کر رکھا تھا۔مرزا صاحب پلنگ پر رضائی اوڑھے لیٹے ہوئے تھے۔بخار کی شدت سے ان کا بدن پھنک رہا تھا۔میری آواز سنی تو فوراً اٹھ بیٹھے۔میں کہتا رہا کہ مرزا بھائی لیٹے رہو مگر مرزا ایک ہٹی، بیٹھے رہے اور فرمایا، ارے کہاں کا بخار اور کہاں کی بیماری۔بخاری آمد بخار رفت۔میں نے ان کا دل بہلانے کے لیے ان ہی کے شعر ان کو سنانا شروع کیے، مگر سناتے سناتے شعروں کی کیفیت میں ایسا کھو گیا کہ میری آنکھیں نم ہو گئیں۔مرزا صاحب کے بھی آنسو نکل آئے۔مجھے گلے لگایا اور روتے روتے کہا، بھائی تم ایسا شعر دوست پھر کب پیدا ہو گا۔میں بولا۔

تبرک ہے میرا پیرہن چاک
نہیں اہل جنوں کا یہ زمانہ

یہ شعر سن کر مرزا صاحب کی حالت دگرگوں ہو گئی۔دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔روتے جاتے تھے اور یہ شعر پڑھتے جاتے تھے۔ایک ایک لفظ پر سر دھنتے۔تبرک کے لفظ پر تو بہت دیر تک سینہ پیٹتے رہے۔ہائے ظالم کیا لفظ رکھا ہے۔تبرک۔ہائے تبرک۔آنسوؤں کا تار تھا کہ ٹوٹنے میں نہ آتا تھا۔روتے روتے نحیف آواز میں پوچھا بھائی یہ شعر تمہارا ہے؟ میں نے کہا نہیں۔پوچھا کس کا ہے۔میں نے کہا اقبال کا۔فرمایا تعجب ہے!!! اور پھر رونے لگے اور میں روتے روتے ہنس پڑا۔استاد بندو خان کے برابر والا کمرہ میں نے مرزا صاحب کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔مرزا صاحب میں اور سب ہی کچھ تھا مگر زود گوئی کا ملکہ نہ تھا۔ہفتوں بلکہ مہینوں میں ایک غزل کہتے تھے۔ایک ایک شعر کو کئی دن تک الٹ پلٹ کر دیکھتے تھے۔ایک دن شام کو بندو خان، مرزا صاحب اور ہم سب بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ بندو خان نے مرزا صاحب سے پوچھا، یہ سارا سارا دن اور ساری ساری شام آپ کمرے میں بیٹھ کر کیا کرتے ہیں؟ فرمایا شعر کہتا ہوں۔بندو خان نے پوچھا، دن میں کتنے شعر کہہ لیتے ہیں۔فرمایا، کبھی کبھی ایک شعر کہنے میں کئی کئی ہفتے گزر جاتے ہیں۔بندو خان بولے ریاض کی کمی معلوم ہوتی ہے؟ ایک دن مرزا صاحب دیوانِ صائب میرے کمرے میں غلطی سے چھوڑ گئے۔اپنے کمرے میں پہنچے تو داس سے کہا کہ میں کتاب بھول آیا ہوں جاؤ لے آؤ۔داس غلطی سے دیوان غالب لے گیا۔بے چارے داس پر برس پڑے۔میں مرزا صاحب کو سمجھاتا ہی رہ گیا کہ بھائی غریب، داس سے غلطی ہوئی مگر مرزا صاحب برابر یہ شک کیے جائیں کہ داس نے مذاق کیا ہے۔داس نے مجھ سے پوچھا کہ مجھ سے کیا غلطی ہوئی کہ مرزا صاحب اس قدر بگڑ رہے ہیں۔اب میں داس کو کیا سمجھاتا، البتہ شام کو دیکھا تو مرزا صاحب اس بے چارے مدراسی عیسائی، داس کو غالب اور صائب کے معائب و محاسن پر لیکچر دے رہے تھے اور داس یوں سن رہا تھا جیسے سب کچھ سمجھ رہا ہے۔بس اس کے بعد مرزا صاحب کا دل داس کی طرف سے صاف ہو گیا۔داس جوان لڑکا اور وہ بھی عیسائی، اتوار کو گرجا گھر جاتا تو ایک آدھ عیسائی لڑکی سے دوستی پیدا کرتا۔مرزا صاحب عشق سے بہت چڑتے تھے۔حسن کو بلائے حسن کہا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اگر کسی نوجوان پر بلائے حسن نازل ہو جائے اور وہ اس بلا سے چھٹکارا نہ پا سکے تو سمجھ لو کہ اس نوجوان کے ہاتھ پاؤں شل ہیں اور دماغ ماؤف۔چنانچہ مرزا صاحب ہمیشہ داس کو سمجھایا کرتے تھے کہ یہ عشق بازی چھوڑ دو۔مرزا صاحب میرے سامنے داس کی عشق بازی کا تذکرہ چھیڑتے تو میں ہنس کر بات ٹال دیتا۔جوانی چناں کہ افتد و دانی، میں کرتا بھی کیا اور مجھے فرصت کہاں کہ میں داس کی ٹوہ میں لگا رہوں، البتہ بیگم قزلباش کو مرزا صاحب نے اپنے ساتھ ملا لیا۔جب داس پر مرزا صاحب کی نصیحت کارگر نہ ہوئی تو مرزا صاحب نے بیگم قزلباش سے کہا کہ داس کی عشق بازی کے پیچھے لٹھ اٹھائے پھرنے لگیں۔نہ مرزا صاحب نے سمجھا اور نہ بھابھی گوہر قزلباش نے کہ عیسائی نوجوان لڑکے لڑکیاں آپس میں ہنس بول لیں تو اس کا مطلب عام طور پر ان کے یہاں سوائے معصوم دوستی اور کچھ نہیں ہوتا۔آخرکار بھابھی گوہر قزلباش کی سخت خبرگیری رنگ لائی۔جنگ چھڑی تو میں انگلستان چلا گیا۔بیوی بچوں کو میں نے شملے بھیج دیا اور داس سامان کی حفاظت کے لیے بمبئی میں رہ گیا۔میں نے گوہر قزلباش سے کہا کہ تم اسے اپنے یہاں رہنے کی اجازت دے دو۔گوہر نے مان لیا اور داس ان کے یہاں رہنے لگا۔گوہر قزلباش کی ایک عیسائی آیا تھی۔یہ بھی مدراس کی رہنے والی تھی اور داس بھی مدراس کا رہنے والا۔وہ بھی جوان اور یہ بھی جوان۔دونوں میں محبت ہو گئی اور یہ دونوں میرا انتظار کرنے لگے کہ انگلستان سے واپس آئے اور ہماری شادی رچائے۔بیگم قزلباش نے اس کو بھی عشق بازی سمجھا اور داس کو گھر سے نکال دیا۔داس نے مجھے نہ کچھ لکھا، نہ مجھ سے کچھ پوچھا، پیلرڈ پیر پر پورٹ ٹرسٹ میں ملازم ہو گیا۔یہاں ایک جہاز بارود سے اڑ گیا اور اس کے ساتھ داس کے بھی پرزے ہو گئے۔

☆☆☆☆☆

پیر/14 اپریل 2014ء
روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

بمبئی ریڈیو کو قائداعظم کی پہلی تقریر نشر کرنے کا اعزاز حاصل ہے

بانی پاکستان میری درخواست پر ریڈیو اسٹیشن تشریف لائے-عید کی نماز ان کیساتھ پڑھنے کی سعادت ملی-قائداعظم کی تقریر پر ہندوستان ٹائمز نے تین دن اداریے لکھے-انگریز اور کانگریس سرکار بھی چلا اٹھی تھی-زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



حقیقت یہ ہے کہ مجھ ایسے بہت سے سرکاری افسر، کانگریس کی حکومت کے دور میں کانگریس کے رنگ میں رنگے گئے تھے۔ جس طرح انگریز کی حکومت کے سامنے ہم سرکاری ملازم جھک گئے تھے، اسی طرح کانگریس کے سامنے بھی جھک گئے۔ انگریز کے سامنے گڈ مارننگ کہہ کر اور کانگریسی ہندو کے سامنے نمستے اور نمسکار کہہ کر داد غلامی دی۔ جس طرح انگریز کے سامنے ان کا سوٹ بوٹ پہن کر گئے، اسی طرح کانگریسی حکومت کے سامنے کھادی کا لباس پہن کر حاضر ہوئے۔ اب پاکستان میں آکر ہم سب پاک صاف ہو بیٹھے ہیں اور مسلمان ہونے میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کر رہے ہیں۔

بت خانے میں ہم نے کوئی ہم کیش نہ پایا
کعبہ نظر آیا تو مسلمان ہزاروں

میں کھادی کے کپڑے ہمیشہ سے پہنتا چلا آیا ہوں۔ پشاور کے دیہات میں آج سے تیس چالیس برس پہلے ہم گاؤں کی کھادی کے کپڑے پہنتے تھے۔ بڑے بڑے خان خوانین بھی اور ہم جیسے عام لوگ بھی باریک اور مہین کپڑے کو نسائیت کی نشانی سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ ہم لوگ پگڑی بھی کھادی ہی کی باندھتے تھے اور کندھے پر چادر بھی کھادی کی رکھتے تھے۔ آج بھی پشاور کے دیہات میں لوگ کھادی کے کپڑے پہنے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سب کچھ درست، لیکن کانگریس کے زمانے میں کھادی کے کپڑے پہنتے، تو دل کی تہہ میں یہ بات ضرور ہوتی کہ اس لباس سے کانگریسی آقا خوش ہوتے ہیں۔

خیر یہ تو لباس کا معاملہ ہے۔ ہم لوگوں نے تو مذہب کے بارے میں بھی اول جلول باتیں بکنی شروع کر دی تھیں۔ مسلمان سرکاری ملازم کھلے بندوں یہ کہتے پھرتے تھے کہ اجی یہ الگ الگ مذہب کیا؟ رام اور رحیم میں کیا فرق ہے؟ عبادت مقصود ہے نہ کہ طریق عبادت۔ کسی نے ہاتھ جوڑ کر عبادت کر لی یا کسی نے رکوع و سجود کر کے، اس میں فرق ہی کیا ہے؟ اجی ہٹایئے یہ کافر اور کفر کیا ہوتا ہے؟ کافر تو وہ ہوتا ہے جو خدا کو نہ مانے۔ ہندو تو خدا کو مانتے ہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ وہ خدا کو پرمیشور یا رام کرشن کہتے ہیں، اس سے کیا بگڑتا ہے؟ توبہ! اللہ ہم سب کو معاف کر دے۔

میں نے کانگریس والوں کو خوش کرنے اور ریڈیو کی ساکھ جمانے کے لیے ہر قسم کے ہندوؤں کی تقریریں ریڈیو سے نشر کیں۔ سروجنی نائیڈو، بابو راجندر پرشاد، کرپلانی، پروفیسر ملکانی، امبیدکر، جیکر، مرارجی ڈیسائی، بھتی سنگھ، کرشنا ہاتھی سنگھ اور پنڈت نہرو۔ غرض کہ بڑے بڑے ہندو ریڈیو سے براڈ کاسٹ کرتے رہے۔ ہماری کوشش یہ تھی کہ مسلم لیگ کا شاہین بھی زیر دام آئے، لیکن ہماری کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ قائداعظم کی کم فرصتی ہمیشہ مانع آئی۔ چندریگر ہمیشہ یہ جواب دیتے تھے کہ مسلم لیگ کی طرف سے صرف قائداعظم ریڈیو پر تقریر کر سکتے ہیں، تم انہیں کے پاس جاؤ۔ قائداعظم کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے میرے دو وسیلے تھے۔ ایک تو حسین بیگ محمد اور دوسرے محمد علی منیار۔ ان سے میں نے کئی مرتبہ کہا کہ قائداعظم کے سامنے میری سفارش کرو اور ان سے درخواست کرو کہ بمبئی کے ریڈیو اسٹیشن سے براڈ کاسٹ کرنا قبول فرمائیں۔ لیکن یہ دونوں حضرات موقع کے انتظار میں رہے۔ یہ بھی سچے تھے۔ قائداعظم اگر ایک مرتبہ کسی بات سے انکار دیتے تھے تو دنیا کی کوئی طاقت ان کے انکار کو اقرار میں تبدیل نہ کر سکتی تھی۔ یہ حضرات بھی جانتے تھے اور مجھے بھی خوب معلوم تھا کہ اگر بے موقع بات ہوئی اور قائداعظم نے براڈ کاسٹ کرنے سے انکار کر دیا تو معاملہ ہمیشہ کے لیے بگڑ جائے گا۔

خیر اللہ نے میری مدد کی۔ نومبر 1939ء کا ذکر ہے کہ رمضان کے مہینے کی آخری تاریخوں میں دہلی میں تمام سیاسی جماعتوں کا ایک اجتماع ہوا۔ جس میں شرکت کے لیے قائداعظم بھی تشریف لے گئے۔ اس اجتماع کی خبریں اخباروں میں چھپتی رہتی تھیں اور اخباروں کے ذریعہ یہ بھی معلوم ہوتا رہتا تھا کہ قائداعظم نے ملک کے مختلف مسائل اور مسلمانوں کے نقطہ نظر پر کن خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ جب دہلی کا اجتماع ختم ہوا تو اخباروں میں اعلان کیا گیا کہ قائداعظم بی بی اینڈ سی آئی سے 12 نومبر کی صبح کو بمبئی پہنچیں گے۔ میں فوراً بھائی محمد علی منیار کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ اب موقع ہے۔ میں تمہارے ساتھ کل صبح ریل کے اسٹیشن پر جاؤں گا۔ ہم قائداعظم سے یہ درخواست کریں گے کہ عید کی نماز عید گاہ میں پڑھیں اور شام کے وقت ریڈیو سے تقریر نشر فرمائیں۔ منیار بھائی کچھ سوچنے لگے۔ میں نے کہا کہ سوچو مت، قائداعظم دہلی سے کامیاب واپس آرہے ہیں۔ یقیناً وہ خوش ہوں گے اور کیا تعجب ہے کہ اس خوشی کے موقع پر وہ ہماری درخواستیں منظور کر لیں۔

چنانچہ جہاں اور ہزاروں آدمی قائداعظم کی راہ میں اپنی آنکھیں فرش کرنے کے لیے اسٹیشن پر موجود تھے، وہاں میں بھی حاضر تھا۔ جب گاڑی اسٹیشن پر آکر ٹھہری اور قائداعظم نے گاڑی کا دروازہ کھولا تو بھائی منیار نے مجھے دھکا دیا اور میں گاڑی کے اندر گھس گیا۔ جب میں گاڑی کے اندر چلا گیا تو منیار نے دروازہ بند کر دیا۔ محترمہ فاطمہ جناح بھی قائداعظم کے ہمراہ فرسٹ کلاس کوپے میں سفر کر رہی تھیں۔ میں نے عرض کیا...... اب کیا بتاؤں، کیا عرض کیا اور کیا الفاظ استعمال کیے۔ قائداعظم کے سامنے زبان کھولنے کی جرأت ذرا مشکل سے پیدا ہوتی تھی۔ خدا معلوم میں نے کیا کہا، لیکن قائداعظم، خدا انہیں غریق رحمت کرے، اگلے روز عید گاہ میں نماز پڑھنے بھی تشریف لائے اور عید کا دن گزار کر شام کو انہوں نے ریڈیو سے تقریر بھی نشر کی۔ یہ ریڈیو سے ان کی پہلی تقریر تھی۔ 12 نومبر 1939ء عید کا دن، یہ عید واقعی میرے لیے مبارک عید تھی۔ اب ذرا اس براڈ کاسٹ کی تفصیل بیان کرنے کی اجازت دیجیے۔

میں نے قائداعظم کی خدمت میں درخواست کی کہ ریڈیو سے تقریر نشر فرمائیں اور انہوں نے یہ درخواست قبول بھی کر لی مگر اب مجھ پر ایک خوف طاری ہو گیا کہ خدا جانے قائداعظم کیا فرمائیں گے۔ کانگریسیوں کی حکومت ہے۔ اگر قائداعظم نے کانگریسیوں کو اصلی رنگ میں دکھایا تو میرا کیا حشر ہوگا۔ آصف علی، گاندھی، مرارجی ڈیسائی، کھیر، سروجنی نائیڈو اور فیلڈن یہ سب کیا کہیں گے۔ مگر پھر کہا جو ہو سو ہو، اب تو اوکھلی میں سر دے ہی دیا ہے، دھماکوں کا کیا ڈر۔

قائداعظم عید کی نماز کے لیے تشریف لے گئے تو مجھے بھی ان کے ساتھ نماز پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ بھائی منیار بھی موجود تھے اور دہلوی صاحب بھی۔ اب کس کس کے نام گنواؤں۔ سارا شہر عید گاہ میں جمع ہو گیا تھا۔ اس مجمع میں اعلان ہوا کہ شام کو قائداعظم بمبئی ریڈیو اسٹیشن سے تقریر نشر فرمائیں گے۔ شام قریب آئی تو ریڈیو کے آس پاس کی تمام سڑکوں پر لوگوں کا ہجوم ہو گیا۔ میں بہت ڈرا کہ اگر خدانخواستہ کوئی دشمن ہجوم میں گھس کر قائداعظم کی گاڑی پر بم پھینک دے تو کیا ہوگا؟ بس اس خیال کا آنا تھا کہ میرے ہوش و حواس گم ہو گئے۔

ان دنوں بمبئی کا گورنر راجرلم لے تھا۔ جو آج کل لارڈ سکاربرا کے نام سے مشہور ہے۔ یہ شخص میرا بہت دوست تھا۔ میں اکثر اس کے یہاں آیا جایا کرتا تھا۔ مگر ان دنوں یہ بمبئی سے کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ خیر دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ہوم ڈپارٹمنٹ کا کوئی انگریز ان کی جگہ کام کر رہا ہے اور گورنمنٹ ہاؤس میں عارضی طور پر مقیم ہے۔ میں دفتر سے نکلا کہ گاڑی میں بیٹھ کر اس کے پاس جاؤں۔ میرا باہر نکلنا تھا کہ لوگوں نے مجھے گھیر لیا۔ یہ روح پرور نظارہ دیکھ کر میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ سروجنی، نہرو وغیرہ کے آنے پر کبھی بھی ایسی خوشی کا اظہار نہ ہوا تھا۔ یہ جادو قائداعظم ہی کے نام کا تھا کہ لوگ یوں ٹوٹ پڑے تھے۔

خیر میں گورنمنٹ ہاؤس پہنچا۔ اس انگریز سے ملاقات ہوئی۔ اس انگریز پر اپنی گھبراہٹ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اس نے نہایت سرسری طور پر کہا کہ قائداعظم آج شام کو ریڈیو سے تقریر نشر کر رہے ہیں۔ میں نے کہا ہاں! فرمایا، کہ تمہارا محکمہ مرکزی حکومت کے تحت ہے۔ صوبائی حکومت کو محکمے کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا اختیار نہیں، لیکن پھر بھی تم سے کہتا ہوں کہ تم نے بہت برا کیا کہ قائداعظم کو تقریر نشر کرنے کی دعوت دی۔ ہندوؤں پر اس کا اثر اچھا نہیں پڑے گا۔ میں نے کہا ہاں صاحب یہ تو ہوتا ہی ہے۔ جب نہرو اور بابو راجندر پرشاد وغیرہ نے براڈ کاسٹ کیا تو بہت سے مسلمانوں پر اس کا اثر اچھا نہیں پڑا تھا۔ چلیے عوض معاوضہ گلہ ندارد۔ فرمایا تم نے کسی سے پوچھ ہی لیا ہوتا۔ میں نے عرض کیا کہ صاحب آپ سے پوچھتے ہوئے شرم آئی۔ فرمایا کیوں؟ میں نے کہا میں نے یہ خیال کیا کہ اگر آپ سے قائداعظم کے براڈ کاسٹ کے متعلق مشورہ کروں تو کہیں آپ یہ نہ پوچھ بیٹھیں کہ کیوں جی جب پنڈت نہرو اور سروجنی وغیرہ کو ریڈیو پر لائے تھے تو ہم سے پوچھا تھا؟ اب قائداعظم کی باری آئی تو ہم سے کیوں پوچھ رہے ہو؟

میرا جواب سن کر صاحب بہادر کچھ خاموش ہو گئے۔ بس کہا تو یہ کہا کہ اچھا تم جانو اور تمہارا کام۔ میں نے کہا نوازش، آج رات کو نو بجے قائداعظم کی تقریر ضرور سننا۔ فرمایا میں کہیں باہر جا رہا ہوں۔ میں نے کہا یہ لو، دیکھ لو، میرے پاس تقریر کا مسودہ موجود ہے۔ وہ مسودہ دیکھنے لگا اور میں اس کے چہرے کا رنگ، جوں جوں پڑھتا جاتا تھا اس کا رنگ دگرگوں ہوتا جاتا تھا۔ جب مسودہ ختم ہوا تو اس نے کہا، اس کا جواب کانگریسیوں کے پاس کچھ بھی نہ ہوگا۔ اس تقریر میں قائداعظم نے کانگریسیوں کو انہیں کے الفاظ میں مخاطب کیا تھا۔ میں نے مسودہ اس سے واپس لیا اور اٹھ کر چلنے لگا۔ چلتے چلتے یوں کہا جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آئی ہو کہ ریڈیو کے گرد ابھی سے بہت ہجوم ہو گیا ہے۔ پوچھا کیوں؟ میں نے کہا لوگ قائداعظم کے دیدار کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ فرمایا پھر؟ میں نے کہا یہی کہ کچھ ایسا انتظام ہونا چاہیے کہ کوئی شخص گڑبڑ نہ کرنے پائے۔

بس صاحب میرا یہ کہنا تھا کہ صاحب بہادر بپھر گئے اور لگے واہی تباہی بکنے کہ اب قائداعظم کی جان خطرے میں پڑتی ہے تو پڑنے دو۔ اس کے ذمہ دار تم ہو۔ تم نے ان کو کیوں بلایا۔ تم نے ہم سے مشورہ کیوں نہیں کیا؟ تم نے پولیس کمشنر کو اطلاع کیوں نہ دی؟ میں اب کچھ نہیں کر سکتا، تم ہمارے لیے عذاب بن گئے ہو۔ میں نے کہا صاحب کچھ بھی ہو یہ یاد رکھیے کہ میں نے آپ کو قائداعظم کے ریڈیو پر آنے کی اطلاع اور ہجوم کے جمع ہونے کی خبر دے دی ہے۔ اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔ یہ کہہ کر میں اس کے کمرے سے نکل آیا اور سیدھا قائداعظم کے در دولت پر پہنچا۔ ابھی وقت بہت تھا۔ میں باہر بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ وقت سے کچھ دیر قبل قائداعظم نے مجھے اوپر طلب فرمایا اور خود ریڈیو اسٹیشن کی طرف روانہ ہونے کی تیاری کرنے لگے۔

جب ہم زینے سے نیچے اترے تو میں نے عرض کیا کہ ہجوم بہت ہو گیا ہے۔ آپ کے دیدار کے لیے بہت سے لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ سن کر خاموش رہے۔ گاڑی میں بیٹھے تو میں نے عرض کیا کہ صاحب مجھے ڈر لگتا ہے۔ کڑک کر کہا ڈر کس بات کا۔ میں عرض کیا اتنے بڑے مجمع میں کیا معلوم کوئی دشمن بھی ہو اور وہ...... میرا فقرہ قائداعظم کی بے نیازانہ مسکراہٹ میں گم ہو گیا۔

جب قائداعظم کی سواری کوئنز روڈ پر پہنچی تو لوگوں کے بے پناہ ہجوم کے باعث گاڑی کا آگے چلنا دشوار ہو گیا۔ گاڑی آہستہ آہستہ آگے بڑھتی گئی اور بڑھتے بڑھتے ریڈیو کے پھاٹک میں داخل ہوئی۔ لوگ اندر آنے لگے۔ میں بہت گھبرایا۔ میری گھبراہٹ دیکھ کر قائداعظم نے فرمایا ان سے کہو کہ اندر نہ آئیں۔ ان کا یہ فرمان سن کر میں سکتے میں آ گیا۔ میں کیا اور میری آواز کیا، اور میری حیثیت کیا کہ میں کہوں اور میرے کہنے پر یہ ہجوم احاطے کے اندر آنے سے باز رہے۔ مگر قائداعظم کا فرمان کیوں کر ٹالتا۔ گاڑی سے باہر نکلا اور احاطے کی دیوار پر کھڑے ہو کر میں نے کہا، قائداعظم کے حکم کے مطابق آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ احاطے کے اندر تشریف نہ لائیں۔ یہ سب قائداعظم کے نام کی برکت تھی کہ میری آواز میں تاثیر پیدا ہو گئی اور آگے بڑھتے ہوئے لوگ یوں پیچھے ہٹ گئے جیسے سمندر کی لہر ساحل تک آ کر پلٹ جائے۔

اسٹوڈیو چوتھی منزل پر تھا۔ میں قائداعظم کے ساتھ لفٹ میں سوار ہوا۔ لفٹ چلانے کے لیے میں نے اپنا ایک خاص آدمی متعین کیا تھا۔ مجھے کسی اور پر بھروسہ نہیں تھا۔ جب پاکستان بنا تو میں اس لفٹ ڈرائیور کو ساتھ لے آیا۔ یہ شاید اب تک ریڈیو پاکستان کے کسی محکمہ میں چپراسی ہے۔ ضعیف آدمی ہے اور خدا جانے زندگی کے دن کس طرح گزار رہا ہے۔ کسی کو کیا معلوم کہ قوم کے کتنے بیش بہا سرمایے کی حفاظت اس غریب کے سپرد کی گئی تھی۔

قائداعظم کی آواز تھی کہ صور اسرافیل۔ لہجہ تھا کہ صداقت کے سمندر کی لہریں۔ الفاظ تھے کہ ترستی مٹی پر رحمت باراں۔ جس جس نے قائداعظم کی تقریر سنی مبہوت ہو گیا۔ کٹر ہندو اخبار ہندوستان ٹائمز نے اس تقریر پر متواتر تین دن اداریے لکھے۔ مدراس، کلکتہ، احمد آباد، لاہور کوئی بڑا مرکز اخباروں کا ایسا نہ تھا جہاں قائداعظم کی تقریر ہفتوں تک موضوع سخن نہ بنی رہی ہو۔ جب قائداعظم تقریر کر کے اسٹوڈیو سے باہر نکلے تو فدائی ٹوٹ پڑے۔ قائداعظم کو اور ان کے طفیل مجھ کو اتنے ہار پہنائے کہ عرض نہیں کر سکتا۔ قائداعظم کی تقریر نے مسلمانوں میں زندگی کا نیا خون بھر دیا۔ مگر انگریز اور کانگریس والے مل کر میرا خون خشک کرنے لگے۔

دہلی سے کیفیت طلب ہوئی کہ یہ تقریر کس کے حکم سے نشر کی گئی۔ میں نے جواب دیا کہ کسی کی تقریر نشر کرنے کے لیے کسی کے حکم کی کیا ضرورت ہے۔ اسٹیشن ڈائریکٹر کو حق پہنچتا ہے کہ مناسب تقریریں اپنے اسٹیشن سے نشر کرائے۔ یہ جواب ناکافی سمجھا گیا اور مجھ سے پوچھا گیا کہ کیا تم کو نہیں معلوم کہ اس تقریر کی ایک خاص سیاسی اہمیت ہے۔ اس خاص سیاسی اہمیت کے پیش نظر یہ بہت ضروری تھا کہ تم سرکار دہلی سے اجازت حاصل کرنے کے بعد اس تقریر کے نشر کرنے کا بندوبست کرتے۔ میں نے عرض کیا کہ میں اس سے پیشتر نہرو، بابو راجندر پرشاد وغیرہ وغیرہ کی تقریریں نشر کر چکا ہوں۔ چونکہ سرکار نے ان کی تقاریر پر کوئی اعتراض نہ کیا تھا اور نہ کسی قسم کی کیفیت طلب کی تھی، اس لیے میں یہ سمجھنے میں حق بجانب تھا کہ قائداعظم سے تقریر نشر کراؤں گا تو کوئی پوچھ گچھ نہ ہوگی۔ میرا جواب پا کر سرکار منہ سے تو کچھ نہ بولی، البتہ میز پر مکے ضرور مارنے لگی۔ آخر بڑی دور کی کوڑی لائی۔

قائداعظم کی تقریر کے ایک حصے پر اعتراض کر ڈالا۔ قائداعظم نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ اسلام کے معنی ہیں عمل۔ پیغمبر اسلام نے رمضان کے ضبط و انضباط کی تلقین اس لیے فرمائی تھی کہ ہم میں عمل کی قوت پیدا ہو۔ قائداعظم نے عمل کے لیے ایکشن کا لفظ استعمال فرمایا تھا۔ انگریز اور کانگریس والوں نے ایکشن سے مراد ڈائریکٹ ایکشن لیا جس کا فیصلہ 31 نومبر 1939ء کے سات سال بعد یعنی 29 جولائی 1946ء کو قائداعظم نے بمبئی میں فرمایا تھا۔ مراد اس سے یہ ہے کہ کانگریس اور اس کے ساتھ انگریز ایکشن کے لفظ سے گھبرا اٹھے اور سمجھے بس اگر مسلمان ایکشن پر اتر آیا تو ہم مرے......

ارشاد ہوا کہ تم کو تقریر کا یہ حصہ بغیر ہم سے پوچھے براڈ کاسٹ نہیں کرنا چاہیے تھا، لہٰذا تم گردن زدنی ہو۔ میں نے عرض کیا حضور آپ کے ہوم ڈپارٹمنٹ کے سیکریٹری ایک انگریز صاحب ہیں۔ انہوں نے نشر ہونے سے قبل یہ تقریر ملاحظہ فرمائی تھی۔ انگریز خاموش ہو گیا، مگر یہ بات زیادہ دیر تک خاموش رہنے والی نہ تھی۔ تھوڑے دن کے بعد ایک حکم جاری کیا کہ آئندہ کسی سیاسی لیڈر یا کسی سیاسی پارٹی کے ممبر کی تقریر، بغیر ہماری اجازت کے ریڈیو کا کوئی اسٹیشن براڈ کاسٹ نہ کرے۔ ہم نے کہا کہ حضور ملک کے اہل علم دو طبقوں میں منقسم ہیں۔ ایک تو وہ جو سرکار کا نمک خوار اور غلام ہے۔ اور دوسرا وہ جو آپ کو ملک بدر کرنے کے لیے میدان میں اتر آیا ہے۔ آپ کے نمک خوار اور غلام ریڈیو پر آتے ہیں تو آپ ہمیں بند کر دیتے ہیں۔ اب یہ ریڈیو کیوں کر چلے گا۔ انگریز اس کا جواب نہ دینے پایا تھا کہ ہندوستان میں اس کے دن پورے ہو گئے۔

میں اس تمام کیفیت طلبی کے دوران میں جب کبھی بھی اس اسٹوڈیو میں جاتا جہاں قائداعظم نے تقریر کی تھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے برات رخصت ہو گئی ہو۔ کہاں تو وہ گہما گہمی اور کہاں ایسی خاموشی۔ میں دیر تک اس اسٹوڈیو میں کھڑا رہتا۔ کانوں میں ان کی آواز اور ہاتھوں میں وہ تصویر جس پر انہوں نے اپنے دستخط کیے تھے اور لکھا ''ٹو مائی ذوالفقار''۔ اس کا ترجمہ اردو میں نہیں ہو سکتا۔ ذوالفقار ایک تو میرا نام اور دوسرے تلوار۔ نام مذکر، تلوار مؤنث۔ ترجمہ کیوں کر ہو۔ ہاں فارسی میں ترجمہ ہو سکتا ہے ''بنام ذوالفقار''۔ شکر ہے کہ فارسی میں تذکیر و تانیث کا جھنجھٹ نہیں، لیکن مائی کا ترجمہ پھر رہ گیا۔ جب میں بمبئی کو چھوڑ کر پاکستان آیا تو راستے میں میرا سب سامان لٹ گیا۔ میری ساری عمر کی کمائی تاراج ہو گئی۔ اس سامان میں یہ تصویر بھی تھی۔ میری زندگی کا بہترین سرمایہ۔ (جاری ہے)

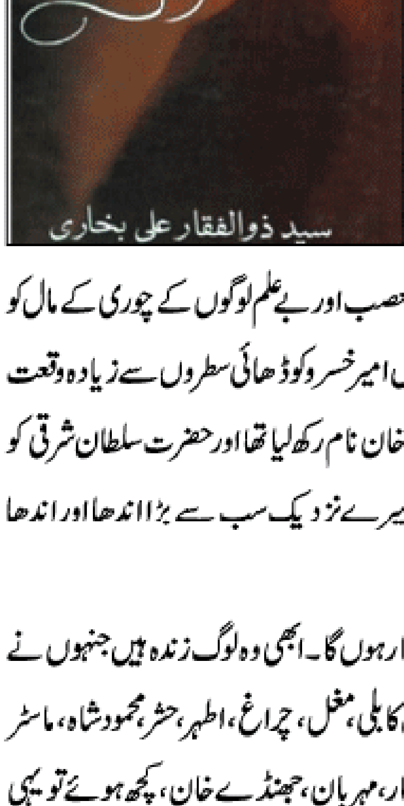
☆☆☆☆☆

منگل/15/اپریل 2014ء

روزنامہ امت کراچی/حیدر آباد

استاد جھنڈے علی خان نے کبھی تہجد قضا نہیں کی

نماز کا وقت ہوتے ہی براڈ کاسٹنگ چھوڑ کر مسجد کا رخ کرتے - تال کے بادشاہ اور بول بٹھانے میں ماہر تھے - "چتر لیکھا" کے تمام گانے ایک ہی راگ میں بنائے - میری محبت میں ریڈیو سے کبھی معاوضہ نہ لیا - پاکستان میں ان کی قدر نہ کی گئی - زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے ہم۔ کل کی بات ہے کہ جو بھی صنعت ہو ہم مسلمان اس میں پیش پیش تھے۔ موسیقی ہو کہ مصوری، شعر شاعری ہو کہ مشاعرہ آرائی، اسٹیج کی اداکاری ہو کہ فلم کی شعلہ انگاری، ہمیں ہم تھے۔ اور آج؟ آج یہ حالت ہے کہ یہیں پاکستان میں بیٹھ کر ہمارے ہی فلم کار اور سخن طراز امیر خسرو، عطا حسین خان (عرف تان سین) اور حضرت سلطان شرقی والیٔ جون پور کی موسیقی کو برا کہتے ہیں۔ جھنڈے خان، عبدالکریم خان، فیاض خان، عاشق علی خان، بندو خان، علی بخش، فتح علی خان، مہربان، رجب علی خان، اللہ دیا خان، صدا رنگ، ادا رنگ سب کے سب یاروں کے دلوں سے محو ہو گئے۔ کل جن کے نغمے سامع نواز تھے، آج سامع خراش ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ جن کو ہم نے ٹھیکریاں سمجھ کر پھینک دیا انہیں انمول موتیوں کو بھارت نے اٹھا لیا اور اپنا مال بنا کر پیش کیا اور فرمایا کہ یہ سرمایہ ہمارا ہے، ہماری پرانی پشتوں کا ہے، مسلمان کا اس سے کیا واسطہ۔ چنانچہ وشنو ڈگمبر اور بھات کھنڈے جیسے متعصب اور بے علم لوگوں کے چوری کے مال کو موسیقی قرار دیا اور ان پر اپنی کتابوں میں صفحے کے صفحے کالے کر کے اپنا نامہ اعمال سیاہ کیا۔ ان کتابوں میں امیر خسرو کو ڈھائی سطروں سے زیادہ وقعت نہ ملی۔ تان سین کے متعلق کہہ دیا کہ وہ ہندو تھا، ویسے بادشاہ کو خوش کرانے کے لیے اس نے عطا حسین خان نام رکھ لیا تھا اور حضرت سلطان شرقی کو سرے سے اپنے تذکروں میں جگہ ہی نہ دی۔ لوگ کہتے ہیں کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ ہوتی ہوگی۔ مگر میرے نزدیک سب سے بڑا اندھا اور اندھا کرنے والا تعصب ہوتا ہے۔

خیر، غیروں کے تعصب کا رونا رونے سے کیا حاصل۔ میں تو اپنوں کی ناقدر شناسی پر ماتم کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔ ابھی وہ لوگ زندہ ہیں جنہوں نے اردو اسٹیج کی بہار دیکھی ہے۔ اس اسٹیج پر جو چمکا وہ مسلمان تھا۔ گل خان، مظہر خان، بابا شہاب، عبدالرحمن کابلی، مغل، چراغ، اطہر، حشر، محمود شاہ، ماسٹر رحمت، لبھو، غلام علی دیوانہ، کریم سندھی، حیدر سندھی، بدرالدین بدھو، حیات محمد، خادم حسین، یوسف، نثار، مہربان، جھنڈے خان، کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے۔ جب اسٹیج کا چراغ فلم کی چکا چوند کے سامنے ماند پڑ گیا تو موت کی تیغ سے بچے ہوئے یہی لوگ سینما کے میدان میں آئے اور وہ نام پیدا کیا کہ باید و شاید۔

قیام پاکستان سے پہلے ہندوستان میں کاردار، محبوب، مظہر خان، بھائی اشرف خان، نور محمد چارلی، شوکت حسین رضوی، ڈبلیو زیڈ احمد کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اور آج بھی محبوب اور نوشاد کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ یہ یکایک کیا ہو گیا کہ ہم مسلمانوں نے اپنے شاگردوں کو استاد مان لیا؟ جو کل تک نقل محفل تھے، آج ان کو میر محفل گردان لیا؟ ان سے اس قدر مرعوب ہوئے کہ فلم میں آئے تو اپنے اسلامی نام چھوڑ کر ہندوانہ نام رکھ لیے۔ یہی نہیں بلکہ آج ہم بیقرار ہیں کہ بھارت کی فلمیں پاکستان میں دکھائی جائیں۔ عدالت کا فیصلہ سر آنکھوں پر، قانون کی باریکیاں بجا، لیکن ہائے غیرت قومی! قانون نے تو کہہ دیا کہ ان فلموں کو، جو پیسے کے لوبھی باپ اپنی معصوم اولاد کو دکھانے کے لیے بھارت سے لائے ہیں، پاکستان میں دکھانے کی اجازت ہے۔ لیکن قانون نے یہ تو نہیں کہا کہ جو پاکستانی ان فلموں کو نہ دیکھے گا، غیرت قومی کے جرم میں اسے سزا دی جائے گی۔ خدا جانے آج میں اپنی سوکھی ہڈیاں کیوں چٹخا رہا ہوں؟ آج یہ باسی کڑھی میں ابال کیوں آ رہا ہے؟ آج یہ مردہ کفن کیوں پھاڑ رہا ہے؟ شاید درد و کرب و فشار کی شدت بڑھ گئی ہے۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

اس تشبیب کے بعد بغیر کسی گریز کے، یہ فقیر اپنی سرگزشت عرض کرتا ہے۔ آج ایک ایسے شخص کے حالات بیان کرنے کو جی چاہتا ہے جو فقیروں کے در کا فقیر تھا مگر عرفان کے ملک کا امیر تھا۔ غلام مصطفی خان ان کا نام تھا۔ موسیقی کی دنیا میں جھنڈے گاڑے اور جھنڈے خان کے نام سے مشہور ہوا۔ آغا حشر کے ساتھ برسوں رہا اور برسوں آغا حشر کے ڈراموں کی موسیقی مرتب کی۔ خود نہ گاتا تھا نہ کوئی ساز بجاتا تھا۔ ہارمونیم پر اس کی انگلیاں یوں چلتی تھیں جیسے کسی اناڑی کی۔ مگر تال کا بادشاہ، بول بٹھانے میں ماہر، نواب جلیل القدر پیارے میاں کی طرح محمد علی خان کے دھرپدوں کی چلتی پھرتی کتاب۔

اس فقیر دوست شخص کو خدا نے دولت عرفان سے مالا مال کر رکھا تھا۔ ایسا عبادت گزار شخص میری نظر سے نہیں گزرا۔ متقی، پرہیزگار، شرع کا پابند، ساری عمر تصویر نہیں کھنچوائی، صفائی کا دلدادہ، سچائی اور صداقت کا پرستار، قلب ایسا کہ جہاں بزرگان دین کا نام آئے، فرط محبت سے اس کی چیخیں نکل جاتی تھیں۔ جب اسٹیج کا پردہ گرا اور سینما کا پردہ اٹھا تو جھنڈے خان نے بمبئی میں اقامت اختیار کر لی۔ میں بمبئی پہنچا تو سب سے پہلے یہ کام کیا کہ استاد جھنڈے خان کو ڈھونڈ نکالا۔ دادر کے کسی اسٹوڈیو میں دیکھا کہ ایک کرسی پر پیانو کے سامنے بیٹھے ہیں اور کسی گانے کی دھن بنا رہے ہیں۔ وہی چھوٹا سا قد، وہی گول پگڑی، وہی لمبا کوٹ، وہی نورانی داڑھی، برسوں کے بعد دیکھا، مگر ویسا کا ویسا ہی پایا۔

جھنڈے خان اپنی کیفیت میں آنکھیں نیچی کیے بیٹھے تھے۔ نہ ان کی نگاہ مجھ پر پڑی اور نہ میں نے مناسب سمجھا کہ ان کے انہماک میں دخل دوں۔ اسٹوڈیو کے دوسرے لوگوں نے مجھے دیکھا اور کچھ کہنے لگے، مگر میں نے اشارے سے روک دیا۔ میں دو تین آدمیوں کو ساتھ لے کر چپکے سے اسٹوڈیو کے باہر آ گیا۔ دل میں کہا کہ جلدی بھی کیا ہے، جھنڈے خان کام سے فارغ ہو لیں تو ملاقات ہو جائے گی۔ اسٹوڈیو والے مجھے قریب ہی ایک کمرے میں لے گئے۔ ابھی وہاں بیٹھا بھی نہ تھا کہ ایک شور اٹھا۔ ایک چیخ اور جھنڈے خان بھاگتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ میرے پاؤں کی طرف بڑھے تھے کہ میں نے سینے سے لگا لیا۔ ان کا دل میرے سینے کے ساتھ ٹکریں مار رہا تھا۔ جو لوگ اسٹوڈیو سے ان کے ساتھ کمرے میں آئے تھے، مجھ سے کہنے لگے کہ آپ کے چلے جانے کے بعد ان کی عجیب حالت ہوئی۔ ایک دم پیانو سے سر اٹھایا اور چیخ چیخ کر کہا، کون آیا ہے اور یہ کہتے ہوئے اٹھے اور سیدھے اس کمرے میں آ گئے۔

ان کی یہ محبت، ان کا یہ کرم، کچھ میری موسیقی دانی کے سبب نہ تھا۔ میں کیا اور میری موسیقی دانی کیا، اور پھر وہ بھی جھنڈے خان کے سامنے۔ یہ سب اس محبت کا کرشمہ تھا جو ان کو خاندان رسول سے تھی۔ جب آنسو تھمے تو مجھے اسٹوڈیو میں لے گئے اور کہا پیانو کو ہاتھ لگا دو۔ میں نے ان کی خاطر پیانو کو یونہی چھیڑا۔ نہ کوئی دھن نہ کچھ اور، یونہی میں نے چند پردوں پر انگلیاں چلا دیں۔ فرمایا بس ہو گئی طرز تیار۔ یہ کہہ کر پیانو پر بیٹھے اور انہیں بے ترتیب سروں کے امتزاج سے کھماج کی ایسی دھن تیار کر دی کہ ہم سب حیران رہ گئے۔

اس طرز سے اسٹوڈیو گونج اٹھا اور آس پاس کے سب لوگ جمع ہو گئے۔ ان میں ایک صاحب آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور دوڑ کر جھنڈے خان کو سینے سے لگا لیا اور بولے خان صاحب یہ بندش کہاں سے آئی۔ جھنڈے خان نے میری طرف اشارہ کیا۔ یہ صاحب دوڑ کر میری طرف آئے اور میرے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ گٹھا ہوا جسم، سانولا رنگ، درمیانہ قد۔ یہ صاحب مشہور ایکٹر اور مشہور اہل دل فقیر بھائی اشرف خان تھے۔ بھائی اشرف خان سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ گجراتی اور اردو ڈراموں میں انہوں نے بہت بڑا نام پایا تھا۔ کامیڈی کے بھی بادشاہ تھے اور ٹریجڈی کے بھی۔ گجرات میں ان کی اداکاری اور ان کی موسیقی کا لوگ لوہا مانتے تھے۔ آواز ایسی پاٹ دار پائی تھی کہ منڈوے کے کونے کونے میں پہنچتی تھی۔ شرع کے پابند ایسے کہ استاد جھنڈے خان کی طرح انہوں نے بھی کبھی تہجد قضا نہیں کی۔

اب دو دیوانوں کی جگہ تین دیوانے ہو گئے۔ استاد جھنڈے خان، بھائی اشرف خان اور یہ فقیر۔ ہاں کبھی ان میں ایک چوتھا فقیر بھی آ ملتا تھا۔ یہ چوتھا فقیر دنکر راؤ تھا۔ یہ بھائی اشرف خان کے مرید باصفا ہیں۔ ان سے اس قدر عقیدت رکھتے تھے کہ ہمیشہ ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے، حالانکہ بھائی اشرف خان ریڈیو کے فنکار تھے اور دنکر راؤ ریڈیو میں موسیقی کا ڈائریکٹر۔ یہ دونوں بزرگ عجیب ہمہ از اوست قسم کے صوفی تھے۔ ایک دن عنایت خان مرحوم کے فرزند رشید اور ستاریے ولایت خان کو میں نے اپنے یہاں مدعو کیا۔ سننے والوں میں بھائی اشرف خان، استاد جھنڈے خان، دنکر راؤ اور میں۔ اور میں نے کسی کو نہیں بلایا۔ جو لوگ موسیقی کے فن سے اچھی طرح واقف نہیں، میں ان کو کبھی ایسی محفل میں شریک ہونے کی تکلیف نہیں دیتا۔ اگر کوئی موسیقی سے لطف اندوز نہ ہونے والا ایسی محفل میں شریک ہو جائے تو خود بھی پریشان رہتا ہے اور دوسروں کو بھی پریشان کرتا ہے۔ بے تال چٹکیاں بجاتا ہے، بے جگہ داد دیتا ہے، بغیر کچھ سمجھے سر ہلاتا ہے۔ ایسے لوگوں تکلیف دینے سے کیا حاصل۔

ایسا رنگ جما کہ اب تک اس کی یاد دل کو ستاتی ہے۔ ولایت خان کے استاد ہونے میں کس کو کلام ہے، مگر اس دن کچھ اور ہی بات تھی۔ میں جب کبھی ستار سنتا ہوں، میری آنکھوں کے سامنے حضرت سلطان نظام الدین اولیا کے دربار کا نقشہ پھر جاتا ہے۔ جس میں امیر خسرو بھی بیٹھے ہیں اور حسن سنجری بھی۔ حسن سنجری بھی اور امیر خسرو بھی۔ اور پھر وہ کیفیت ہوتی ہے کہ۔

"سحر سو رقص بسمل بود شب جائے کہ من بودم"

ہم سب ایسی کیفیت میں گم تھے کہ استاد جھنڈے خان نے ولایت خان کو اپنے سینے سے لگا لیا اور چلا کر بولے ارے چھوکرے تیری جرأت کہ تو یہ بجائے۔ تیرے اندر اس وقت کوئی اور سما گیا ہے، کوئی اور ہے، کوئی اور۔ یہ کہا اور رقص کرنے لگے۔ ہم سب کھڑے ہو گئے۔ ولایت خان بھی کھڑا تھا۔ اس کی یہ حالت تھی کہ جیسے بے ہوش ہو۔ استاد جھنڈے خاں محبت سے مجبور ہو کر تقریباً ہر روز ریڈیو میں مجھ سے ملنے آیا کرتے تھے اور اسٹوڈیو میں جا کر دھنیں بنایا کرتے تھے۔ مگر جہاں نماز کا وقت ہوا، استاد فوراً اسٹوڈیو سے باہر نکل آتے اور نماز پڑھتے تھے۔ ہماری کیا جرأت کہ ان سے کہتے کہ پروگرام براڈ کاسٹ ہو رہا تھا اور آپ اسے چھوڑ آئے۔ سرخ بتی جل رہی تھی اور آپ اسٹوڈیو کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔ استاد جھنڈے خان اس رسم و رواج سے بالا تھے۔

ایک دن میں نے ان سے کہا کہ خان صاحب اب تو میرے خیال میں یہ باتیں بہت پرانی ہو گئی ہیں کہ صبح کے وقت صرف فلاں راگ گاؤ اور شام کے وقت فلاں راگ۔ یہ پابندی ہٹا دی جائے تو کیسا رہے گا۔ میری بات سن کر جیسے ان کے دل میں تیر لگا۔ مگر بہت ضبط سے کام لیا اور فرمایا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ صبح کے وقت ایمن کلیاں گایا جائے۔ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں نے کہا، مگر آپ کے ڈراموں کی موسیقی تو ہر طرح کے راگوں میں مرتب ہے۔ صبح کے راگوں میں بھی اور شام کے راگوں میں بھی۔ میری بات سن کر کچھ سوچ میں پڑ گئے اور فرمایا، ہاں میری دھنیں ٹوڈی میں بھی ہیں۔ اور بھیرویں میں بھی۔ بھیرویں میں بھی ہیں اور اساوری میں بھی۔ سارنگ میں بھی ہیں اور پیلو میں بھی۔ یہ سب دن کے راگ ہیں اور رات کے وقت ڈرامے مجھے برے بھی نہیں لگتے۔ پھر مجھی سے وہ پوچھنے لگے یہ کیا بات ہے، شاہ جی، برے کیوں نہیں لگتے۔ اب میں کیا بتاتا۔ میں خاموش ہو جانا چاہتا تھا مگر دیکھا کہ جھنڈے خاں کا رنگ دگرگوں ہو گیا ہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہے ہوں۔ جیسے ان سے کوئی بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہو، جس کا کوئی جواز ڈھونڈ رہے ہوں۔

میں نے ان کی یہ حالت دیکھی تو گھبرا سا گیا اور بہت سوچ بچار کے بعد کہا خان صاحب ڈرامہ تو ڈرامہ ہے، ڈرامے میں اگر ڈرامہ نویس نے صبح کا منظر دکھایا ہے تو موسیقی لامحالہ صبح کے راگ میں ہوگی۔ چاہے اسے رات کو پیش کیا جا رہا ہو۔ میری بات سن کر انہوں نے اطمینان کا سانس لیا اور یوں آہ بھری جیسے کہ کوئی بہت بڑا بوجھ ان کے سینے سے اتر گیا ہو۔ اب میں نے بات آگے بڑھائی اور عرض کیا کہ خان صاحب یہ کیا بات ہے کہ اگر کوئی دھن دھیمی لے میں بجائی جائے تو اس کا اثر کچھ اور ہوتا ہے اور اگر تیز لے میں بجائی جائے تو کچھ اور۔ اس سے تو یہ ثابت ہوا کہ تاثر راگ میں نہیں، بلکہ لے میں ہوتا ہے۔ اس کا جواب انہوں نے ایسا دیا کہ میں خاموش ہو گیا۔ فرمایا دو مختلف راگوں کو ایک ہی لے میں بجا کر دیکھئے کہ اثر مختلف ہوتا ہے یا نہیں۔ خاموش تو میں ہو ہی گیا تھا مگر اپنی بات کی پچ رکھنے کے لیے میں نے کہا، اب کے میں نے کسی ڈرامے کی موسیقی باندھی تو ایک ہی راگ میں باندھوں گا اور صرف تال کو گھٹا بڑھا کر مختلف تاثرات پیدا کر دوں گا۔ فرمایا کہ ڈیڑھ دو گھنٹے کے کھیل میں ایک ہی راگ مزا نہ دے گا۔ میں نے کہا خیر دیکھا جائے گا۔

اب بات کو کوئی چھ مہینے گزر گئے کہ ایک دن شور مچاتے ہوئے میرے کمرے میں آئے اور فرمایا، شاہ جی ہو گیا، کیا بتاؤں کیوں کر ہو گیا، مگر شاہ جی، مجھے آپ کی قسم، میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا، مگر ہو گیا۔ اب میں حیران کہ کیا ہو گیا ہے۔ دریافت کیا تو آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا، ایک ہی راگ میں فلم کی تمام موسیقی ہو گئی۔ چلئے میرے ساتھ چلئے۔ میں ان کے ساتھ فلم کے اسٹوڈیو میں گیا۔ موسیقی سنی، سب دھنیں بھرویں میں، موسیقی بھی بھرویں میں، جسے موسیقی نہ جاننے والے "بیک گراؤنڈ" کہتے ہیں۔ اس فلم کا نام چتر لیکھا تھا۔ یہ تھا وہ فن جسے ہم دوسروں کی جھولی میں ڈال آئے ہیں۔ اس سے بڑھ کر ہماری غلطی بخشی کیا ہوگی۔

غنی روز سیاہ پیر کنعان را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

اولاد آنکھوں کی روشنی ہوتی ہے، مگر یہ کیا کہ یعقوب کی اولاد یعقوب کو اندھا کر دے اور زلیخا کی آنکھیں روشن ہو جائیں۔

تقسیم برصغیر کے بعد استاد جھنڈے خان پاکستان تشریف لائے۔ گوجرانوالہ میں قیام کیا، مگر لاہور اکثر آتے تھے اور مجھ سے آ کر ملتے تھے۔ مجھ سے ایک دن کہنے لگے، اب تم ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل ہو، میں تمہاری خدمت کرنا چاہتا ہوں، مجھے لاہور ریڈیو پر کوئی کام دلوا دو۔ یہاں یہ عرض کر دوں کہ استاد جھنڈے خان کو مجھ سے کچھ ایسی محبت تھی کہ ریڈیو پر بغیر کسی معاوضے کے کام کرتے تھے۔ جب انہوں نے مجھ سے کہا کہ ریڈیو پر کوئی کام دلوا دو تو میں "اچھا" کہہ کر خاموش ہو گیا۔ کچھ دن کے بعد انہوں نے پھر ذکر چھیڑا کہ ریڈیو پر کوئی کام دلوا دو۔ میں پھر "اچھا" کہہ کر خاموش ہو گیا۔ دس بارہ دن کے بعد انہوں نے پھر اصرار کیا کہ ریڈیو پر کوئی کام دلوا دو۔ میں پھر "اچھا" کہہ کر خاموش ہو گیا۔ اب کے استاد بپھر گئے اور فرمایا، کیا بات ہے۔ پہلے تو تم میری کوئی بات نہیں ٹالتے تھے، اب یہ کیا ہو گیا ہے کہ تین مرتبہ تم سے کہہ چکا ہوں کہ لاہور اسٹیشن پر خدمت کا موقع دو، مگر ہمیشہ "اچھا" کہہ کر ٹال دیتے ہو۔

میرا دل بھر آیا۔ میں نے کہا جھنڈے خان اب میں اسٹیشن ڈائریکٹر نہیں ہوں۔ اب تمہیں لاہور اسٹیشن پر کون پہچانے گا۔ اور میرے پاس وہ الفاظ کہاں کہ لاہور کے ریڈیو اسٹیشن کے نوجوانوں کو بتاؤں کہ جھنڈے خان کون ہے؟ جھنڈے خان کو ریڈیو لاہور کی خدمت کا موقع نہ ملا۔ پاکستان ریڈیو سے اس کی موسیقی سنائی نہ دی۔ جھنڈے خان مر گیا اور شاید یہ شعر پڑھتے پڑھتے مر گیا کہ

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

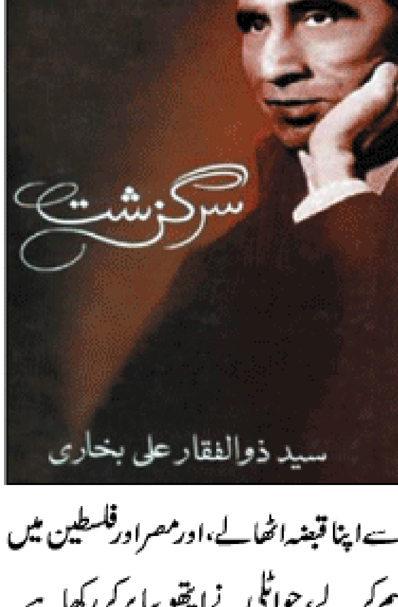
(جاری ہے)

☆☆☆☆☆

بدھ/16 اپریل 2014ء
روزنامہ امت کراچی/حیدر آباد

ریڈیو بمبئی نے رائٹرز اور ٹائمز آف انڈیا کو مات دیدی

تمام تر مخالفتوں اور دھمکیوں کے باوجود میونخ معاہدے کی تفصیلات نشر کر دیں- میں نے جرمنی کیخلاف برطانیہ اور فرانس کے اعلان جنگ کی خبر نشر کر کے بھی خبری اداروں کو شکست دی- زیڈ اے بخاری کی کتاب ''سرگزشت'' سے اقتباس



1935ء سے لیکر 1937ء تک انتھونی ایڈن برطانیہ کا وزیر خارجہ رہا۔ اس کی حکمت عملی یہ تھی کہ فرانس، لیگ آف نیشنز اور یہاں تک کہ روس کے ساتھ بھی ساز باز رکھے، اور ان تینوں کی مدد سے کسی نہ کسی طرح اٹلی اور جرمنی نے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایتھوپیا، اسپین اور آسٹریا پر قبضہ کر لیا۔ ایک کو آپ ایڈن کی حکمت عملی کی شکست کہئے یا وزیر اعظم بالڈون کی۔ بہرحال یہ برطانیہ کی حکمت عملی کی شکست تھی۔ 1937ء میں چیمبرلین وزیر اعظم کی کرسی پر متمکن ہوا۔ اس نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد ایڈن کو وزارت خارجہ سے ہٹا دیا اور ایک نئی حکمت عملی اختیار کی۔

چیمبرلین کی نئی حکمت عملی یہ تھی کہ فرانس کے ساتھ دوستی نہ توڑی جائے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایسی تدبیر بھی کی جائے کہ اٹلی اور جرمنی کے ساتھ یارانہ قائم ہو جائے۔ اٹلی کے ساتھ برطانیہ نے یا یوں کہئے کہ چیمبرلین نے چند معاہدے کئے۔ ان معاہدوں کی رو سے قرار پایا کہ اٹلی جس قدر جلد ممکن ہو، اسپین سے اپنا قبضہ اٹھا لے، اور مصر اور فلسطین میں برطانیہ کے خلاف پراپیگنڈا نہ کرے۔ اس اقرار کے بدلے میں یہ قرار پایا کہ برطانیہ اس ناجائز قبضے کو تسلیم کر لے، جو اٹلی نے ایتھوپیا پر کر رکھا ہے۔ حلوائی کی دکان دادا جی کی فاتحہ۔ برطانیہ کی اس قلابازی پر ایتھوپیا کے معزول بادشاہ، ہیل سلاسی نے بہت شور مچایا، مگر اس کی کون سنتا تھا۔ چیمبرلین نے لیگ آف نیشنز کے کچھ اراکین کو ساتھ لیا اور لیگ آف نیشنز سے یہ بات منوالی کہ لیگ کے اراکین کو اختیار ہے کہ انفرادی طور پر اٹلی کے بادشاہ کو ایتھوپیا کا شہنشاہ تسلیم کر لیں۔ اس ایجاب وقبول میں پہل برطانیہ نے کی۔ یعنی برطانیہ نے سب سے پہلے اٹلی کے بادشاہ کو ایتھوپیا کا شہنشاہ تسلیم کر لیا۔ پھر وہی حلوائی کی دکان اور دادا کی فاتحہ۔

چیمبرلین یہ کارنمایاں کرنے کے بعد خوش ہوئے کہ میدان مار لیا۔ اب اٹلی ہمارے ساتھ آخر دم تک رہے گا اور دن چین سے گزریں گے۔ ایتھوپیا پر اٹلی کا قبضہ ہو گیا تو کیا ہوا، ہمیں تو اپنے حلوے مانڈے سے غرض ہے، ایتھوپیا گیا جہنم میں۔ لیکن ہٹلر چیمبرلین کو کہاں چین لینے دیتا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر چیمبرلین اٹلی سے دب گیا ہے تو جرمنی سے کیوں نہ دبے گا۔ آسٹریا میں تو ہٹلر کو کامیابی ہو چکی تھی، اب اس نے چیکوسلاوکیہ کیخلاف زہر اگلنا شروع کر دیا اور اعلان کر دیا کہ چیکوسلاوکیہ کی اقلیت جرمن نژاد ہے اور جرمن زبان بولتی ہے، سخت مظلوم ہے، اس لئے اس بات کی حقدار ہے کہ جرمنی دامے، درمے اور قدمے اس کی مدد کرے۔ آسٹریا کے بعد سوڈین لینڈ کا جھگڑا ہٹلر نے کھڑا کر دیا۔ ہٹلر کا پراپیگنڈا محض زبانی جمع خرچ نہ تھا۔ ہٹلر پراپیگنڈے کے ساتھ عملی اقدام بھی کرتا تھا۔ چنانچہ ہٹلر نے سوڈین لینڈ کو جرمنی میں مدغم کر دینا چاہا۔

جب چیکوسلاوکیہ والوں نے یہ رنگ دیکھا تو مقابلے کی تیاریاں کرنے لگے۔ انہوں نے فرانس اور روس سے کہا کہ تم نے ہماری مدد کا وعدہ کیا تھا، اب مدد کرو ورنہ ہٹلر ہم کو ہڑپ کر جائے گا۔ ایک طرف چیکوسلاوکیہ امداد کے لئے روس اور فرانس کے آگے ہاتھ پھیلا رہا تھا اور دوسری طرف اٹلی اور ہنگری نے اس کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ جب حالات نے یہ صورت اختیار کر لی تو تمام یورپ کو تپ جنگ چڑھ گئی۔ برطانیہ بھی اس بخار میں مبتلا تھا۔ چیمبرلین کو دورے پڑ رہے تھے۔ آئے دن جرمنی جاتا اور ہٹلر کے سامنے گڑگڑاتا کہ شاید کوئی صلح صورت نکل آئے۔

چیمبرلین ہٹلر سے بات چیت کے بعد لندن پہنچتا تو فرانس کا وزیر اعظم ڈلادیئے بھی پیرس سے اڑ کر لندن آتا اور چیمبرلین سے پوچھتا کہ بھائی سناؤ کوئی صلح کی صورت نکلی یا نہیں۔ صلح کی صورت تو کیا نکلتی۔ فرانس اور برطانیہ تو سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ مگر یہ بات کوئی معلوم نہ کر سکا کہ روس کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ فرانس کے چھکے چھوٹے ہوئے تھے۔ فرانس کو معلوم تھا کہ اگر جنگ چھڑ گئی تو فرانس پس جائے گا۔ برطانیہ بھی اپنی کمزوریوں سے آگاہ تھا کہ ہٹلر کا مقابلہ آسان نہیں۔ چیمبرلین نے اپنی خیریت اس میں دیکھی کہ ہٹلر سے صلح کر لی جائے۔ چیکوسلاوکیہ گیا بھاڑ میں۔ چنانچہ ستمبر 1938ء میں میونخ کے مقام پر چیمبرلین، ڈلادیئے، مسولینی اور ہٹلر کے درمیان معاہدہ ہوا۔ اس معاہدے کی رو سے چیکوسلاوکیہ کا سوڈین لینڈ والا حصہ ہٹلر کی جھولی میں ڈال دیا گیا۔ ٹیس چن والا حصہ پولینڈ نے اڑا لیا اور چیکوسلاوکیہ والے حصے پر ہنگری کا قبضہ ہو گیا۔ چیمبرلین خوش کہ جنگ کی بلا ٹلی۔ چیکوسلاوکیہ گیا بھاڑ میں۔ انگریزوں کے گھر میں خوشی کے شادیانے بجے۔ ہٹلر نے کامرانی کا ترم بجایا۔ فرانس کی جان میں جان آئی۔ اٹلی نے ہٹلر کی جے پکاری۔

میں اس زمانے میں بمبئی کا اسٹیشن ڈائریکٹر تھا۔ میونخ کے معاہدے سے چند ہفتے قبل بمبئی کی منڈی میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ بھاؤ یوں اترتے چڑھتے تھے جیسے ہنڈولا چل رہا ہو۔ انگریزوں کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ حکومت فوجوں کو قواعد کرا رہی تھی، غرض یہ کہ بمبئی نہ رہی تھی۔ جدھر دیکھو جنگ کا تذکرہ، جدھر دیکھو ہٹلر کا ذکر۔ ریڈیو اپنے گردوپیش کے حالات کا آئینہ ہوتا ہے، چنانچہ ہمیں بھی اس افراتفری میں شریک ہونا پڑا۔ میں اور تو کیا کرتا، رات دن ریڈیو کے سامنے بیٹھا رہتا۔ کبھی جرمنی کا پروگرام سنتا اور کبھی لندن کا، اور اس غرض سے سنتا کہ شاید کہیں سے جنگ یا صلح کی خبر آئے۔

آج تک تو ریڈیو کا ایک خاص اور مقتدر محکمہ ہے، جس کا کام ہی یہ ہے کہ دنیا بھر کی خبریں سنتا رہے۔ اس زمانے میں ایسا کوئی محکمہ نہ تھا اور نہ کسی کا یہ فرض منصبی تھا کہ ریڈیو کی گھنڈی گھما کر دنیا بھر کی خبریں سنتا رہے۔ لیکن میں بمبئی میں تھا اور بمبئی کے لوگ اپنے کاروبار کی بنا پر جنگ اور صلح کی خبروں میں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ ان حالات میں مجھے مجبوراً دنیا بھر کی خبریں سننی پڑتی تھیں۔ میں کوئی آٹھ دس دن تقریباً متواتر دن رات خبریں سنتا رہا۔ آخر میری محنت ٹھکانے لگی۔ صبح کے ساڑھے تین بجے لندن ریڈیو نے اعلان کیا کہ میونخ پیکٹ پر دستخط ہو گئے ہیں، ہم تھوڑی دیر میں ان کی تفصیلات پیش کرینگے۔

ان دنوں ایک انجینئر اسٹوڈیو میں سوتا تھا کہ اگر وقت بے وقت کوئی خبر آئے تو ریکارڈ کر لی جائے۔ میں نے لندن ریڈیو کا اعلان سنتے ہی انجینئر کو جگایا اور ہم نے ریکارڈ بھرنے والی مشین چلا دی اور معاہدہ میونخ کی تفصیلات کا انتظار کرنے لگے۔ لندن سے موسیقی کا پروگرام ہو رہا تھا اور ہم میونخ کی تفصیل کا انتظار کر رہے تھے۔ موسیقی اور مجھے بری لگے! لیکن اس وقت اس قدر بری لگ رہی تھی کہ بیان نہیں کر سکتا۔ خدا خدا کر کے موسیقی کا طوفان تھما۔ ہر طرف دل دھڑکنے کی آوازیں یا ریڈیو کو گھڑ گھڑاہٹ۔ آخر میونخ پیکٹ کی تفصیلات کا اعلان ہوا اور ہم نے ریکارڈ بھر لیا۔ میں یہ جانتا تھا کہ یہ خبر ایسے وقت میں پہنچی ہے کہ صبح کے کسی اخبار میں چھپ نہیں سکتی۔ اس خبر کا اعلان سب سے پہلے ریڈیو ہی کرے گا۔ میں سات بجنے کا انتظار کرنے لگا۔ کب سات بجیں، کب ریڈیو شروع ہو اور کب میں یہ ریکارڈ بجا کر بمبئی میں میونخ پیکٹ کی تفصیلات کا اعلان کروں۔

میں نے سات بجنے کے انتظار میں جو دکھ اٹھایا، کچھ میں ہی جانتا ہوں۔ کچھ نہ سوجھا تو تمام ہوٹلوں کو ٹیلی فون کیا۔ بڑے بڑے افسروں کے گھر میں ٹیلی فون کیا۔ گورنر ہاؤس ٹیلی فون کیا۔ بڑے بڑے بیوپاریوں کو ٹیلی فون کیا کہ اٹھو سات بجے ہم میونخ پیکٹ کی تفصیلات ریڈیو پر پیش کریں گے۔ خدا خدا کر کے سات بجے اور ہم نے اعلان کے بعد معاہدہ میونخ کو ریکارڈ کیا، پھر موسیقی، پھر ریکارڈ پھر موسیقی پھر ریکارڈ۔ سب پروگرام منسوخ، صرف ریکارڈ کی ہوئی موسیقی اور معاہدے کا ریکارڈ۔ کوئی آٹھ بجے ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر فرانس لو نے مجھے ٹیلی فون کیا کہ یوں ریکارڈ کی ہوئی خبریں نشر کرنا قانون کے خلاف ہے۔ فوراً یہ ریکارڈ بند کرو۔ میں نے کہا بھیا اب تو ریکارڈ بج چکا، ایک دفعہ کیا اور دس مرتبہ کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد خبر ایجنسی رائٹر کے ڈائریکٹر جان ٹرنر نے ٹیلی فون کیا اور فرمایا کہ تمہارا یوں بی بی سی خبروں کو ریکارڈ کر کے بجانا خبروں کے قانون کے منافی ہے۔ تم پر ہرجانے کا دعوی ہوگا۔

یہاں اجازت دیجئے کہ فرانس لو اور جان ٹرنر کی گھبراہٹ کی وجہ بتا دوں۔ ریڈیو کے ابتدائی زمانے میں، کیا ہندوستان اور کیا دنیا کے دیگر ممالک، ہر جگہ یہ حال تھا کہ اخبار والے ریڈیو والوں سے ڈرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ لوگ ریڈیو سے خبریں سنیں گے تو اخبار خریدنا بند کر دیں گے۔ ریڈیو والے ہزار یقین دلاتے تھے کہ ریڈیو سے خبریں نشر ہوں گی تو اخبار نہ خریدنے والے بھی اخبار خریدیں گے، مگر اخبار والے اپنی بات پر اڑے رہے اور سر توڑ کوشش کرتے رہے کہ ریڈیو سے خبریں نشر نہ ہوں۔ ریڈیو والے خود تو دنیا بھر کی خبریں اکٹھی کرتے نہیں، یہ خبر رساں ایجنسیوں سے معاوضے پر خبریں حاصل کرتے ہیں۔ اب ریڈیو والے ایک طرف اور اخبار والے دوسری طرف۔ ریڈیو والے چھوٹے گاہک، اخبار والے بڑے گاہک۔ اخبار والوں کا اور تو کوئی بس نہ چلا، انہوں نے خبر رساں ایجنسیوں کا ٹیٹوا دبایا اور کہا کہ اگر ریڈیو والوں کو خبریں مہیا کرنی ہیں تو کسی خاص ضابطے کے ماتحت کرو، ورنہ ہم تمہارا ابائی کاٹ کریں گے۔ اب خبر رساں ایجنسیاں ڈرنے لگیں کہ اگر اخبار نے خبروں کی خریداری چھوڑ دی تو ہمیں دکان بڑھانی پڑے گی۔ نتیجہ کشمکش کا یہ ہوا کہ خبر رساں ایجنسیوں اور اخبارات کے مالکوں اور ریڈیو والوں کی متعدد کانفرنسیں ہوئیں اور خبریں براڈ کاسٹ کرنے کے وقت مقرر کئے گئے۔ طے پایا کہ صبح کی خبریں فلاں وقت سے پہلے براڈ کاسٹ نہ کی جائیں اور شام کی خبریں شام کے اخبارات کے شائع ہونے کے وقت کے بعد نشر کی جائیں۔

اخبارات والوں کے ساتھ ریڈیو والوں کی یہ رسہ کشی ہو رہی تھی کہ ٹیلی فون اور تار کا محکمہ بیچ میں آ دھمکا اور فرمایا کہ ریڈیو منڈی کے بھاؤ نشر نہ کرے، کیوں کہ ریڈیو سے منڈی کے بھاؤ سن کر لوگوں کو ٹیلیفون کی آمدنی کم ہو جاتی ہے۔ اخبار والوں نے ٹیلی فون والوں کا ساتھ دیا۔ خبر رساں ایجنسیوں نے اخبار والوں کی ہاں میں ہاں ملائی اور خبریں نشر کرنے پر وہ وہ پابندیاں لگائیں کہ جی جانتا ہے۔ ریڈیو سے خبریں نشر کی جاتی تھیں۔ ان کی ملکیت خبر رساں ایجنسیوں کے حق میں محفوظ ہوتی تھی۔ مراد اس سے یہ کہ ریڈیو کی خبریں قانوناً صرف وہ لوگ سن سکتے تھے، جس کے پاس ریڈیو لائسنس ہو اور نیز یہ کہ ریڈیو سیٹ اسی مقام پر ہو جس کا اندراج لائسنس میں کیا گیا ہے۔ بازاروں میں اور ہوٹلوں میں لاؤڈ اسپیکر پر خبریں سننا خبروں کے قانون کے رو سے غیر قانونی تھا۔

وہ تو خدا بھلا کرے جنگ عظیم کا۔ یہ جنگ چھڑی تو خبروں سے پابندہ اٹھی اور لوگوں کو کھلے بندوں خبریں سننے کی اجازت ملی۔ اجازت کیا ملی، لوگوں سے درخواست کی گئی کہ خبریں سنو، خوب سنو، دکانوں میں سنو، ہوٹلوں میں سنو، لاؤڈ اسپیکر لگا کر سنو، مگر سنو۔ اس جنگ کے شروع میں بی بی سی نے بھی ہندوستان کے ریڈیو کو بی بی سی کی خبریں ریلے کرنے کی اجازت نہ دی۔ لندن ریڈیو پر صاف اعلان ہوتا تھا کہ ہماری خبریں صرف فلاں فلاں ملک ریلے کر سکتے ہیں، ہندوستان نہیں۔ بعد میں بی بی سی کو ہوش ضرور آیا، مگر شروع شروع میں تو خبریں ریلے کرنے پر بڑی پابندی تھی۔

ہاں تو میں میونخ پیکٹ کا ذکر کر رہا تھا۔ رائٹرز ایجنسی کے ڈائریکٹر جان ٹرنر اور ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر نے میرے کان اینٹھے کہ تو نے بی بی سی کی خبر کا ریکارڈ کیوں بنایا اور کیوں بجایا۔ مگر میرے کان پر جوں بھی نہ رینگی۔ میں نے یہ ریکارڈ صبح سات بجے بجانا شروع کیا اور کوئی دس بجے تک بجاتا رہا۔ ٹائمز آف انڈیا ہار گیا اور آخر کار اس نے گیارہ بجے میونخ پیکٹ کے بارے میں اپنے اخبار کا ضمیمہ شائع کیا۔ یہاں تک تو خیریت رہی مگر ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر نے بمبئی ریڈیو کی حرکت کے خلاف دہلی کی سرکار کو لکھا، رائٹرز کو لکھا اور بی بی سی کو لکھا۔ ٹائمز آف انڈیا کوئی معمولی اخبار تھا نہ فرانس لو کوئی معمولی شخص۔ اس کے احتجاج کا بہت اثر ہوا اور مجھے لینے کے دینے پڑ گئے۔ ہر طرف سے کیفیت طلب ہوئی۔ خدا جانے میں ریڈیو میں کس گھڑی شامل ہوا تھا کہ عمر کا بیشتر حصہ کیفیتیں لکھنے میں گزرا۔ دہلی میں اسٹیشن ڈائریکٹر سیٹھنا نے مجھ سے ایک دن میں چونتیس کیفیتیں طلب کی تھیں۔ اس دن کام تو میں کیا کرتا، دن کا اکثر حصہ کیفیتوں لکھنے میں گزر گیا۔ ایک کیفیت کا مضمون مجھے اب تک یاد ہے۔ اسٹیشن ڈائریکٹر سیٹھنا نے میرے نام مراسلہ بھیجا کہ تم سے کیفیت طلب کی جاتی ہے کہ کل رات کو نو بج کر دس منٹ پر اسٹوڈیو نمبر چار کا دروازہ کھلا کیوں تھا؟ میں نے اس کا جواب لکھا کہ حضور عالی! رات کو نو بج کر دس منٹ پر اسٹوڈیو نمبر چار کا دروازہ اس لئے کھلا تھا کہ کسی نے اسے بند نہیں کیا تھا۔

میونخ کے معاہدے کے موقع پر کیفیت طلب کا سلسلہ خدا جانے کب تک جاری رہتا، مگر بھلا ہو ہٹلر کا۔ اس نے معاہدے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد چیکوسلاوکیہ کے حصے بخرے کر ڈالے اور سلوویکیہ کو جرمنی کے تحت لے آیا اور پراگ میں جرمن فوجیں اتارنی شروع کر دیں۔ ایتھوپیا نے مجبور ہو کر بے مل کے علاقے کو ہٹلر کے حوالے کر دیا۔ مسولینی نے البانیہ پر قبضہ کر لیا۔ پولینڈ پر جرمنی کی یورش شروع ہوئی۔ اب چیمبرلین کو معلوم ہوا کہ ہٹلر سے نمٹنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اسے اور تو کچھ نہ سوجھا فوراً پولینڈ اور فرانس سے دوستی کا نیا معاہدہ کیا، جس کے رو سے معاہدے پر دستخط کرنے والوں پر لازم آیا کہ حملے کی صورت میں ایک دوسرے کی مدد کریں۔ اس کے ساتھ ہی چیمبرلین نے یہ بھی اعلان کیا کہ برطانیہ اب رومانیہ، یونان اور ترکی کے ساتھ بھی اسی قسم کے معاہدہ کرنے کو تیار ہے۔ مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ وقت کی قدر نہ برطانیہ اور فرانس نے کی اور نہ امریکہ نے۔ اگر یہ جمہوریتیں صحیح وقت کوئی قدم اٹھاتیں تو 1930ء میں جاپان منچوریا پر قبضہ نہ کر سکتا۔ اٹلی 1935ء میں ایتھوپیا کو غلام نہ بنا سکتا اور ورسائی معاہدے کی خلاف ورزی کر کے جرمنی 1936ء میں تجدید اسلحہ پر کمر بستہ نہ ہوتا۔ اگر میونخ کے معاہدے کے وقت بھی یہی طاقتیں مل کر روس کو اپنے ساتھ ملا لیتیں تو شاید ہٹلر یورپ پر یوں نہ دندناتا۔

فرانس اور برطانیہ نے معاہدہ بھی کیا تو پولینڈ کے ساتھ اور وہ بھی ایسا کہ نہ برطانیہ میں اس کا خیر مقدم کیا گیا نہ فرانس میں۔ امریکہ نے تو الگ تھلگ رہنے کی ٹھان لی اور بار بار اس کا اعلان کیا کہ ہم پرائی آگ میں نہیں کودیں گے۔ ادھر تو یہ حالت تھی اور ادھر ہٹلر نے اٹلی اور جاپان کو ساتھ ملا لیا اور اسپین میں بھی اپنے سیاسی گھوڑے دوڑانے شرور کر دیئے۔ مختصر یہ کہ ستمبر 1939ء کی تین تاریخ کو برطانیہ اور فرانس نے ہٹلر کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ 3 ستمبر کو اتوار کا دن تھا۔ میں بچوں کا پروگرام کر رہا تھا۔ کوئی تین چار سو بچے جمع تھے۔ بچوں کے باپ بھی اور مائیں بھی۔ پہلی ستمبر کو جرمن فوجوں نے پولینڈ پر حملہ کر دیا تھا۔ مجھے اسی دن سے لندن اور جرمنی کی خبریں سننے کی لگ گئی تھی۔ چنانچہ میں بچوں کے پروگرام سے گھڑی گھڑی باہر نکلتا اور کنٹرول روم میں آ کر لندن کی خبریں سنتا۔ بچوں کا پروگرام ابھی جاری تھا۔ سہ پہر کے کوئی تین ساڑھے تین بجے بی بی سی سے خبر نشر ہوئی کہ برطانیہ اور فرانس نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے۔ یہ سنتے ہی میں اسٹوڈیو میں آیا اور بچوں کے پروگرام کو کاٹ کر اعلان کیا کہ اعلان جنگ ہو گیا۔ یہ خبر شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ تمام شہر بھڑک اٹھا اور اس خبر کی آگ کے شعلے جان ٹرنر اور ٹائمز آف انڈیا ایڈیٹر فرانس لو کو بھی لگے۔ (جاری ہے)

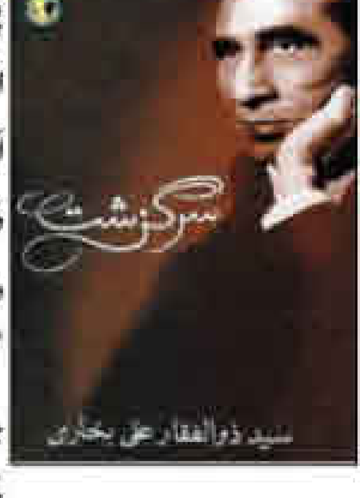
☆☆☆☆☆

جمعرات/17 اپریل 2014ء
روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

”ریڈیو سے مسلم تہواروں کے خصوصی پروگرام نشر کرائے“

کلکتے اور بمبئی میں محرم کا پروگرام سننے والوں سے سڑکیں بند ہو جاتی تھیں۔ ہندوستان میں ہارمونیم کی وبا عیسائی پادری لائے

اس ساز کو سب سے پہلے ہندوؤں نے اپنایا۔ وہ موسیقی کی شدبد سے ناواقف تھے۔ زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



پشاور میں کچہری دروازہ کے اندر جہاں اب میونسپل کمیٹی کا دفتر ہے، وہاں ہمارے زمانے میں گورنمنٹ ہائی اسکول ہوا کرتا تھا۔ لب سڑک اسکول کی عمارت، عمارت کے پیچھے ایک وسیع میدان، وسیع میدان کے سامنے ایک اونچا ٹیلہ، ٹیلے پر ایک بڑا پیپل کا درخت، درخت کے نیچے ایک چبوترہ، چبوترے پر پیر محمد کی چائے کی دکان، دکان کے پیچھے ایک چھوٹا سا دروازہ جو خلاصی لائن میں کھلتا تھا، خلاصی لائن کے ساتھ قلعہ بالا حصار کی دیوار، اس خلاصی لائن کے جاڑے کے موسم میں امیر کابل کے ہاتھی آیا کرتے تھے اور جاڑے کا موسم یہیں گزارا کرتے تھے۔

جب اسکول میں تفریح کا گھنٹہ بجتا تھا تو ہم سب لڑکے پیر محمد کی دکان پر جا کر چائے پیتے تھے اور بھاگتے ہوئے پچھلے دروازے سے خلاصی لائن میں جا پہنچتے تھے اور ہاتھیوں کو دیکھتے تھے۔ ہاتھیوں کے مہاوت اور چرکٹے عین تفریح کے گھنٹے میں ہاتھیوں کو پانی پلانے ڈگی پر لے جاتے تھے۔ ہم انہیں ایک ایک پیسہ دے کر ہاتھیوں پر چڑھتے تھے اور دھت دھت کرتے ہوئے ہاتھیوں کی ڈگری پر پانی پلا کر واپس اسکول میں آجاتے تھے۔

اسی خلاصی لائن کے ایک کونے میں بالا حصار کی دیوار کے ساتھ ایک پگلی بیٹھی رہتی تھی۔ لڑکے بالے اس پگلی کو چھیڑتے تھے اور پگلی اول فول بکتی تھی۔ میں اس پگلی کے پاس صرف اتوار کو جایا کرتا تھا، کیونکہ اتوار کے دن اس پگلی کے سامنے کوئی بھی نہ ہوتا تھا، جس کو گالی دے۔ بس اپنے آپ میں کھولتی رہتی تھی کہ دیکھا آج کوئی بھی نہیں آیا، دیکھا آج کوئی نہیں چھیڑتا، کہاں مر گئے، اتوار کا ستیاناس ہو، ہائے کیسی اداسی ہے، ہائے کون مجھے چھیڑے، ہائے کس کو گالی دوں!

مجھے ریڈیو کے زمانے میں اس پگلی کا خیال رہ رہ کر آتا تھا۔ میرے زمانے میں ہم ریڈیو والوں کی حالت کچھ اس پگلی جیسی تھی۔ اگر کوئی ہمارے پروگرام پر اعتراض کرتا تھا تو ہم جل بھن جاتے تھے اور اگر کوئی خاموش رہتا تھا تو ہمارے دل میں کھد بد ہوتی رہتی تھی کہ اللہ یہ خاموش کیوں ہیں، کیا پروگرام نہیں سنتے۔ اور اگر سنتے ہیں تو پھر کچھ بولتے کیوں نہیں، چپ کیوں ہیں۔ یقین مانیے سننے والوں کے اعتراضات سے کھوپڑی پلپلی ہو جاتی تھی، لیکن ان کی خاموشی اعتراضات سے بھی زیادہ ہمارے حق میں بری ثابت ہوتی تھی۔ ان کی خاموشی سے مجھے اکثر ہول آتا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کسی تاریک کوٹھری میں ہوں، جہاں پتہ کھڑکا اور دل دھڑکا والی کیفیت ہو۔

آل انڈیا ریڈیو کے زمانے میں مسلمان تو صرف پروگراموں پر اعتراض کرتے تھے، یعنی یہ کہتے تھے کہ فلاں پروگرام ڈھیلا گیا، فلاں پروگرام خمار آور تھا، پروگرام مختصر تھا، فلاں پروگرام بہت طویل تھا۔ لیکن ہندوؤں کو اکثر اعتراض ہوتا تھا کہ فلاں مسلمان کو تقریر کیلئے کیوں بلایا گیا، فلاں ہندو کو کیوں دعوت نہ دی گئی۔ مسلمان گویوں ہی کو کیوں پروگرام دیا جاتا ہے۔ ہندو گویوں کو کیوں نہیں دیا جاتا۔ اب ان کو کون بتائے کہ مدراس کو چھوڑ کر باقی تمام ہندوستان میں موسیقی کا علم اگر ہے تو صرف مسلمانوں کو۔ موسیقی ہندوؤں کے نزدیک بھی نہیں گئی۔ میں یہ بات کسی تعصب کی بنا پر نہیں کہتا۔ علم کے معاملے میں تعصب کیسا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہندوستان میں آنے سے قبل یہاں صرف چار سر رائج تھے۔ مسلمانوں نے فیثاغورث کے سات سر یہاں آکر رائج کئے۔ یہ تمام موسیقی مسلمانوں کی آوردہ ہے۔ مدراس میں اس موسیقی کو عرب لائے اور شمالی ہندوستان میں ایران کے راستے سے آنے والے مسلمان۔ ہندوؤں کا دعویٰ ضرور ہے کہ یہ موسیقی ہمارے شاستروں کی ہے، لیکن آج تک باوجود ہماری درخواست کے کسی ہندو دوست نے وہ شاستر ہم کو نہیں دکھائے جن میں اس موسیقی کا ذکر ہو۔ ہمارے یہاں کے ساز پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ہم ایران اور عرب سے آئے ہیں۔ ہمارے نام ہمارے دعویٰ کا ثبوت ہیں۔ سارنگی (سہ رنگی)، ستار (سہ تار)، طبلہ، نقارہ، شہنائی، ڈھول (دھل) سربہار، دلربا، طنبورہ، نفیری، الغوزہ، سرود، رباب۔ اگر یہ سب عربی یا فارسی کے الفاظ ہیں تو یہ ساز ہندوستان کے ہندوؤں کی ایجاد کیوں کر ہوئے۔ ساز مسلمانوں کی ایجاد اور ان سازوں کو بجانے والے سب کے سب مسلمان۔ مجھے ہارمونیم سے سخت نفرت ہے۔ نہ اہل یورپ نے کبھی اس کو موسیقی کا ساز سمجھا اور نہ ایشیا کے موسیقی دانوں نے۔ یہ ساز حساب کے رو سے قطعی غلط ہے۔ خیر یہ ایک جدا بحث ہے، جسے کسی اور وقت پر اٹھا رکھتا ہوں اور مختصراً یہ عرض کرتا ہوں کہ ہارمونیم کی وبا عیسائی پادری یہاں لائے تھے۔ یہ بیہودہ ساز انہوں نے چرچ آرگن کو مختصر کر کے بنایا تھا۔ اسے گلے میں لٹکائے لٹکائے پھرتے تھے اور اس پر الٹی سیدھی انگلیاں چلا کر

”ہم سب ہیں یسوع مسیح کی بھیڑیں“

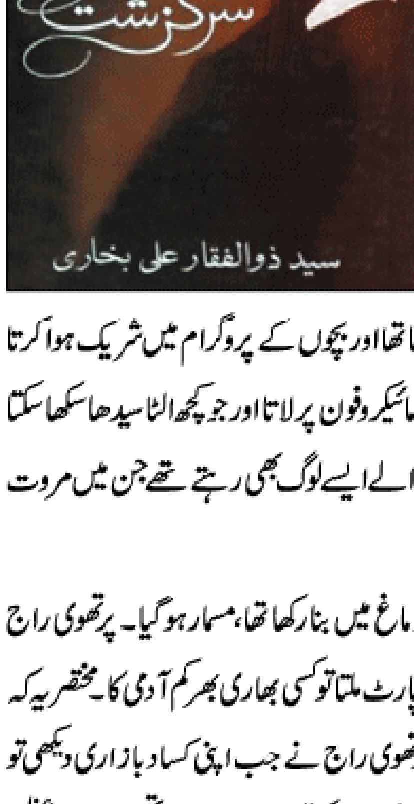
گلی گلی کوچے کوچے گاتے پھرتے تھے۔

ہندوستان میں سب سے پہلے ہندوؤں نے اس ساز کو اپنایا۔ اس کی بھی ایک وجہ ہے۔ اور وہ یہ کہ ہندوؤں کے یہاں یہ ضروری سمجھا جاتا تھا کہ لڑکی امور خانہ داری کے علاوہ موسیقی سے بھی واقف ہو۔ اگر لڑکی موسیقی سے ناواقف ہوتی تو اس کی شادی کے راستے میں رکاوٹیں پڑ جاتیں۔ کلکتے، بمبئی اور مدراس میں تو لوگ اپنی لڑکی کو موسیقی دان مشہور کرنے کیلئے طرح طرح کی حرکتیں کرتے تھے۔ مثلاً کسی گانے والی لڑکی کو گراموفون کمپنی میں لے جاتے۔ کمپنی والوں کو لڑکی کا اصل پتہ نہ بتاتے، بلکہ اپنی لڑکی کے نام سے ریکارڈ بھروا لیتے تاکہ لڑکے والوں پر لڑکی کے موسیقی سے بلد ہونے کا رعب پڑے۔ کلکتہ ریڈیو پر کئی ایسے واقعے ہوئے کہ گاتا تو کوئی اور رہی ہے اور نام کسی اور لڑکی کا لیا جا رہا ہے۔ ہاں تو ہندو لڑکی کے لئے گانا سیکھنا ضروری تھا۔ مگر یہاں مصیبت یہ آپڑی کہ گانا سکھانے والے سب مسلمان، ساز بجانے والے سب مسلمان۔ جب عیسائی پادری ہارمونیم لے کر ہندوستان آئے تو ہندوؤں نے اس ساز کو آنکھوں سے لگایا۔ کلکتے اور بمبئی میں ہارمونیم بنانے والوں کی بڑی بڑی دکانیں اور کارخانے کھل گئے۔ ہر زبان میں ”ہارمونیم ٹیچر“ کے نام سے کتابیں شائع کی گئیں۔ ہندو لڑکیاں گھر بیٹھ کر بغیر مسلمان استادوں کے موسیقی کی تانیں اڑانے لگیں۔ اس زمانے میں وشنو ڈگمبر نے بھارت کھنڈے میوزک اسکول کی بنیاد ڈالی اور ہندوستان بھر میں اس اسکول کی شاخیں قائم کیں۔ بھائی جان مرحوم اور میں دونوں وشنو ڈگمبر کے لاہور والے اسکول میں داخل ہوئے تاکہ دیکھیں تو سہی کہ یہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ مگر چند ہی دنوں میں لاحول پڑھ کر باہر آگئے۔ اب کون بیٹھ کر بھجن گاتا اور وہ بھی بے سرے استاد کی آواز کے ساتھ آواز ملا کر۔ ہارمونیم سے موسیقی کو نجات دلانے کے لئے میں نے مناسب یہ سمجھا کہ کسی نہ کسی طرح ریڈیو میں ہارمونیم کا استعمال بند ہو جائے۔ فیلڈن فن کا دلدادہ اور صاحب ذوق آدمی ہے۔ اس کو اس ہارمونیم کی شکل سے نفرت تھی۔ اس پر اضافہ ہوا میری ہر وقت کی کن کن کا۔ فیلڈن ہارمونیم کو ریڈیو سے نکالنے پر آمادہ ہو گیا۔ مگر میں فیلڈن کی جلد بازی سے ڈرتا تھا۔ خوف مجھے یہ تھا کہ یہ کوئی اول جلول حرکت نہ کر بیٹھے اور بنا بنایا کام بگڑ نہ جائے۔ میں نے اسے صلاح دی کہ عوام کی رائے کا مقابلہ کرنا آسان نہیں ہوتا۔ بہتر بات یہ ہے کہ پہلے ہندوستان کے بڑے بڑے لوگوں کی رائے معلوم کر لی جائے۔ فیلڈن نے میری صلاح مان لی۔ ایک خط ٹیگور کو لکھا اور ایک پنڈت جواہر لال نہرو کو۔ دونوں نے جواب میں لکھا کہ یہ ہارمونیم نہایت ہی لغو چیز ہے۔ ریڈیو کو اس کا استعمال ہرگز نہیں کرنا چاہئے۔ یہ جواب پا کر میں خوشی کے مارے دیوانہ ہو گیا۔ قرار پایا کہ فلاں تاریخ سے ریڈیو سے ہارمونیم کا استعمال بند کر دیا جائے اور اس دن ہارمونیم کا جنازہ نکالا جائے۔ چنانچہ ہارمونیم کا جنازہ نکالا گیا اور ہارمونیم کا استعمال ریڈیو پر ممنوع قرار دیا گیا۔ اب میرے خلاف ایک طوفان اٹھا اور سب کا سب ہندوؤں کی طرف سے یا ان مسلمانوں کی طرف سے جو ہندوؤں کے تنخواہ دار ملازم تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ یہاں بھی ہندوؤں نے مجھ پر مذہبی تعصب کا الزام لگایا اور کہا کہ ہندوستانی ساز بنانے والے مسلمان ہیں، ہارمونیم بنانے والے ہندو ہیں، چنانچہ ہندوؤں کی تجارت کو نقصان پہنچانے اور مسلمانوں کی تجارت کو فروغ دینے کیلئے بخاری نے ہارمونیم بند کر دیا ہے۔ خیر ہندوؤں نے طرح طرح سے مذہبی تعصب کو میرے نامہ اعمال میں شامل کرنے کی کوشش کی، لیکن اپنی طرف کبھی نہ دیکھا کہ وہ خود مسلمانوں کو نیچا دکھانے اور ان کے مذہبی تہواروں کی توہین کرنے پر کس بری طرح کمر کسے ہوئے تھے۔ 1935ء سے قبل کلکتے اور بمبئی کے چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں سے ہندوؤں کے تہواروں کے پروگرام کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا تھا۔ لیکن عیدین کا پروگرام ہو یا محرم الحرام کا پروگرام، پہلے تو پیش ہی نہیں کیا جاتا تھا اور اگر پیش کیا بھی جاتا تو اس طرح کہ نہ پیش کرنا ہی بہتر تھا۔ جب دہلی، ریڈیو کی بنیاد پڑی تو ہم نے اس بات پر اصرار کیا کہ مسلمانوں کے تہواروں کو بھی عزت و احترام سے پیش کیا جائے۔ جب محرم کا مہینہ آیا تو ہم نے اس بات پر زور دیا کہ باجوں کا شور بند کیا جائے۔ سازندے سب کے سب مسلمان تھے۔ محرم الحرام کے احترام میں انہوں نے محرم کے پہلے دس دن تک سازوں کو ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا۔ ہم نے حکومت سے کہا کہ اگر ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے کچھ موسیقی کا پروگرام پیش کرنا ہی ہے تو ان دس دنوں کے لئے ہندو سازندے رکھنے ہوں گے۔ حکومت کو یہ عارضی ہندو سازندے رکھنے کی اجازت دینا ہی پڑی۔ ہندو بہت خوش ہوئے کہ چلو دس دن تک تو ہندو سازندے ریڈیو پر دندنائیں گے۔ اب ہندوؤں میں سارنگی بجانے والا کہاں سے آئے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں کوئی ہندو سارنگی نہ بجاتا تھا۔ اس پر کسی جانور کی کھال منڈھی ہوتی ہے، ہندو اس کو ہاتھ کیوں کر لگائیں۔ اب ایک آدھ سارنگی بجانے والا ہندو پیدا ہو گیا ہے۔ میں نے اس کی سارنگی ریڈیو پر ایک مرتبہ سنی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بچہ کسی بڑے کی نقل اتار رہا ہے۔ چنانچہ سارنگی کے بجائے محرم کے دنوں میں کوئی ہندو بجوائیاں اپنے ہم مذہب گویوں کے ساتھ وائلن بجاتا تھا۔ وائلن کیا بجاتا تھا کسی ٹین کے ٹکڑے پر ریتی چلاتا تھا۔ غرض کہ محرم کے دنوں میں سازندے ہندو اور گویے بھی ہندو اور پروگرام اتنا برا کہ خود ہندو چیخ اٹھے۔ مگر یہ تو نہیں کہا کہ ہندو گویے اور سازندے برے ہیں۔ کہا تو یہ کہا کہ بخاری چن چن کر برے سازندے لایا ہے۔ آخر ایک کانفرنس ہوئی اور طے پایا کہ میرس کالج لکھنؤ سے ہندو سازندے اور ہندو گویے بلوائے جائیں۔ یہ نئے قسم کے طالب علم، دن کو بزازی کی دکان کریں اور رات کو بھجن گائیں، یہ ریڈیو کا پروگرام کیا چلاتے۔ مگر زبردست ٹھینگا سر پر۔ میرس کالج سے طائفہ منگوایا گیا۔ اس کا پروگرام اس قدر برا تھا کہ کچوریوں کی بو کے ساتھ ساتھ ابلی ہوئی مولیوں کی بو بھی آنے لگی۔ محرم کے ایام میں جب مسلمان سوز خوان نوحہ، سلام اور مرثیہ پیش کرتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے صحرا میں پھول اگ آئے ہیں۔ یقین مانئے کہ خود ہندوؤں نے موسیقی کے پروگرام چھوڑ کر یہ پروگرام سننا شروع کر دیا اور کئی جگہ سے ہمیں ہندوؤں کے خط موصول ہوئے کہ اگر ہندوؤں ہی سے موسیقی سنوانا ہے تو خدا کیلئے نہ سنواؤ۔ اس کی جگہ ہم کو سوز خوانی سنواؤ۔ خط لکھنے والوں میں سر تیج بہادر سپرو بھی تھے۔ دہلی کے بعد ہم نے محرم کے پروگرام کلکتے اور بمبئی میں بھی شروع کر دیئے۔ پہلے تو غیر مسلم بہت کسمسائے، لیکن آخر راضی ہو گئے۔ ہم نے تجویز پیش کی تھی کہ تمام قوموں کے تہواروں کی فہرست مرتب کی جائے اور ہر ایک تہوار کو حسب اہمیت ریڈیو پر وقت دیا جائے۔ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ عوام مسلمان تو ہمارے ساتھ تھے، مگر خواص نے ہم سے اس معاملے میں بھی بے اعتنائی برتی۔ کلکتے کی حالت یہ تھی کہ مسلمانوں کی اکثریت والا صوبہ بنگال، لیکن وہاں بھی ریڈیو والے صبح کے وقت نمسکار ہی کہتے تھے۔ میں نے کلکتے کے ایک مسلمان صحافی سے اس کا تذکرہ کیا اور کہا کہ اپنے اخبار میں اس نمسکار کے خلاف احتجاج کرو تاکہ معاملہ سرکار کے سامنے اٹھایا جائے۔ اس مسلمان صحافی کا جواب اب تک میرے کانوں میں بھن بھن کر رہا ہے۔ فرمایا بخاری صاحب، تم سمجھتے نہیں۔ جب ہم بنگالی بولتے ہیں تو نمسکار کہتے ہیں اور جب اردو بولتے ہیں تو السلام علیکم کہتے ہیں۔ بہرحال ہم نے عوام کی ہمت پر بھروسہ کیا اور خواص سے کہا کہ آپ اپنی خواہش کیجئے۔ جب کلکتے اور بمبئی سے محرم کا پروگرام شروع کیا گیا تو عوام نے اس کے سننے کے لئے گلی کوچوں میں کھمبوں پر لاؤڈ اسپیکر لگوائے۔ لوگ اتنی تعداد میں یہ پروگرام سننے کے لئے جمع ہوتے تھے کہ سڑکیں بند ہو جاتی تھیں۔ مسلمان عوام کی اس ہمت اور جرأت ایمانی کا اثر نہ صرف حکام پر بلکہ غیر مسلموں پر بھی پڑا اور پھر کسی کو محرم الحرام کے پروگرام پر نکتہ چینی کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

پرتھوی راج کے تعصب نے دنیائے فن کو تقسیم کر دیا

فلموں میں ڈیمانڈ کم ہوئی تو راج کپور کے والد نے ''دیش بھگت'' بننے کی ٹھان لی-تحریک پاکستان کیخلاف ڈرامہ ''دیوار'' بنا کر قائداعظم کی کردار کشی کی-فلموں میں نوکروں اور بدمعاشوں کے کردار مسلمان دکھائے جانے لگے- زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



پرتھوی راج سے میں بہت محبت کرتا تھا۔ میرے دل میں اس نے یہ مقام اس لیے حاصل نہیں کیا تھا کہ وہ مشہور ایکٹر ہے۔ ایکٹر تو اس سے کہیں بڑے ہندوستان و پاکستان میں جب بھی موجود تھے اور اب بھی موجود ہیں۔ پرتھوی راج کے والد پشاور پولیس میں ملازم تھے اور وہیں انہوں نے اپنی جوانی گزاری۔ بہت پرخلوص انسان تھے۔ ہنس مکھ۔ دوسروں کے دکھ درد میں ہمیشہ کام آنے والے۔ پرتھوی راج کی والدہ کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا کہ ''مادر مہربان'' کا لفظ انہیں کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ بھائیوں اور بیٹیوں کی خدمت میں رات دن مصروف اور اسی مصروفیت میں مسرور۔ شکل و صورت ایسی جیسے کسی دیس کی رانی ہو۔ حلم و انکسار ایسا جیسے کوئی درویش ہو۔ میں اکثر پرتھوی راج کے والد اور والدہ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا اور گھنٹوں ان کے خلوص سے فیض یاب ہوا کرتا تھا۔ پرتھوی راج کی یہ بات مجھے پسند تھی کہ ورزش کرتا تھا اور نیک چلن تھا۔ پرتھوی راج کا بیٹا راج کپور ان دنوں بہت چھوٹا سا تھا اور بچوں کے پروگرام میں شریک ہوا کرتا تھا۔ میں اس کے باپ اور ماں کی رفاقت کے سبب اس کا خاص خیال رکھتا تھا اور اس ہونہار بچے کو اکثر مائیکروفون پر لاتا اور جو کچھ الٹا سیدھا سکھا سکتا تھا، سکھاتا۔ اس تمہید سے میری مراد یہ ہے کہ اس دور کا کچھ ذکر ہو جائے جس دور میں کچھ اگلے زمانے والے ایسے لوگ بھی رہتے تھے جن میں مروت تھی، آنکھوں کا لحاظ تھا، فن کی قدر تھی۔

دفعتاً ایسے واقعات پیش آئے کہ میرے دل کو ٹھیس پہنچی اور پرتھوی راج کا جو قلعہ میں نے اپنے دل و دماغ میں بنا رکھا تھا، مسمار ہو گیا۔ پرتھوی راج ورزش کرتے کرتے پورا پہلوان ہو گیا تھا اور فلموں میں اس کی مانگ کم ہونے لگی تھی۔ اب اگر اس کو کوئی پارٹ ملتا تو کسی بھاری بھرکم آدمی کا۔ مختصر یہ کہ اب وہ ہیرو کے زمرے سے نکل کر، ہیرو کے باپ یا بوڑھے وفادار ملازم کے زمرے میں آ گیا تھا۔ پرتھوی راج نے جب اپنی کساد بازاری دیکھی تو ایسی چال چل گیا کہ ہندوؤں نے اسے دیش بھگت سمجھا، مگر مسلمانوں نے بگلا بھگت۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستان کی تحریک زوروں پر تھی اور قائداعظم زمین کا گز بنے ہوئے ہندوستان کے طول و عرض میں تحریک پاکستان چلا رہے تھے۔ ہندو بھارت ماتا کے حصے بخرے کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اس لیے وہ ہر ممکن کوشش کر رہے تھے کہ قائداعظم کی تحریک پنپنے نہ پائے۔

ہندوؤں کے ان جذبات کو دیکھ کر پرتھوی راج نے اسٹیج کے لیے ایک ڈرامہ ''دیوار'' نامی لکھا۔ یہ ڈرامہ کھلے بندوں تحریک پاکستان کے خلاف تھا۔ کہانی اس ڈرامہ کی یہ تھی کہ ایک زمیندار کے دو بھائی ہیں۔ پیار محبت سے رہتے ہیں، مگر باپ کے مرنے کے بعد انگریزوں کی شہ پر چھوٹے بھائی نے بٹوارے کا مطالبہ کیا۔ کھیت ہو کہ مکان، ہر جگہ بیچ کی دیوار۔ مکان کے آنگن میں دیوار۔ بڑا بھائی ایک طرف رہتا تھا اور چھوٹا بھائی دیوار کی دوسری طرف۔ بڑا بھائی دھوتی اور کرتے میں ملبوس اور چھوٹا بھائی انگریزوں کی وضع قطع اختیار کئے ہوئے۔ بڑے بھائی کا پارٹ خود پرتھوی راج نے کیا اور چھوٹے کا سجن نے۔ سجن نے قائداعظم کی وضع قطع کا چربہ اتارنے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ اس نے گفتگو کا لہجہ بھی قائداعظم جیسا اختیار کیا۔ کہانی کا اختتام یہ تھا کہ آخر چھوٹا بھائی اپنے کئے پر نادم ہوتا ہے اور بڑے بھائی کے پاؤں پر گر کر معافی مانگتا ہے۔ دیوار ڈھا دی جاتی ہے اور سب ایک ہو کر مل بیٹھتے ہیں۔

اس کھیل میں پرتھوی راج کے تقریباً ہر فقرے پر ہر ہر مہادیو، مہاتما گاندھی کی جے، بھارت ماتا کی جے کے نعرے لگتے تھے۔ بڑے بڑے ہندو وزیر اور مہا منتری اس کھیل کو دیکھنے آئے اور پرتھوی راج کے کارنامے کی داد دی۔ یہاں تک کہ تقسیم کے بعد شری پرتھوی راج کو نہرو کے دربار سے پدم وغیرہ کا خطاب ملا اور پرتھوی راج اسمبلی کا ممبر بھی ہو گیا۔ پرتھوی راج کو کانگریسی دربار سے سب کچھ ملا لیکن پرتھوی راج نے وہ عزت کھو دی جو مجھ جیسے لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے موجود تھی۔ مجھے اس بات سے صدمہ ہوا کہ پرتھوی راج کے یہ زہریلے خیالات کیوں ہیں؟ مجھے اس بات پر دکھ پہنچا کہ پرتھوی راج نے برسوں سے یہ زہر اپنے دل میں چھپا کر کیوں رکھا تھا؟ پرتھوی راج آستین کا سانپ کیوں نکلا؟

پرتھوی راج کا پھیلایا ہوا زہر پاکستان کی تحریک کے جسم میں تو گھر نہ کر سکا، لیکن یہ ضرور ہوا کہ فن کے معاملے میں بھی دو فرقے ہو گئے۔ ایک ہندو اور ایک مسلمان۔ یہاں تک کہ فن بھی دو طرح کا ہو گیا۔ ایک مسلمانوں کا اور ایک ہندوؤں کا! یہ زہر بھات کھنڈے اور وشنو ڈگمبر نے موسیقی کے معاملے میں پہلے ہی پھیلا رکھا تھا۔ اب پرتھوی راج جیسے مشہور ایکٹر نے بھی زہر بھری پچکاریاں چلائیں تو ایسا پھیلا کہ خدا کی پناہ۔ ہندو گویے چاہے ٹھمری گائیں یا دادرے جیسی جنسی چیز، سب سے پہلے اوم تت ست کا آلاپ کرنے لگے۔ ایکٹروں کی تو یہ حالت ہوئی کہ مسلمان ایکٹر دھڑا دھڑ ہندو نام اختیار کرنے لگے۔ مسلمان ایکٹروں کے ہندوانہ نام اختیار کرنے کی بدعت، جہاں تک مجھے یاد ہے این این سرکار کے نیو تھیٹرز سے شروع ہوئی۔ نیو تھیٹرز نے ایک فلم پورن بھگت کے نام سے بنائی۔ اس کے ڈائریکٹر دیوکی بوس تھے۔ وہ بہت بڑا انسان تھا اور بہت بڑا ڈائریکٹر۔

دیوکی بوس نے ایک مسلمان نوجوان کو پورن بھگت کے پارٹ کے لیے منتخب کیا۔ اس لڑکے کا قد، شکل، اس کی گفتگو کا انداز بالکل ویسا تھا جیسا کہ دیوکی بوس کی نگاہ میں پورن بھگت کا ہونا چاہئے تھا۔ اس لڑکے کا فلم پر ٹیسٹ لیا گیا تو دیکھنے والے اچھل پڑے۔ سب نے کہا کہ اس سے زیادہ موزوں کوئی شخص پورن بھگت کے پارٹ کے لیے نہیں ہو سکتا۔ فلم کے پہلے دور میں، خاص کر دیوکی بوس کے دور میں، کہانی کے کردار کے مطابق ایکٹر ڈھونڈا کرتے تھے۔ چاہے ایکٹر نیا ہو کہ پرانا، ڈائریکٹر کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ ایسا چہرہ ملے جو کردار کے مطابق ہو۔ وہ فلم کا ابتدائی زمانہ تھا لیکن پھر بھی ایکٹروں کے انتخاب میں وسعت نظری سے کام لیا جاتا تھا اور آج کل یہ حالت ہے کہ ہیرو ہے تو ساری فلموں میں ہیرو، ہیروئن ہے تو ساری فلموں میں ہیروئن!

ہاں، تو ایک مسلمان لڑکے کو پورن بھگت کے پارٹ کے لیے موزوں قرار دیا گیا۔ لیکن ہندو کمپنی، این این سرکار اور ان کے صاحبزادے اس کے مالک، وہ یہ کیونکر گوارا کر سکتے تھے کہ ایک مسلمان لڑکا پورن بھگت کا پارٹ ادا کرے۔ انہوں نے دیوکی بوس سے کہا کہ اس پارٹ کے لیے کوئی ہندو لڑکا چنو، یہ مسلمان لڑکا پورن بھگت کا پارٹ کرے گا تو بڑا پاپ ہوگا۔ مگر دیوکی کے دل میں یہ مسلمان لڑکا کھب گیا تھا، وہ اڑ گیا کہ پارٹ کرے گا تو یہی لڑکا، ورنہ میں فلم کی ہدایت کاری نہیں کرتا۔ بحث مباحثے کے بعد یہ قرار پایا کہ یہ مسلمان لڑکا اپنا نام تبدیل کر کے ہندوانہ نام اختیار کر لے۔ کمار اس لڑکے کا نام قرار پایا اور اسی ہندوانہ نام سے اس مسلمان لڑکے نے پورن بھگت کا پارٹ ادا کیا۔ یہ کمار کا نام ایسا چلا کہ اس کے بعد کئی ایکٹروں نے اپنے نام کے ساتھ کمار کا دم چھلا لگا لیا۔ یہاں تک کہ مسلمان ایکٹروں نے بھی اپنا نام تبدیل کیا اور نتھو کمار یا خیرو کمار کے نام سے پردہ سیمیں پر جلوہ گر ہوئے۔

اب پرتھوی راج کے ساتھ شانتا رام بھی آ ملا۔ دونوں نے تیر چلانے شروع کئے۔ آغا حشر کے ڈرامے اور اس قماش کے باقی ڈرامے یک قلم ٹکسال سے باہر قرار دیئے گئے۔ ان کی جگہ وہ ڈرامے پیش کئے گئے جو عرف عام میں سوشل ڈرامے کہلاتے ہیں۔ ایک لڑکا ایک لڑکی، ایک رقیب، رقیب کا آخر میں روسیاہ اور لڑکے لڑکی کی شادی، لڑکا بھی ہندو، لڑکی بھی ہندو، شادی بیاہ کی رسمیں بھی ہندوانہ، گھر بار کا نقشہ بھی ہندوانہ۔ البتہ ملازم مسلمان، وفادار مالک کے سامنے ہاتھ جوڑ کر سلام کرنے والا۔ مندر اور پوجا کا منظر کہانی کا جزو لاینفک۔ یوں پرتھوی راج اور شانتا رام نے مل کر ہندو تہذیب، ہندو ثقافت، ہندو رسم و رواج، ہندو لباس، ہندو طریق زندگی کو رواج دیا اور اس کے ساتھ ساتھ سینما کے ذریعے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مسلمان قوم ملازم قوم ہے۔ اس قوم میں اچھے وفادار غلام بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن وفادار ہونے سے کیا ہوتا ہے غلام کا تو کام ہی یہی ہے کہ وفادار رہے۔ گدا اگر تواضع کند خوئے اوست۔ جس کہانی میں مسلمان کسی غلام کا کردار نہ کرے، اس کہانی میں مسلمان کردار کوئی غنڈہ، بدمعاش دکھایا جاتا تھا۔ مثلاً ہوٹل کا بیرا، ترکی ٹوپی اس کے سر پر ہے، وہ ہندوؤں سے رشوت لے کر ان کا پیغام دور کی میز پر بیٹھی ہوئی لڑکی کو پہنچاتا ہے۔ یا یہ نہیں تو داڑھی رکھے عمامہ باندھے ہوئے مسلمان، ڈاکا ڈال رہے ہیں۔ تقسیم کے بعد تو یہ تعصب ہندوستانی فلموں میں اس قدر نمایاں ہوا کہ خدا کی پناہ۔ میں فلم کا سنسر ممبر رہ چکا ہوں۔ ایک مرتبہ ایک ہندوستانی فلم سنسر کرنے گیا۔ وہی سوشل کہانی مگر کہانی کا محل وقوع کشمیر۔ کشمیری مسلمان قلی، بھیک مانگنے والے، کشتی کھینے والے، گڑگڑا کر مزدوری مانگنے والے۔ باقی تمام کردار ہندو، کشمیر میں یوں دندنا رہے ہیں جیسے کشمیر کا مسئلہ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ یہ فلم پاکستان میں مہینوں چلی۔ اللہ اللہ۔

اقوام متحدہ میں کشمیر کا مسئلہ پیش، آرام باغ میں کشمیر کے بارے میں جلسے، جہانگیر پارک میں کشمیر کے بارے میں جلسے، قراردادیں، تقریریں، اخباروں میں مضمون۔ مگر یہ فلم چلتی رہی اور اس کے اشتہار بھی۔ یہ سب زہر پرتھوی راج کے ڈرامے ''دیوار'' کے بعد شدت سے پھیلنا شروع ہوا اور ہم ہیں کہ چاہتے ہیں کہ زہر پھیلے اور ہندوستانی فلمیں پاکستان میں آتی رہیں، اور جو آئی ہوئی ہیں وہ چلتی رہیں۔ اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا۔ پاکستان کی فلمی صنعت جانے اور پاکستان کی فلمی صنعت والے۔ مجھے اس سے براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اس بات پر جی ضرور کڑھتا ہے کہ ہندوستانی فلموں میں ہندوانہ بود و باش کی ترویج و اشاعت ہوتی ہے، ہندو مذہب کی کسی نہ کسی صورت میں تبلیغ ہوتی ہے، کسی نہ کسی صورت سے مسلمانوں کو گھٹیا قوم کے افراد کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، مسلمان یا تو نوکر ہوتا ہے یا ڈاکو اور یا عیاش قسم کا رئیس۔ یہ ہماری تہذیب اور ہمارے مذہبی مفاد کے قطعی منافی ہے۔ میں تو یہاں تک عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ یہ ہمارے سیاسی مفاد اور ہماری سیاسی ضروریات کے بھی قطعی منافی ہے۔ مگر ہمارے یہاں کے فلم والے ہیں کہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔

پرتھوی راج اور شانتا رام کا ہندو برانڈ زور ساری ہندوستانی فلم انڈسٹری میں پھیل گیا ہے اور اس کا اثر ریڈیو پر بھی پڑنے لگا۔ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی اور آرزو رہی کہ ریڈیو والے آپس میں مل جل کر رہیں، جیسے ایک ہی خاندان کے افراد ہوں۔ میرے لیے یہ بات سخت تکلیف دہ تھی کہ ریڈیو میں ہندوستانی فلم کا پھیلا ہوا زہر سرائیت کر جائے۔ میں ایسے مواقع کے تلاش میں رہنے لگا جو اس زہر کے اثر کو نابود کرنے یا کم کرنے میں مفید ثابت ہوں۔ ان ہی دنوں مشہور موسیقار عبدالکریم خان کی برسی تھی۔ عبدالکریم خان نے بمبئی میں بہت نام پایا تھا۔ میں نے اعلان کر دیا کہ بمبئی ریڈیو برسی منائے گا۔ عبدالکریم خان میرج میں دفن ہیں۔ میں نے عبدالکریم خان کے رشتہ داروں اور شاگردوں سے کہا کہ میرج میں عبدالکریم خان کی قبر پر جلسہ کرو، ہم وہیں سے یہ پروگرام ریلے کریں گے۔ کہنے کو تو میں نے کہہ دیا کہ ہم میرج سے ریلے کریں گے، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ میرج میں ٹیلی فون ہی نہیں۔ اب میرے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ وہاں میرج میں بہت بڑے جلسے کا انتظام ہو چکا ہے۔ اخباروں میں اس پروگرام کا چرچا ہے، پوسٹر لگ چکے ہیں، دعوت نامے جاری ہو چکے ہیں اور یہاں یہ حالت ہے کہ میرج میں ٹیلی فون ہی نہیں۔

بہت سوچ بچار کے بعد یہ ترکیب سمجھ میں آئی کہ کہیں سے ایک چھوٹا سا ٹرانسمیٹر فراہم کیا جائے۔ یہ ٹرانسمیٹر میرج پہنچایا جائے اور میرج کا پروگرام اس ٹرانسمیٹر کے ذریعے سورت پہنچایا جائے اور سورت سے ٹیلی فون کے ذریعے بمبئی ریلے کرے۔ جوئندہ یابندہ۔ شکاگو ریڈیو والوں کے یہاں ایک پرانا مگر چالو چھوٹا سا ٹرانسمیٹر پڑا تھا۔ میں نے کمپنی کے مالک متوانی صاحب سے پوچھ کر اٹھوا لیا اور میرج پہنچا دیا۔ عبدالکریم خان کی برسی کا پروگرام اس ٹرانسمیٹر کے ذریعے میرج سے براڈ کاسٹ ہوا، سورت میں سنا گیا اور وہاں سے ٹیلی فون کے ذریعے بمبئی پہنچایا گیا اور ریلے کیا گیا۔ پروگرام بہت مقبول ہوا۔ ہم اس کی مقبولیت پر خوشیاں منا رہے تھے کہ ٹیلی گراف والوں نے دریافت فرمایا کہ یہ نیا ٹرانسمیٹر تم نے کس کی اجازت سے استعمال کیا اور دیگر یہ کہ نیا ٹرانسمیٹر آیا کہاں سے۔ میں نے اس خط کا تذکرہ متوانی صاحب سے کیا اور ان سے صلاح مانگی کہ کیا جواب دیا جائے۔ صلاح تو وہ کیا دیتے میری بات سن کر ان کے ہوش اڑ گئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ متوانی صاحب نے یہ ٹرانسمیٹر بغیر سرکاری اجازت حاصل کئے، اپنے پاس رکھ چھوڑا تھا۔ کس مقصد کے لیے رکھ چھوڑا تھا؟ یہ وہ جانیں یا اس زمانے کی سیاست۔ خیر کسی نہ کسی طرح میں نے ہاتھ پاؤں مار کر معاملہ دبوا دیا اور متوانی صاحب کا نام بیچ میں کہیں بھی نہ آیا۔

عبدالکریم خان کی برسی کے پروگرام کا شہرہ اس قدر پھیلا کہ پونا کے ایک بت تراش کار ماکر نے عبدالکریم خان کا ایک مجسمہ تیار کیا اور عبدالکریم خان کے شاگردوں کے ذریعے خواہش ظاہر کی کہ یہ مجسمہ بمبئی ریڈیو میں نصب کیا جائے۔ کافی خوب صورت مجسمہ تھا۔ لیکن سوال یہ آ پڑا کہ اس کو سرکاری دفتر میں نصب کیوں کر کریں۔ آخر ہمیں ایک ترکیب سوجھی۔ کانگریس حکومت کے وزیر یاسین نوری سے کہا کہ آپ اس مجسمے کی نقاب کشائی کریں۔ نوری صاحب نے ہماری درخواست قبول کر لی۔ عبدالکریم خان کے سینکڑوں مداحوں کے سامنے اس مجسمے کی نقاب کشائی کی اور مجسمہ اسٹوڈیو کے دروازے کے باہر ایک اونچے سے پائے پر رکھا گیا۔ اخباروں میں جب اس مجسمے کا چرچا ہوا تو سرکار دہلی نے ہم سے پوچھا کہ تم کون ہوتے ہو مجسمہ نصب کرانے والے۔ اس کا جواب بہت آسان تھا۔ اور وہ یہ کہ حکومت بمبئی کے ایک وزیر نے یہ حرکت کی ہے، اب جو سرکار کا حکم ہو۔ سرکار خاموش ہو گئی۔

یہ آفت تو خیر گزر گئی مگر اب کٹر قسم کے ہندوؤں میں کھسر پھسر ہونے لگی کہ اگر ایک مسلمان موسیقار کی برسی کا پروگرام ریلے کیا گیا ہے تو کسی نہ کسی طرح ہندو گویے کی برسی کا پروگرام بھی ریلے کیا جائے۔ اب ہندو گویا آئے کہاں سے۔ اور وہ بھی ایسا جو بڑا گویا بھی ہو اور مر بھی چکا ہو اور اس کی کہیں قبر بھی ہو۔ پرتھوی راج کا پھیلایا ہوا زہر فلمی دنیا سے نکل کر اب تمام آرٹ کی دنیا میں پھیل چکا تھا۔ جب تعصب کارفرما ہو تو کوئی جھوٹا بت تلاش کرنے میں کون سی دیر لگتی ہے۔ ہندوؤں کی طرف سے مطالبہ ہوا کہ بھاشکر راؤ اور وشنو ڈگمبر کی برسی کے موقع پر پروگرام کیا جائے۔ بھاشکر راؤ تو خیر کچھ سریلا تھا، لیکن وشنو ڈگمبر گاتا کیا تھا، ڈگ بھرتا تھا۔ زبردست کا ٹھینگا سر پر۔ ہم نے ان دونوں کی برسی کے موقع پر پروگرام نشر کئے۔ مگر اسٹوڈیو سے۔ ہندوؤں کی قبر ہی نہیں ہوتی تو ان کے لیے کون سے میرج سے پروگرام ریلے کیا جاتا۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

ہندوؤں کے تعصب نے ریڈیو کے پروگراموں کو تقسیم کر دیا تھا

ان کا مطالبہ تھا ہندو فنکاروں کو آبادی کے لحاظ سے موقع دیا جائے - موسیقی کی بہت سی اصناف کے ماہر ہندو فنکار ناپید تھے - نتیجتاً مسلمانوں - مرہٹوں - گجراتیوں - انگریزوں اور پارسیوں کیلئے الگ الگ پروگرام کئے جانے لگے - زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



بمبئی میں فیاض خان، عبدالکریم خان، رجب علی خان، اللہ دیا خان، وغیرہ نے نام پایا اور ان لوگوں کے شاگرد سارے شہر میں پھیلے ہوئے تھے۔ ہندو لوگ اس زمانے میں ان استادوں کے شاگرد ہوتے تھے، جب پرتھوی راج کی ''دیوار'' کا زہر پرتھوی کے دل ہی میں کھدبد کر رہا تھا، باہر نکل کر پھیلا نہ تھا۔ مگر اس کے بعد تو ان استادوں کے علاوہ اور کوئی مسلمان گویا بمبئی میں پنپ ہی نہ سکا، یہاں تک کہ عاشق علی خان جیسے میدانی گویے کو بھی یہاں کے ہندو خاطر میں نہ لائے۔ مجھے بے حد خوشی ہے کہ ریڈیو اس مذہبی تعصب سے پاک رہا۔

پرتھوی اب بھی ریڈیو میں مجھ سے ملنے آتا تھا اور میں اب بھی اس کے گھر جاتا تھا۔ لیکن میرے تیور کچھ بگڑے ہوئے تھے یا ویسے بھی پرتھوی کی ''دیوار'' کے باعث فضا مکدر ہو گئی تھی۔ ایک دن پرتھوی کے والد بشیشر ناتھ کپور نے مجھ سے پوچھا۔ ''دیوار'' کھیل تم نے دیکھا۔ میں نے کہا دیکھا تو ہے لیکن اگر نہ دیکھتا تو اچھا تھا۔ ایک فنکار کو ایک پوری قوم کا مذاق نہیں اڑانا چاہئے اور ایک ایسی ہستی کا مضحکہ اڑانے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے جو اس برصغیر کے تمام مسلمانوں کے نزدیک لائق احترام ہے۔

بشیشر ناتھ آنجہانی میری بات سن کر کچھ دیر خاموش رہے اور پھر بولے یاد رکھو اس ہندوستان میں دو قومیں ایک دوسرے کے مقابل کھڑی ہیں ایک ہندو فوج ہے اور ایک مسلمان کا لشکر، جو شخص ان دونوں فوجوں کے بیچ میں کھڑا ہوگا اس پر دونوں طرف سے تیر برسیں گے، ہندوؤں کی طرف سے بھی اور مسلمانوں کی طرف سے بھی۔ پرتھوی نے اچھا کیا کہ ایک فوج میں جا شامل ہوا۔ اور تم نے برا کیا کہ دونوں لشکروں کے درمیان میدان میں آ کھڑے ہوئے۔

بشیشر ناتھ کی بات سن کر ایک ولولہ اٹھا کہ سب کچھ چھوڑ کر مسلم لیگ کے رضا کاروں کی جماعت میں شامل ہو جاؤں لیکن منہ کو نوکری کی کمائی کا خون لگا ہوا تھا، دل کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔

مسلمانوں کی رواداری دیکھئے کہ ہندوستان آئے اور ہندوستان ہی کے ہو کر رہ گئے اور زندگی کا مقصد یہ بنا لیا کہ بکھرے ہوئے ہندوستان کو متحد کیا جائے۔ ہندوستان کی شیرازہ بندی کا کام بابر سے لے کر اورنگ زیب تک ہوتا رہا۔ مسلمانوں اور انگریزوں میں سب سے بڑا فرق یہ تھا کہ انگریز نے ہندوستان کو اپنا وطن نہیں بنایا بلکہ برطانیہ کا نام لے لے کر ہوم سویٹ ہوم کا گیت گاتا رہا۔ اس کے برخلاف مسلمان ہندوستان آئے تو ہندوستان ہی کو وطن بنا لیا اور کبھی کوئی اچٹتی ہوئی نظر بھی اپنے کسی ہوم سویٹ ہوم پر نہ ڈالی۔

یہ تو بادشاہوں کا ذکر ہے۔ مسلمان ادبا اور شعرا نے بھی اسی ہندوستان کی محبت کے گیت گائے۔ انشاء اور نظیر اکبر آبادی سے لے کر اقبال اور حفیظ جالندھری تک سب نے ہندو مذہب کے پیشواؤں پر، ہندو تہواروں پر اور ہندوستان کی عظمت پر خامہ فرسائی کی۔ آغا حشر نے جو ڈرامے ہندو مذہب اور ہندوانہ روایات پر لکھے ہیں، خود ہندوؤں کے ادب میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ منشی بیتاب ہندو تھے اور تصنیف کے میدان میں بہت واجبی شدبد رکھتے تھے۔ انہوں نے اردو ہندی کی ملی جلی زبان میں ایک ڈرامہ ''مہابھارت'' لکھا۔ یہ ڈرامہ بحیثیت ڈرامے کے نہایت گھٹیا تھا لیکن آغا حشر کی رواداری دیکھئے کہ انہوں نے استاد جھنڈے خان سے سفارش کی کہ منشی بیتاب کے ڈرامے مہابھارت کی موسیقی کا اہتمام کریں۔ استاد جھنڈے خان کا سلوک اور خلوص دیکھئے کہ انہوں نے مہابھارت کے گانے اس تندہی اور محنت سے تیار کئے کہ ڈرامے کے بہترین گانے شمار ہوئے۔ ڈرامے کی تاریخ میں مہابھارت سے بہتر گانوں کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ یہی حال فلم کی دنیا میں چتر لیکھا کا ہے۔ ہزاروں فلمیں بنیں، چمکیں اور ماند پڑ گئیں لیکن استاد جھنڈے خان کے گانوں کے سبب چتر لیکھا جہاں تھی وہیں قائم ہے۔

مراد میری اس تحریر سے یہ ہے کہ ہم مسلمانوں نے اپنی رواداری کی بنا پر ہندوؤں کی تہذیب کا اتنا گہرا مطالعہ کیا کہ مہابھارت جیسے خالص ہندوانہ مذہبی ناٹک میں بھی ایک مسلمان سے گانے باندھنے کی درخواست کی گئی اور اس نے وہ گانے باندھے کہ آج تک کوئی ڈرامہ موسیقی کے لحاظ سے اس شان کا نہیں ہوا۔ اس کے برخلاف ہندو ہماری تہذیب اور ثقافت سے اس قدر دور دور رہے کہ اب تک ان سے بوئے بیگانگی آتی ہے۔

مغلوں کے زمانے میں کائستھوں نے فارسی کی ٹانگ توڑی لیکن عبدالرحیم خان خاناں اور دیگر مسلمان مصنفین نے ہندی میں اس پائے کا ادب پیش کیا کہ اب تک ہندو یونیورسٹیوں میں یہ ادب ہندی کے نصاب میں شامل ہے۔

غرض یہ کہ ہم مسلمان اپنے کسی ثقافتی معاملے کی ذمہ داری ہندوؤں پر بہ سبب ان کی بے علمی کے نہ ڈال سکے تھے۔

ہندوؤں کے ان اطوار کے باعث ریڈیو کے کام میں بہت گڑبڑ پڑی۔ خیال کی موسیقی خاص مسلمانوں کی ایجاد تھی، اس میں ہندو ہمیشہ سے پھسڈی۔ طبلہ سارنگی، سرود خاص مسلمانوں کی ایجاد، ان میں ہندو پھسڈی۔ غزل، قوالی، سوز، نوحہ اور مرثیہ خاص مسلمانوں کی ایجاد، ان میں ہندو پھسڈی۔ لامحالہ جب کبھی ان اصناف کا پروگرام ہو، ہم کو مسلمان فنکار بلانے پڑتے تھے۔ ہندوؤں کو ان اصناف میں دخل ہی نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو صرف خیال کی موسیقی کی حد تک اور وہ بھی واجبی، کیونکہ بعض ہندو گویوں نے مسلمان استادوں کے آگے زانوئے تلمذ تہ کر کے اس صنف میں تھوڑی بہت شدبد پیدا کر لی تھی۔ مختصر یہ کہ ہندو گویے صرف مرہٹی پد، گجراتی گیت گا لیتے باقی خیر صلا تھی۔

ہندو ناقدین، ادب اور آرٹ کے معاملے میں انصاف سے کام لیتے تو ریڈیو کی ہمت افزائی کرتے مگر جہاں تعصب کی پٹی آنکھوں پر بندھی ہو وہاں انصاف کا کیا کام۔ مطالبہ کیا گیا کہ ہندو گویوں اور مسلمان گویوں اور فنکاروں میں ہندوستان کی آبادی کے لحاظ سے تناسب قائم کیا جائے۔

ہمیں سب کچھ منظور تھا لیکن ہم پروگرام کی مٹی پلید ہوتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ ہم نے ناقدین کو جواب دیا کہ ہندو فنکار پہلے تو تعداد میں بہت قلیل ہیں اور جو تھوڑے بہت ملتے بھی ہیں تو وہ ہمارے سننے والوں کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ لیکن، ہماری کون سنتا تھا۔ خود تو کسی نے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر نہ دیکھا، الٹا ہمیں کو متعصب ٹھہرانے لگے۔ آخر ہم کو ایک ترکیب سوجھی۔ اپنے سب سے بڑے اور منہ پھٹ نکتہ چیں صحافی سے ملاقات کی اور اس کو کسی نہ کسی طرح سمجھا بجھا کر اس بات پر راضی کر لیا کہ فنکاروں کے انتخاب کے لیے ریڈیو کی مدد کرنی چاہئے اور اگر ریڈیو کوئی غیر رسمی بورڈ فنکاروں کے انتخاب کے لیے تجویز کرے تو انہیں اس کی رکنیت قبول کر لینی چاہئے۔

بدھ کے دن ہمارے یہاں فنکاروں کی آواز کا امتحان لیا جاتا تھا۔ اب کے جو بدھ آیا تو میں نے جیکر اور امید کر کو اسٹوڈیو میں بلا لیا۔

اس زمانے میں ہمارے یہاں آواز کا امتحان لینے کا طریقہ یہ تھا کہ تمام آرٹسٹ اسٹوڈیو میں جمع ہو جاتے تھے، ان سب کے ناموں کی فہرست بنالی جاتی تھی اور ہر نام کے آگے ایک نمبر ڈال دیا جاتا تھا۔ جب فنکار امتحان دینے کے لیے مائیکروفون کے سامنے آتے تو ان کا نمبر پکارا جاتا۔ امتحان دینے سے قبل خود آرٹسٹ کو بھی معلوم نہ ہوتا تھا کہ میرا نمبر کیا ہے۔

آرٹسٹ اسٹوڈیو میں اور آرٹسٹوں کا امتحان لینے والے نچلی منزل میں کسی دفتر کے لاؤڈ اسپیکر کے گرد۔

اس انتظام میں یہ خوبی تھی کہ امتحان لینے والے آرٹسٹ کی شخصیت، اس کے نام یا اس کے مذہب سے بے نیاز ہو کر اس کی آواز کا امتحان لیتے تھے۔ جب امید کر اور جیکر کی موجودگی میں اپنے دفتر کے لاؤڈ اسپیکر پر میں نے آرٹسٹوں کی آواز کا امتحان لینا شروع کیا تو پہلے ہی نمبر کو سن کر جیکر چلا اٹھا کہ امتحان لینے کا طریقہ غلط ہے۔ میں نے دریافت کیا، حضرت کیوں غلط ہے؟ وہ بغیر کسی تامل کے بولا کہ نمبر سے ہمیں کیا معلوم ہوگا کہ گانے والا ہندو ہے یا مسلمان؟ ہم تو یہاں اس لیے آئے ہیں کہ ہندوؤں کو نیابت دلوائیں۔ نہ یہ فیصلہ کرنے کہ کون اچھا گاتا ہے اور کون برا؟

یقین مانئے جیکر جیسے شخص کی زبان سے یہ بات سن کر میں سکتے میں رہ گیا۔ جیکر جس کی ساری عمر عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر مقدمات فیصل کرنے میں گزری ہو، اس قدر متعصب، تنگ دل اور اس قدر کوتاہ نظر!!! مجھے اور تو کچھ کہنے کا یارا نہ تھا، میں نے فقط یہ کہا کہ جو کچھ آپ نے زبانی فرمایا، لکھ دیجئے۔

میری اس درخواست کا جواب جیکر نے نہیں، امید کر نے دیا اور فرمایا ہم یہاں ہندو فنکاروں کے انتخاب میں تمہاری مدد کرنے آئے ہیں اور وہ بھی اس لیے کہ تم ہندوؤں کی تہذیب اور ان کی فن کی عظمت سے واقف نہیں ہو۔ ہم یہاں دستاویزیں عطا کرنے اور تحریریں لکھنے نہیں آئے۔

اب میں کیا کہہ سکتا تھا۔ صرف یہ کہا کہ تو پھر آیئے حضرات دوسرے کمرے میں تشریف لے چلئے، چائے حاضر ہے۔

رفتہ رفتہ اس آڈیشن کا احوال سارے شہر میں مشہور ہو گیا، کسی نے مجھے برا بھلا کہا اور کسی نے امید کر، جیکر اینڈ کمپنی کو۔

اس لے دے کے بعد میرے نزدیک تو بات آئی گئی ہو گئی لیکن میں کون اور میری بساط کیا۔ بمبئی میں جیکر اور امید کر کا بہت اثر و رسوخ تھا اور پھر کانگریسی حکومت اہر چند کانگریسی حکومت میں اور امید کر میں ہمیشہ ماتھا پھٹول رہتی تھی لیکن جہاں کہیں مسلمانوں کو زک پہنچانے کا سوال ہو امید کر اور کانگریسی ایک ہو جاتے تھے۔

بمبئی کی کانگریسی حکومت میں اس وقت مرارجی ڈیسائی اور کے ایم منشی جیسے لوگ تھے۔ وہ میری بات کیا سنتے۔ انہوں نے مجھے فرقہ پرست اور نہ جانے کیا کیا کہا۔ میں یاسین نوری کے پاس گیا مگر انہوں نے اس آگ میں کودنے سے گریز کیا۔ میں آخر کھیر کے پاس گیا۔ کھیر صاحب اس زمانے میں کانگریسی حکومت کے وزیر اعلیٰ تھے۔ میں ان کی نیک دلی کا بہت قائل تھا۔ انہوں نے سب معاملے کو غور سے سنا اور فرمایا کہ اگر غزل، سوز، نوحہ، مرثیہ اور قوالی گانے والے ہندو گویے اور سارنگی، ستار، طبلہ، سرود اور رباب بجانے والے ہندو سازندے نہیں ملتے تو یہ پروگرام ہی کم کر دو اور ایسے پروگرام کی بجائے وہ پروگرام رکھو جن میں ہندوؤں کو دسترس ہو۔

یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ میں شملے کے آرمی ہیڈ کوارٹرز میں ملازم تھا۔ مجھے ترقی ملی تو میرے دفتر کے ہندو دوستوں نے مجھ سے کہا کہ اس مسرت کے موقع پر دعوت کا انتظام کرو۔ طے پایا کہ اگلے دن یہ حضرات شام کے وقت غریب خانے پر آ کر ماحضر تناول فرمائیں۔

یہ سب کے سب حضرات آریہ سماجی تھے۔ گوشت نہیں کھاتے تھے۔ صرف سبزیوں سے پیٹ بھر لیتے تھے۔

ان دنوں جاڑے کا موسم تھا۔ میری بیوی دلی میں تھیں اور میں شملے میں۔ شام کو کھانا کھانے لگا تو اپنے رکاب دار مراد بخش سے کہا کہ کل پانچ ہندو شام کے کھانے پر تشریف لا رہے ہیں، وہ گوشت نہیں کھاتے اس لیے بغیر گوشت کے دو چار کھانے تیار کرنے ہوں گے، کل صبح ناشتے کے وقت ہم کو بتانا کہ تم کیا کیا پکاؤ گے، اور سودے سلف کے لیے کتنے پیسے تم کو چاہئیں۔

صبح کو میں ناشتہ کر رہا تھا کہ مراد بخش آیا۔ میں نے پوچھا مراد بخش سوچ لیا کیا کچھ پکانا ہے۔ بولا جی ہاں۔ میں نے کہا بتاؤ۔ فرمایا، صاحب ایک تو بھجیا ہو جائے گی اور دوسرے...... بھجیا ہو گی...... اور پھر صاحب بھجیا ہی ہے۔

کھیر صاحب سے جب میں نے پوچھا کہ صاحب کون سے پروگرام ہیں جن میں بمبئی کے ہندوؤں کو دسترس حاصل ہے تو فرمایا کہ ایک تو مرہٹی پد اور گربا ہے اور...... دوسرے مرہٹی پد اور گربا ہے۔ بس مرہٹی پد اور گربا ہی ہے۔

میں نے تو اس کو مذاق سمجھا لیکن کھیر صاحب کے نزدیک ان کی تجویز نہایت اہم تھی۔ اتنی اہم کہ انہوں نے نجی خط لکھ کر فیلڈن کو اس اہم مسئلے پر گفتگو کرنے کے لیے دہلی سے بمبئی بلوایا۔ یہ کھیر صاحب کی شرافت تھی کہ انہوں نے فیلڈن کو نجی خط لکھا ورنہ جہاں تک مجھ گنہگار کا تعلق تھا، میرے ہر معاملے کے متعلق سرکاری خط لکھا جاتا وہ بھی فیلڈن کو نہیں بلکہ وزیر کو۔

فیلڈن بمبئی تشریف لائے۔ میں نے انہیں تمام معاملہ سمجھایا لیکن ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ مثال کے طور پر غزل کی روایات میں کیونکر ان کے ذہن نشین کراتا اور کیونکر سمجھاتا کہ مرہٹہ اور گجراتی غزل نہیں گا سکتا۔

مرنے سے کچھ عرصہ قبل میرے بھائی نے مجھے نیویارک سے ایک بڑے مزے کا خط لکھا۔ اس میں تحریر فرمایا کہ میں امریکہ کے ایک بہت بڑے شاعر کو غزل کی روایات سمجھا رہا تھا۔ معاملہ کچھ چل نکلا اور وہ کچھ کچھ غزل کی تاریخی اہمیت سمجھنے لگا۔ مجھ سے کہا بہت خوب، اب کوئی غزل سناؤ اور اس کا انگریزی میں ترجمہ کرو۔ میں نے انعام اللہ یقین کی غزل کا مطلع پڑھا۔

نہیں معلوم اب کے سال مے خانے پہ کیا گزری
ہمارے توبہ کر لینے سے پیمانے پہ کیا گزری

''اب کے سال'' پر آ کر میری انگریزی ختم ہو گئی اور مجھے ان تین لفظوں کی اس قدر وضاحت کرنی پڑی کہ رات کے بارہ بج گئے۔ ظاہر بات ہے کہ ''اب کے سال'' کوئی جنتری کا سال تو ہے نہیں کہ آسانی سے سمجھ میں آ جائے۔

غرض یہ کہ فیلڈن کو میں کچھ نہ سمجھا سکا، البتہ اس بات پر راضی کر لیا کہ پروگرام کے پانچ حصے کئے جائیں۔

پہلا حصہ بحیثیت مجموعی تمام سننے والوں کے لیے۔

دوسرا حصہ مسلمان سننے والوں کے لیے۔

تیسرا حصہ مرہٹوں کے لیے۔

چوتھا حصہ گجراتیوں کے لیے۔

پانچواں حصہ انگریزوں، پارسیوں اور دیگر انگریز منش ہندوستانیوں کے لیے۔

کھیر صاحب کو یہ تقسیم پسند آئی اور اس پر عمل ہونے لگا۔ لیکن یقین مانئے، پلہ اسی ثقافت کا بھاری رہا جو ایک ہزار برس سے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی۔

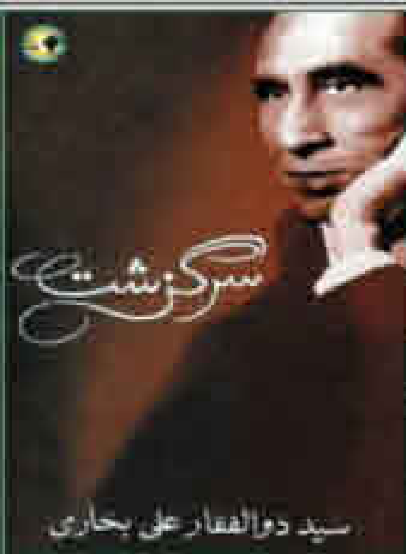
(جاری ہے)

☆☆☆☆☆

پیر/21 اپریل 2014ء
روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

اردو کو علمی زبان بنانے کیلئے دکن نے نمایاں خدمات انجام دیں

اہل قلم کی توجہ سے قبل ''ڑ'' کی جگہ ''ڈ'' لکھا جاتا تھا - علی گڑھ کے بجائے ''علی گڈھ'' رائج تھا - فلم ''انمول گھڑی'' اور ''چوڑیاں'' کے اشتہارات ''انمول گاڈی'' اور ''چڈیاں'' کے نام سے شائع ہوئے تو میں چکرا کر رہ گیا - زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



دکن میں اردو کو علمی زبان بنانے کے لیے بڑے انہماک سے کام کیا گیا اور استادانِ فن کی محنت شاقہ کی بدولت یہ زبان دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں آ کھڑی ہوئی۔

کہاں پراکرت اور کہاں اردو۔ پراکرت بقول اہل تحقیق کے سوقیانہ زبان اور اردو اس کے مقابلے میں اہل قلم اور اہل علم کی زبان۔ آج بھی اگر ہندوستان کے پراکرت بولنے والے علاقوں کی خالص پراکرت کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اردو کے خادم ایک بولی ٹھولی کو کہاں سے کہاں لے آئے۔ اردو کے عالموں نے زبان تو زبان، حروف تہجی میں بھی ہندوستان کی اس مشترکہ زبان کو لکھنے کے لیے اہم اور مناسب تبدیلیاں کیں۔ خ، غ، ق، ط، ظ وغیرہ حروف کو چھوڑ کر میں ایک معمولی سے حرف کا ذکر یہاں کرنا چاہتا ہوں اور وہ حرف ہے ''ڑ''۔

اردو کے علما کی توجہ سے پہلے ''ڑ'' کی صوت کو بھی ''ڈ'' ہی کے ذریعہ ادا کیا جاتا تھا۔ چنانچہ پرانی تحریروں میں آپ کو ''علی گڑھ'' کی بجائے ''علی گڈھ'' لکھا ہوا ملے گا۔ اسی طرح ''جونا گڑھ'' کے بجائے ''جونا گڈھ''، ''گاڑی'' کے بجائے ''گاڈی''۔

ایک ہندوستانی فلم ''انمول گھڑی'' کے نام سے نکلی تھی۔ بمبئی کے گجراتیوں نے اس کے انگریزی اشتہار میں ''گھڑی'' کو جی اے ڈی آئی لکھا۔ یعنی ''گاڈی''۔ میں اشتہار کو پڑھ کر کئی دن تک چکر میں رہا کہ ''انمول گاڈی'' کیا معنی۔

اس ''ڑ'' اور ''ڈ'' کا فرق ایک مرتبہ تو خوب ہی رنگ لایا۔ ہمارے ایک گجراتی کرم فرما ایک گجراتی فلم کمپنی میں پبلسٹی کا کام کرتے تھے۔ گجراتی زبان کے تو مشہور اہل قلم تھے، مگر اردو بولنے کا تو خیر، اردو لکھنے کا علم ان کا واجبی تھا۔ ایک دن ان کے مالک نے انہیں اپنی فلم کا اشتہار انگریزی میں لکھ کر دیا اور کہا کہ اس کا اردو ترجمہ کل تک اخباروں میں شائع کرا دو۔ فلم کا نام تھا ''چوڑیاں''۔ ہمارے اس کرم فرما نے پرانی فلموں کے اشتہار دیکھے اور جس طرح بھی بن پڑا ''شاہکار''، ''ہدایت کار''، ''موسیقار'' وغیرہ لکھ کر اشتہار اخبارات میں بھجوا دیا۔ اگلے دن جو اشتہار بمبئی کے تمام اردو اخبارات میں آب و تاب سے شائع ہوا، یہ تھا:

آ رہا ہے...... آ رہا ہے...... آ رہا ہے

فلاں ابن فلاں...... فلم کمپنی

کا شاہکار......

''چڈیاں''

آیئے ''چڈیاں'' ملاحظہ فرمایئے۔

وہ صاحب بھی کیا کرتے۔ گجراتی میں ''ڑ'' ہے ہی نہیں۔ حرف ''ڈ'' ہی سے کام چلایا جاتا ہے۔ وہاں ''چوڑیاں'' کو ''چڈیاں'' لکھنا ہی پڑتا ہے۔

یہ تمام ذکر ہمارے آزاد ہونے سے پہلے کا ہے۔ جب ہم آزاد ہوئے اور بھارت بھی آزاد ہوا تو، معاف فرمایئے، ہم کچھ بہک گئے۔ اپنے عظیم الشان ثقافتی سرمائے کی طرف سے بے پروا ہو گئے۔ خیال یہ کیا کہ اب تو یہاں ہم ہی ہم ہیں۔ اب ہمارے ثقافتی سرمائے پر کون حملہ کرے گا۔ اب اس کا تحفظ کیا معنی۔ ادھر ہماری یہ حالت اور ادھر بھارت والوں کی یہ حالت کہ پاکستان کے معرض وجود میں آتے ہی انہوں نے لنگر لنگوٹے کس لیے اور ہاتھ دھو کر اس بات کے پیچھے پڑ گئے کہ مسلمان پاکستان میں چلے گئے تو کیا ہوا، ہم اپنی ہندوانہ تہذیب اور ہندوانہ ثقافت کے گولے ہندوستان میں بیٹھ کر پاکستان پر برسائیں گے۔ چنانچہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت انہوں نے شروع شروع میں ہر طریقے سے اپنے یہاں کا بنا ہوا کپڑا ہمیں دکھایا، اور دس روپے کی چیز کو جھوٹ موٹ دو روپے بتایا، تاکہ یہاں کے لوگوں میں بددلی پیدا ہو کہ دیکھو، ہمارے ملک میں کپڑا کس قدر گراں ہے اور ہندوستان میں کس قدر ارزاں۔ یہاں کے سفارتی حلقوں کے ذریعہ ہندوستان فلمیں بھیجیں اور سفارت خانے میں مفت دکھائیں۔ انہوں نے تو یہاں تک بندوبست کیا کہ فلم دکھانے کا پردہ کوٹھی کے احاطے کی دیوار کے اوپر لگایا، تاکہ کوٹھی کے چمن میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی فلم دیکھ سکیں اور باہر سڑک پر کھڑے ہوئے لوگ بھی۔

اس زمانے میں پاکستان میں گراموفون کمپنی قائم نہیں ہوئی تھی۔ تمام ریکارڈ ہندوستان سے بن کر آتے تھے۔ یہ ریکارڈ کیا تھے ہندو تہذیب، ہندو مذہب اور ہندو فلموں کا مرقع تھے۔ خدا خدا کر کے ہمیں ہوش آیا اور ہم نے گراموفون کمپنی پر زور دیا کہ ایک شاخ یہاں بھی قائم کی جائے۔ بڑی مشکل سے یہ کمپنی یہاں شاخ قائم کرنے پر آمادہ ہوئی۔ مگر اب بھی اس کمپنی کے زیادہ تر ریکارڈ وہی ہیں جن کا چربہ ہندوستان سے بن کر آتا ہے۔ چربہ وہاں کا اور ریکارڈ کی ساخت یہاں کی۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم بھارت کے ثقافتی گولوں سے بچنے کے لیے، چاہے وہ گولے موسیقی کی شکل دھار کر آئیں یا فلم کا روپ۔ خود اپنی ثقافت، اپنی موسیقی اور اپنی فلموں کا ایک حصار قائم کریں، تاکہ ہلاکت سے بچ سکیں۔

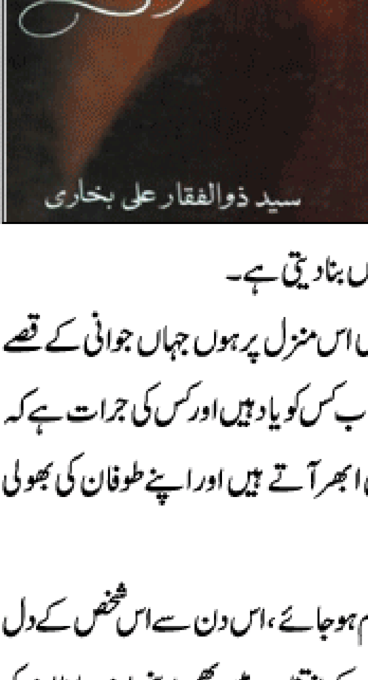
پاکستان میں یہ ہندوستانی تہذیب کے گولے درآمد کرنے والوں کی خدمت میں حاضر ہونا چاہیے اور ان سے دست بستہ درخواست کرنی چاہیے کہ اے ہماری ثقافتی اور تہذیبی ہلاکت کا سامان درآمد کرنے والو، تم ہندو ہو یا مسلمان۔ آخر پاکستانی ہو۔ تم کیوں پاکستان کے نوجوان طبقے کو اخلاقی اعتبار سے موت کے گھاٹ اتار رہے ہو؟ آخر خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے؟ یا پھر اس قوم کو کیا منہ دکھاؤ گے جو آج نہیں تو کل ضرور بیدار ہوگی۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

فلمی دنیا کے نامور فنکار ریڈیو پر آنے کیلئے بے تاب رہتے

سہگل-کے سی ڈے-اندو بالا اور بندو خان سمیت کئی فنکار فلم سے ہزاروں کماتے تھے-ریڈیو سے برائے نام معاوضہ ملتا تھا-فلم میں ہیروئن کا کردار ادا کرنا وحیدن کے لئے منحوس ثابت ہوا-زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



مولانا روم فرماتے ہیں۔

''عشق ہائے کو بر رنگے بود

عشق نہ بود عاقبت ننگے بود

جو عشق محض رنگ کے لیے یعنی جسمانی کشش کے باعث ہوتا ہے، دراصل عشق نہیں ہوتا، رسوائی کا سامان ہوتا ہے۔ عشق کی رسوائی کا سامان، اس شخص کی رسوائی کا سامان جو محض جسم کی خاطر عشق کا ڈھونگ رچا لیتا ہے۔

جو محبت محض جسم کے لیے ہو، وہ جسم کے ڈھلتے ہی ڈھل جاتی ہے۔ محبت درحقیقت وہ ہے جو ذہنی مماثلت اور روحانی کشش کے باعث ہو۔ اگر ذہنی یگانگت اور روحانی کشش کارفرما ہو تو سیاہ فام لیلیٰ بھی قیس عامری کو مجنوں بنا دیتی ہے۔

یہ تمہید نہایت بھونڈی ہے مگر کیا کروں، اپنی جوانی کا قصہ بیان کرنے کے لیے بہانہ ڈھونڈ رہا ہوں۔ زندگی کی اس منزل پر ہوں جہاں جوانی کے قصے بیان کرتے ہوئے شرم سی آتی ہے۔ اور پھر جوانی کے طوفان میں کیا کیا غوطے لگائے اور کیا کیا غوطے کھائے، اب کس کو یاد ہیں اور کس کی جرات ہے کہ یاد کرنے کی کوشش کرے۔ ہاں جب کسی اور جگہ کوئی طوفان اٹھتا ہے تو میرے حافظے کے مٹے ہوئے نقش ابھر آتے ہیں اور اپنے طوفان کی بھولی بسری باتیں عرق انفعال بن کر میرے ماتھے پر پھیل جاتی ہیں۔

سننے والوں کے نزدیک اور پھر ان کی شہ پر راج دربار کے لوگوں کے نزدیک جس دن کوئی شخص ریڈیو میں ملازم ہو جائے، اس دن سے اس شخص کے دل سے دوستی، مروت، اخلاق کے تمام جذبات یک قلم خارج ہو جانے چاہئیں۔ یہاں تک کہ اس کو فنکاروں کے انتخاب میں بھی اپنی پسند یا ناپسند کو بالائے طاق رکھنا چاہئے۔ اس کے برخلاف اس پر لازم ہے کہ صبح سویرے اٹھ کر سننے والوں کے گھر جایا کرے اور فرداً فرداً ہر ایک کا دروازہ کھٹکھٹا کر پوچھا کرے کہ آپ کا مزاج کیسا ہے اور دیگر احوال یہ ہے کہ اگر آپ اجازت دیں تو وحیدن کا گانا پسند کروں اور اسے ریڈیو کا پروگرام دوں۔

یہ وحیدن آگرے کی رہنے والی تھی۔ بہت گہرا سانولا رنگ۔ بہت گہرا سانولا کیا، یوں کہئے کہ قریب قریب سیاہ فام تھی۔ شادی شدہ تھی۔ اولاد والی تھی۔ فلموں میں پارٹ کرتی تھی اور ریڈیو پر گاتی تھی۔ موسیقی کی ماہر نہ تھی۔ اس کا گانا غزل ٹھمری دادرے تک محدود تھا۔ لیکن آواز بہت سریلی پائی تھی۔ جو کچھ گاتی تھی کیف میں ڈوب کر گاتی تھی۔ بمبئی ریڈیو کی گانے والیوں میں مجھے تین عورتیں خاص طور پر اچھی لگتی تھیں۔ ایک تو وحیدن، دوسری روشن آرا اور تیسری جدن بائی۔ یہ تینوں مشہور گانے والیاں تھیں۔ صاحب اخلاق تھیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ اردو بولتی تھیں۔ باقی گانے والیاں یا تو مرہٹی تھیں یا گجراتی۔ میں گجراتی اور مرہٹی بول تو لیتا تھا لیکن اٹک اٹک کر۔ جب انسان اٹک اٹک کر کوئی زبان بولے تو گفتگو کا مزہ آدھا رہ جاتا ہے۔

روشن آرا اور وحیدن کے یہاں تو میں کبھی نہیں گیا البتہ جدن کے یہاں متعدد مرتبہ جانے کا اتفاق ہوا، وہ بھی مشاعروں کے سلسلے میں۔ جدن کے یہاں کے مشاعرے بمبئی کی تاریخ میں یادگار رہیں گے۔ ان میں جوش اور یگانہ بھی شرکت کرتے تھے۔ یہ مشاعرے سنجیدہ بھی ہوتے تھے اور غیر سنجیدہ بھی۔ سنجیدہ مشاعروں کی صدارت تو خیر کوئی اور کیا کرتا تھا لیکن غیر سنجیدہ مشاعروں کی صدارت کا قرعہ ہمیشہ جدن کے نام پڑا کرتا تھا۔ مگر جدن کا قصہ چھوڑیے۔ مجھے تو وحیدن کی داستان بیان کرنا ہے۔

وحیدن ریڈیو سے مہینے میں ایک پروگرام کیا کرتی تھی اور وہ بھی کوئی پچاس ساٹھ روپے کا۔ فلم کی بڑی نامور ایکٹریس تھی اور فلم میں پارٹ کر کے اچھا خاصا کما لیتی تھی لیکن پھر بھی ریڈیو کی چاٹ اس کو ایسی لگی تھی کہ اگر ریڈیو کا پروگرام کبھی ادھر ادھر ہو جائے تو رونے لگتی تھی۔ ایک وحیدن ہی پر کیا منحصر ہے، ریڈیو کی چاٹ ایسی بری ہے کہ سہگل جیسا آدمی جو فلموں سے ہزاروں کماتا تھا، ریڈیو پر اپنی پرانی فیس ساڑھے بارہ روپے لے کر پروگرام کیا کرتا تھا۔ یہی حال کے سی ڈے، اندو بالا اور انگو بالا کا تھا۔ یہ سب دس دس بارہ بارہ روپے میں پروگرام کیا کرتے تھے۔

یہاں مجھے بندو خان مرحوم کا قصہ یاد آتا ہے۔ ایک دفعہ ریڈیو کو کچھ مالی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس بحران سے سلامت بچ نکلنے کا بس یہی طریقہ تھا کہ فنکاروں کے پروگرام کم کر دیئے جائیں اور ریکارڈ بجا بجا کر وقت پورا کیا جائے۔ چنانچہ بندو خان کو چار پروگراموں کے بجائے مہینے میں تین پروگرام ملنے لگے۔ جب چار کے تین پروگراموں کا کنٹریکٹ بندو خان کے پاس پہنچا تو شور مچاتے ہوئے میرے پاس پہنچے اور شکایت کی کہ میرا ایک پروگرام کاٹ دیا گیا ہے۔ میں نے ریڈیو کی مالی مشکلات کا ذکر کیا اور کہا کہ سرکار نے جتنی چادر ہمیں دی ہے، ہمیں اسی میں پاؤں پھیلانے ہوں گے۔ تم صبر شکر کر کے یہی تین پروگرام قبول کر لو، بعد میں اگر کوئی گنجائش نکلی تو تمہارے پروگرام پھر چار کر دیئے جائیں گے۔ بندو خان میری بات سن کر اپنا منہ میرے کان کے قریب لائے اور چپکے سے کہا، صاحب پیسے تین پروگرام کے دو مگر کنٹریکٹ چار پروگرام کا ہو، میں انہیں پیسوں میں چار پروگرام کروں گا، ورنہ لوگ کہیں گے کہ بندو خان کی سارنگی پسند نہیں کی گئی اس لیے پروگرام بجائے چار کے تین ملنے لگے۔

ہاں تو میں وحیدن کا ذکر کر رہا تھا۔ فلم میں ہزاروں کماتی تھی مگر ریڈیو کو چھوڑنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ پروگرام والے دن وحیدن پروگرام کے وقت سے بہت پہلے ریڈیو اسٹیشن پر آ جاتی اور یہاں میرے کمرے میں محفل گرم ہوتی۔ اس محفل میں ونکر راؤ، سی سی مہتہ اور مرڈھیکر بھی شامل ہوتے۔ وحیدن کا انداز گفتگو ایسا شستہ تھا کہ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے مرہٹے اور گجراتی بھی اش اش کر اٹھتے۔ وحیدن اکثر فلمی دنیا کے قصے سنایا کرتی تھی اور ایسے مزے لے لے کر سنایا کرتی کہ ہمیں گھر بیٹھے بیٹھے فلمی دنیا کے پس پردہ ماحول کا نقشہ نظر آ جاتا تھا۔ وحیدن کی داستانیں یا تو گجراتیوں اور مرہٹوں کے مضحکہ خیز اردو تلفظ کے بارے میں ہوا کرتی تھیں یا ان معاشقوں کے بارے میں جو فلم اسٹوڈیو میں آئے دن ہوتے رہتے تھے۔ وحیدن کہا کرتی تھی کہ فلم کے اسٹوڈیو میں کمپنی کے مالک کے مزاج میں دخل رکھنا ہو تو بناوٹی معاشقہ کرنا ہی پڑتا ہے، ورنہ سارے اسٹوڈیو میں مشہور ہو جاتا تھا کہ عورت نک چڑھی ہے، پھوہڑ ہے، جذبات سے خالی ہے۔ جب یہ ایسے معاشقہ نہیں کر سکتی تو فلم کے پردے پر کیا خاک کرے گی۔

بمبئی ریڈیو سے میں اکثر سننے والوں کے خطوط کا جواب دیا کرتا تھا۔ مائیکروفون ایک ایسی چیز ہے کہ اگر کوئی چاہے تو اس کے ذریعے میلوں دور اپنا دل پھینک سکتا ہے۔ لیکن یقین مانئے کہ میں نے کبھی بھی مائیکروفون کو اپنے دل کے لیے غلیل نہیں سمجھا۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ بعض سننے والوں نے میری آواز اور میرے لب و لہجہ سے وہ مطلب نکالا جو میرا ہرگز نہیں تھا۔ اس سے یہ اندازہ نہ لگایئے کہ میری آواز میں کوئی خاص بات ہے۔ بھونڈی سے بھونڈی آواز والا بھی اگر مائیکروفون پر وقتاً فوقتاً بولتا رہے تو ملک کے کسی نہ کسی کونے کھدرے میں اس کی آواز پر مر مٹنے والے پیدا ہو ہی جاتے ہیں۔

وحیدن کی گفتگو اس قدر دلچسپ ہوتی تھی کہ مائیکروفون پر فلمی دنیا کے قصے بیان کرتے وقت اکثر وحیدن کے فقرے میری زبان پر آ جاتے تھے اور ایک آدھ مرتبہ تو میں نے دوران تقریر مائیکروفون پر وحیدن کا نام بھی لے لیا۔ بس پھر کیا تھا ہر طرف سے چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور فلمی دنیا پکار اٹھی کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ نیک بختوں نے یہ نہ سمجھا کہ جب دل میں کالا نہ ہو تو دال میں کالا کہاں سے آئے گا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ لیکن ہمارے معمول میں فرق نہ آیا۔ وحیدن معمول کے مطابق ہر مہینے آتی اور پروگرام کرتی۔ پروگرام کرنے والے دن وہی معمول کے مطابق میرے کمرے میں محفل گرم ہوتی اور تادیر قائم رہتی۔ ایک دن وحیدن یونہی میرے کمرے میں آ گئی۔ اس دن اس کا پروگرام نہ تھا۔ اس کو خلاف معمول اپنے کمرے میں دیکھ کر مجھے کچھ حیرت ہوئی، مگر اسے کرسی پر بٹھایا اور چپراسی سے کہا کہ یاران سرپل کو بلا لاؤ۔ وحیدن بولی نہیں، آج مجھے آپ سے تنہائی میں بات کرنی ہے، کسی اور کو نہ بلایئے۔

اب میں پریشان کہ یہ تنہائی میں مجھ سے کیا بات ہو گی۔ وحیدن نے بہت اطمینان سے چائے پی مگر مجھے اطمینان کہاں۔ میرے دل میں کھد بد ہو رہی تھی کہ خدا جانے کیا کہنے آئی ہے اور وہ بھی تنہائی میں۔ جب میرا اضطراب بہت بڑھ گیا تو میں نے خود ہی پوچھا کہ کہو وحیدن کیا بات ہے، مجھ سے تنہائی میں کیا کہنا چاہتی ہو۔ میرا یہ کہنا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ میں نے دل میں کہا ''جل تو جلال تو''۔ یہ قصہ آخر کیا ہے! جی میں آئی کہ کمرے سے بھاگ کھڑا ہوں مگر پھر خیال آیا کہ شاید کسی اشد ضرورت سے آئی ہو، شاید اس کو میری کسی مدد کی ضرورت ہو...... شاید! آخر جب اس کے آنسو کا طوفان تھما تو بولی، مجھے کسی فلم میں ہیروئن کا پارٹ دلوا دو۔ اب میں چھوٹے موٹے پارٹ نہ کروں گی۔ وحیدن اپنی عمر اور اپنے چہرے بشرے کی وجہ سے صرف ضمنی پارٹ کیا کرتی تھی۔ اب جو اس نے کہا کہ مجھے ہیروئن کا پارٹ دلوا دو تو پہلے تو میں حیران ہوا کہ اس کو ہیروئن کا پارٹ کون دے گا اور پھر یہ خیال آیا کہ میں کون ہوں کہ میری بات مان کر اس کو کوئی ہیروئن کا پارٹ دے گا۔ بہرحال بات آگے چلانا تھی۔ میں نے پوچھا بیٹھے بٹھائے تمہیں کیا سوجھی کہ ہیروئن کا پارٹ کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگی ہو۔

کہا تمہارا اخلاق اور تمہارا کرم میرے لیے عذاب بن گیا ہے۔ میں ضمنی پارٹ کرتی ہوں، اس لیے یوں سمجھو کہ میری جڑیں زمین کے باہر ہیں۔ میرا سینہ لوگوں کے طعن تشنوں سے چھلنی ہو گیا ہے۔ میں اگر ہیروئن کا پارٹ کروں گی تو لوگ میری خوشامد کریں گے۔ اب ضمنی پارٹ کرنے کے لیے مجھے لوگوں کی خوشامد کرنی پڑتی ہے۔ وحیدن کی منطق کمزور تھی لیکن اس کی بات میری سمجھ میں آ گئی۔ مگر میں کر ہی کیا سکتا تھا۔ وحیدن سیٹھ چمن لال ڈیسائی کے اسٹوڈیو میں ملازم تھی اور وہاں میرا کوئی دخل نہ تھا۔ سیٹھ چمن لال کے علاوہ صرف ایک اور شخص کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ تھا سریندر۔ وکیل تھا مگر فلموں میں پارٹ کرتا تھا۔ بے حد شریف اور بے حد پڑھا لکھا آدمی تھا۔ یہ سب کچھ صحیح لیکن میں دوسروں کے معاملات میں دخل کیوں کر دیتا۔ فلمی دنیا کے اکثر لوگ میرے پاس صلاح مشورے کے لیے آیا کرتے اور میری خاطر تواضع کیا کرتے تھے۔ مگر میں ایاز قدر خود بشناس کے اصول پر ہمیشہ کاربند رہا ہوں۔ کبھی ایسی بات منہ سے نہیں نکالتا تھا کہ جس کا مجھے حق نہ ہو۔ اگر کوئی شخص میری کسی درخواست کو ٹھکرا دے تو مجھے سخت اذیت پہنچتی ہے۔ مجھے اس شخص پر غصہ نہیں آتا بلکہ اپنے اوپر غصہ آتا ہے کہ کیوں اپنی حیثیت پہچانے بغیر منہ سے بات نکال دی۔ التجا کر کے اپنی بات کھونا کہاں کی دانشمندی ہے۔

لیکن وحیدن سے کیوں کر کہتا کہ یہ کام میرے بس کا نہیں۔ انسان ہوں اور وہ بھی کمزور۔ سچ بول نہ سکا۔ جھوٹوں کہہ دیا کہ اچھا سوچوں گا۔ وحیدن تو بات کر کے چلی گئی اور میں واقعی سوچنے لگا۔ کبھی خیال آتا کہ بابو راؤ پٹیل سے کہوں۔ وہ اپنے رسالے فلم انڈیا میں وحیدن کی تعریف کرے۔ کبھی خیال گزرتا کہ محبوب، کاردار یا سہراب سے کہوں کہ وحیدن کو کسی فلم میں ہیروئن کا پارٹ دیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بات بھی مجھے جچتی نہ تھی۔ اپنی بات کی پچ رکھنے کے لیے میں نے راتوں کی نیند اپنے اوپر حرام کر لی۔ رات دن اس فکر میں غلطاں و پیچاں رہنے لگا کہ وحیدن کو ہیروئن کا پارٹ دلوانے کے لیے کیا صورت اختیار کی جائے۔ جسم کی اچھی، مگر رنگ کی کالی۔ اس کو ہیروئن کا پارٹ کیوں کر دلوایا جائے۔

آخر بہت سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ کوئی کہانی ایسی ڈھونڈ نکالی جائے یا لکھی جائے جس میں ہیروئن کا کردار وحیدن کی سج دھج اور چہرے بشرے سے ملتا جلتا ہو۔ سوچتے سوچتے مجھے علی بابا چالیس چور کا خیال آیا۔ اس میں مرجینا کا کردار تو یوں معلوم ہوا جیسے خاص وحیدن کا کردار ہو۔ اس خیال کا آنا تھا کہ میں سیدھا چمن لال ڈیسائی کے پاس گیا۔ ان کا اور سیٹھ چندولال کا اس زمانے میں بہت نام تھا۔ دونوں پرانے ''بزنس مین'' تھے اور پرانی وضع کے لوگ۔ چنانچہ جب میں چمن لال ڈیسائی کے پاس پہنچا تو وہ بے حد اخلاق سے پیش آئے۔ تمام اسٹوڈیو والوں کو میرے اردگرد یوں جمع کر دیا جیسے کوئی بہت بڑا آدمی آیا ہو۔ خیر جب خاطر تواضع اور باتوں کا طوفان ختم ہو گیا تو میں نے کہا سیٹھ تم نے بڑے بڑے ڈرامے فلمائے ہیں۔ علی بابا چالیس چور کا ڈرامہ فلماؤ، اس ڈرامے میں بڑی جان ہے۔ اور پھر مرجینا کے پارٹ کے لیے تو تمہارے پاس وحیدن بنی بنائی رکھی ہے۔ چمن لال میری بات سن کر بہت ہنسے اور بولے بہت اچھا۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ یہ بات تم نے میرے فائدے کے لیے کہی ہے یا وحیدن کے لیے۔ میں کیا کہتا۔ مجھے پسینہ آ گیا۔

چمن لال نے مجھے گومگو کے عالم میں دیکھا تو خود ہی کہا کہ کوئی بات نہیں، تم نے یہ بات وحیدن کے فائدے کے لیے کہی ہے لیکن اس میں میرا بھی فائدہ ہے۔ میں ضرور علی بابا چالیس چور فلماؤں گا۔ دو چار دن کے بعد چمن لال کی طرف سے علی بابا چالیس چور کے فلمانے کا اعلان اخبارات میں شائع ہو گیا اور اس بات کا بھی اعلان ہو گیا کہ مرجینا کا پارٹ وحیدن کریں گی۔ میں یہ اعلان پڑھ کر بہت ہی خوش ہوا۔ میں نے چمن لال ڈیسائی کو ٹیلی فون کیا اور شکریہ ادا کیا۔ چمن لال بولے اس میں شکریہ کی کوئی بات نہیں۔ تم نے ایک بات کہی میں نے مان لی۔ اب دعا کرو کہ اس کا انجام اچھا ہو۔ چمن لال کی بات سن کر مجھے کچھ حیرت ہوئی۔ میں نے پوچھا تمہیں اس کے انجام کے متعلق کچھ شک ہے۔ فرمایا نہیں۔ مجھے تو اس فلم میں کسی قسم کا نقصان نہ ہو گا لیکن ہیروئن کا پارٹ کرنا وحیدن کے لیے اچھا نہ ہو گا۔ میں نے پوچھا کیوں؟ فرمایا یہ نہ پوچھو۔ خیر علی بابا چالیس چور کو فلمانے کی تیاریاں زور و شور سے ہونے لگیں۔ تمام انڈسٹری میں اس فلم کی تیاری کا چرچا تھا۔ وحیدن ڈرامہ اٹھا کر میرے پاس لے آئی اور مجھ سے کہا کہ ریہرسل کرا دو۔

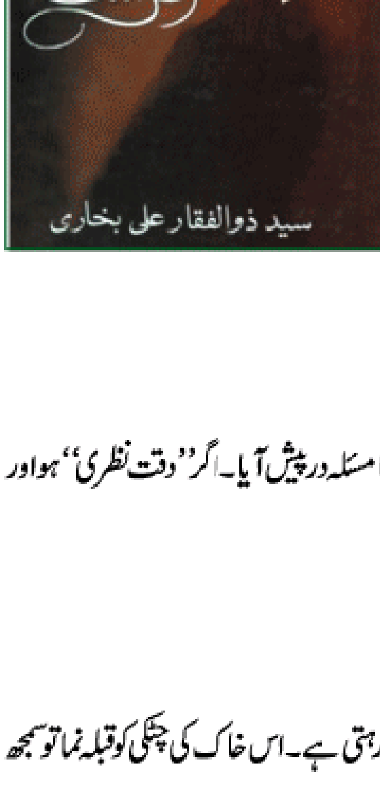
میں نے رات دن محنت کر کے وحیدن کو اس کا پارٹ سکھایا۔ وہ جب شوٹنگ کے لیے جاتی تو اسٹوڈیو والوں سے اپنے پارٹ کی خوب داد پاتی۔ مجھے چمن لال ڈیسائی نے اور وحیدن نے بیسیوں مرتبہ کہا کہ آ کر شوٹنگ دیکھو مگر میں وحیدن کی شوٹنگ دیکھنے کبھی نہیں گیا۔ میں اس لیے اس کی شوٹنگ دیکھنے نہیں گیا کہ اگر میرے سکھائے ہوئے پارٹ میں فلم کا ڈائریکٹر یا خود وحیدن شوٹنگ کے وقت کوئی تبدیلی کر دے تو میرے پیٹ میں مروڑ اٹھے گا۔ کوئی پانچ یا چھ مہینے کے بعد چمن لال ڈیسائی کی فلم علی بابا چالیس چور تیار ہوئی اور ملک کے سینماؤں میں دکھائی گئی۔ ملک کے ہر گوشے میں اس فلم کو سراہا گیا اور وحیدن کا پارٹ بے حد پسند کیا گیا۔ ہر طرف سے داد و تحسین کے ڈونگرے وحیدن پر برسنے لگے۔ داد و تحسین کے پھول اتنے برسے کہ ان کے نیچے وحیدن دب گئی اور ہمیشہ کی نیند سو گئی۔ چمن لال ڈیسائی نے مجھ سے کہا کہ میں نہ کہتا تھا کہ ہیروئن کا پارٹ وحیدن کے لیے اچھا نہ ہو گا۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

بدھ 23 اپریل 2014ء
روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

”فون پر بات کرنے والی خاتون کا معمہ ڈیڑھ برس بعد حل ہوا“

فیلڈن کا اصرار تھا کہ اجنبی خاتون سے ہونے والی گفتگو اسکرپٹ کی شکل میں محفوظ کرلوں-انکار پر معاملہ بیگم کے علم میں لانے کی دھمکی دیدی- ڈونگری میں بیٹھی مجذوبہ نے اس ایرانی خاتون سے ملادیا- زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



میں نے ایک بار اپنے کسی مضمون میں ”دقت نظر“ استعمال کیا تھا۔ کاتب نے کہا ”دقت نظر“ کیا؟ بخاری بہک گیا ہے۔ درحقیقت اس کا مطلب ”وسعت نظر“ ہے۔ چنانچہ اس میرے بہی خواہ نے ”دقت نظر“ کو ”وسعت نظر“ بنا دیا۔ اس نیک دل انسان کو کیا معلوم کہ بخاری کی ساری عمر ”دقت نظر“ اور ”وسعت نظر“ کے جھگڑے میں کٹ گئی ہے۔

”یہ بلائے حسن کہاں نہیں مگر اپنے واسطے قحط حسن
تمہیں کیا بتاؤں نظر کے ساتھ جو وقت نظر رہی“

دنیا میں حسن کی کمی نہیں۔ جدھر دیکھو حسن ہی حسن ہے۔ مگر صرف ان لوگوں کے لیے جن کو خدا نے وسعت نظر عطا فرمائی ہے۔ مثلاً داغ۔

”الٰہی کیسی کیسی صورتیں تو نے بنائی ہیں
کہ ہر صورت کلیجے سے لگا لینے کے قابل ہے“

جو حسن نظر آیا، اسی سے عشق کر کے جی بہلایا۔ چلو نہ رات کی نیند حرام ہوئی نہ دن کا چین گیا اور نہ انتخاب کا مسئلہ درپیش آیا۔ اگر ”دقت نظری“ ہو اور انتخاب کا قضیہ آپڑے تو پھر حالی کی ہمنوائی کرنا پڑتی ہے۔

”ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں“

اسی وقت نظر کا مارا بیٹھا ہوں۔ خاک کی چٹکی پر اکسیر کا گمان کر کے قناعت تو کر لیتا ہوں مگر نگاہ انتخاب مچلتی رہتی ہے۔ اس خاک کی چٹکی کو قبلہ نما تو سمجھ لیتی ہے، قبلہ ماننے پر تیار نہیں ہوتی۔

”ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود!
قبلے کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں“

نتیجہ یہ ہوا کہ دوست یکے بعد دیگرے میری زندگی میں آتے رہے اور قبلہ نمائی کا فرض ادا کر کے اپنی اپنی راہ لیتے رہے۔ بعد میں آنے والا ہر دوست پہلے دوست کی بتائی ہوئی منزل سے آگے لے جاتا رہا، حتیٰ کہ وہاں آپہنچا ہوں جہاں آج ہوں۔ اب تھک گیا ہوں۔ اب سمجھ لیا ہے اور یقین سا ہو گیا کہ بس اس سے آگے ھو کا میدان ہے۔ اللہ بس باقی ہوس!

حسن تو وہی رہتا ہے البتہ دیکھنے والے کی نگاہ بدل جاتی ہے۔ اگر نگاہ نہ بدلے اور انسان ایک ہی دوست پر اکتفا کرے تو یوں سمجھیے کہ انسان ساری عمر ایک ہی کتاب پڑھتا رہے۔ اب ایسی کتاب تو قسمت والوں کے ہاتھ آتی ہے کہ جب پڑھو اس میں کوئی نیا نکتہ نظر آئے۔ یعنی معاملہ کچھ ایسا ہو کہ۔

”حدیث دل کش و افسانہ از افسانہ می خیزد
دگر از سر گرفتم قصہ زلف پریشاں را“

نظیری کا ایک شعر ہے:

”شماری تا سحر دستم بہ زلف درہمی دارد!
گریبانم گریبانست و دامن و دامن ست امشب“

آج کی رات میرا دامن بھی صحیح وسلامت ہے اور میرا گریبان بھی، کیونکہ میرے ہاتھ کسی کی زلف پریشاں کو سلجھانے میں لگے ہوئے ہیں۔

خوش قسمت ہیں وہ ہاتھ جو کسی زلف پریشاں کے سلجھانے میں لگے رہیں۔ میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں کیونکہ میرے ہاتھ بھی ہمیشہ کسی نہ کسی کی زلف پریشاں کو سلجھانے میں مصروف رہے ہیں۔ آج ایسی ہی ایک زلف پریشاں کا ذکر کرتا ہوں جس نے مجھے اپنے سلجھانے میں لگائے رکھا اور مہلت نہ دی کہ اپنا گریبان پھاڑوں یا دامن چاک کروں۔

میں ایک رات اپنے کمرے میں بستر پر دراز کتاب پڑھ پڑھ کر نیند کو بلا رہا تھا۔ کوئی گیارہ ساڑھے گیارہ کا عمل ہوگا۔ دن کے تمام ہنگامے سو گئے تھے۔ سمندر کی لہروں کی آواز تھی، کتاب تھی اور میں تھا کہ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ایک عورت کی آواز تھی۔

میں آواز سن کر بولنے والے کا کردار، یہاں تک کہ اس کی شکل وصورت کا بھی اندازہ لگا لیتا ہوں۔ میں نے یہ آواز سنی تو اندازہ لگا لیا کہ بولنے والی خاتون ایرانی ہے، لمبے قد کی ہے، عمر کوئی تیس بتیس سال، تعلیم واجبی مگر خاندان مذہب کا دلدادہ۔ میں نے کہا فرمایئے آپ کا اسم گرامی۔ فرمایا تم کو نام نہیں بتایا جائے گا البتہ تم سے ہر شام کو ٹیلی فون پر باتیں کی جائیں گی۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تم وعدہ کرو کہ ہمارے متعلق یہ دریافت کرنے کی کوشش نہ کرو گے کہ ہم کون ہیں؟ کہاں رہتے ہیں؟ ہمارا ٹیلی فون نمبر کیا ہے؟ اگر تم نے کبھی ہمارے متعلق کچھ بھی دریافت کرنے کی کوشش کی یا ہم کو دیکھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے تو ہم گفتگو کا یہ سلسلہ بند کر دیں گے۔ کیا بتاؤں کہ اس آواز میں کتنی جاذبیت تھی۔ کتنا تحکم تھا، کتنی خوداعتمادی تھی۔ میں نے وعدہ کر لیا۔

اب ہر وقت شام کو ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی اور ہم باتیں کرتے۔ ان باتوں میں عشق بازی کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔ ”ہم نے وہ فلم دیکھا“، ”ہم نے تم کو وہاں دیکھا“، ”ہم نے تم کو مارکیٹ میں سودا خریدتے دیکھا“، ”ہم نے تم کو فلاں دن فلاں شخص کے ساتھ دیکھا“۔ وہ میری بیوی اور بچوں کے نام جانتی تھی۔ مگر مجھے اس کے بچوں کا نام معلوم نہ تھا۔ یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس کا خاوند کون ہے؟ نہ وہ بتائیں نہ میں۔ اپنے وعدے سے مجبور، کس سے دریافت کروں۔ ڈیڑھ برس تک یونہی ٹیلی فون پر باتیں ہوتی رہیں۔ اس گفتگو میں خدا جانے کیا بات تھی کہ مجھے دن بھر شام کا انتظار رہتا اور اگر کبھی ٹیلی فون کی گھنٹی کے بجنے میں دیر ہو جائے تو میں بے چین ہو جاتا۔ دعائیں مانگتا کہ اس کا ٹیلی فون خراب نہ ہو۔ خود اپنے ٹیلی فون کا بھی جائزہ لیتا رہتا کہ کم بخت خراب تو نہیں۔

اور تو سب کچھ درست مگر اس ٹیلی فون بازی کے باعث میرا گھر سے نکلنا دشوار ہو گیا۔ ویسے میں باہر جانے کو جاتا مگر کوشش یہی کرتا کہ ٹیلی فون کے وقت تک گھر واپس آجاؤں۔ چنانچہ کسی کے یہاں جاؤں تو جم کر بیٹھ نہ سکتا تھا۔ اکھڑا اکھڑا سا رہتا تھا۔ کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اس ٹیلی فون نے مجھے کتنی ہرزہ گردیوں سے مامون رکھا، کتنی الجھنوں سے نجات دلوائی، کتنی بری صحبتوں سے بچایا۔ میں نے پہلے ہی عرض کر دیا تا کہ اگر ہاتھ کسی زلف کے سلجھانے میں لگے رہیں تو نہ گریبان پھٹتا ہے نہ دامن چاک ہوتا ہے۔

میری اس ٹیلی فون دوستی کا علم حبیب تنویر کو بھی تھا اور فیلڈن کو بھی۔ دونوں کئی مرتبہ اصرار کر چکے تھے کہ ٹیلی فون پر بات کر چکنے کے بعد تمام گفتگو کو قلمبند کر لیا کرو۔ ان کا خیال تھا کہ یہ گفتگو عجیب وغریب مکالمے کی صورت اختیار کرے گی اور کسی ماہر نفسیات کے لیے تحقیق وتدریس کا بیش بہا خزانہ ہوگا۔

بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب کبھی کوئی کھانے پینے کی چیز آپ کو پیش کریں، ساتھ ہی اس کے طبی فوائد بھی بیان کر دیتے ہیں۔ یہ ساگ کھاؤ، معدے کے لیے اچھا ہے۔ شربت پیو، مفرح قلب ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ جب کبھی کوئی شخص اچھی خاصی کھانے پینے کی چیز کو دوا بنا کر پیش کرے تو میرا جی اس چیز سے اچاٹ ہو جاتا ہے۔ میں شربت پینا چاہتا ہوں نسخہ استعمال کرنا نہیں چاہتا۔ ساگ کھانا چاہتا ہوں سونف نہیں کھانا چاہتا۔

کچھ اسی قسم کے جذبے کے تحت میں نے حبیب اور فیلڈن کی تجویز کو ہر بار ٹھکرا دیا۔ یہ لوگ میرے نزدیک اچھی خاصی دل خوش کن اور بے لوث گفتگو کو مادی رنگ دینا چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ میں یہ گفتگو قلم بند کرلوں، چھپواؤں اور پیسے کماؤں۔ لاحول ولاقوۃ۔ یا تو ان لوگوں میں شے لطیف کی کمی تھی یا اس شے لطیف کو سمجھنے سے قاصر تھے جو میں اس گفتگو سے اخذ کر رہا تھا۔ خدا جانے میرے انکار کے باعث یا کسی اور جذبے کے ماتحت فیلڈن برہم ہو گیا۔ بات بات پر لڑائی، بات بات پر جھگڑا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مجھے دھمکیاں دینے لگا کہ اگر تم نے ٹیلی فون پر گفتگو کا یہ سلسلہ منقطع نہ کیا تو میں تمہارے بیوی کو یہ سب حال بتا دوں گا۔

یہ میری دکھتی رگ تھی۔ میں نے دیدہ ودانستہ آج تک کوئی بات ایسی نہیں کی جس سے میری بیوی کو کسی قسم کا صدمہ پہنچے۔ جس نے ساری عمر کوئی صدمہ نہ پہنچایا ہو اس کو صدمہ پہنچاتے ہوئے دل ڈرتا ہے۔ میں کسی کی گیدڑ بھبکیوں میں ذرا کم ہی آتا ہوں مگر فیلڈن منہ پھٹ اور منہ زور۔ میں نے دل میں کہا نہ جانے کیا لگائی بجھائی کرے، بہتر یہی ہے کہ خود ہی بیوی کو اس طویل ٹیلی فون گفتگو کا حال سنا دوں۔ یہ ارادہ تو کر لیا لیکن یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ سناؤں تو کیا سناؤں۔ ڈیڑھ سال کی گفتگو کے ماحصل کو دو چار منٹوں میں کیوں کر بیان کروں اور وہ بھی اس طرح کہ لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ حاشا وکلا ہماری گفتگو میں کوئی بات ایسی تو تھی ہی نہیں کہ جس کے ظاہر ہو جانے سے مجھے کسی قسم کی شرمندگی ہو۔ مگر یہ شرمندگی تھوڑی ہے کہ ڈیڑھ سال سے ایک اجنبی خاتون سے نہایت انہماک کے ساتھ مصروف گفت وشنید ہوں اور بیوی کو کانوں کان خبر نہیں۔ میں نے مناسب یہی سمجھا کہ بیوی ہماری گفتگو سن لے، تا کہ اس کو یہ اندازہ ہو جائے کہ یہ گفتگو ہے کس سطح کی۔ اس کے بعد میرے لیے معاملہ کو سمجھانا اور سلجھانا آسان ہوگا۔

میں نے ٹیلی فون کے منیجر سے کہہ سن کر اپنے گھر کے ٹیلی فون کی دو شاخیں کر لیں۔ ایک ٹیلی فون بیوی کے کمرے میں اور ایک میرے کمرے میں۔ میں نے حبیب تنویر کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور اس سے کہہ رکھا تھا جب کبھی موقع ملے، میری بیوی کو یہ گفتگو سنوا دینا۔ ایک دن ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو حبیب نے میری بیوی والے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا اور کچھ دیر ہماری باتیں سننے کے بعد ریسیور میری بیوی کے کان سے لگا دیا۔ وہاں بات چیت یہ ہو رہی تھی۔

وہ: یہ بھی آخر کوئی بات ہے کہ صبح ساڑھے چھ بجے دفتر......!

میں: اری پگلی دفتر سات بجے شروع ہوتا ہے، اس لیے میں......!

وہ: سا بجے دفتر شروع نہیں ہوتا پروگرام شروع ہوتا ہے......

میں: میں بھی تو یہی کہہ رہا تھا کہ......

وہ: نہیں تم نے دفتر کہا تھا......

میں: افوہ...... مراد میری یہ تھی کہ پروگرام سات بجے شروع ہوتا ہے، اس لیے مجھے سات بجے سے پہلے ہی پہنچنا ہوتا ہے۔

وہ: جی ہاں...... اس لیے کہ پروگرام میں سب سے پہلے ورزش کا پروگرام ہوتا ہے۔

میں: جی ہاں۔

وہ: اور تم ورزش کرتے ہو؟

میں: جی ہاں!

وہ: کیوں؟

مجھے بیوی کے کمرے سے قہقہہ سنائی دیا۔ اس خاتون نے بھی قہقہہ سن لیا اور ٹیلی فون بند کر دیا۔

میں بیوی کے کمرے میں گیا۔ حبیب اور میری بیوی اس قدر زور زور سے ہنس رہے تھے کہ ان کی بتیسی نظر آرہی تھی۔ میں شرمندہ اور محجوب کھڑا تھا۔ ماتھے پر پسینہ، ٹانگوں میں ہلکا ہلکا رعشہ! میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ میری بیوی بولیں۔ بس ڈیڑھ برس میں گفتگو یہیں تک پہنچی۔ اور اس کے بعد ایک اور زور کا قہقہہ بلند ہوا اور تمام معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ میں نے فیلڈن کو یہ واقعہ سنایا اور کہا کہ چلو صاحب جو جی چاہے کر لو۔ فیلڈن خاموش ہو گیا۔ بس کہا تو یہ کہا کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ مشرقی خاتون کا کردار مغرب والوں کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا۔

اگلے دن اس خاتون کا ٹیلی فون آیا۔ مجھ سے کیفیت طلب ہوئی۔ میں نے تمام قصہ فیلڈن اور حبیب کا اور ٹیلی فون کی دو شاخوں کے لگوانے کا بیان کر دیا۔ مجھے کچھ سسکیوں کی آواز آئی اور پھر یہ الفاظ کہ اب سے ٹیلی فون کا سلسلہ بند۔ میں بہتیرا کہتا رہا کہ اچھا اپنا نام تو بتاؤ مگر ٹیلی فون تو بند ہو چکا تھا۔

بمبئی میں میرے ایک دوست تھے ڈاکٹر صادق۔ انہوں نے پشاور میں تعلیم پائی تھی۔ بعد میں جرمنی چلے گئے۔ وہاں سے ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ہندوستان آئے۔ اب کراچی میں ہیں۔ خدا انہیں خوش رکھے، ہمیشہ کرم کرتے ہیں۔ دنیا بدل گئی مگر ان کی دوستی میں فرق نہیں آیا۔

بمبئی میں ڈونگری کے قریب بچو بھائی بلڈنگ میں ان کا مطب تھا۔ میں اکثر ان سے ملنے جایا کرتا۔ اور پھر آپ جانیں، جب ڈاکٹر دوست ہو تو کوئی نہ کوئی بیماری انسان اپنے آپ میں ایسی ڈھونڈ نکالتا ہے جس کے لیے دوا کی ضرورت ہو۔ چنانچہ ڈاکٹر صادق سے باتیں بھی کرتا اور ایک آدھ بوتل کسی نہ کسی دوا کی بھی لے آتا۔ بچو بھائی بلڈنگ کے قریب ہی ایک دیوانی بیٹھی رہتی تھی۔ اس کے پاس آکر میں رک جایا کرتا تھا اور اس کی مجذوبانہ باتوں سے تسکین قلب پاتا تھا۔ اس کے گرد اکثر عورتوں اور مردوں کا ہجوم رہتا تھا۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ میں جاؤں اور ہجوم کے پاس راستہ نہ پاؤں تو یہ کسی نہ کسی طرح مجھے دیکھ لیتی اور زور سے چلاتی، ریڈیو والا آیا، ریڈیو والا آیا، ہٹو ہٹو جاؤ، جاؤ۔ یہ لوگ آواز سن کر چھٹ جاتے اور مجھے آگے بڑھنے کے لیے راستہ دیتے۔ جتنی دیر میں اس سے باتیں کرتا لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتا۔ مراد میری یہ کہ لوگ حیرت سے مجھے دیکھتے کہ اس مجذوبہ دیوانی کے حضور میں اس ریڈیو والے مغرب زدہ انسان کی اتنی رسائی کیونکر ہو گئی۔

ایک دن یہ دیوانی مائی میرے آنے کے بعد سب پر چلائی اور سب سے کہا کہ چلے جاؤ۔ میں بھی جانے لگا تو مجھ سے کہا نہیں تم ٹھہرو۔ میں رک گیا۔ میرے ہاتھ میں ڈاکٹر صاحب کی دی ہوئی دوا کی بوتل تھی۔ کہا، پھینک دو۔ میں نے پھینک دی۔ کہا، اللہ اللہ کرو، تم بیمار نہیں ہو۔ اتنے میں دو چار عورتیں سیاہ چادروں میں ملبوس، اس دیوانی کی طرف آتی دکھائی دیں، لیکن آتے آتے فوراً پلٹ گئیں۔ دیوانی نے چلا کر انہیں بلایا۔ وہ کچھ دیر تو جھجکیں اور پھر آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی ہوئی دیوانی کی طرف آئیں۔ میں اپنا سر نیچے ڈالے بیٹھا تھا۔ میں نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا کہ کون ہے۔ جب وہ خواتین بیٹھ گئیں تو دیوانی بولی۔ سب اچھا ہو جائے گا، بچہ بھی اچھا ہو جائے گا، ریڈیو والا بھی اچھا ہو جائے گا۔ ریڈیو والے نے دوا پھینک دی ہے۔ وہ عورتیں بدستور خاموش تھیں۔ مجھے خیال گزرا کہ مجھ مرد کی موجودگی میں کھل کر بات نہیں کر سکتیں، مجھے یہاں سے چل دینا چاہیے۔ میں اٹھنے لگا تو دیوانی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا بیٹھو، نہ جاؤ۔ میری جان بڑی مشکل میں تھی۔ میں نے پلٹ کر ان خواتین سے معافی چاہی کہ میری موجودگی کے باعث آپ کی بات چیت میں کھنڈت پڑ رہی ہے۔ ان خواتین پر میری نظر پڑی تو ایک چہرے پر آکر رک گئی۔ مجھے یقین سا ہو گیا کہ یہ وہی خاتون ہے جو ڈیڑھ برس تک ٹیلی فون پر مجھ سے باتیں کرتی رہی ہے۔ اب تو اگر مجھ سے دیوانی بھی کہتی کہ چلے جاؤ تو میں نہ جاتا۔ میرے پاؤں گڑ گئے اور میں نے دل میں کہا، آج جو ہو سو ہو۔ یہ ٹیلی فون والا راز معلوم کر کے جاؤں گا۔ میں جانتا تھا کہ یہ خواتین ایرانی ہیں۔ میں نے فارسی میں کہا کہ میں شرمندہ ہوں کہ میرے باعث آپ کو خاموشی اختیار کرنی پڑی۔ ان میں ایک بولیں، بھائی تم ہم کو شرمندہ کر رہے ہو۔ ہمارے باعث تمہاری گفتگو میں کھنڈت پڑی۔ غرض کہ دو چار منٹ ایرانی اخلاق کا مظاہرہ ہوتا رہا۔ جب میری کچھ ہمت پڑی تو میں نے پوچھا آپ دو عورتیں تو مجھ سے مخاطب ہیں، یہ تیسری خانم نے چپ شاہ کا روزہ کیوں رکھ چھوڑا ہے۔ کیا ان کی آواز میری جانی پہچانی تو نہیں۔ اس پر وہ خاتون وہی ٹیلی فون والے انداز میں بولیں، ”تمہارا سر“۔ ہم سب بہت زور سے ہنسے۔ وہ دیوانی بھی۔ دیوانی ہنستے ہنستے بولی، بس جاؤ۔ ہم سب روانہ ہوئے۔ گاڑی ان کے پاس بھی تھی اور میرے پاس بھی۔ ان کی گاڑی ڈرائیور چلا رہا تھا اور میں اپنی گاڑی کا خود کوچبان تھا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ سب میری گاڑی میں سوار ہوں اور میں ان کو گھر پہنچاؤں۔ یہ خواتین مجھے اپنے گھر لے گئیں۔ اپنی والدہ اور اپنے بھائیوں سے ملایا۔ پھر سب سوائے والدہ کے اٹھ کر ہمارے گھر آئے۔ ڈیڑھ سال کا اسرار کھلا۔ میری بیوی نے شام تک سب کو مہمان رکھا۔ اس کے بعد تو کچھ ایسی رسم وراہ بڑھی کہ میری بیوی اور یہ تینوں بہنیں یک جان اور چار قالب ہو گئیں۔ دو بہنوں کا انتقال ہو گیا ہے۔ والدہ کا بھی۔ تیسری بہن ابھی زندہ ہے، خدا اسے زندہ رکھے۔ اب کیا بتاؤں اس کا کیا نام ہے۔ جس طرح میں نے دریافت کیا اس طرح اگر آپ بھی دریافت کریں تو کچھ لطف آئے۔ میرے بتا دینے سے کیا خاک لطف آئے گا۔ (جاری ہے)

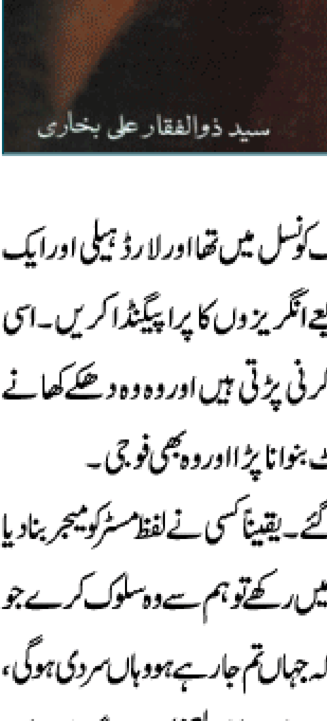
☆☆☆☆☆

جمعرات/24 اپریل 2014ء

روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

"دوسری جنگ عظیم میں برطانوی فوجی میجر کی حیثیت سے حصہ لیا"

جنوری 1940ء میں یورپ کے محاذ جنگ کو دیکھنے کا موقع ملا-فرانس میں اتحادیوں کے جنگی ہیڈکوارٹرز کے سربراہ جنرل لارڈ گاٹ میرے شاگرد رہ چکے تھے-جنگی نامہ نگار مجھ پر رشک کرنے لگے- یورپی اخبارات نے عزت بخشی- زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



جنگ کا زمانہ، لندن شہر، جوائنٹ براڈ کاسٹنگ کونسل، برطانوی وزارت اطلاعات، 1940ء جنوری کا مہینہ اور یہ خاکسار۔ عجب بے سروسامانی کا عالم تھا۔ جب وہ زمانہ یاد آتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ انگریزوں نے لڑائی جیتی تو کیونکر۔ ان کی بے سروسامانی کا اندازہ صرف اس ایک بات سے لگا لیجئے کہ ہم ہوم گارڈ میں بھرتی ہوئے تو ہم کو بندوق بھی ملی اور گولیاں بھی، لیکن بندوق الگ نمونے کی تھی اور گولیاں الگ نمونے کی! وہ گولیاں اس بندوق میں بھری ہی نہ جا سکتی تھیں! حکم یہ بھی تھا کہ بندوق کے ساتھ پریڈ صرف ہفتے میں ایک دن کی جائے۔ ہفتے کے باقی دن حکم تھا ڈنڈوں سے پریڈ کرو۔ انگریز بلا کی قوم ہے۔ اس تیزی، سرعت اور محنت سے اس نے جنگی تیاری کی کہ جرمنی کی پچیس سال کی تیاری کو مات دے کر دم لیا۔

جنوری 1940ء میں مجھے بی بی سی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ میں برطانیہ کی وزارت اطلاعات کی جوائنٹ براڈ کاسٹنگ کونسل میں تھا اور لارڈ ہیلی اور ایک خاتون ہیلڈا میتھیوسن کے ساتھ اس ادھیڑبن میں لگا ہوا تھا کہ کسی نہ کسی طرح دوست ملک اپنے ریڈیو کے ذریعے انگریزوں کا پراپیگنڈا کریں۔ اسی سلسلے میں مجھے حکم ملا کہ یورپ کے محاذ جنگ پر جاؤ۔ کسی غیر فوجی کا محاذ جنگ پر جانا آسان نہیں۔ وہ وہ تیاریاں کرنی پڑتی ہیں اور وہ وہ دھکے کھانے پڑتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ جو پاسپورٹ ہم اٹھائے پھرتے تھے، محاذ جنگ کے لیے بے کار ثابت ہوا۔ نیا پاسپورٹ بنوانا پڑا اور وہ بھی فوجی۔ اس پاسپورٹ کو دیکھا تو تعجب ہوا۔ اس میں تحریر تھا کہ یہ شخص میجر کا درجہ رکھتا ہے۔ ہم کو بہت ہنسی آئی کہ ہم میجر کیسے ہو گئے۔ یقیناً کسی نے لفظ مسٹر کو میجر بنا دیا ہے۔ لیکن دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ غلطی نہیں۔ یہ عہدہ ہم کو اس لئے دیا گیا ہے کہ اگر ہم کو دشمن گرفتار کر لے اور اپنی قید میں رکھے تو ہم سے وہ سلوک کرے جو میجر کے شایان شان ہوتا ہے۔ روٹی کپڑا تنخواہ وغیرہ قید کے دوران میں میجر کی اور اگر قید نہ ہو تو مسٹر کی۔ ہم سے کہا گیا کہ جہاں تم جا رہے ہو وہاں سردی ہوگی، اس لئے موٹے کپڑے بنواؤ۔ لندن میں ایک بہت مشہور دکان ہے، جس کا نام ماس برادرز ہے۔ یہ دکان لندن کی سبزی منڈی یعنی کاوینٹ گارڈن میں ہے۔ میں اس دکان کو لندن کے عجائبات میں سمجھتا ہوں۔ یہاں بنے بنائے کپڑے بکتے ہیں اور کرائے پر بھی دیئے جاتے ہیں۔ لندن کے بڑے بڑے روسا اس دکان سے خاص خاص تقریبات کے لیے کپڑے کرایہ پر لیتے ہیں۔ کسی کے جنازے میں شرکت کرنی ہو یا بکنگھم پیلس کی چائے کی دعوت میں شریک ہونا ہو تو فاختئی رنگ کا فراک کوٹ، ٹاپ ہیٹ، خاص واسکٹ، خاص طرز کی پتلون، کالے جوتے، فاختئی نکٹائی، سفید قمیص اور سفید یا فاختئی دستانے پہن کر جانا پڑتا ہے۔ یہ سب لباس ماس برادرز کے یہاں سے کرایہ پر ملتا ہے۔ زندگی میں شادی تو انسان ایک آدھ مرتبہ ہی کرتا ہے۔ اس ایک آدھ مرتبہ کی شادی کے لیے خاص کپڑے کون بنوائے۔ انگریز سیدھا ماس برادرز پہنچتا ہے، شادی کے کپڑے کرائے پر لیتا ہے اور دولہا بنتا ہے۔ ہماری طرح نہیں کہ شادی کے لئے پہلے تو پوت کی شیروانی بنوائی اور پھر آخر میں اس شیروانی کو کاٹ کر بیوی کا کرتا اور ننھے کا پاجامہ سلوایا۔ فلموں کے فالتو یعنی ایکسٹرا ایکٹر کو ایک آدھ دن کے لیے اگر پارٹ کرنا ہو تو اسی ماس برادرز سے کپڑے کرایہ پر لیتے ہیں۔ کمال ان کرائے کے کپڑوں میں یہ ہے کہ یہ کرائے کے نظر نہیں آتے۔ ہزاروں وضع قطع اور سینکڑوں مختلف جسموں کے کپڑے یہاں موجود رہتے ہیں۔ صاف ستھرے ایسے کہ بالکل نئے نظر آتے ہیں۔ یعنی ان کرایہ کے کپڑوں کو پہن کر کوئی شخص کرائے کا نظر نہیں آتا۔ مجھے کپڑوں کی جلدی تھی، میں بھی اسی دکان پر پہنچا۔ معلوم ہوا کہ جنگ کے محاذ پر جانے والوں کو کرائے پر کپڑے نہیں ملتے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر جنگ میں کام آ جائیں تو کپڑے کس سے واپس لیے جائیں گے۔ ہمیں مشورہ دیا گیا کہ نئے بنے بنائے کپڑے خرید لو۔ اس زمانے میں بنے بنائے کپڑے خریدنا ذرا معیوب بات تھی۔ بڑے لوگ اپنے جسم کے مطابق بنوا کر پہنتے تھے۔ بنے بنائے کپڑے پہننا چھوٹے لوگوں کا وتیرہ تھا۔ میں تھا تو چھوٹا، لیکن بڑے لوگوں کے زمرے میں شریک ہونا چاہتا تھا، اس لئے میں نے بھی بنے بنائے کپڑے پہننا اپنے لئے معیوب سمجھ رکھا تھا۔ یہ بنے بنائے کپڑے پہننے کی توبہ درحقیقت امریکہ میں جا کر ٹوٹی۔ مغرب میں کپڑے بنوانے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنے کسی خوش پوش دوست سے کہتے ہیں کہ مجھے اپنے درزی سے متعارف کرا دو۔ میں جب امریکہ گیا تو میں نے بھی اپنے ایک دوست سے کہا کہ مجھے کچھ سوٹ سلوانے ہیں، مجھے اپنے درزی سے متعارف کرا دو۔ میرا یہ دوست یہودی تھا۔ زرمین اس کا نام تھا۔ ایم جی ایم میں انتظامی امور اس کے سپرد تھے۔ معقول تنخواہ پاتا تھا اور ویسے بھی گھر کا امیر تھا۔ جب میں نے کہا کہ اپنے درزی سے متعارف کرا دو تو مجھے حیرت سے دیکھنے لگا اور کہا میاں ہوش کی دوا کرو۔ یہ امریکہ ہے۔ یہاں لوگ بنے بنائے کپڑے پہنتے ہیں۔ میں نے کہا تم بھی؟ کہا ہاں، یہ کپڑے جو میں نے پہن رکھے ہیں بنے بنائے ہیں۔ یہاں کپڑے یا تو راک فیلر سلواتا ہے یا فلم کے بڑے بڑے لکھ پتی ایکٹر۔ خیر کپڑے تو میں نے بنے بنائے خرید لئے مگر خدا جانے کیوں یہ دھن سوار ہوئی کہ اس درزی کو دیکھوں گا جو راک فیلر کے کپڑے سیتا ہے۔ بمشکل تمام اس درزی کا پتہ لگایا اور اس سے کہا کہ میاں میں کپڑے سلوانے نہیں آیا، صرف تم سے ملنے آیا ہوں۔ کیونکہ تم امریکہ کے عجائبات میں سے ہو۔ یہ درزی بہت تپاک سے ملا۔ مجھے اپنے دکان کے تمام محکمے دکھائے۔ ایک کمرے میں ہم گئے تو دیکھا کہ کئی ایک مجسمے پڑے ہیں مگر ایک ہی آدمی کے۔ کسی مجسمے میں وہ آدمی کرسی پر بیٹھا دکھایا گیا ہے۔ کسی میں کھڑا ہے، کسی میں جھکا ہوا ہے، کسی میں اس نے باہیں اٹھا رکھی ہیں۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ فرمایا راک فیلر کے مجسمے ہیں۔ انہیں پر کپڑے کاٹتا ہوں اور انہیں کو پہنا کر دیکھتا ہوں کہ درست و چست ہیں یا نہیں۔ راک فیلر کو اتنی فرصت کہاں کہ یہاں آئے اور کپڑے پہن کر دیکھے کہ ٹھیک ہیں یا نہیں۔ ہاں، میں نے ماس برادرز سے بنے بنائے کپڑے خریدے۔ برجس، موٹا کوٹ، اوورکوٹ، دستانے، گلوبند، موٹی موٹی قمیص، جرابیں، ان دنوں سرکار بڑی فیاض تھی۔ ان تمام کپڑوں کا بل سرکار نے ادا کیا۔ کپڑے خریدنے کے بعد میں وزارت جنگ میں گیا۔ یہاں مجھے فولاد کا ٹوپ اور گیس ماسک دیا گیا کہ گولی چلے تو فولاد کا ٹوپ پہنوں اور دشمن زہریلی گیس چھوڑے تو منہ پر ماسک کا توبڑا چڑھا لوں۔ اب میں اپنا سوٹ کیس اور ٹوپ اور گیس ماسک اٹھائے وکٹوریہ اسٹیشن پر فوجی ٹرانسپورٹ کے دفتر میں گیا۔ انہوں نے میرے تمام کاغذات دیکھے، سامان دیکھا اور کہا کہ ٹھیک ہے، اب تم کہیں نہیں جا سکتے، یہیں بیٹھے رہو۔ میں نے کہا گاڑی کب چلے گی؟ فرمایا "چپ"۔ میں نے کہا ہم کہاں جائیں گے؟ فرمایا "خاموش"۔ توبہ ایسا بھی کیا راز۔ مگر اس دفتر میں سب نے چپ شاہ کا روزہ رکھ چھوڑا تھا۔ میں نے کہا بیکار بیٹھا کیا کروں۔ باہر نکلا اور ایک کتاب خرید لایا۔ میرے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر ایک فوجی لپکا۔ کتاب کتاب؟ کیسی کتاب؟ کیا کتاب؟ انہوں نے میرے ہاتھ سے کتاب لی اور ادھر ادھر سے دیکھا اور واپس کر دی یعنی اجازت دے دی کہ پڑھو۔ شام کے کوئی سات بجے ہوں گے کہ ہم سے کہا گیا کہ چلو کھانا کھاؤ۔ ساڑھے سات بجے سے پہلے پہلے ختم کر دو۔ خیر جلدی جلدی کھانا کھایا۔ لوٹ کر دفتر میں آئے تو حکم ملا کہ اٹھاؤ سب اپنا اپنا سامان۔ سب نے سامان اٹھایا، کسی نے کندھے پر اور کسی نے کمر پر۔ ہم سب کو گاڑی کے ڈبے میں بند کر دیا گیا۔ اب گاڑی ہے کہ چلنے کا نام نہیں لیتی۔ میں تو بیٹھا بیٹھا اونگھنے لگا اور پھر بلاتکلف سو گیا۔ کوئی دس بجے کے قریب گاڑی میں انجن لگا اور گاڑی روانہ ہو گئی۔ کوئی بارہ بجے قریب ہم ایک اسٹیشن پر پہنچے۔ میں نے ایک صاحب سے پوچھا، بھیا اس اسٹیشن کا کیا نام ہے؟ فرمایا "چپ"۔ خیر یہ ایک شہر تھا۔ معلوم ہو ہی گیا کہ یہ فوکس ٹن ہے۔ نہایت ہی بدصورت اور بھونڈا شہر۔ یہ انگلستان کی ایک بندرگاہ ہے۔ یہاں بھی ہم کو حکم ملا کہ اٹھاؤ اپنا سامان اور سوار ہو جاؤ جہاز پر۔ یہ جہاز کیا تھا، نہانے کا ٹب تھا۔ میں نے جنگی جہاز اتنا چھوٹا کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کا نام برٹنی تھا۔ ہوگا کوئی پچاس آدمیوں کے لیے۔ لیکن ہم کئی سو آدمی اس پر سوار ہوئے۔ برآمدے میں جھولے لٹک گئے۔ ایک ایک کیبن میں چھ چھ آدمی۔ واقعی اس جہاز پر کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ غسل خانوں اور پاخانوں کے باہر اہل حاجت کی قطاریں ہمیشہ لگی رہتی تھیں۔ بالکل اس طرح جیسے سینما کے باہر ٹکٹ کے لیے قطاریں لگی ہوتی ہیں۔ ہر طرف گندگی اور ہر طرف غلاظت۔ چلتے جہاز میں تو غلاظت سمندر میں پھینک دی جاتی تھی لیکن جہاز نے لنگر ڈال رکھا ہو تو غلاظت کہاں پھینکی جائے۔ اب ہمارا جہاز ہے کہ چلنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ تمام رات مارے سڑاند کے برا حال ہو گیا۔ جالی کا جھولا، دو کھمبوں سے باندھ دیا گیا، اس میں ہم لیٹ گئے اور ساری رات "جھولا کن ڈالو امریاں" گاتے رہے۔ میں سحر خیزی کا بہت قائل ہوں۔ میری عادت ہے کہ صبح پانچ بجے کے قریب اٹھ بیٹھتا ہوں۔ یہاں پانچ کیا ساڑھے سات بجے گئے، مگر سب کے سب دنیا و مافیہا سے غافل سو رہے تھے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور سیدھا بیت الخلا کا رخ کیا لیکن بو نے اس قدر پریشان کیا کہ فوراً بے نیل مرام لوٹ آیا۔ معلوم ہوا کہ جب تک جہاز روانہ نہیں ہوگا بو بدستور رہے گی۔ میں نے پوچھا جہاز کب روانہ ہوگا، تو جواب ملا "چپ"۔ کوئی سوا دس بجے کپتان نے سب کو قطار میں کھڑا کیا۔ سب کو ایک ایک لائف جیکٹ دی اور فرمایا کہ اسے ہمہ وقت پہنے رکھو۔ میں نے عرض کیا، جناب ابھی پہن لیں یا اس وقت جب جہاز روانہ ہو۔ فرمایا جب جہاز روانہ ہو۔ میں نے کہا کب روانہ ہوگا، فرمایا "چپ"۔ آخر خدا خدا کر کے جہاز پونے گیارہ بجے کے قریب روانہ ہوا، لیکن لہریے بناتا ہوا۔ سمندر پر یوں سمجھئے کہ ایک سڑک سی بنی تھی جس کے دونوں طرف جنگی جہاز کھڑے تھے۔ ہمارے جہاز کو ان جہازوں کے بیچ میں سے گزرنا تھا۔ دائیں بائیں حفاظتی سمندری جہاز، اور سروں پر ہوائی جہاز قلابازیاں لگا رہے تھے۔ رود بار انگلستان کا پانی اس قدر متلاطم تھا کہ توبہ۔ ایک تو جہاز ہلکا اور چھوٹا، پھر رود بار انگلستان کے شتر غمزے، جس کو دیکھو ابکائیاں لے رہا تھا۔ بس صرف میں بچا ہوا تھا۔ مجھے سمندری جہاز میں یا ہوائی جہاز میں کبھی ابکائی نہیں آتی۔ اس معاملے میں بہت خوش قسمت ہوں۔ خدا خدا کر کے ہم فرانس کے ساحل پر پہنچے۔ سردی ایسی تھی کہ خدا کی پناہ۔ بتیسی بج رہی تھی، ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ فرانسیسی بولتے وقت منہ سے پشتو کے الفاظ نکلتے تھے۔ جب پاسپورٹ دکھایا تو فرانسیسی افسر بہت ہنسا۔ پاسپورٹ میں نام کے بعد چھپا ہوتا ہے کہ مرد یا عورت۔ انگریز پاسپورٹ بنانے والے صاحب نے ہمارے نام کے بعد مرد کاٹ دیا اور عورت رہنے دیا۔ گدھا کہیں کا۔ ہم نے فرانسیسی صاحب سے درخواست کی کہ صاحب خدا کے لیے عورت کاٹ دیجئے اور مرد لکھ دیجئے، ورنہ ہم جہاں پاسپورٹ دکھائیں گے پسینہ پھوٹ آئے گا۔ یہاں سے سامان کندھوں پر اٹھایا اور لاریوں میں سوار ہو کر چلے۔ سردی، کھلی لاری، اس پر سخت تختے، وہ حالت ہوئی کہ کچھ نہ پوچھئے۔ رات کے کوئی 11 بجے ایک شہر میں پہنچے۔ جاڑا سخت، تاریکی ایسی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ اس شہر کا نام ایراس تھا۔ یہیں اتحادیوں کا جنگی ہیڈکوارٹرز تھا۔ ہمیں ہوٹل میں اتارا گیا، مگر کمرہ چھوٹا اور بدوضع اور پھر میرے ساتھ اس چھوٹے سے کمرے میں دو اور فوجی۔ میں سخت بددل ہوا۔ اگلے روز پتہ چلا کہ یہاں کے سب سے بڑے جرنیل لارڈ گاٹ ہیں۔ میں یہ نام سن کر اچھل پڑا۔ یہ صاحب ہندوستان کے آرمی ہیڈکوارٹرز میں ڈائریکٹر آف ملٹری ٹریننگ تھے اور میرے شاگرد تھے۔ میں سیدھا ان کے پاس پہنچا۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اپنے سب افسروں سے میرا تعارف کرایا۔ بس صاحب اس کے بعد تو میری وہ خاطر تواضع ہوئی کہ مزہ آ گیا۔ کمرہ کشادہ، ایک گاڑی ہر وقت سواری میں، ایک بیٹ مین ہمیشہ پیش خدمت وغیرہ وغیرہ۔ جنرل گاٹ کے طفیل مجھے محاذ جنگ کو دیکھنے کے لیے ایسی ایسی سہولتیں ملیں کہ اخباروں کے جنگی نامہ نگار رشک کرنے لگے۔ ان میں سے ہر ایک کی خواہش تھی کہ میرے ساتھ ساتھ رہے۔ لندن اور یورپ کے بعض اخباروں نے مجھے جو عزت بخشی اس کا اصلی سبب وہ دوستی تھی، جو مجھے فرانس میں اخبارات کے نمائندوں سے حاصل ہوئی۔ ایک دن ہم ایراس سے کوئی 200 میل دور نکل گئے۔ ہر طرف برف ہی برف۔ اس زمانے میں جیپ گاڑی ایجاد نہ ہوئی تھی۔ جیپ گاڑی اس وقت میدان میں آئی جب واقعات نے امریکہ کو غیر جانب داری کی چہار دیواری سے نکال کر جنگ کی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔ اس زمانے میں جنگ کے میدان میں بھی یہی معمولی گاڑیاں استعمال ہوتی تھیں جو شہروں میں نظر آتی ہیں۔ یہ گاڑیاں ایسی تو ہیں نہیں کہ برف پر چل سکیں۔ ان کو برف پر چلنے کے قابل بنانے کے لئے پابہ زنجیر کر دیا گیا تھا۔ مراد میری یہ ہے کہ ان کے پہیوں پر گائے بھینس کو باندھنے والی زنجیریں لپیٹ دی جاتی تھیں، تاکہ یہ برف پر پھسلنے نہ پائیں۔ یہ زنجیر تو پہیہ پر چڑھا دی گئی، لیکن اس کا کیا علاج کہ برف کے گالے کے گالے گاڑی کے سامنے شیشے پر پڑتے تھے اور شیشے کا وائپر برف کے نیچے دب دبا کر رہ جاتا تھا۔ خیر ہم سفر کرتے کرتے بلجیم کی سرحد کے پاس جا پہنچے۔ وہاں سڑک پر دور دور تک بتیاں دکھائی دیتی تھیں اور یہاں فرانس میں گھپ اندھیرا تھا۔ اس مقام سے لوٹتے وقت ہمیں راستے میں رات ہو گئی۔ سڑک بالکل نظر نہ آتی تھی۔ ہر طرف برف کی سفیدی تھی۔ سڑک کا پتہ ان برف پوش درختوں سے چلتا تھا جو سڑک کے دونوں کنارے یوں کھڑے تھے جیسے ٹھٹھر گئے ہوں۔ ہماری گاڑی سڑک کی ٹوہ لیتی ہوئی آہستہ آہستہ چل رہی تھی کہ سامنے ایک پہاڑی آئی۔ ہم اس پر چڑھے۔ مڑے ہی تھے کہ دیکھا کہ سڑک کے بیچوں بیچ ایک بڑی لاری کھڑی ہے۔ ڈرائیور اس کو درست کرنے میں مصروف ہے۔ جب وہ گاڑی درست ہوئی تو ڈرائیور اس کو چلانے کے لیے سوار ہوا۔ بجائے اس کے کہ گاڑی آگے کو چلتی، پیچھے کو ڈھلکنے لگی۔ ہمارے ڈرائیور نے پھرتی سے اپنی گاڑی کا بریک کھولا اور گاڑی کو پیچھے کی طرف چلانا شروع کر دیا۔ ہماری گاڑی ڈھلان سے پیچھے کی طرف لڑھک رہی تھی اور ہمارے سامنے والی لاری بھی! ہمارا ڈرائیور فولاد کا بنا ہوا تھا۔ ایک جگہ اسے ذرا سا راستہ ملا اور اس نے گاڑی سڑک کے نیچے اتار دی۔ لاری ہماری گاڑی کے پاس سے لڑھکتی ہوئی پیچھے نکل گئی۔ کچھ دیر کے بعد ایک دھماکہ ہوا اور ایک شور۔ لاری ایک درخت سے ٹکرا کر الٹ گئی۔ لاری میں کوئی بیس آدمی تھے۔ سب کے سب زخمی ہو گئے تھے۔ ہم تین آدمیوں کو اپنی گاڑی میں سوار کر سکتے تھے۔ چنانچہ تین آدمیوں کو سوار کیا اور باقی زخمیوں کو وہیں چھوڑ کر پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ رات کے ایک بجے ایک گمنام گاؤں میں پہنچے۔ وہاں ایک کیفے کا دروازہ کھلوایا۔ تین زخمیوں کو وہیں چھوڑا اور پھر اپنی راہ لی۔ خاموش اور افسردہ۔ جنگ کی نفسی نفسی اور آپا دھاپی پر ماتم کناں۔ (جاری ہے)

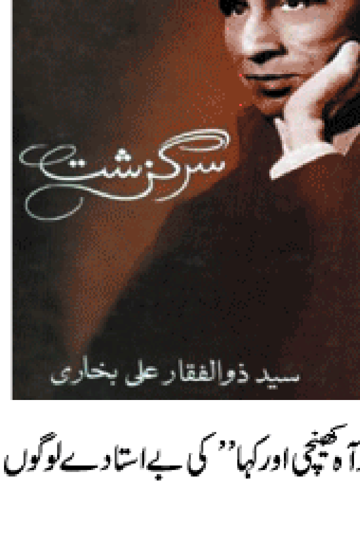
☆☆☆☆☆

ہفتہ/26اپریل2014ء

روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

انگریز مصنف نے تقریر کی دعوت دینے پر ہنگامہ مچادیا

آئی سی ایس افسر نے ہندوستانی محکمہ اطلاعات کو خط لکھا کہ آل انڈیا ریڈیو کیا بلا ہے- بخاری کون ہوتا ہے مجھے مدعو کرنے والا؟- فیلڈن کی مداخلت سے تنازعہ ختم ہوا- انگلستان قیام کے دوران میں نے کانگریسی لیڈر کو زچ کردیا- زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



ایک برخوردار قسم کے شاگرد نے استاد سے پوچھا کہ استاد، بلبل کیوں کر پکڑا جاتا ہے۔ استاد نے کہا بیٹا یہ راز کی بات ہے، لیکن تم نے ہماری اس قدر خدمت کی ہے کہ ہم یہ راز تم کو بتائے دیتے ہیں۔ سنو، جیٹھ اساڑھ کا مہینہ ہو، گرمی پڑ رہی ہو، دوپہر کا وقت ہو تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ یہ ہوگا کہ بلبل کو پیاس لگے گی اور بلبل ندی کے کنارے پانی پینے اترے گا۔ بس جب بلبل پانی پینے ندی کے کنارے اترے تم دبے پاؤں جاؤ اور چپکے سے موم کی ٹکیہ بلبل کے سر پر رکھ دو۔ اب کیا ہوگا؟ اب یہ ہوگا کہ سورج کی گرمی سے موم پگھلنے لگے گا اور پگھل کر بلبل کی آنکھ میں پڑ جائے گا اور بلبل کو کچھ دکھائی نہ دے گا۔

جب اس طرح بلبل کے دیدے پٹم ہو جائیں تو تم جاؤ اور بلبل کو پکڑ لو۔ شاگرد بولا حضور واہ واہ۔ لیکن یہ تو فرمایئے کہ جب میں موم کی ٹکیہ بلبل کے سر پر رکھنے جاؤں، اس وقت بلبل کو کیوں نہ پکڑ لوں۔ استاد نے سن کر آہ کھینچی اور کہا ”کی بے استادے لوگوں والی بات“۔ انگریزی دفتروں میں بھی بلبل پکڑنے کا وہی طریقہ ہے، جو استاد نے اپنے شاگرد کو بتایا تھا۔

جب میں بمبئی میں اسٹیشن ڈائریکٹر تھا تو مجھے خیال آیا کہ انگریزوں نے ہندوستان کے متعلق کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کتابوں کے کچھ مصنف ابھی زندہ ہیں۔ اگر ان سے ہندوستان کے بارے میں تقریریں کرائی جائیں تو پڑھے لکھے لوگ دلچسپی سے سنیں گے۔ مصنفوں کی فہرست پر نظر ڈالی تو ایک ایسے صاحب کا نام سامنے آیا جنہوں نے مہاراشٹر کی دیہاتی شاعری پر کتاب لکھی تھی۔ جس طرح اور مقرروں کو اسٹیشن ڈائریکٹر خط لکھتا ہے، اسی طرح میں نے ان کو بھی ولایت کے پتے پر خط لکھا کہ آپ کی کتاب میری نظر سے گزری، اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ اگر آپ مہاراشٹر کے فلاں علاقے کے متعلق اپنے تاثرات ہمارے ریڈیو کے لیے ریکارڈ کرنے کی زحمت گوارا کریں تو میں بی بی سی کو لکھوں کہ آپ کی تقریر کا ریکارڈ لندن میں تیار کر کے ہمارے پاس بھیج دے۔ العبد: زیڈ اے بخاری بقلم خود۔

یہ صاحب آئی سی ایس تھے اور پرانے زمانے میں صوبہ بمبئی میں کمشنر وغیرہ کے عہدے پر فائز رہ چکے تھے۔ جب میرا خط انہیں ملا تو آئی سی ایس کا خون ان کی رگوں میں کھول اٹھا۔ فرمایا آل انڈیا ریڈیو کیا بلا ہے؟ ہمارے زمانے میں کوئی ریڈیو نہ تھا، اب کہاں سے آ گیا؟ یہ بخاری کون ہے؟ کوئی دیسی کالا لوگ معلوم ہوتا ہے۔ اس کو یہ جرات کیوں کر ہوئی کہ انگریز کو اور وہ بھی آئی سی ایس انگریز کو یوں بے تکلف خط لکھے۔ آئی سی ایس صاحب نے میرا خط انڈیا آفس کو اپنے خط کے ساتھ نتھی کر کے بھیج دیا اور انڈیا آفس سے دریافت فرمایا کہ یہ آل انڈیا ریڈیو کیا ہے؟ اسٹیشن ڈائریکٹر کس درجہ کا افسر ہوتا ہے؟ یہ بخاری کس قماش اور درجے اور حیثیت کا آدمی ہے؟ کیا اس کو حق پہنچتا ہے کہ کالا اور دیسی ہو کر مجھ گورے انگریز کو خط لکھے؟

انڈیا آفس میں اس وقت لارڈ زٹ لینڈ سیکریٹری آف اسٹیٹ تھے اور اطلاعات کے محکمے کے سربراہ جوائیس صاحب تھے۔ دونوں بڑے اچھے اور لائق آدمی تھے مگر اس کا کیا علاج کہ انگریز تھے اور دفتری معاملات میں بلبل کے سر پر موم کی ٹکیہ رکھنے کے قائل۔ فائل پر انہوں نے دو تین صفحے لکھ ڈالے۔ آل انڈیا ریڈیو کی ہسٹری بتائی، اس کی شان نزول سے پڑھنے والوں کو آگاہ کیا، یہ حقیقت بھی سپرد قلم فرمائی کہ اس محکمے کا سربراہ لائینل فیلڈن ہے، لیکن جب اس موضوع پر آئے کہ آیا بخاری اسٹیشن ڈائریکٹر کی حیثیت ایسی ہے یا نہیں کہ کسی صاحب بہادر کو براہ راست خط لکھے، تو جوائیس صاحب کا قلم لنگڑا ہو گیا۔ فرمایا کہ اس امر کی بابت میں کوئی رائے نہیں دے سکتا کیونکہ انڈیا آفس میں اس موضوع پر گورنمنٹ آف انڈیا نے کوئی معلومات تا حال بہم نہیں پہنچائیں۔ لہٰذا یہ مسئلہ ہندوستان میں وزیر اطلاعات کو بھیج دی جائے تاکہ وہ ضروری معلومات انڈیا آفس کو بہم پہنچائیں۔ ان معلومات کی وصول یابی پر مراسلہ زیر غور کا مناسب جواب دیا جائے گا۔ دریں اثنا محرر مراسلہ زیر غور کو لکھ دیا جائے کہ معاملہ زیر غور ہے، جب بالائے غور آ جائے گا تو جواب باصواب دیا جائے گا۔ لاحول ولا قوۃ، سیدھی سی بات تھی۔ جوائیس صاحب کو لازم تھا کہ محرر مراسلہ زیر غور کو لکھ بھیجتے کہ صاحب بہادر آپ جامے سے باہر کیوں ہوئے جاتے ہیں، تقریر کرنا ہے تو کر دو ورنہ بات گول کر دو۔ مگر ہائے لال فیتہ! ہائے بلبل کے سر پر موم کی ٹکیہ! خیر یہ معاملہ وزیر اطلاعات ہندوستان کے دفتر میں آیا۔ ایک نوٹ اسسٹنٹ نے لکھا، اس پر ایک مزید نوٹ کا اضافہ سپرنٹنڈنٹ نے کیا، پھر اسسٹنٹ سیکریٹری صاحب نے خامہ فرسائی کی، ازاں بعد ڈپٹی سیکریٹری صاحب نے مسل کے میدان میں اپنا توسن طبع رواں دوڑایا اور ارشاد فرمایا کہ انڈیا آفس کا مراسلہ زیر غور معہ ان خطوط کے جو اس کے ساتھ نتھی ہیں، لائینل فیلڈن کنٹرولر آف براڈ کاسٹنگ کے پاس اظہار رائے کے لیے بھیج دیا جائے۔ چنانچہ یہ سب پلندہ فیلڈن کے پاس پہنچا۔ فیلڈن نے اسے پڑھا اور نیچے ایک فقرہ لکھا۔ یہ فقرہ فحش تھا، مگر نہایت لپیٹ کر لکھا تھا۔ مراد اس فقرے سے یہ تھی کہ ”یہ بک بک بند کی جائے“۔ فقرہ چونکہ لپیٹ کر لکھا تھا، اس لیے سپرنٹنڈنٹ صاحب کی سمجھ میں نہ آیا۔ ڈکشنریاں دیکھیں مگر ڈکشنری میں وہ محاورہ کہاں! آخر مسل پر لکھ دیا کہ کنٹرولر براڈ کاسٹنگ کا جواب بعید از فہم ہے۔ اسسٹنٹ سیکریٹری ملاحظہ فرمائیں۔ اسسٹنٹ سیکریٹری صاحب نے لکھا کہ مجھے سپرنٹنڈنٹ کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ کنٹرولر آف براڈ کاسٹنگ کا جواب بعید از فہم ہے۔ ڈپٹی سیکریٹری صاحب ملاحظہ فرمائیں۔ ڈپٹی سیکریٹری انگریز تھا۔ فیلڈن کا جواب پڑھ کر کچھ ہنسا، کچھ لال پیلا ہوا اور مسل سیکریٹری کے پاس لے گیا۔ سیکریٹری اس زمانے میں سر این سین تھے۔ کلکتے کے بنگالی بابو۔ انگریز ڈپٹی سیکریٹری نے انہیں مسل دکھائی اور فیلڈن کی گل افشانی کی وضاحت کی۔ سین صاحب نے حکم لکھا کہ فیلڈن سے کہا جائے کہ یہ فحش الفاظ مسل سے خارج کر دے اور معافی مانگے۔ یہ مسل دو بڑے سربہ مہر لفافوں میں یوں ہاتھوں ہاتھ فیلڈن کے پاس پہنچائی گئی جیسے بری کا جوڑا ہو۔ فیلڈن نے لفافے کھولے، حکم پڑھا اور اس کے نیچے پھر وہی فحش فقرہ لکھ دیا۔ وزارت اطلاعات نے خود وہ تمام صفحات مسل سے خارج کر دیئے اور فیلڈن کے نام سخت ناراضی کا خط لکھا۔ اس معاملے نے یہاں تک طول کھینچا کہ وائسرائے تک پہنچا۔ انہیں دنوں میں بمبئی سے کسی سرکاری کام پر دلی آیا ہوا تھا۔ فیلڈن نے مجھے تمام واقعہ سنایا۔ اس قدر ہنسی آئی کہ بیان نہیں کر سکتا۔ اب سنئے، ڈپٹی سیکریٹری کے یہاں سلام کرنے گیا تو وہ ناراض، سیکریٹری کے پاس گیا تو وہ برہم، وزیر کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کے نتھنے پھولے ہوئے۔ البتہ وائسرائے ولنگڈن خوب ہنسا، مگر ساتھ ہی یہ فہمائش بھی کی کہ فیلڈن کو بھی قابو میں رکھو۔ میں نے کہا حضور میں فیلڈن کی انا تو ہوں نہیں کہ قابو میں رکھوں۔ فرمایا شکر کرو کہ تم فیلڈن کی انا نہیں، ورنہ اب تک اس نے تمہارا گلا گھونٹ دیا ہوتا۔

جب میں جنگی خدمات کے سلسلے میں لندن گیا تو انڈیا ہاؤس کی ایک پارٹی میں ان صاحب سے اتفاقاً ملاقات ہوئی، جس سے میں نے تقریر کی درخواست کی تھی۔ لطف یہ کہ جوائیس ہی نے یہ ملاقات کرائی۔ ان صاحب کو دیکھ کر میرے دل میں طرح طرح کے فقرے گھومنے لگے۔ وہ پرانا گھاگ سمجھ گیا کہ اس کے تیور دگرگوں ہیں۔ مجھے الگ لے گیا۔ ایک کرسی پر وہ بیٹھ گیا اور دوسری پر میں۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر وہ خود ہی بولا تو تم وہ اسٹیشن ڈائریکٹر بخاری ہو جس نے مجھے تقریر کے لیے خط لکھا تھا۔ میں نے کہا اور تم وہ مکتوب الیہ ہو جس نے خط کا جواب دینا صاحبیت کے منافی سمجھا تھا۔ خیر تھوڑی دیر تو تو میں میں رہی۔ آخر اس نے اپنے کرتوت پر اظہار افسوس کیا اور میں خاموش ہو گیا۔ خدا جانے ہندوستان میں کیا بات تھی کہ اچھا خاصا انگریز یہاں آ کر بگڑ جاتا تھا۔ حکومت کا نشہ بہت تیز سہی، مگر جس تیزی سے انگریز کو چڑھتا ہے اور کسی قوم کو نہیں چڑھتا۔ جب وہ یہاں حکومت کرنے آیا تو نو نو دس دس نوکر رکھے۔ ہندوستانیوں سے اپنے آپ کو سر کہلوایا۔ اپنی سواری کے لیے گھوڑا، بچوں کی سواری کے لیے گدھا اور میم صاحب کی سواری کے لیے پالکی رکھی۔ یہی انگریز جب ملازمت سے سبک دوش ہو کر انگلستان لوٹتا تھا تو پھر وہی سیدھے سادھے شریف انگریز کی زندگی بسر کرتا تھا۔ مگر ہندوستان کے عیش کی یاد اس کے دل سے محو نہ ہوتی تھی۔ بے چارہ اپنے گھر کا نام شالامار یا نشاط یا شاہدرہ یا خیبر رکھ دیتا تھا۔ کمرے میں اپنے ہندوستانی بیرے کی تصویر ضرور آویزاں کرتا تھا۔ اور اس گھوڑے کی بھی جو سرکار کی طرف سے اسے سواری کے لیے ملتا تھا۔

انگلستان میں پہلے پہلے تو میں بہت گھبرایا، کیوں کہ اس قسم کے انگریزوں سے مجھے چڑ تھی۔ جہاں جاؤں ان میں سے ایک نہ ایک ضرور موجود ہوتا اور اس بات کا دعویٰ کرتا کہ مجھ سے زیادہ ہندوستان کو اور ہندوستانیوں کو کوئی نہیں جانتا۔ جہاں کہیں ہندوستان کے بارے میں کانفرنس ہو تو میں دیکھوں کہ ایک نہ ایک پنشن یاب انگریز بیٹھا ہے۔ کئی ایک کانفرنسوں سے تو میں بطور احتجاج اٹھ کر چلا آیا اور صاف کہہ دیا کہ اگر آپ کو ایسے انگریزوں کے مشورے پر کام کرنا ہے تو میری کیا ضرورت ہے، مجھے بخشئے۔ یہ میری ناتجربہ کاری تھی۔ آخر میں آنکھیں کھلیں کہ معاملہ اگر ”یہ ہمیں مرد ماں“ والا ہے تو ان کو راہ راست پر لانا بھی میرا ہی کام ہے۔ اس انگریز کو اگر ہندوستان دانی کا زعم ہے تو ایسی ترکیب کرو کہ یہ خود اپنے منہ سے وہ بات کہے جو تمہارے مطلب کی ہو۔ یہ گر دراصل مجھے ایک ڈاکٹر نے سکھایا تھا۔ یہ ڈاکٹر مرہٹہ تھا۔ ڈونگری سے آگے سانڈرس روڈ پر گول پیٹھے میں اس کا مطب تھا۔ جس طرح میں ڈاکٹر صادق کے یہاں کبھی کبھی جا بیٹھتا تھا، اسی طرح اس مرہٹہ ڈاکٹر کے یہاں بھی جایا کرتا تھا۔

یہ مرہٹہ عجیب وغریب ڈاکٹر تھا۔ طب میں ماہر ہو یا نہ ہو لیکن مریض کا اعتماد حاصل کرنے میں صاحب کمال تھا۔ ہم جیسے مریض تو جا کر کہتے تھے کہ بھئی ڈاکٹر رات پیٹ میں درد تھا۔ قبض کی شکایت ہے۔ ڈاکٹر نے زبان دیکھی اور دوا دے دی۔ چلو چھٹی ہوئی۔ لیکن ایسا مریض بھی آ نکلتا تھا جو ڈاکٹر کے کمرے میں ہائے ہائے کرتا داخل ہوتا اور داخل ہوتے ہی دھڑام سے کرسی پر بیٹھ جاتا تھا۔ ڈاکٹر پوچھتا کیوں بھئی کیا شکایت ہے، تو کہتا ہائے ہائے پیٹ میں کل کل...... ساری رات...... درد رہا...... ساری رات...... ڈاکٹر صاحب ساری رات پیٹ میں، پیٹ میں درد...... رہا...... درد...... درد......۔ بس یہ سن کر ڈاکٹر کھڑا ہو جاتا، مریض کو سہارا دے کر میز پر لٹاتا، تھرمامیٹر لگاتا، اسٹیتھس کوپ لگاتا اور جگہ جگہ کی آواز سنتا، زبان دیکھتا، پوچھتا کہ پچھلے تین دن میں کیا کیا نوش جان فرمایا ہے، آنکھیں دیکھتا، آنکھیں دکھاتا، کان دیکھتا، کان مروڑتا، ناک دیکھتا، ناک چڑھاتا اور آخر میں وہی دوا دیتا جو ہمیں دی تھی۔

ایک دن اس ڈاکٹر کے پاس ایک ایسا ہی مریض آیا اور کہا ڈاکٹر صاحب ج...... میرے، میرے، سر میں...... سر میں سخت، سخت درد...... درد ہے...... سخت ہائے...... درد ہائے......۔ ڈاکٹر فوراً اٹھا، سہارا دے کر مریض کو میز پر لٹا دیا۔ اسٹیتھس کوپ نکالا اور مریض کے سر پر لگا دیا۔ مریض چپ اور ڈاکٹر بھی چپ۔ کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر نے مریض کے سر سے اسٹیتھس کوپ ہٹا لیا اور طویل تفصیلات پوچھنے لگا۔ پوچھنے کے بعد اسپرین کی قسم کا پاؤڈر پانی میں حل کر کے دیا، مکسچر میں کوئی کڑوی بے ضرر دوا بھی ڈال دی۔ میں نے ایک دن اس سے پوچھا کہ یہ ڈھونگ کیوں کرتے ہو؟ فرمایا ایسے مریض کے سامنے اگر یہ ڈھونگ نہ رچایا جائے تو مریض سمجھتا ہے کہ یا تو ڈاکٹر میرے مرض کو پا نہیں سکا اور یا بے توجہی سے علاج کر رہا ہے۔ میں نے پوچھا تم نے اسپریل میں یہ کڑوی دوا کیوں ڈال دی؟ فرمایا اگر دوا کڑوی نہ ہو تو یہ مریض سمجھتے ہیں کہ دوا ہی نہیں دی۔ وہ دوا ہی کیا جو کڑوی نہ ہو!

اس مرہٹہ ڈاکٹر کا بتایا ہوا نسخہ میرے بڑے کام آیا۔ جہاں کہیں مجھے کوئی پنشن یاب انگریز انگلستان میں ملا، میں نے جی کھول کر ان بیہودہ مراد آبادی پیتل کے برتنوں کی تعریف کی جن کو صاحب بہادر کی میم ہر روز گھس گھس کر پالش کرتی تھی۔ اس بیرے کی تعریف کی جس کی تصویر کمرے میں آویزاں ہوتی تھی۔ پھر صاحب بہادر اور میم صاحب کو ہندوستانی ہوٹل میں ”دال اور چپاتی“ کھلاتا اور جب صاحب بہادر اور میم صاحب ہندوستان کے ذکر جمیل پر آہیں بھرتے تھے، تو میں آنکھوں میں آنسو بھر لاتا تھا۔ اس طرح میں نے ہندوستان زدہ انگریزوں کو اپنا گرویدہ کر لیا۔ اب کیا تھا۔ جہاں یہ لوگ جائیں میری تعریف کریں اور کیوں نہ کرتے، میں جو ان کی تعریف کرتا تھا! میری اس زمانہ سازی کا ایک فائدہ ہوا اور وہ یہ کہ وہ پنشن یاب انگریز جن کی راج دربار میں شنوائی تھی اور جنہیں انگلستان کے اخبارات ماہر ہندوستانیات سمجھتے تھے، رفتہ رفتہ مسلمانوں کے سیاسی نقطہ نگاہ سے واقف ہونے لگے۔

ان دنوں انگلستان میں کانگریس کا سربراہ کرشنا مینن تھا۔ بڑا منہ پھٹ، منہ زور اور بدتمیز۔ نہایت بوسیدہ اور میلے کچیلے کپڑے پہنتا تھا۔ اس نے اپنے ساتھ مزدور پارٹی کے چند لوگوں کو ملا رکھا تھا۔ چند کمیونسٹ بھی اس کے ساتھ تھے۔ کرشنا مینن ان لوگوں کے بل پر انگلستان کے کسی چوک میں مہینے دو مہینے میں ایک آدھ جلسہ کر دیتا تھا۔ انگلستان میں کوئی شخص کہیں بھی کھڑا ہو کر تقریر کرے، تماشائی اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ کرشنا مینن کے جلسے کی تقریریں سننے کے لیے بھی راہگیر کھڑے ہوتے تھے اور چپ چاپ تقریر سن کر اور بور ہو کر چلے جاتے تھے۔ لیکن اب ان جلسوں میں کچھ رنگ آنے لگا۔ اب ایک آدھ آدمی مقرر سے کہتا کہ جناب آپ کانگریس کا نقطہ نظر بیان کر رہے ہیں یا مسلم لیگ کا۔ بس پھر کیا تھا۔ مسلم لیگ کا نام سن کر کرشنا مینن بپھر جاتا اور لگتا واہی تباہی بکنے۔ بحث مباحثے میں جب کسی شخص کے ہاتھ سے ضبط کا دامن چھوٹ جائے تو سمجھ لیجئے کہ وہ بازی ہار گیا۔ مسلم لیگ کا نام سن کر کرشنا مینن کے منہ میں جھاگ آتے اور اس کے منہ کے جھاگ دیکھ کر انگریز ہنستے اور کرشنا مینن کا بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ سوائے ”ڈیلی ورکر“ کے باقی تقریباً تمام اخبارات کرشنا مینن کے جلسوں کا ذکر کرتے تو مسلم لیگ کا ذکر بھی کہیں نہ کہیں آ جاتا اور پریس کی رپورٹ کا اختتام اس مقطع پر ہوتا کہ مسلم لیگ کے ذکر پر کرشنا مینن صاحب غصے میں آ گئے اور جلسہ درہم برہم ہو گیا۔

میں سرکاری ملازم، میری یہ جرأت کہاں کہ سیاسی حلقوں میں شریک ہوں اور وہاں مسلم لیگ کا ذکر کروں۔ لیکن کرشنا مینن صاحب کی سی آئی ڈی نے کسی نہ کسی طرح انہیں یقین دلا دیا کہ فساد کی جڑ یہی بخاری ہے۔ کرشنا مینن نے فیلڈن سے شکایت کی۔ فیلڈن پنڈت جواہر لال نہرو کا دوست، مجھ پر برسا۔ میں نے کہا میاں ہوش کی دوا کرو، میں تو کبھی کرشنا مینن کے جلسے میں گیا بھی نہیں۔ البتہ یہ ضرور کیا ہے کہ جہاں جہاں میری رسائی ہو سکی میں نے انگلستان والوں کو مسلمانوں کے نقطہ نظر سے آگاہ کیا اور یہ میرا فرض تھا۔ میں سرکاری ملازم، سرکار دولت مدار کو صحیح حالات وکوائف سے آگاہ نہ کرتا تو اور کون کرتا۔ خیر فیلڈن تو یہ جواب سن کر خاموش ہو گیا مگر کرشنا مینن کہاں خاموش ہونے والا تھا، اس نے جگہ جگہ میری شکایت کی، مگر جسے خدا رکھے اسے کون چکھے۔ (جاری ہے)

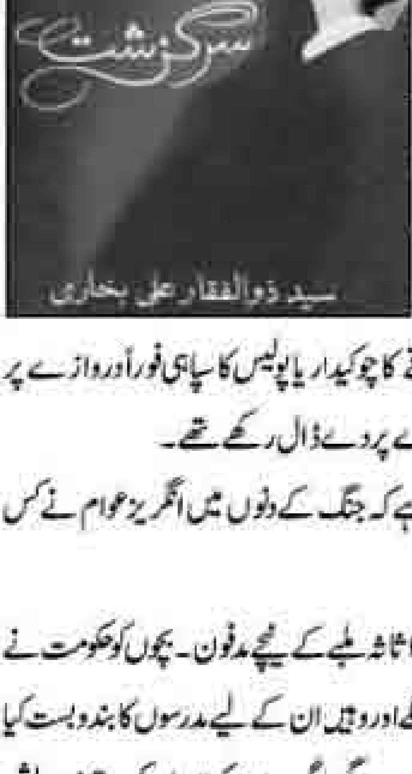
☆☆☆☆☆

پیر 28 اپریل 2014ء

روزنامہ امت کراچی / حیدرآباد

جرمن جنگی جہازوں کی بمباری نے برطانیہ کو کھنڈر بنا دیا

بے گھر عوام زیر زمین پلیٹ فارم پر رات بسر کرتے - انگلستان میں بچت کی خاطر کپڑے سمیت ہر چیز راشن کارڈ پر ملنے لگی - نئے ہائی کمشنر سر عبدالعزیز کا بھونڈا لباس دیکھ کر ہم سب کو دکھ ہوا - زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



انگریزی کی سلطنت کو اگر جسم تصور کر لیا جائے، تو ماننا پڑے گا کہ لندن اس جسم کا دل ہے۔ ہٹلر اس بات پر تلا ہوا تھا کہ اس دل کو ضرب پہنچائی جائے۔ اگر ضرب کاری لگ گئی تو سارا جسم ماؤف ہو جائے گا۔ چنانچہ ہٹلر نے لندن کو خاص طور پر اپنے بمبار ہوائی جہازوں کی آماجگاہ بنایا۔ ہٹلر کا سب سے پہلے حملہ لندن کے مشرقی علاقے پر ہوا۔ یہی وہ علاقہ ہے جہاں بندرگاہ، بینک آف انگلینڈ اور تجارت کی کوٹھیاں ہیں۔ اس علاقے کو کم و بیش تباہ کر لینے کے بعد ہٹلر نے لندن کے مختلف علاقوں پر اندھا دھند بمباری شروع کر دی۔ ہٹلر کے ہوائی جہازوں نے چند ہی دنوں میں لندن کا حلیہ بگاڑ دیا۔ ہر طرف ملبے کے ڈھیر نظر آنے لگے، سڑکیں ٹوٹ گئیں، آمد و رفت میں خلل پڑ گیا۔ رات کے وقت لندن گھپ اندھیرے میں ڈوب جاتا تھا۔ لوگ گھروں میں تو بتیاں روشن کر لیتے تھے، لیکن کیا مجال کہ روشنی کی ایک کرن بھی باہر سے دکھائی دے سکے۔ اگر پردے کے کسی سوراخ سے ذرا سی روشنی بھی چھنی تو علاقے کا چوکیدار یا پولیس کا سپاہی فوراً دروازے پر دستک دیتا تھا۔ لندن کے اکثر لوگوں نے اپنی کھڑکیوں پر کالا رنگ پھروا دیا اور کھڑکیوں کے آگے دہرے پردے ڈال رکھے تھے۔

یہاں مجھے یہ بتانا مقصود نہیں کہ وہاں کی حکومت نے کیا کیا انتظامات کیے۔ مجھے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ جنگ کے دنوں میں انگریز عوام نے کس جذبہ قومی کا ثبوت دیا۔

بم زدہ مکانوں سے نکلے ہوئے بے گھر لوگ حقیقت میں بے سروسامان ہو گئے۔ گھر ملبے کا ڈھیر اور گھر کا اثاثہ ملبے کے نیچے مدفون۔ بچوں کو حکومت نے باہر دیہات میں بھیج دیا۔ دیہات میں رہنے والے امرا کے مکانوں کے شاگرد پیشہ میں یہ بچے رہنے لگے اور وہیں ان کے لیے مدرسوں کا بندوبست کیا گیا۔ باقی رہ گئے ان کے والدین، ان کو تو لندن میں ہی رہنا تھا، لندن ہی میں رہ کر روٹی کمانی تھی۔ مگر یہ بے گھر لوگ رات کہاں بسر کرتے! درویش ہر کجا کہ شب آمد سرائے اوست، یہ لوگ رات کے وقت زمین کے نیچے چلنے والی ریلوے کے پلیٹ فارموں پر آ جاتے اور اخبار کے کاغذ زمین پر بچھا کر سو جاتے۔ صبح گاڑی کے آنے کے وقت سے پہلے ان لوگوں کو جگا دیا جاتا اور یہ اپنے اپنے کام پر چلے جاتے۔ دن فیکٹریوں میں اور رات ریل کے پلیٹ فارم پر۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک یوں لیٹے ہوتے تھے کہ ان کے بیچ میں چپہ بھر بھی زمین خالی نہ ہوتی تھی۔

انگلستان میں ان دنوں ہر ایک چیز راشن کارڈ سے ملتی تھی۔ گوشت راشن کے مطابق۔ چینی راشن کے مطابق، یہاں تک کہ کپڑا بھی راشن کے مطابق۔ بچت کی خاطر ان دنوں یہ حکم لگا دیا گیا کہ کوئی درزی ڈبل برسٹ کوٹ نہ بنائے، کوئی درزی کوٹ کی آستینوں پر بٹن نہ لگائے، کوئی درزی پتلون کی مہری اوپر کو نہ موڑے۔ ایسے سوٹ کو کفایتی سوٹ کہتے تھے۔ بڑا آدمی ہو یا چھوٹا، کوئی شخص کفایتی سوٹ کے علاوہ اور کوئی سوٹ نہ بنوا سکتا تھا۔

اسی زمانے کا ذکر ہے کہ ملک فیروز خان نون کی جگہ سر عزیز الحق انگلستان کے ہائی کمشنر ہو کر لندن تشریف لائے۔ سر عزیز الحق نہایت شریف اور سادہ انسان تھے۔ پٹی کا کوٹ اور فلالین پہنے انڈیا ہاؤس میں ہائی کمشنر کی کرسی پر آ کر تشریف فرما ہوئے۔

سفیر حضرات ایک تو ویسے ہی اپنے ملک کی لاج رکھنے کے لیے اعلیٰ لباس پہننے پر مجبور ہوتے ہیں، اس پر مزید طرہ یہ کہ سر عزیز الحق سے قبل ملک فیروز خان نون جیسا خوش پوش، باوضع ہائی کمشنر اس کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ سر عزیز الحق کا بے ڈھنگا، بے ہنگام اور بھونڈا لباس دیکھ کر ہم سب کو دکھ ہوا۔ مجھے سر عزیز الحق کی خدمت میں شرف باریابی حاصل تھا۔ چنانچہ میں بے دھڑک ان کے پاس پہنچا اور ان سے کہا کہ صاحب یوں کام نہیں چلے گا، آپ کو ایک دو سوٹ اچھے بنوانے ہی پڑیں گے، میں وزیر امور ہند کے پاس جاتا ہوں اور ان سے خاص اجازت لے کر آتا ہوں کہ آپ کو کفایتی سوٹ کی پابندی سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ ویسے تو کوئی شخص دو سال میں ایک سوٹ سے زیادہ نہیں بنوا سکتا۔ لیکن آپ کو اجازت دی جائے گی کہ آپ حسب ضرورت جتنے سوٹ چاہیں بنوائیں، آخر آپ ہائی کمشنر ہیں۔

ان دنوں وزیر امور ہند مسٹر لیو ایمری تھے۔ یہ عجیب و غریب انسان تھے۔ پہاڑوں پر چڑھنے کے بہت شوقین اور اس موضوع پر متعدد کتابوں کے مصنف۔ کوہ پیمائی کے علاوہ ان کو ایرانی مصوری کے نمونے جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ ان کے گھر کے ہر کمرے میں اور گھر کے ہر ایک زینے پر ایرانی مصوری کے نادر نمونے آویزاں تھے۔

کوہ پیمائی سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ لیکن میں نے پھر بھی لیو ایمری کی کتابوں کا مطالعہ نہایت دلچسپی سے کیا۔ لیو ایمری صاحب طرز مصنف تھے اور صاحب طرز ہر موضوع پر یوں قلم اٹھاتا ہے کہ انسان اس کی تحریروں کو پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یوں کہیے کہ اس معاملے میں وہ ممدوح تھے اور میں مداح۔

میرے اور لیو ایمری کے تعلقات کا ایک ذریعہ تو ان کی تصنیفات تھیں اور دوسرے وہ ایرانی تصویریں جنہوں نے ان کے گھر کو عجائب گھر بنا رکھا تھا۔ میں اکثر ان کے گھر جایا کرتا اور ان تصویروں سے حظ اٹھایا کرتا۔

ایک تو لیو ایمری سے ایسے گہرے تعلقات اور پھر سر عزیز الحق کے کپڑوں کے بارے میں میری درخواست نہایت حق بجانب، مجھے یقین تھا کہ لیو ایمری میری گزارش مان لیں گے۔ لیکن جب میں نے اس مسئلے کا ذکر کیا تو لیو ایمری سوچ میں پڑ گئے۔ کہنے لگے، راشن کے معاملے میں استثنیٰ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور پھر یہ ہے کہ میں راشن کے محکمے کا وزیر نہیں ہوں۔ اس معاملے میں ویسے بھی کچھ نہیں کر سکتا، تم لارڈ وولٹن سے ذکر کرو۔

لارڈ وولٹن اس زمانے میں وزیر خوراک تھے اور ہر قسم کے راشن کے کارڈ انہی کی وزارت سے جاری ہوتے تھے۔ میں نے لیو ایمری سے پوچھا کہ اگر ضرورت پڑے تو لارڈ وولٹن سے کہہ دوں کہ آپ اس درخواست کی منظوری کے لیے سفارش کرتے ہیں۔ لیو ایمری نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ ذاتی طور پر میں اس بات کا قائل ہوں کہ سر عزیز الحق کو بہت سے کپڑوں کی ضرورت ہے اور یہ بات بھی مانتا ہوں کہ بحیثیت ہائی کمشنر کے انہیں اچھے کپڑے پہننے چاہئیں، لیکن بحیثیت وزیر میں اصولاً اس معاملے میں سفارش کرنے کے خلاف ہوں۔

لیو ایمری کی بات میرے دل کو لگی۔ میں اس کی اصول پرستی کا قائل ہو گیا، لیکن پھر بھی میں نے فیصلہ کیا کہ لارڈ وولٹن سے ملا جائے۔

ان دنوں لارڈ وولٹن کے دست راست کرکٹ کے مشہور کامن ٹیٹر ہاورڈ مارشل تھے۔ یہ میرے دوست تھے۔ ان کی وساطت سے میں لارڈ وولٹن سے ملا۔ سر عزیز الحق کی سادگی کا ذکر کیا، ان کے لباس کی خستگی کا تذکرہ رقت انگیز الفاظ میں کیا، ہائی کمشنر کی کرسی کی عظمت پر لیکچر دیا، یہاں تک کہ لارڈ وولٹن نے اجازت دے دی کہ سر عزیز الحق جتنے سوٹ چاہیں بنوا لیں اور جس وضع کے چاہیں بنوا لیں۔ یہ اجازت نامہ لے کر میں اپنے درزی کے پاس پہنچا۔ سیول رو کا یہ درزی بہت اونچے طبقے کے سوٹ سیتا تھا۔ ڈیوک آف ونڈسر، انتھونی ایڈن، فیلڈن سب اسی دکان کے گاہک تھے۔ میں نے درزی سے کہا کہ کل کسی وقت اپنے ہائی کمشنر کو لے کر آؤں گا، ان کے سوٹ تمہیں بہت جلدی کر دینے ہوں گے۔

یہاں سے میں خوشی خوشی لارڈ وولٹن کا اجازت نامہ ہاتھ میں لیے سر عزیز الحق کے یہاں گیا۔ دیکھا کہ ایک بنا بنایا کفایتی سوٹ پہنے بیٹھے ہیں۔ بازار سے خرید کر لائے تھے اور وہ بھی ایک نہایت معمولی دکان سے۔

انہیں دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ میں نے کہا کہ حضرت آپ کے لیے میں نے اتنی دوڑ دھوپ کی اور بڑی مشکل سے اجازت نامہ حاصل کیا اور آپ بازار جا کر بنا بنایا گھٹیا سا کفایتی سوٹ خرید لائے۔ فرمایا، جیسا اوروں ویسا ہمیں، جو سب کا حال سو میرا حال، میری حمیت گوارہ نہیں کرتی کہ میں خاص اجازت نامہ حاصل کر کے اپنے لیے کپڑے بنواؤں۔

سر عزیز الحق کا جواب سن کر میں سکتے میں رہ گیا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے کہا کہ اچھا تو پھر شکریے کے خط کے ساتھ یہ اجازت نامہ لارڈ وولٹن کو واپس بھیج دیجیے۔ فرمایا، یہ بھی نہیں کروں گا۔ یہ اجازت نامہ تم منت سماجت کر کے لائے ہو اب تم ہی آداب و تسلیمات کے بعد انہیں واپس کر دو۔ تھوڑی دیر کے بعد فرمایا، یاد رکھو مسلمان کی حقیقی عزت تزکیہ نفس سے ہوتی ہے، ظاہری لباس سے نہیں۔

میں پھر لارڈ وولٹن کے پاس پہنچا اور انہیں سارا واقعہ سنایا۔ یہ سن کر انہیں اس قدر حیرت ہوئی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ انہوں نے میرے سامنے لیو ایمری کو ٹیلی فون کیا اور انہیں سب داستان سنائی۔ لیو ایمری نے مجھ سے کہا کہ ایثار کی عجیب و غریب داستان ہے۔ اگر تم اسے لکھ دو تو بہت اچھا ہو۔ میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں ایک مسلمان کے درویشانہ رویے کو جنگی پروپیگنڈے کے طور پر استعمال کرنے سے قاصر ہوں۔

شیخ سعدی کا شعر ہے:

بادہا خوردن و ہشیار نشستن سہل است
گر بدولت رسی و مست نہ گردی مردی

نشہ پی کر ہوشیار بیٹھے رہنا کون سی بڑی بات ہے، ہاں مردانگی تو یہ ہے کہ انسان کو اقتدار ملے اور اقتدار کے نشے سے بدمست نہ ہو۔

سر عزیز الحق انہی لوگوں میں سے تھے جنہیں اقتدار کا نشہ نہ چڑھ سکا۔ اللہ مغفرت کرے عجیب درویش صفت انسان تھے۔

دوران جنگ ایک وقت وہ بھی آیا جب پے در پے شکست کھانے کے بعد انگریزوں کو یقین ہو گیا کہ ہٹلر اپنی چھاتہ فوج انگلستان میں اتارنے والا ہے۔ چنانچہ انگلستان کی حکومت نے تمام ریلوے اسٹیشنوں کے نام کے بورڈ اتروا دیے، دیہات کی تمام سڑکوں کی ناموں کی تختیاں اتار لیں تاکہ اگر جرمن چھاتہ فوج انگلستان کے کسی علاقے میں اترے تو اسے معلوم ہی نہ ہو سکے کہ وہ کہاں ہیں اور کس طرف جانا ہے۔ عوام کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ کہ اگر دیہات میں کوئی اجنبی تم سے راستہ پوچھے تو اسے راستہ نہ بتاؤ، ہاں اس کا شناختی کارڈ دیکھ کر اطمینان کر لو کہ یہ اپنا آدمی ہے تو راستہ بتانے میں کوئی حرج نہیں۔

یہ بات تھی بھی کسی حد تک معقول، کیوں کہ اس زمانے میں انگلستان میں ہر پتا ہوا جواری موجود تھا۔ پولینڈ کے لوگ، ہالینڈ کے لوگ، فرانس کے لوگ، بلجیم کے لوگ، لکسم برگ کے لوگ، غرض کہ ہٹلر سے مار کھا کر جو بھاگا وہ سیدھا انگلستان پہنچا اور یہاں آ کر انگریزوں کی مدد کا طالب ہوا۔ انہی لوگوں میں جنرل ڈیگال بھی تھا۔ مگر خیر اس کا قصہ پھر کبھی سہی۔

ایک دن سر عزیز الحق اور میں موٹر میں بیٹھے دیہات کی سیر کر رہے تھے کہ ایک جگہ پہنچ کر ہم راستہ بھول گئے۔ وہاں کئی سڑکیں نکلتی تھیں۔ ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ کس سڑک پر گاڑی ڈالیں۔ سامنے دو لڑکے کھیلتے ہوئے دکھائی دیے۔ میں ان کی طرف بڑھا اور ایک سے کہا کہ بھیا فلاں گاؤں کو کون سا راستہ جاتا ہے؟ اس نے میری شکل دیکھی اور کہا کہ اس سڑک پر سیدھے چلے جاؤ، کوئی ڈیڑھ میل کے بعد ایک سڑک دائیں ہاتھ کو مڑے گی، اس پر مڑ جانا اور ناک کی سیدھ چلے جانا۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ڈیڑھ میل سیدھا گیا، پھر ایک سڑک دائیں کو مڑی اس پر مڑ گیا اور چلا ناک کی سیدھ تا آں کہ ہم پھر اسی گاؤں میں پہنچ گئے جہاں سے راستہ پوچھا تھا۔ وہی دو لڑکے وہاں کھیل رہے تھے۔ سر عزیز الحق بھی پریشان اور میں بھی کہ یہ قصہ کیا ہے؟ میں نے اس لڑکے کو قریب بلایا، جس نے ہمیں راستہ بتایا تھا اور کہا میاں یہ کیا مذاق ہے۔ ہم تو ہر پھر کر وہیں آ گئے جہاں سے چلے تھے۔ تم نے غلط راستہ کیوں بتایا؟ لڑکا بولا جناب آپ کا فرض تھا کہ آپ مجھ سے بات کرنے سے قبل اپنا شناختی کارڈ دکھاتے۔

سر عزیز الحق کا مارے ہنسی کا برا حال ہو گیا اور میں اس قدر کھسیانا ہوا کہ کچھ نہ پوچھیے۔ خیر شناختی کارڈ ہم دونوں نے دکھائے، جب جا کر اس لڑکے نے ہمیں ٹھیک راستہ بتایا۔

اس زمانے میں انگلستان میں ہر شخص کو شناختی کارڈ دیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ بادشاہ اور وزیر اعظم بھی اپنا شناختی کارڈ اپنی جیب میں رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ بادشاہ مع بیگم بادشاہ ایک فیکٹری کا ملاحظہ کرنے گئے۔ میں بطور نامہ نگار ساتھ تھا۔ اس فیکٹری میں جنگی سامان تیار ہوتا تھا۔ جب ہمارا قافلہ فیکٹری کے پھاٹک پر پہنچا، تو پہرے دار نے پہلے تو بادشاہ کو سلوٹ کیا اور پھر کہا، حضور شناختی کارڈ۔ بادشاہ نے فوراً شناختی کارڈ نکال کر پہرے دار کو دکھایا۔ پہرے دار نے کارڈ دیکھا، سلوٹ کیا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا، تاکہ بادشاہ اندر جا سکے۔

اب خدا جانے یہ بات پروپیگنڈے کے لیے پہلے ہی حکومت نے بنا رکھی تھی یا واقعی اس گورے نے جرأت کر کے بادشاہ سے شناختی کارڈ دکھانے کو کہا۔ لیکن اگلے دن تمام اخبارات میں اس بات کا چرچا تھا اور اس کارنمایاں کے صلے میں اس گورے کو کچھ انعام بھی دیا گیا۔

شناختی کارڈ حاصل کرنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ اس کے بغیر راشن کارڈ نہیں ملتا تھا اور راشن کارڈ نہ ملے، تو انسان بھوکا رہتا تھا۔

ایک تو راشن کارڈ کے قانون سخت اور دوسرے انگلستان کے لوگ قوم پرست۔ شاذ ہی کوئی آدمی قانون کی خلاف ورزی کرتا تھا۔

جنگ کے دوران میں لیو ایمری سیکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کے یہاں مجھے جب بھی چائے دی گئی، پھیکی۔ ان کے پاس کسی مہمان کے لیے فالتو شکر تھی ہی نہیں، تو دیتے کہاں سے۔ کمال یہ ہے کہ مہمان کے سامنے پھیکی چائے پیش کرتے ہوئے انہیں کوئی سراسیمگی بھی نہیں ہوتی تھی اور ایک ہم ہیں کہ ملمع کی زندگی میں خوش ہیں۔ اس ملمع کی زندگی کا تار و پود کیونکر بکھرتا ہے، اس کے بارے میں ایک قصہ سن لیجیے۔

ایک شخص تھا دیانتدار، محنتی، اپنی کھال میں رہنے والا۔ اس کا واسطہ ایک ایسے شخص سے پڑ گیا جو ظاہرداری کو بہت مرغوب رکھتا تھا۔ یہ میاں ظاہردار بیگ ایک دن اس غریب آدمی کے یہاں پہنچے۔ جاتے ہی انواع و اقسام کے کھانوں کی فرمائش کر دی۔ یہ غریب بہت پریشان ہوا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ ظاہردار بیگ کی کلا جو والی جوتی چپکے سے اٹھائی، بازار میں پندرہ دام لگے، بیچ دی اور طرح طرح کی مٹھائیاں، کیک اور پھل لے کر ظاہردار بیگ کے آگے رکھے۔ ظاہردار بیگ بہت خوش کہ خوب خاطر تواضع ہوئی۔ بولا بھائی بہت کمال کر دیا تم نے۔ غریب بولا: "سب آپ کی جوتیوں کے طفیل ہے"۔

ظاہردار بیگ مٹھائیاں اور پھل ٹھونس کر باہر نکلا، تو جوتی غائب!۔ پوچھا بھائی جوتی کہاں گئی، غریب بولا عرض تو کیا تھا کہ پھل مٹھائیاں وغیرہ سب آپ کی جوتیوں کے طفیل ہیں۔

اللہ ہم کو کھال میں رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میں آج تک کھال میں نہیں رہا اور آج اس کا خمیازہ بھگت رہا ہوں اور خدا جانے کب تک بھگتوں گا۔

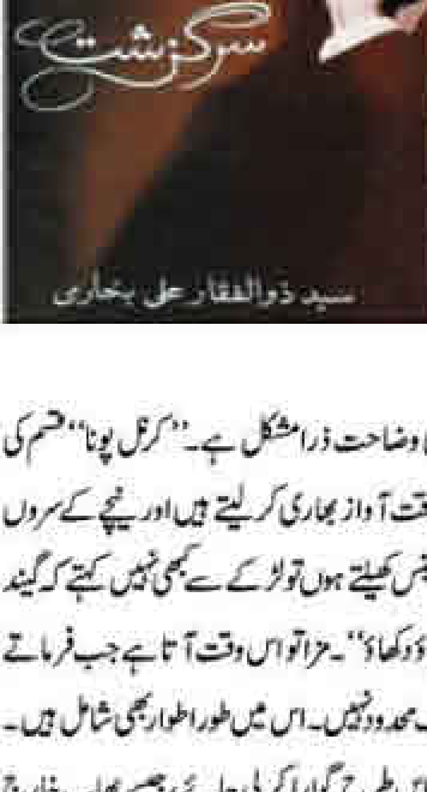
اچھا۔

"من نہ کردم شما حذر بکنید"

☆☆☆☆☆

انتباہ کے باوجود انگلستان کے بادشاہ کو پروٹوکول نہ دے سکے

حکم تھا کہ شاہی جوڑے کے سامنے ہنسنا آداب کیخلاف ہے۔ سر جھکا کر دائیں ہاتھ سے مصافحہ کیا جائے۔ دورہ بی بی سی پر شاہی جوڑا اچانک کمرے میں آیا تو سب کھلکھلا رہے تھے۔ مصافحہ کرتے وقت ہاتھ میں پکڑے تار گر پڑے۔ زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



بی بی سی میں معائنے کے لیے ایک مرتبہ بادشاہ اپنی ملکہ کے ساتھ تشریف لائے۔ میں بی بی سی کے جس سیکشن میں کام کرتا تھا، اسی میں لائنل فیلڈن بھی تھا۔ مالکم ڈارلنگ بھی اور بلراج ساہنی بھی۔ بلراج اور اس کی آنجہانی بیوی دمینتی کو میں لندن لے گیا تھا۔ بادشاہ اور ملکہ کا قصہ بعد میں بیان کروں گا، پہلے بلراج اور دمینتی کا ذکر سن لیجیے۔

دونوں جوان، خوش شکل، شریف، محنتی اور علم و ادب کے دلدادہ۔ بلراج نے لندن سے واپس آ کر فلم کی دنیا میں نام پایا، لیکن وہ مرنے والی بھی غضب کی فن کار تھی۔ میں جو کچھ اسے سکھاتا تھا فوراً یاد کر لیتی تھی اور اس بلا کی اداکاری کرتی تھی کہ بڑے بڑے ایکٹر دنگ رہ جاتے تھے۔ یہ دونوں میرے پروانے تھے اور میں ان کا پروانہ۔ ان میں تعصب نام کو نہ تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ جب ان کے یہاں بچی ہوئی تو اس کا نام انہوں نے ''شبنم'' رکھا۔

بلراج ہمری طرح ''کرنل پونا'' قسم کی انگریزیت کے خلاف تھا۔ ''کرنل پونا'' قسم کی انگریزیت کی وضاحت ذرا مشکل ہے۔ ''کرنل پونا'' قسم کی انگریزیت کے دلدادہ، نوکر سے کبھی صحیح اردو نہیں بولتے۔ آپ سے ہم سے اچھی خاصی اردو بولتے وقت آواز بھاری کر لیتے ہیں اور نیچے کے سروں میں فرماتے ہیں ''بیرا''۔ جب بیرا آتا ہے تو فرماتے ہیں ''صاحب کے واسطے کوئی پینے کا چیز لاؤ''۔ ٹینس کھیلتے ہوں تو لڑکے سے کبھی نہیں کہتے کہ گیند پھینکو۔ ہمیشہ ارشاد ہوتا ہے کہ ''چھوکرا، گولی''۔ کہنا ہو کہ پلاؤ کی رکابی پیش کرو تو فرماتے ہیں بیرا ''پلاؤ دکھاؤ''۔ مزا تو اس وقت آتا ہے جب فرماتے ہیں کہ بیرا ہم کو پانی دکھاؤ۔ ابلق گھوڑے کہیں گے ''کرنل پونا'' نوع کی انگریزیت صرف زبان تک محدود نہیں۔ اس میں طور اطوار بھی شامل ہیں۔ مثلاً کسی چھوٹے آدمی کی بات پر یوں ہنسنا جیسے طوعاً و کرہاً ہونٹوں کو ذرا سا کشادہ کرنے کی تکلیف اس طرح گوارا کر لی جائے، جیسے بھاپ خارج کرنے کے لیے ابلتی ہوئی دیگچی کا ڈھکنا ذرا سا سرکا دیا جائے۔ یہ لوگ استری کر کے پتلون نہیں پہنتے، بلکہ پتلون پہن کر اوپر سے استری کرتے ہیں۔ میرے اس بیان کی تصدیق درکار ہو تو ان لوگوں کی چال دیکھیے۔ کیا مجال کہ چلتے وقت گھٹنے میں خم پڑے۔ کالر لگائیں گے تو ایسا کہ گردن اس میں گھومنے ہی نہ پائے۔ یوں عادت پڑتے پڑتے ان کی گردن ہمیشہ کے لیے اکڑ جاتی ہے۔ فیلڈن کے ساتھ میری دوستی کی دراصل بنا ہی یہی تھی کہ ہم دونوں اس قسم کے صاحب بہادروں کے خلاف تھے۔ میں تو خیر بوجہ اپنی کم مائیگی کے ویسے بھی اکڑفوں والوں کے خلاف ہوں، لیکن فیلڈن اس لیے ان لوگوں کے خلاف تھا کہ یہ لوگ اس کی ساری قوم کو انگوکہ روزگار بناتے تھے۔ اب ہم میں تیسرا آدمی بلراج ساہنی آ ملا اور پھر اس کے ساتھ اس کی بیوی دمینتی۔

مالکم ڈارلنگ صاحب اس قسم کے انگریز تھے، جن کا میں نے حوالہ دیا ہے۔ یہ صاحب پنجاب میں کمشنر وغیرہ رہ چکے تھے اور اپنی خدمات جلیلہ کے صلے میں ''سر'' کا خطاب بھی حاصل کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے کام میں یعنی امداد باہمی کی تاریخ اور اس کی ترویج کے ڈھنگ سے خوب واقف تھے۔ اس مضمون پر ان کی کتابیں سند مانی جاتی ہیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ تھے ذرا اکڑفوں اور براڈکاسٹنگ کے کام کے لیے بالکل ناموزوں۔ صاحب چونکہ ہندوستان میں افسری کر چکے تھے اور پنشن یاب ہو چکے تھے، اس لیے ماہر جملہ امراض ہندوستان سمجھے جاتے تھے۔ میں نے ان کا نام ڈاکٹر امرت دھارا رکھ چھوڑا تھا۔ دماغ ان کا اچھا خاصا تھا مگر دل چھوٹا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ احساس کمتری میں مبتلا تھے۔ اگر ہندوستان کے بارے میں کوئی کانفرنس ہو رہی ہو اور مجھے اس میں شرکت کا پیغام آئے تو جل جاتے اور ہر ایک سے کہتے پھرتے کہ ماہر امراض ہندوستان تو میں ہوں، مجھے اس کانفرنس میں شریک ہونا چاہیے۔ میں انگریز ہوں، میری سنو، جو گوش نصیحت نیوش ہو۔ میں جو بات کہوں گا وہ انگریزوں کے نقطہ نگاہ سے ہو گی۔ بخاری تو انگریزی نقطہ نگاہ سے کوئی بات کر ہی نہیں سکتا۔

ایک میں ہی کیا ہم سب کو غلامی کے دور میں ایسے کئی انگریزوں سے واسطہ پڑ چکا تھا۔ اور ہم خوب جانتے تھے کہ ایسوں سے نپٹنا کیوں کر چاہیے۔ مجھ پر ان کا یہ اعتراض کہ یہ تو ہمیشہ ہندوستانی نقطہ نگاہ سے بات کرے گا، ان کے حق میں بہت برا ہوا۔ کیوں کہ میں نے اس اعتراض کو اپنی توصیف سمجھا اور کہا کہ اگر میں ہندوستان کے غلاموں کی طرف سے بات نہ کروں تو اور کون کریگا؟ سر مالکم ڈارلنگ؟ میں نے تو سکریٹری آف اسٹیٹ تک سے یہ کہہ دیا کہ صاحب آپ کے وطن انگلستان میں انگریز ہی انگریز ہیں، اگر آپ کو انگریزوں ہی کا نقطہ نگاہ دریافت کرنا تھا تو مجھے ہزاروں میل دور سے کیوں بلوایا۔ مجھے تو محض اس لیے بلایا گیا ہے کہ میں آپ کو غلاموں کے نقطہ نگاہ سے آگاہ کروں۔ اگر آپ اس ضمن میں آگاہی حاصل نہیں کرنا چاہتے تو مابہ خیر شما بہ سلامت، مجھے اجازت دیجیے کہ میں واپس چلا جاؤں، اللہ رزاق ہے۔

اب مالکم ڈارلنگ نے تو شاید نہیں لیکن اس کے حواریوں نے یہ بے پرکی اڑا دی کہ بخاری کمیونسٹ ہے۔ مجھے کمیونسٹ مشہور کر دینے میں ان لوگوں کو آسانی یہ تھی کہ بہت سے کمیونسٹ میرے دوست تھے۔ ہندوستان میں بھی اور انگلستان میں بھی۔ بمبئی میں ظہیر کے یہاں کی محفلیں اور ان میں تمام یاران سرپل کی شرکت کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ اور پھر یہ کہ انگلستان کے قیام کے دوران میں بھی ان دوستوں سے خط و کتابت جاری رہی۔ سب میں مشہور ہو گیا کہ بخاری کمیونسٹ ہے۔ یہاں تک کہ مجھ سے پوچھ گچھ بھی ہوئی۔ اس پوچھ گچھ پر مجھے بہت غصہ آیا اور غصہ میں آ کر کیا معلوم میں کیا کیا کہہ گیا۔ سکریٹری آف اسٹیٹ سے تو میں نے یہاں تک کہہ دیا کہ صاحب کیا آپ اپنے وطن کے کمیونسٹ لوگوں کو پانی نہیں دیتے؟ راشن نہیں دیتے؟ ان کو سڑکوں پر چلنے کی مناہی ہے؟ دکان سے سودا خریدنا ان کے لیے ممنوع ہے؟ اگر دکان دار ان سے بات کرے تو گردن زدنی ہے؟ اگر کوئی عورت ان سے شادی کرے تو کشتنی ہے؟ اگر یہ نہیں تو میں نے ان سے محبت پال لی تو کیا برا کیا؟ اور پھر آپ ہم کو اتنا بچہ سمجھتے ہیں کہ ذرا کمیونسٹوں سے اختلاط ہوا اور ہم بھی کمیونسٹ ہو گئے۔ آپ یہ کیوں فرض نہیں کر لیتے کہ کمیونسٹ لوگ، ممکن ہے غیر کمیونسٹ لوگوں سے مل کر پارسا ہو جائیں!

الغرض میرے سیاسی عصیاں کا معاملہ رفع دفع ہو گیا، مگر مالکم ڈارلنگ میری نظروں سے کھٹکنے لگا اور باقاعدہ اعلان جنگ ہو گیا۔ اب اس قصے کو کہاں تک طول دوں۔ مختصر یہ کہ سر مالکم ڈارلنگ بی بی سی سے رخصت ہو گئے۔ اس تمام جھگڑے میں بلراج اور دمینتی میرے ساتھ تھے اور خوب ہنستے تھے۔ ان کے ہنسنے کی وجہ یہ تھی کہ مجھے سیکریٹری آف اسٹیٹ کے سامنے اپنی صفائی پیش کرتے وقت تو غصہ آیا، لیکن اس کے بعد میں نے سارے معاملے کو ایک بہت بڑا مذاق سمجھا اور سر مالکم ڈارلنگ کے خلاف جو قدم بھی اٹھایا استہزا کے طور پر۔ مجھے اس آدمی پر غصہ نہیں آتا تھا۔ اس پر ہنسی آتی تھی اور اسی ہنسی میں بلراج اور دمینتی میرے برابر کے شریک تھے۔

اب سنیئے بادشاہ سلامت اور ان کی ملکہ کی آمد کا قصہ۔ ایک روز اعلان ہوا کہ نظر سامنے باادب، باملاحظہ، ہوشیار، شاہ کی سواری آتی ہے۔ شاہ سے ملنے کے آداب یہ ہیں کہ جب حضور ملک معظم تشریف لائیں تو چہ مالکم ڈارلنگ، چہ فیلڈن اور چہ بخاری سب اپنے اپنے سروں کو جھکا دیں۔ لیکن خبردار پشت باہر نہ نکلنے پائے۔ بس یوں معلوم ہو کہ گردن میں دم نہیں۔ خود ہاتھ بڑھائیں تو تم اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے اپنا ہاتھ آگے بڑھاؤ اور اگر فاصلہ زیادہ ہو اور دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے سے مل نہ سکیں تو چھوٹا سا قدم لے کر آگے بڑھو۔ ڈگ ہرگز نہ بھرنا۔ دوران ملاقات میں چہرے پر مسکراہٹ رکھو۔ صرف مسکراہٹ، بتیسی نہ دکھانا۔ دوران گفتگو میں بادشاہ سلامت کو صرف ایک مرتبہ یور مجسٹی کہہ کر مخاطب کرو۔ اس کے بعد صرف ''سر''۔ ملکہ سلامت کو بھی ایک مرتبہ یور مجسٹی کہو اس کے بعد میڈم نہیں، بلکہ عوام کے تلفظ میں ''میم'' کہو۔ ان ہدایات کے دوران میں مالکم ڈارلنگ کا چہرہ اس قدر سنجیدہ تھا کہ خدا کی پناہ! بلراج اور میں دونوں نے ہنسی اس زور سے ضبط کر رکھی تھی کہ ہمارے چہرے دوران خون کے رکنے کے باعث سرخ ہو رہے تھے۔ مالکم ڈارلنگ کے چہرے کو دیکھ کر ضبط نہ ہو سکا اور ہم کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اس کو ہماری انتہائی بدتمیزی اور انتہائی گستاخی قرار دیا گیا۔

اس مرحلے کے بعد تلاشی کا مرحلہ آیا۔ یعنی حکم ملا کہ سب کی تلاشی لی جائے کہ کہیں کسی کے پاس پستول یا کوئی اور مہلک شے تو نہیں۔ اب اسے مالکم ڈارلنگ کی قسمت کہیے یا کچھ اور اس کے کمرے کے لوگوں کی تلاشی لینے کے لیے جس شخص کو مقرر کیا گیا، وہ یہ خاکسار بخاری تھا۔ قطار بندھ گئی اور میں ہنستے ہوئے سب کی جیبوں کو باہر سے ٹٹولنے لگا۔ جب مالکم ڈارلنگ کی باری آئی تو میں نے اسے صید زبوں سمجھ کر ویسے ہی چھوڑ دیا۔ اس امتیازی سلوک پر اس کا چہرہ شرم کے مارے اور بلراج کا چہرہ ہنسی کے مارے سرخ ہو گیا۔

اس زمانے میں ہندوستان اور انگلستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ قریب قریب منقطع ہو گیا تھا۔ ڈاک کا جہاز جرمنوں کے سمندری حملوں سے بچتا بچاتا ہندوستان پہنچ گیا تو پہنچ گیا، ورنہ نجی خط کا پہنچنا محال تھا۔ اس لیے ہم نے یہ بندوبست کر رکھا تھا کہ انگلستان میں رہنے والے ہندوستانیوں کو ایک ایک منٹ کے لیے اپنی خیریت کی خبر سنانے کے لیے مائیکروفون پر بلاتے تھے۔ ہندوستان سے ہمیں ہر روز متعدد تار آتے تھے کہ ہمارے فلاں صاحب زادے کو مائیکروفون پر بلاؤ۔ ہم اس کی آواز سننے کے لیے بے چین ہیں۔ ایسے بہت سے تار میں نے اکٹھے کر کے اپنی جیب میں رکھ لیے کہ بادشاہ سلامت آئیں گے تو ان کو دکھاؤں کہ دیکھیے ہم کتنا مفید کام کر رہے ہیں اور ہندوستان کے لوگ ہمارے ریڈیو کی آواز سننے کے لیے کس قدر بے تاب ہیں۔

نو بجے کے قریب ہمیں اطلاع ملی کہ حضور ملک معظم نے مع ملکہ سلامت کے بی بی سی میں نزول اجلال فرمایا ہے۔ گھومتے گھماتے، خراماں خراماں ہمارے کمرے میں بھی تشریف لائیں گے۔ کس وقت آئیں گے یہ کوئی نہ بتا سکا۔ البتہ ہمیں یہ ہدایت کی گئی کہ تم ہمہ وجوہ تیار رہو۔ کہیں یہ نہ ہو کہ وہ اچانک دروازہ کھول کر اندر تشریف لائیں اور تم گلی ڈنڈا کھیل رہے ہو۔ چنانچہ ہم کمرے میں یوں بکھر کر کھڑے ہو گئے جیسے کسی ڈرامہ کے کسی اہم سین میں ایکسٹرا اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بلراج نے تجویز پیش کی کہ حضرات بہتر یہ ہو گا کہ ہم سب اپنا اپنا سر ابھی سے جھکا لیں۔ یہ کہہ کر بلراج اپنا سر نیچے جھکا لیا۔ سوائے مالکم ڈارلنگ کے ہم سب کے سب ہنس رہے تھے کہ دروازہ کھٹ سے کھلا اور حضور ملک معظم مع ملکہ کے کمرے میں داخل ہوئے۔ ہم سب نے سنبھلنے کی کوشش کی۔ بوکھلاہٹ میں یہ کوشش کچھ اس قدر بھونڈی نظر آئی کہ بادشاہ اور ملکہ کے چہرے پر تبسم آ گیا۔ بس پھر کیا تھا ہم نے فوراً سر جھکا لیے اور میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر تار نکالے۔ تار میرے دائیں ہاتھ میں تھے کہ بادشاہ نے مصافحے کو ہاتھ بڑھایا۔ میں نے جلدی سے تار بائیں ہاتھ میں پکڑنے کی کوشش کی تاکہ دائیں ہاتھ سے مصافحہ کر سکوں لیکن جلدی میں کچھ تار میرے ہاتھ سے گر گئے۔ بلراج چپکے سے آگے بڑھا، جھکا اور گرے ہوئے تار اٹھا کر مجھے دیے۔ میں اس وقت کم بخت بلراج سے آنکھیں ملانا نہیں چاہتا تھا، مگر مل گئیں اور ہم دونوں ہنس پڑے۔ بادشاہ سلامت بھی ہماری سراسیمگی دیکھ کر ازراہ تلطف ہنس پڑے۔ میں نے ادھر ادھر کی باتیں کیں اور پھر کہا حضور یہ تار ملاحظہ فرمایئے۔ بادشاہ نے فرمایا ذرا احتیاط سے پھر نہ گر پڑیں۔ ایک تو فقرہ چست اور دوسرے بادشاہ کی زبان سے صادر ہوا، سب ہنسے یہاں تک کہ مالکم ڈارلنگ بھی!

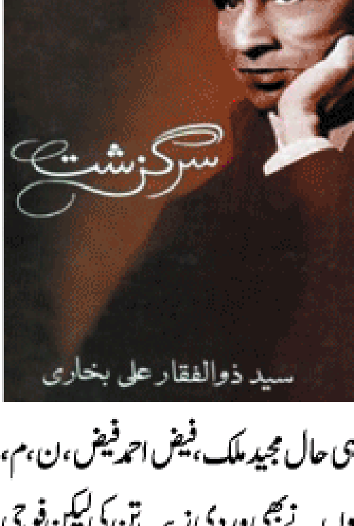
(جاری ہے)

☆☆☆☆☆

بدھ/30 اپریل 2014ء
روزنامہ امت کراچی/حیدر آباد

روم میں ایک روٹی کے عوض عزتیں بیچی جاتی تھیں

جنگ عظیم دوم نے شریفوں کو بھی پیٹ بھرنے کیلئے جسم فروشی پر مجبور کر دیا تھا - ایک دکاندار نے چھڑی کی قیمت اپنے بیوی بچوں کیلئے دو وقت کا کھانا لگائی - اٹلی کی اقتصادی حالت عوام نے درست کی - زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



آپ نے مغربی ممالک کا کوئی نہ کوئی ایسا شخص ضرور دیکھا ہوگا جو اپنے شوق کے باعث یا ہمیں بے وقوف بنانے کی خاطر شلوار پہنتا ہے، پگڑی باندھتا ہے، پاؤں میں چپل پہنتا ہے۔ لیکن باوجود اس معقول لباس کے نامعقول نظر آتا ہے۔ کسی میم صاحب کیلئے ساری باندھ لینا تو آسان ہے، لیکن ساری کو سنبھالنے کیلئے جس طرح ہمارے یہاں کی خواتین چابک دستی سے کام لیتی ہیں، وہ مغربی خواتین کیلئے مشکل ہے۔ میم صاحب ڈھلکتی ہوئی ساری کو اس بھونڈے انداز سے کندھے پر ڈالتی ہیں جیسے گلے کے گرد مفلر لپیٹ رہی ہوں۔ کچھ یہی حال فوجی وردی پہن کر میرا بھی ہوا۔

جب اٹلی پر اتحادیوں کا قبضہ ہوا تو مجھے وردی پہن کر لندن سے روم بھیجا گیا۔ وردی تو میں نے پہن لی اور وہ بیری ٹوپی بھی پہن لی جسے جنرل منٹگمری نے شہرت بخشی تھی، لیکن وردی پہن کر فوجیوں کی طرح چلنا نہ آیا۔ ایسا ہی حال مجید ملک، فیض احمد فیض، ن، م، راشد، چراغ حسن حسرت کا تھا۔ جنگ کے دوران میں ان حضرات کو بھی میجر، کرنل، کپتان وغیرہ بنا دیا گیا۔ انہوں نے بھی وردی زیب تن کی لیکن فوجی نہ بن سکے۔ غریب چراغ حسن حسرت کا تو عجیب حال تھا۔ منہ میں پان، وردی کے کوٹ کے بٹن کھلے ہوئے، مگر فوجی پیٹی بندھی ہوئی۔ یا کوٹ کے بٹن بند اور پیٹی کھلی ہوئی۔ اس ہیت کذائی میں جب کبھی سلوٹ لینے یا سلوٹ مارنے کا موقعہ آ پڑتا تھا تو ہاتھ یوں اٹھاتے، جیسے کہہ رہے ہوں مکرر ارشاد۔

مولانا چراغ حسن حسرت کا ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔ کراچی ریڈیو میں قومی پروگرام کو مرتبہ کرنے کا کام ان کے سپرد کیا گیا۔ ان کے ساتھ احمد بشیر اور احمد فراز کو بھی لگا دیا گیا۔ ایک دن تین بجے سہ پہر کو میں ان کے دفتر میں آیا۔ چائے کا دور چلا، شعر و شاعری کی موجیں اٹھیں، طنز و مزاح کی محفل گرم ہوئی کہ اتنے میں ایک پروڈیوسر نے آ کر کہا، مولانا آج کا فیچر کوئی پانچ منٹ چھوٹا پڑ رہا ہے۔

ہم نے ریہرسل میں بہت کھینچا تانی کی لیکن پھر بھی کم پڑتا ہے۔ کچھ سطریں اور لکھ دیجئے۔ مولانا اس وقت مجلسی رنگ میں تھے، دماغ پر دفتری رنگ کا ملمع کیوں کر لیتے۔ پان چباتے رہے، ٹانگیں ہلاتے رہے اور سگریٹ مٹھی میں بند کر کے پیتے رہے اور اسی حالت میں مجھ سے کہا، مولانا آپ کچھ مدد کیجئے۔ اپنا دماغ اس وقت حاضر نہیں۔ میں نے پوچھا حضرت فیچر کس موضوع پر آپ نے رقم فرمایا ہے۔ پان کی پیک کو ہونٹوں میں سنبھالتے ہوئے بولے: ''اپوا''۔ میں نے کہا پھر تو کوئی بات نہیں ''اے ماؤ، بہنو، بیٹیو'' والی نظم فیچر میں داخل کر دیجئے۔ وقت پورا ہو جائے گا۔ حالی کی اس نظم کی تلاش شروع ہوگئی، مگر ریڈیو کے دفتر میں دستیاب نہ ہوئی۔ فوراً ایک آدمی کتب فروش کی دکان پر بھیجا گیا کہ کتاب خرید لائے۔ مجھے مولانا کے پاس بیٹھے کوئی گھنٹہ بھر گزر چکا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اجازت لی اور گاڑی میں سوار ہو گیا۔ گاڑی چلانے ہی والا تھا کہ مولانا اور پروڈیوسر بھاگتے ہوئے آئے۔ میں نے گاڑی ٹھہرا لی اور پوچھا خیریت ہے۔ فرمایا وہ نظم تو مل گئی ہے، لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اسے چسپاں کہاں کیا جائے۔ میں نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے پروڈیوسر سے کہا کہ لاؤ بھائی مسودہ، تم بھی تو ہر بات میں بچوں کی طرح انا کی مدد چاہتے ہو۔ یہ کہہ کر میں نے قدرے برہمی کے ساتھ مولانا کا لکھا ہوا مسودہ پروڈیوسر سے لیا۔ اب جو دیکھتا ہوں تو اس مسودے کا عنوان تھا ''افواہ''، جو مولانا کے پان بھرے منہ میں ''اپوا'' بن گیا تھا۔ اب آپ ہی خیال فرمایئے کہ ''اے ماؤ، بہنو، بیٹیو'' والی نظم ''افواہ'' کے فیچر میں کیا خاک کھپتی۔ میں مسودہ پھینک گاڑی چلا براڈکاسٹنگ ہاؤس سے بھاگا۔ مولانا حسرت حیران کہ اس شخص کو کیا ہو گیا کہ اس قدر عجلت میں بھاگ گیا ہے۔ وہ کیا جانیں کہ حضرت نے ''افواہ'' کا تلفظ کچھ اس طرح کیا تھا کہ میں گنہگار ''اپوا'' سمجھا۔

مولانا کے رفقا، مجید ملک کے واقف کار، فیض کے دوست، راشد کے نیاز مند، اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ حضرات وردی میں کیا دکھائی دیتے ہوں گے۔ ان کی جامہ زیبی بجا، لیکن وردی جامہ نہیں۔ جامہ عجیب پوش ہوتا مگر وردی عجیب نما۔ خیر میں نے وردی پہنی اور لندن سے روم پہنچا۔ روم کے بازاروں میں اگر کوئی سپاہی مل جاتا اور سلوٹ کرتا تو میں بسا اوقات اسے جواباً سلوٹ نہ کر سکتا۔ صرف مسکرا دیتا یوں جیسے اس نے کہا ہو حضرت مزاج گرامی اور میں جواب میں کہوں الحمدللہ آپ کا مزاج گرامی؟۔ اپنے سے بڑے افسر کو سلوٹ کرنے کا موقع آتا تو میں منہ موڑ کر کسی دکان کے اندر جھانکنے لگتا اور دکان کے شیشے میں سے دیکھتا رہتا کہ بلا ٹلی یا نہیں۔ جب بلا ٹل جاتی تو میں شکر کا کلمہ پڑھتا اور مڑ کر پھر خراماں خراماں چلنے لگتا۔ نیپلز میں میرے ساتھ بہت بری ہوئی۔ میں وردی پہنے بازار میں جا رہا تھا۔ موڑ مڑا ہی تھا کہ انگریز سپاہیوں کی ایک ٹولی اچانک سامنے آ گئی اور سپاہیوں نے اچانک مجھ سلوٹ کیا۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے محض اضطراری کیفیت میں اپنی ٹوپی اتار لی۔ مجھے سپاہیوں کے چہروں پر ہنسی ضبط کرنے کے آثار بہت نمایاں دکھائی دیئے۔ خیر سپاہی ایک گلی میں مڑ گئے۔ میں نے ٹوپی سر پر رکھی اور اپنے عطائی پنے کو کوستا ہوا آگے بڑھا۔ اب جو دیکھا تو سپاہیوں کی وہی ٹولی پھر سامنے سے آ رہی ہے۔ اب میں کیا کرتا۔ تہیہ کر لیا کہ اب کے ٹوپی نہیں اتاروں گا۔ سلوٹ کا جواب سلوٹ سے دوں گا۔ سپاہی میرے قریب آئے۔ آنکھیں اور گردنیں میری طرف موڑ دیں اور مجھے سلوٹ کیا۔ میں نے بھی جواب میں سلوٹ کرنے کی کوشش کی، لیکن شاید میں نے زیادہ کوشش کی، زیادہ پھرتی دکھائی کیونکہ میرا اپنا ہاتھ زور میں میرے سر سے اوپر نکل گیا۔

اب ان کم بخت سپاہیوں کو مذاق سوجھا۔ دکانوں کا چکر لگا کر میرے سامنے آ گئیں اور مجھے سلوٹ کریں۔ آخر جب تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد مجھے چار پانچ سلوٹ کرنے پڑے تو میں نے ان سپاہیوں کو ٹھہرا لیا اور ان سے کہا کہ اے برخوردارو، کیوں مردم آزاری پر کمر بستہ ہو۔ دیکھتے نہیں ہم فقیر لوگ ہیں۔ اگر تم نے زیادہ پریشان کیا تو اپنی وردی پھاڑ دیں گے پھر جو ہو سو ہو۔ اس کے بعد ان سپاہیوں سے صلح صفائی ہو گئی۔ انہوں نے جان لیا کہ یہ شخص ہاتھ سے قلم گھستا ہے، سلوٹ نہیں کر سکتا۔ اب میں نے خیریت اسی میں سمجھی کہ پیدل چلنا موقوف کر دوں اور سواری کا بندوبست کروں۔ اس زمانے میں ٹیکسیاں سرے سے مفقود تھیں۔ صرف فوجی گاڑیاں نظر آتی تھیں۔ میں نے ہاتھ پاؤں مار کر ایک جیپ گاڑی سواری کیلئے فوجیوں سے لے لی۔ گاڑی کے مل جانے کے بعد راوی نے چین لکھنا شروع کیا۔ میں شہر کے رستوں سے نابلد تھا، اس لئے میری درخواست پر شہر میں گاڑی چلانے کیلئے مجھے ایک ڈرائیور دے دیا گیا۔ یہ ڈرائیور اطالوی تھا۔ نہایت ہوشیار۔ ہوشیار کیا چلتا پرزہ۔ شہر کے کونے کونے سے واقف۔ مجھ جیسے کوچہ گرد انسان کیلئے ایسے ڈرائیور کا مل جانا نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ شہر کا کونہ کونہ چھان ڈالوں گا۔ یہاں مصیبت یہ پڑی کہ شہر کے کچھ گلی کوچے ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں فوج کا محکمہ فوج کے جان و مال کی حفاظت کیلئے فوجی پولیس متعین کر دیتا ہے اور واضح طور پر بورڈ لگا دیتا ہے کہ یہ علاقہ فوجیوں کیلئے بند ہے۔ جب گاڑی کو میں جیب میں نہیں ڈال سکتا تھا، اپنی وردی کو چھپا نہیں سکتا تھا، لامحالہ میں نے وردی کو ان خاص علاقوں کی سیاحت کے موقع پر خیرباد کہنا ہی مناسب سمجھا اور گاڑی مقام ممنوعہ و ناگفتہ بہ سے دور کھڑی کر دی۔ پاکٹ بک اور دو چار پنسلیں جیب میں ڈالیں اور داخل بازار حسن ہوا۔ یہاں عجیب حالت دیکھی۔ یہاں جسم کے بدلے روپیہ نہیں لیا جاتا تھا۔ ایک یا آدھی ڈبل روٹی پر جسم کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ دکان دار صاف کہہ دیتا تھا کہ صاحب روپیہ لے کر کیا کریں گے، یہاں کوئی ہوٹل نہیں کہ روٹی خریدیں۔ یہاں کوئی بزاز نہیں کہ کپڑے مول لیں، ہمیں روٹی کا ٹکڑا دے دو اور اس روٹی کے ٹکڑے کے عوض جو جسم تمہیں پسند آئے خرید لو۔ اس بازار میں فوجیوں کا داخلہ ممنوع تھا اور فوجی ہی تھے جن کو روٹی میسر تھی اور جو روٹی دے سکتے تھے۔ چنانچہ یہاں کی رہنے والی طوائفوں نے جب کساد بازاری دیکھی تو اکثر نے اس بازار کو چھوڑ دیا اور ان بازاروں میں رہنے سہنے لگیں جہاں فوجیوں کا داخلہ کھلا تھا۔ جب شریفوں کے محلے میں ان کا کاروبار چلنے لگا اور انہیں پیٹ بھرنے کو روٹی ملنے لگی تو اڑوس پڑوس کے بھوکے شریفوں نے بھی ان کی دیکھا دیکھی جسم فروشی کر کے پیٹ پالنے کا دھندا اختیار کر لیا۔ یورپین سپاہی ہاتھ میں ڈبل روٹی لئے سڑک پر سے گزرتے تو لوگ اپنی بیویوں اور بیٹیوں کو اکیلا چھوڑ کر ادھر ادھر ٹل جاتے کہ سودا ہو جائے اور شام کی روٹی میسر آئے۔ فوجی سگریٹ پیتے ہوئے سڑک پر چل رہے ہوں تو ان کے پیچھے لوگوں کی ایک قطار ہوتی کہ کب یہ سگریٹ کا ٹھنٹھ سڑک پر پھینکے اور ہم کو ایک آدھ کش مل جائے۔ میں ٹہلتے ٹہلتے ایک جوہری کی دکان پر پہنچا۔ میں اس کو امن کے زمانے سے جانتا تھا۔ لکھ پتی آدمی تھا۔ میں اس کی دکان میں گھس گیا۔ بہت تپاک سے ملا۔ مگر یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اس کی ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی ہوں۔ لب بند، رنگ زرد، میں نے مناسب نہ سمجھا کہ بات کرید کر پوچھوں۔ دکان میں ٹہلتا ٹہلتا وہاں پہنچا جہاں چھڑیاں رکھی تھیں۔ ایک چھڑی مجھے بہت ہی اچھی لگی۔ میں نے کہا کہ یہ خریدنا چاہتا ہوں۔ کہا بخوشی۔ میں نے کہا کیا دام ہیں۔ یہ سن کر اس لکھ پتی نے آہ بھری اور کہا تم سے پیسے لے کر کیا کروں گا۔ تم یوں کرو کہ مجھے اور میری بیوی بچوں کو آج شام کا کھانا اپنے فوجی میس میں کھلا دو۔ یہ تھی جنگ کے بعد اٹلی کی حالت۔ وہ اٹلی جو اقتصادی طور پر آج پاؤں پر کھڑا ہے۔ آج تو خیر اس کی حالت بہت ہی اچھی ہے۔ جنگ کے کوئی دو سال بعد بھی اس کی حالت فاتح انگلستان سے بہتر تھی۔ فلورنس کا میئر میرا دوست تھا۔ ایک دن اس کے یہاں انگلستان اور اٹلی کی اقتصادی حالت کا تذکرہ چھڑا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آخر یہ بات کیا ہے کہ فاتح انگلستان تو اب بھی پھٹے حالوں میں، اب بھی وہاں کھانے پینے کی چیزوں پر کنٹرول ہے اور ایک تم ہو کہ شکست کھا کر بھی تمہارا سر اونچا ہے۔ نہ یہاں خوراک کا راشن ہے نہ کچھ اور۔ یہ بات کیا ہے؟ کہا، بات صرف اتنی ہے کہ انگلستان والوں کیلئے جو کچھ کرتی ہے حکومت کرتی ہے۔ یہاں اٹلی میں کبھی کوئی حکومت تھی ہی نہیں۔ تھی بھی تو کچھ عرصے کیلئے موسولینی کی۔ یہاں تو جو کچھ ہوتا ہے عوام خود کرتے ہیں۔ یہاں کے عوام جب بھوکے مرنے لگے تو خود میدان میں اترے اور خود اپنی اقتصادی حالت کو درست کرنے میں لگ گئے۔ اور پھر تم جانو عوام جس بات کو کرنا چاہیں دنوں میں کر لیتے ہیں۔ حکومت کی مشینری ذرا بھاری بھرکم ہوتی ہے۔ اسے چلنے میں ہمیشہ دیر لگا کرتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم، پہلی جنگ عظیم سے زیادہ ہولناک تھی۔ اب کے اگر جنگ چھڑی اور اس میں نئے مہلک اسلحہ استعمال ہوئے تو یوں سمجھ لیجئے کہ قیامت کا نمونہ نظر آئے اور وہ بھی اس شرط پر کہ کوئی دیکھنے والا باقی رہ جائے! (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

جمعرات/یکم مئی 2014ء

روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

دوسری جنگ عظیم میں لزبن جاسوسوں کا گڑھ بنا ہوا تھا

غیر جانبدار ہونے کے سبب جرمن اور انگریز اسی شہر میں رہتے ہوئے پروپیگنڈا مہم چلا رہے تھے- ایک جرمن افسر میرے نام اور تمام کوائف سے آگاہ نکلا تو حیران رہ گیا- تقدیر نے یقینی موت سے بچا لیا- زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



میں نے ایک فلم "بنجارن" دیکھی- یہ فلم کیا تھی دیدہ دلیری، سینہ زوری اور چوری کی چلتی پھرتی تصویر تھی اور وہ بھی بھونڈی- فلم کا مرکزی خیال برناڈ شاہ کے مشہور ڈرامے اور مشہور فلم "پگ مے لی ان" سے لیا گیا تھا، لیکن فلم "بنجارن" بنانے والوں کو اتنی توفیق بھی نہ ہوئی کہ برناڈ شاہ ٹھہرا معمولی سا آدمی، "پگ مے لی ان" ٹھہرا معمولی سا ڈرامہ، ہم ان کا نام لے کر اپنے کمال کو بٹہ کیوں لگائیں- برناڈ شاہ کی کہانی میں اس عشق و محبت بلکہ اس بے حیائی کا کہیں شائبہ بھی نہیں جو فلم بنجارن میں روا رکھی گئی- اگر کوئی باہر کا آدمی اس فلم کو دیکھے تو یقیناً اس نتیجے پر پہنچے کہ پاکستان کے فلمساز چوری کرتے ہیں اور وہ بھی بغیر سوچے سمجھے- ایک تو چوری پھر اس پر بھونڈی چوری- یعنی ایک تو چھپے منہ اور دوسرے در پھٹے منہ- اس عورت کا نام اس وقت میرے ذہن سے اتر گیا ہے، جس نے بنجارن کا پارٹ کیا- اس نے اپنی تھرک پھرک سے دعوت نظارہ دی اور یوں فلم بنانے والوں کی تجوری میں کچھ پیسے آ گئے، ورنہ اس بھونڈی فلم کا بھانڈا چوراہے میں پھوٹتا-

ایک تو دنیا کے عظیم الشان اہل قلم برناڈ شاہ کے ڈرامے کی چوری- دوسرے یہ کہ جب انگلستان میں "پگ مے لی ان" فلم تیار ہو رہی تھی تو میں اپنے ایک دوست کی وساطت سے سیٹ پر جایا کرتا تھا اور کچھ بے حیائی اور بد تہذیبی کے مختلف مناظر- مجھے فلم "بنجارن" نے سخت بیزار کیا- جس دوست کی وساطت میں "پگ مے لی ان" کے سیٹ پر جایا کرتا تھا، اس کا نام تھا لیزلے ہاورڈ- جوان آدمی، پڑھا لکھا، خوش شکل، خوش وضع، اسٹیج اور فلم کا مشہور اداکار، اتنا مشہور اور اتنا باکمال کہ برناڈ شاہ جیسے نکتہ چین اور نکتہ شناس نے اس کو اپنے اس ڈرامے میں پروفیسر کا مرکزی کردار ادا کرنے کے لئے منتخب کیا- لیزلے ہاورڈ میرے یہاں اکثر آیا جایا کرتا تھا- میں نے زندگی کی کئی یادگار اور رنگین شامیں لیزلے ہاورڈ کے ساتھ گزاری ہیں-

جب جنگ چھڑی تو انگلستان کے مشہور ایکٹر محاذ جنگ پر گئے، اپنے ہم وطن سپاہیوں سے ملے، جہاں جہاں ممکن ہوا ان کے سامنے کھیل تماشے کئے اور ان کا دل بڑھایا- لیزلے ہاورڈ بھی جگہ جگہ گیا، تقریریں کیں، کھیل تماشے پیش کئے، خندقوں میں گھوما اور خندقوں کے اداس ماحول میں زندگی کی لہر دوڑائی- لیکن لیزلے ہاورڈ، جان گیل گڈ، نیول کارڈ جیسے مشہور اداکار اور اہل علم کا کام محض محاذ جنگ تک محدود نہ تھا- یہ لوگ دراصل اپنے ملک کے سفیر تھے- جہاں کہیں بھی ان کی ضرورت پڑتی، انہیں بکار خاص بھیج دیا جاتا- یہاں تک کہ سر جان گیل گڈ جیسے نامی ایکٹر اور ڈیم ایڈتھ اے ونز جیسی مشہور ایکٹرس نے ہندوستان کا دورہ بھی کیا- کچھ اسی قسم کے کام پر مجھے دوران جنگ میں پرتگال کے صدر مقام لزبن بھیجا گیا-

پرتگال جنگ میں شریک نہیں تھا- غیر جانبدار تھا- اس لئے لزبن کا شہر ہر ملک کے آنے جانے والوں کے لئے کھلا تھا- ہمیں کڑی ہدایت کی گئی کہ کانوں کان کسی کو خبر نہ ہو کہ تم کہاں اور کب جا رہے ہو- رات کی تاریکی میں چھپتے چھپاتے ہم لندن کے قرب و جوار کے کسی ایئرپورٹ پر گئے اور وہاں سے چکر کاٹ کر مغرب کا رخ کیا- کچھ معلوم نہ تھا کہ کہاں جا رہے ہیں- لیکن کوئی ڈھائی تین گھنٹے کے بعد ہمارا جہاز آئرلینڈ میں شینن کے مقام پر اترا- آئرلینڈ بھی جنگ سے الگ تھلگ تھا- اس لئے یہاں نہ راشن تھا، نہ کوئی کنٹرول، نہ فوجی ہلچل- ایئرپورٹ کے ریسٹوران میں گئے تو آنکھیں کھل گئیں- چینی کا بھرا ہوا تشا کا سہ، مکھن کی ہی اینٹ جتنی بڑی، چائے، دودھ، چاکلیٹ، روٹی! ہم کو اس مقدار میں یہ چیزیں لندن میں کہاں نصیب ہوتی تھیں- ہم ندیدوں کی طرح کھانے پر پل پڑے- آئرلینڈ نسبتاً غریب ملک ہے، لیکن کھانے پینے کی چیزوں کی فراوانی دیکھ کر ہر شخص دل میں خیال کرنے لگا کہ یہ ملک خوشحال ہے- جنگ میں شریک ہونا بدحالی کو دعوت دینا ہے اور جنگ سے الگ تھلگ رہنا خوش حالی کو- ہمیں پراپیگنڈے کا یہ خوش گوار طریقہ بہت پسند آیا-

میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر ہمارے کراچی کے ایئرپورٹ کے ریسٹوران کا انتظام و انصرام بہتر پیمانے پر ہو جائے تو کتنا اچھا ہو- ہمارے ملک میں کسی چیز کی کمی نہیں- لیکن پھر بھی اس ریسٹوران میں چینی اس گنگنی کی کلیا میں دی جاتی ہے، جو عام طور پر بٹیروں کے پنجرے میں رکھنے کے کام آتی ہے- دودھ بقدر اشک بلبل- جی چاہتا ہے کہ بیرے سے کہوں ڈال دو میرے کان میں- مکھن اتنا قلیل کہ کسی پھنسی کے پھاہے پر لگائیں تو کم پڑے، اور پھر کوئی ملازم ایسا نہیں کہ جس کے جسم پر اس کی وردی درست و چست بیٹھے- خدا کرے کبھی کسی کو خیال آ جائے کہ ہزاروں غیر ملکی لوگ یہاں ہر روز آتے جاتے ہیں، اور کچھ نہیں تو ہم ایئرپورٹ کے ریسٹوران ہی کو ایسا سجائیں اور اس طرح چلائیں کہ اگر ملک کا نام نہیں ہوتا تو الٹی بدنامی تو نہ ہو- یہاں کے ناقص انتظام اور ناقص خوراک کو دیکھ کر بڑی بڑی ہوائی کمپنیوں نے ایئرپورٹ پر اپنے اپنے الگ ریسٹوران کھول لئے ہیں- چلو چھٹی ہوئی- ایک بات اور بھی کہتا چلوں- ہمارے ایئرپورٹ کے دو ہال ہیں- ایک میں ریسٹوران ہے، دوسرے میں نہیں- ایک میں ڈاک خانہ ہے، دوسرے میں نہیں- ایک میں انکوائری آفس ہے دوسرے میں نہیں- ایک میں کتابوں کی دکانیں ہیں اور دوسرے میں نہیں- ایک میں پاکستان کی دستکاری کے نمونوں کی دکانیں ہیں اور دوسرے میں نہیں- ہمارے ہوائی جہازوں سے جو لوگ منسلک ہیں وہ تو دنیا بھر کی سیر کرتے ہیں، کیا ایسی بدسلیقگی انہوں نے کہیں اور بھی دیکھی جو یہاں دیکھنے میں آتی ہے؟

ہاں تو جنگ کے زمانے میں شینن کے ایئرپورٹ کو دیکھ کر جی خوش ہو گیا- یہاں ہم دو دن ٹھہرے- اس کے بعد سمندری ہوائی جہاز پر سوار ہو کر لزبن کی طرف روانہ ہوئے- لزبن آئرلینڈ کے جنوب میں ہے- ہوگا کوئی ڈیڑھ ہزار میل دور- لیکن ہم اگلے دن دوپہر کے وقت لزبن پہنچے- وجہ اس طویل سفر کی یہ تھی کہ ہم ازور جزائر کے گرد چکر کاٹ کر آئے تھے- اگر سیدھے آتے تو دشمن کے بمبار ہوائی جہاز ہمیں مار گراتے- ہمارا جہاز لزبن کے ساحل پر اترا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ساتھ ہی ایک جرمن جہاز بھی اترا کھڑا ہے- لزبن غیر جانبدار شہر تھا- یہاں تو کسی کو آنے کی مناہی نہ تھی- جرمن اور ہم سب ایک قطار میں کسٹم والے کاؤنٹر کے سامنے کھڑے ہو گئے- باری باری ہم سب اپنی اپنی گاڑیوں میں سوار ہو کر شہر کی طرف چلے- آمنے سامنے دو ہوٹل تھے- ایک میں جرمن رہتے تھے اور ایک میں انگریز اور انگریزوں کے غلام- میں انگریزوں کے ہوٹل میں اترا- یہاں ہم سب کو ایک بڑے کمرے میں جمع کیا گیا اور لیکچر پلایا گیا- ہوشیار، یہ شہر جاسوسوں سے بھرا پڑا ہے- یہاں جرمن بھی ہیں اور جرمنوں کے حلیف بھی- کسی سے بات نہ کرو اور کرو بھی تو واجبی اور وہ بھی احتیاط سے- خبردار کسی عورت کی مسکراہٹ پر نہ جانا- کسی عورت کا رومال گر پڑے تو اخلاقاً اسے اٹھا کر دیدو لیکن بس زیادہ نہ پھیلنا- وغیرہ وغیرہ- میں شام کو ہوٹل کے لاؤنج میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا کہ کسی نے میرا نام لے کر مجھے پکارا- پلٹ کر دیکھتا ہوں تو لزلے ہاورڈ-

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا

بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

بس پھر کیا تھا، ہم دونوں نے سارا شہر چھان ڈالا- ہم نے اپنی اچھل کود سے سارے ہوٹل کو سر پر اٹھا لیا- جسے دیکھو ہماری محفل میں شریک، جسے دیکھو سائے کی طرح ہمارے ساتھ- جو اعلان ہو ہماری وساطت سے، جو بات ہو ہم سے پوچھ کر- ایک دن ایک صاحب نے ہم سے کہا کہ چرچل آ رہے ہیں- خبردار ہوشیار اس کا تذکرہ کسی سے نہ کرنا- اس بات پر مجھے ہنسی آ گئی- جنگ کے زمانے میں انگریز خواہ مخواہ ہر بات کو صیغہ راز میں رکھنے کا عادی ہو گیا تھا- اب خیال فرمائیے کہ چرچل لزبن میں آ رہا ہے- لزبن غیر جانبدار شہر ہے- اس میں جرمن بھی موجود اور جرمنوں کے حواری بھی- ہر طرف جاسوس ہی جاسوس- پھر ہوائی اڈے پر چرچل کا استقبال، اخباروں میں اس کے لزبن پہنچنے کی خبر اور ہم سے کہا جا رہا ہے کہ خبردار کسی سے نہ کہنا کہ چرچل لزبن میں ہے!

اگلے دن لزلے کو کہیں لیکچر دینے جانا تھا، مگر میں کنی کترا گیا- بیسیوں مرتبہ میں اس کے لیکچر سن چکا تھا- میں نے کہا، لیکچر کیا سنیں، لاؤ ذرا شہر کا چکر لگائیں- شہر کے بڑے بازار میں تقریباً سب قوموں کے دفاتر اطلاعات کھلے تھے- بالکل اس طرح جس طرح ہمارے یہاں کراچی میں روسیوں، امریکیوں، انگریزوں نے اپنے اپنے دفتر اطلاعات کھول رکھے ہیں- فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں تو ان قوموں نے بڑی بڑی کوٹھیوں میں پراپیگنڈے کا بازار لگایا ہے، وہاں لزبن میں بازار کی دکانوں میں یہ دفتر تھے، جیسے جراہیں، بنیانیں یا کپڑے لزبن میں بازار کی دکانیں ہوتی ہیں- کھڑکیوں میں بڑے بڑے شیشے، ان پر پراپیگنڈے کی تصویریں چسپاں- میں خراماں خراماں جرمنوں کی دکان اطلاعات کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا- کھڑکی میں لگی ہوئی تصویریں دیکھیں- ہٹلر ایک بڑھیا سے ہاتھ ملا رہا ہے، ہٹلر بچوں کو پیار کر رہا ہے، ہٹلر تقریر کر رہا ہے، ہٹلر فوجیوں سے مخاطب ہے، ہٹلر تمغے عطا کر رہا ہے- وغیرہ وغیرہ- میں یہ تصویریں دیکھ ہی رہا تھا کہ اندر سے ایک آدمی باہر آیا اور مجھ سے انگریزی میں کہا اندر تشریف لائیے- میں خدا جانے کیوں اندر چلا گیا- وہاں مجھے بہت سی تصویریں دکھائی گئیں- بہت سی کتابیں اور کتابچے دیئے گئے اور ہر طرح میری خاطر مدارات کی گئی- ایک جرمن نے پوچھا تمہارا نام؟ میں نے کہا میں اپنا نام بتانے سے قاصر ہوں-

دور میز پر ایک نوجوان جرمن بیٹھا تھا- وہیں سے بیٹھے بیٹھے بولا آپ قاصر ہیں مگر بندہ قاصر نہیں- آپ زیڈ اے بخاری ہیں- پشاور کے رہنے والے ہیں- بی بی سی میں آل انڈیا ریڈیو سے آئے ہیں- انگریزوں کے ہوٹل میں ٹھہرے ہیں- اپنا کام کر کے لندن چلے جائیں گے- میرے چھکے چھوٹ گئے- میں وہاں سے بھاگا اور سیدھا برطانیہ کے سفارت خانے میں پہنچا- اس زمانے میں وہاں کا سفیر ٹامس تھا- میں سیدھا اس کے کمرے میں گیا اور نہایت برہمی سے کہا کہ یہ کیا اندھیر ہے کہ ..... میں اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ ٹامس بولا- ارے میاں کیوں برہم ہو رہے ہو، ہمیں اطلاع مل چکی ہے کہ تم جرمنوں کے دفتر اطلاعات میں گئے تھے اور وہاں تم سے یہ یہ گفتگو ہوئی- میں سراغ رسانی کے اس کارنامے پر حیران ہوا- پیشتر اس کے کہ میں جرمن دفتر اطلاعات سے سیدھا ٹیکسی میں سوار ہو کر سفارت خانے میں پہنچوں، میری نقل و حرکت کا تمام حال ٹامس تک پہنچ چکا تھا- اب میں قائل ہو گیا کہ دیوار ہم گوش دارد- لزلے ہاورڈ نے یہ ماجرا سنا تو خوب ہنسا- اس کے بعد میں نے کان پکڑے کہ لزلے کے بغیر کہیں نہیں جاؤں گا-

ہمیں لزبن میں رہتے کافی دن ہو گئے تھے- لزلے بیچارہ ابھی کام میں پھنسا ہوا تھا لیکن میرے ذمے کا کام ختم ہو گیا تھا- اب میں لندن جانے کے لئے پر تولنے لگا- اس زمانے میں جنگی طیاروں پر سفر کرنا کارے دارد والی بات تھی- ہر شخص کی اس کے درجے کے مطابق باری آتی تھی- میں کوئی نو مرتبہ صبح صبح فوجی لاری میں سوار ہو کر ہوائی اڈے پر پہنچا مگر ہر مرتبہ مجھے یہ کہہ کر واپس کر دیا گیا کہ آج تمہاری جگہ فلاں جرنیل کو دیدی گئی، آج تمہاری جگہ فلاں بریگیڈیئر کو دیدی گئی ہے- نو دس مرتبہ مجھے ہوائی اڈے سے مایوس لوٹ آنا پڑا- ایک دن میں نے ایک افسر کی بہت منت سماجت کی کہ بھیا مجھے کل کے جہاز میں ضرور بھیج دینا- دیکھو مجھ پر رحم کرو، یہاں رہتے رہتے بہت دن گزر گئے ہیں- میری منت سماجت سن کر اس افسر کا دل پسیج گیا اور اس نے وعدہ کر لیا کہ کسی نہ کسی طرح کل کے جہاز پر تمہیں ضرور جگہ دیدوں گا- میں اس وعدے پر خوش ہو رہا تھا کہ اتنے میں لزلے ہاورڈ میرے کمرے میں آیا- مجھے خوش دیکھ کر پوچھا کیا بات ہے، آج تم مارے خوشی کے زمین پر پاؤں نہیں دھرتے- میں نے کہا کل جا رہا ہوں، حتمی وعدہ ہو گیا ہے- لزلے کچھ سوچ میں پڑ گیا- میں نے کہا خیر باشد؟ کہا، اگر مجھے خود غرض نہ سمجھو تو ایک گزارش کروں- میں نے کہا کہو کیا بات ہے؟ کہا پرسوں لندن میں مجھے ایک ڈرامے میں ضروری شریک ہونا ہے، تم اپنی جگہ مجھے دیدو، تمہارا کیا ہے، دو چار دن بعد آ جانا-

لزلے ہاورڈ جیسا پیارا دوست اور یہ معمولی سی درخواست- میں فوجی ہوائی جہاز کے افسر کے پاس گیا، اسے تمام ماجرا سنایا اور کہا میری جگہ لزلے ہاورڈ کو دیدو- میں دو چار روز بعد چلا جاؤں گا- چنانچہ لزلے ہاورڈ میری جگہ ہوائی جہاز پر سوار ہو کر لندن کی طرف روانہ ہوا- مگر یہ لکھتے ہوئے میرا سینہ شق ہوتا ہے کہ لزلے ہاورڈ کے جہاز کو راستے میں جرمنوں نے مار گرایا اور لزلے ہاورڈ ہمیشہ کی نیند سو گیا- (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

عظیم شاعر ٹی ایس ایلیٹ کو نظم کاسٹ کرنے کی دعوت دی

بی بی سی کے کانٹریکٹ ڈیپارٹمنٹ نے اتنے بڑے شخص کو برائے نام فیس ادا کی- ڈائریکٹر جنرل کا خیال تھا وہ نظم پڑھنا نہیں جانتا- لیکن ریکارڈنگ کے بعد برٹش کونسل نے اس سے تمام نظموں کے ریکارڈ بھروائے اور دنیا بھر میں بھیجے- زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



جنگ سے پہلے بی بی سی ہمارے برصغیر کے لیے پروگرام نشر کیا کرتی تھی لیکن ہدف ان پروگراموں کا دیسی لوگ نہ تھے بلکہ وہ انگریز تھے جو انگلستان سے ہندوستان میں ملازمت کرنے آتے تھے یا آسام اور سلہٹ کی ڈھلانوں پر چائے کے باغوں میں کام کرتے تھے۔ یہ انگریز اپنے ملک کے عوامی طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور اسی قسم کے پروگرام پسند کرتے تھے، جس طرح کے پروگرام ان کے انگلستان میں رہنے والے بھائی بندوں کو مرغوب تھے۔ مار دھاڑ، فحاشی کی حد سے ٹکراتا ہوا مزاح، تعیش کے دامن کو چھوتی ہوئی عشق ومحبت کی داستان، ہزل کے قرب وجوار میں رہنے والی تک بندی، معجون مرکب کے نشے کی متبادل موسیقی وغیرہ وغیرہ۔ یہ تھی کل کائنات اس پروگرام کی جو انگلستان سے ہندوستان کے لیے پیش کیا جاتا تھا۔ یہاں کا انگریز ایسے پروگرام کو سنتا تھا تو اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے گھر کا گھر میں بیٹھا ہو۔ میں جب انگلستان گیا تو میں نے بی بی سی کے ناخداؤں کے حضور گزارش کی کہ اے ہمہ دانو، ہمارے برصغیر میں پڑھے لکھے انسان بھی رہتے ہیں، یہ حضرات آپ کے پروگرام کو سنتے ہیں اور آپ پر ہنستے ہیں۔ بات بھی ہنسنے کی ہے کہ اتنا بڑا انگلستان، اتنے بڑے ادیبوں اور شاعروں اور سائنس دانوں کو پیدا کرنے والا انگلستان، یہ کیا پروگرام پیش کرتا ہے۔ میری گزارش سن کر بی بی سی والے بہت چکرائے۔ کہا پھر کیا کریں۔ میں نے کہا تمہاری سیاست اور سامراجیت سے ہمیں بیزار کہی، لیکن تمہارے یہاں کے اہل علم کی ہم قدر کرتے ہیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ تم مائیکروفون پر اپنے یہاں کے اہل علم کو لاؤ۔ بات بڑی معمولی سی تھی لیکن یقین مانیے کہ اس معمولی بات کا فیصلہ کرنے کے لیے بھی بیسیوں کانفرنسیں ہوئیں۔ اس ضمن میں بی بی سی کے دو حضرات ہم خیال تھے۔ انہوں نے میری بہت مدد کی۔ ایک تھے ٹونی رینڈل جن کا انتقال ہوگیا ہے اور دوسرے تھے سر جی بی کلارک جو زندہ ہیں اور بی بی سی میں بہت بڑے عہدے پر فائز ہیں۔

کچھ میں نے شور مچایا، کچھ ان حضرات نے مدد کی، آخر کار خدا خدا کر کے بی بی سی کے ہاتھی نے اثبات میں سونڈ ہلائی۔ اس سونڈ کا ہلنا تھا کہ اس پروگرام کو مرتب کرنے کی دھن میرے سر پر سوار ہوئی۔ تمام مقتدر شاعروں، ناقدوں، اداکاروں، پروفیسروں، سائنس دانوں وغیرہ کی فہرست مرتب کی، ان سے ملاقات کی اور ان کو براڈ کاسٹ کرنے پر آمادہ کر لیا۔ اسی زمانے میں جارج اورول کی ایک کتاب شائع ہوئی تھی۔ اس کا نام تھا The lion and the unicorn۔ مجھے یہ کتاب بہت پسند آئی۔ جارج اورول کی پہلی دو کتابیں بھی میری نظر سے گزر چکی تھیں، مگر میری اس کی ملاقات نہ تھی۔ اس کی تازہ کتاب پڑھ کر میں اس قدر متاثر ہوا کہ میں نے اسے تعریف کا خط لکھا۔ یہ تھی اس کی اور میری دوستی کی ابتدا۔ اس کے بعد تو وہ اکثر میرے یہاں آیا کرتا تھا اور گھنٹوں باتیں ہوا کرتی تھیں۔

جارج اورول کا اصلی نام ایرک بلیر تھا۔ یہ شخص سخت غلیظ تھا۔ جارج اورول کی نفیس شستہ تصنیفات پڑھ کر کبھی خیال بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ یہ شخص اس قدر غلیظ ہو سکتا ہے۔ ایٹن کا پڑھا ہوا لیکن دیہز۔ بے استری پتلون، اس پر جا بجا چکنائی اور میل کچیل کے دھبے۔ کالر میلا چکٹ، نکٹائی باورچی خانے کی صافی کی ایک دھجی، کوٹ اس بوری جیسا جس میں کوئلے بھرے جاتے ہیں، بوٹ بدشکل اور بن پالش، ناخن میل سے سیاہ، دانت بدوضع اور تمباکو کے سڑے ہوئے پتے کی طرح ملگجے زرد، دبلا پتلا جسم، لمبا قد، چہرہ زرد اور مدقوق، مونچھیں ترشی ہوئی مگر باریک، جیسے ناک کے نیچے ہلکے سرمے کی ایک لکیر، گفتگو کا انداز ایسا جیسے کوئی جلا بھنا لٹھ جارجاٹ ہو۔ میرے فلیٹ پر مجھ سے ملنے آیا تو میں اس کی ہیئت دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ میں نے اسے سگریٹ پیش کیا، فرمایا میں اپنا سگریٹ پیوں گا۔ یہ کہہ کر جیب میں سے ایک سڑی ہوئی ٹین کی ڈبیا نکالی۔ اس میں تمباکو تھا۔ پھر سگریٹ کا کاغذ نکالا، تمباکو کی بتی بنا کر کاغذ میں رکھی، کاغذ کو چپکایا، پھر لائٹر نکالا۔ یہ لائٹر خاص جنگ کے زمانے کی ایجاد ہوگا کیونکہ اس میں پیٹرول استعمال نہیں ہوتا تھا۔ چق مق، ایک گراری، اس کے ساتھ ایک لمبی سی بتی، کوئی ڈیڑھ فٹ لمبی۔ اس نے گراری چلائی، چق مق میں سے آگ نکلی۔ بتی کی روئی نے آگ پکڑی، ایرک نے پھونک مار کر اس آگ کو دہکایا۔ جب بتی دہک گئی تو اس نے سگریٹ سلگایا۔ سگریٹ سلگا کر اس نے بتی کو نیچے کھینچا۔ بتی ایک خول میں چلی گئی اور بجھ گئی۔ جارج اورول کی سادگی نے بلکہ اس کی غلاظت نے میرا دل موہ لیا۔ میں نے اتنے غلیظ جسم پر مسلط ایسا صاف ستھرا دماغ کبھی نہیں دیکھا۔ یہ شخص برما پولیس میں ملازمت کر چکا تھا۔ اس ملازمت کی یادگار اس کی کتاب "ایام برما" یا "برمیز ڈیز" ہے۔ لاجواب کتاب ہے اور کئی لحاظ سے ای، ایم فورسٹر کی کتاب "اے پیسج ٹو انڈیا" سے ٹکر لیتی ہے۔ یہ شخص انگلستان میں بھیک بھی مانگتا رہا ہے اور فرانس کے ایک ہوٹل میں برتن دھونے پر بھی ملازم رہا ہے۔ اس نے بھیک مانگنے اور ہوٹل میں ملازمت کرنے پر بھی ایک کتاب لکھی ہے۔ یہ کتابیں تو پہلے ہی سے مشہور تھیں، لیکن بعد میں جو کتابیں اس نے لکھی ہیں ان کا تو جواب نہیں اور انہیں کتابوں کے طفیل انگلستان کے صف اول کے مصنفین میں اس کا شمار ہونے لگا۔

ایک دن جارج اورول میرے یہاں آیا تو کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ میں نے سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس کی گرفتاری کے سامان ہو رہے ہیں۔ بات دراصل یہ تھی کہ ان دنوں روس اتحادیوں کے زمرے میں شامل نہیں ہوا تھا اور انگریز کو خواب میں بھی ریچھ دکھائی دیتا تھا۔ جو شخص ذرا سا بھی سر اٹھائے اور جنگی حالات پر مخالفانہ تنقید کرے، اس کے متعلق بے تامل یہ سمجھ لیا جاتا تھا کہ ہو نہ ہو یہ شخص کمیونسٹ ہے، روسیوں کا جاسوس ہے، ملک کا دشمن ہے۔ کچھ اسی قسم کا شک جارج اورول پر بھی کیا گیا۔ لیکن جارج اورول پر اس قسم کا شک کرنا سراسر حماقت تھی۔ جارج اورول سولہ آنے انگریز تھا اور جمہوریت کا کٹر حامی۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ ذرا منہ پھٹ تھا اور پسماندہ طبقے اور پسماندہ ملکوں کا طرف دار۔ وہ اس کا بھی مخالف تھا، بلکہ اس بات پر شرمندہ تھا کہ انگریز ہندوستان پر قابض ہیں۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ ایرک بلیر یعنی جارج اورول کی دیانت اور شرافت پر حملہ ہونے والا ہے تو مجھے سخت غصہ آیا اور میں نے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارنا شروع کئے۔ یہاں تک کہ میں نے تجویز پیش کی کہ جارج اورول کو میرے دفتر میں تقریروں کے محکمہ میں ملازمت دی جائے۔ جب میری یہ تجویز افسران بالا تک پہنچی تو انہوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ میاں تم کس خیال میں ہو، یہ شخص تو بھروسے کے قابل نہیں، اس پر تو وطن دشمن کا الزام عائد ہونے والا ہے۔ میں یہ سن کر بہت زور سے ہنسا۔ افسران بالا کو فارسی کا ایک شعر سنایا۔

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

اب رہا ہی کون ہے جسے تو اپنی تیغ ناز سے قتل کرے گا، اب تو یوں کر کہ سب کو اپنی مسیحائی سے پھر زندہ کر اور پھر سب کو ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ اتار۔

خیر مختصر یہ کہ میری ضمانت پر جارج اورول بی بی سی میں ملازم ہوگیا اور میرے ماتحت کام کرنے لگا۔ اسی کی مدد سے میں نے انگریزی کے پروگرام مرتب کئے۔ اگر ایرک بلیر میرا معاون نہ ہوتا تو ان پروگراموں کی بے مثال کامیابی کا سہرا چاہے کوئی ہزار میرے سر باندھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے لائق جارج اورول ہی تھا۔ ان بھاری بھرکم پروگراموں کو جو محض برصغیر کے لیے براڈ کاسٹ کئے جاتے تھے اور صرف ان ٹرانسمیٹروں پر براڈ کاسٹ کئے جاتے تھے جن کی آواز صرف برصغیر میں سنائی دیتی تھی، اس قدر شہرت نصیب ہوئی کہ بی بی سی والوں نے ایسا ہی پروگرام اپنے وطن کے لیے بھی نشر کرنا مناسب سمجھا اور یوں اس شہرہ آفاق پروگرام کی بنیاد پڑی جسے بی بی سی کا تیسرا پروگرام کہا جاتا ہے۔ اس سے قبل بی بی سی سے انگلستان والوں کے لیے صرف دو پروگرام الگ الگ ٹرانسمیٹروں پر براڈ کاسٹ ہوتے تھے، ایک ٹرانسمیٹر پر ہلکا پھلکا پروگرام جس کو سن کر دماغ پر آنچ نہ آئے اور دوسرے ٹرانسمیٹر پر قومی پروگرام جس میں ہر نوع کا پروگرام شامل تھا، یعنی کھچڑی۔ اب شروع ہوا تھرڈ یعنی تیسرا پروگرام اور وہ بھی الگ ٹرانسمیٹر پر۔ اس تیسرے پروگرام میں عوام کی پسند کو بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ صرف خواص کی پسند کا خیال کیا گیا۔ یہ پروگرام رفتہ رفتہ اس قدر مقبول ہوا کہ عوام میں بھی باقی دو پروگراموں سے بازی لے گیا۔

یہاں مجھے ذرا دہلی ریڈیو کا ذکر کرنے دیجئے۔ 1936ء میں دہلی ریڈیو شروع ہوا۔ مجھے اس وقت یونہی خیال آیا کہ پروگرام ذرا بھاری بھرکم ہونے چاہئیں۔ چنانچہ میں نے موسیقی کے شعبے میں کلاسیکی موسیقی کا پروگرام خاص اہتمام سے پیش کرنا شروع کیا۔ اب اگر آپ اس وقت کے اخبارات ملاحظہ فرمائیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ کام کس قدر مشکل تھا۔ کوئی اخبار ایسا نہ تھا جس نے مجھے ہدف ملامت نہ بنایا ہو۔ دہلی اور شمالی ہند کے تمام اخباروں نے یک زبان ہو کر مجھے برا بھلا کہنا شروع کیا اور سب نے متحد ہو کر کلاسیکل موسیقی کے خلاف شور مچایا۔ مگر میں ڈھیٹ قسم کا آدمی ہوں۔ ایسے شور وشغب کا اثر مجھ پر ذرا کم ہوتا ہے۔ میں اپنی ہٹ پر قائم رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہندوستان کے ہندو حضرات جنہوں نے مسلمانوں سے موسیقی کا سبق سیکھا، کلاسیکل موسیقی کا کلمہ پڑھنے لگے ہیں اور اسی موسیقی کو اپنے لیے طغرائے امتیاز سمجھ رہے ہیں۔

پاکستان میں بھی میں نے حتی المقدور مسلمانوں کے اس عظیم ورثے کی حفاظت کے لیے کوشش کی۔ میں نے موسیقی پر کتابیں بھی لکھیں اور ریڈیو پر بھی اس کا چرچا کیا اور مجھے خوشی ہے کہ آج پیارے میاں جلیل القدر، روشن آرا، امید علی، امانت علی، فتح علی، سلامت علی، قدرت اللہ اور عاشق علی وغیرہ کو عوام میں عزت ومقبولیت نصیب ہے۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر مسلمانوں کی عظیم الشان ثقافت اور تہذیب کو سلیقے اور ڈھب سے پیش کیا جائے تو مخالفت کے بادل رفتہ رفتہ چھٹ جاتے ہیں اور خواص ہوں کہ عوام اپنی عظمت رفتہ کی نشانیوں کی حفاظت کے لیے میدان میں اتر آتے ہیں۔ میرے مدنظر ہمیشہ یہ بات رہی ہے کہ آرٹ زندگی کا تابع نہیں، زندگی آرٹ کی تابع ہوتی ہے۔ لوگ آرٹ کو دیکھ کر اپنی زندگی اور اپنے ذوق کا معیار قائم کرتے ہیں۔ اس لیے یہ اشد ضروری ہے کہ آرٹ اعلیٰ درجے کا ہو۔ اگر آرٹ ادنیٰ درجے کا ہوگا تو زندگی غلط راستے پر پڑ جائے گی۔ ہندوستانی فلموں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ان فلموں نے ادنیٰ عشق ومحبت، ادنیٰ لباس، ادنیٰ تزئین آرائش جمال کے نمونے پیش کئے۔ اس کا اثر عوام پر دیکھ لیجئے۔ کنٹرلڑکے دلیپ کمار اور لڑکیاں نرگس کماری کی طرح نظر آنا چاہتی ہیں۔ لاحول ولاقوۃ۔

ہاں تو میں بی بی سی کے بھاری بھرکم پروگرام کا ذکر کر رہا تھا۔ اس پروگرام کے سننے والوں کو جو حظ پہنچا سو پہنچا، مجھے خود اس سے بے حد فائدہ ہوا۔ اور وہ یہ کہ مجھے انگلستان کے تمام بڑے بڑے ادبا، ناقدین، اداکار، سائنس دان، موسیقی دان حضرات کی خدمت میں رسائی حاصل ہوگئی۔ اور بعض کے حضور میں تو اس قدر قرب نصیب ہوا کہ باید وشاید۔ ان میں ٹی ایس ایلیٹ کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ دنیا کا یہ عظیم الشان شاعر اور ناقد علم وادب کی دنیا میں تمام اعزاز حاصل کر چکا ہے۔ اس کے نام کے ساتھ میرے نام کا وابستہ ہونا میرے لیے باعث صد عزت وافتخار ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ کی خدمت میں کبھی حاضر نہ ہوا تھا اور نہ جرأت ہوتی تھی کہ اتنی بڑی شخصیت کے حضور میں جاؤں۔ میں کوئی نہ کوئی وسیلہ ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ ٹی ایس ایلیٹ کی ایک نئی نظم "ایسٹ کوکر" شائع ہوئی۔ اس نظم نے مجھے مسحور کیا اور میں نے کانپتے ہاتھوں سے ٹی ایس ایلیٹ کو تعریفی خط لکھا اور ساتھ ہی یہ درخواست کی کہ آپ یہ نظم مائیکروفون پر خود پڑھیں۔ ایک دو دن کے بعد ٹی ایس ایلیٹ کے سیکریٹری نے ٹیلی فون کیا کہ تمہاری درخواست منظور ہے۔ وقت مقررہ پر ٹی ایس ایلیٹ بی بی سی میں اپنی نظم ریکارڈ کرنے کے لیے تشریف لائیں گے۔ یہ پیغام پا کر میں بہت خوش ہوا۔ میں نے فوراً کنٹریکٹ ڈپارٹمنٹ کے نام یادداشت بھیجی کہ ٹی ایس ایلیٹ کو کنٹریکٹ بھیج دیا جائے۔

تمام بی بی سی میں یہ خبر مشہور ہوگئی کہ بخاری نے ٹی ایس ایلیٹ کو نظم کاسٹ کرنے کے لیے بلایا ہے۔ یہاں تک کہ بی بی سی کے ڈائریکٹر جنرل پروفیسر اوگلوی نے مجھے اپنے کمرے میں بلا بھیجا، مجھے چائے پلائی، ادھر ادھر کی باتیں کیں اور پھر ٹی ایس ایلیٹ کا تذکرہ کیا۔ مجھ سے کہا وہ شخص نظم پڑھنا کیا جانے، تم نے اس کو خواہ مخواہ بلایا ہے۔ پہلے تو مجھے اعتبار نہ آیا کہ پروفیسر اوگلوی جیسا آدمی ٹی ایس ایلیٹ کی عظمت سے واقف نہیں۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ حضور باوجود پروفیسر ہونے کے ٹی ایس ایلیٹ کے بارے میں تقریباً کورے ہیں۔ میں نے کہا جناب پروفیسر صاحب! اب تو جو ہوا سو ہوا، ٹی ایس ایلیٹ نظم ضرور براڈ کاسٹ کرے گا۔ میں نے کچھ ایسی ہٹ دھرمی دکھائی کہ پروفیسر صاحب کو ہار ماننی پڑی۔

اب میں اس دن کا انتظار کرنے لگا جس دن ٹی ایس ایلیٹ کو اپنی نظم ریکارڈ کرنے کے لیے بی بی سی تشریف لانا تھا۔ خدا خدا کر کے وہ دن آیا۔ مجھے ریسپشن نے ٹیلی فون کیا کہ ٹی ایس ایلیٹ آگئے ہیں اور ہال میں تمہارے منتظر ہیں۔ میں بھاگا بھاگا نیچے گیا اور ادھر ادھر ٹی ایس ایلیٹ کو ڈھونڈنے لگا۔ مجھے وہاں کوئی شاعر صورت شخص دکھائی نہ دیا۔ آخر میں ڈیسک پر گیا اور پوچھا ٹی ایس ایلیٹ کہاں ہیں۔ فرمایا وہ کرسی پر بیٹھے ہیں۔ مجھے اعتبار نہ آیا۔ ماشاء اللہ یہ تو بینک کا ڈائریکٹر معلوم ہوتا تھا۔ سفید کالر، کولی ٹکٹائی، کالے رنگ کا سوٹ، ہاتھ میں چھتری، اس پر کالی ٹوپی۔ میں ہچکچاتا ہوا اس شخص کے پاس پہنچا اور پوچھا آپ ہی مسٹر ایلیٹ ہیں۔ فرمایا ہاں۔ خیر، میں نے کہا تشریف لایئے۔ وہ اٹھے اور لفٹ کی طرف چلے۔ چلتے چلتے انہوں نے کہا۔ ایک ضروری کام یاد آگیا ہے، وہ بھی کرتا چلوں۔ یہ کہہ کر ڈیسک پر آئے۔ جیب سے کنٹریکٹ نکالا اور اس پر دستخط کرنے لگے۔

بی بی سی میں کچھ ایسا رواج ہے کہ پروگرام کے کارکن فیس اور کنٹریکٹ کے جھگڑوں سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ وہ کنٹریکٹ ڈپارٹمنٹ والوں کو صرف یہ لکھ بھیجتے ہیں کہ میں فلاں فن کار فلاں پروگرام کے لیے فلاں دن چاہیے۔ اس کے بعد کی تمام کارروائی کنٹریکٹ ڈپارٹمنٹ والے کرتے ہیں اور فیس وغیرہ کا فیصلہ بھی وہی کرتے ہیں۔ پروگرام کے کارکن کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور نہ اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ فن کار کی فیس کیا ہے۔ اب جو ٹی ایس ایلیٹ کنٹریکٹ پر دستخط کرنے لگا تو میں بشری کمزوری کے تقاضے سے مغلوب ہوا اور جھانک کر دیکھا کہ اتنے بڑے شخص کو کیا فیس دی گئی ہے۔ دیکھا تو صرف پانچ گنی۔ جو بی بی سی کی سب سے کم فیس تھی۔ میں اس وقت تو خاموش رہا لیکن ریکارڈنگ کے بعد میں نے کنٹریکٹ والوں کو ٹیلی فون کیا اور کہا، ہر چند کہ فیس کے معاملے میں آپ سے کچھ کہنا میرے احاطہ کار سے باہر ہے لیکن ٹی ایس ایلیٹ اور صرف پانچ گنی۔ تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو۔ کچھ دن کے بعد کنٹریکٹ والوں نے مجھے ایک خط بھیجا۔ یہ ٹی ایس ایلیٹ نے ان کو لکھا تھا۔ خط کا مضمون کچھ ایسا تھا۔

مہربان بندہ، آپ کا خط ملا۔ میں نے فیس کا سوال اٹھایا ہی نہ تھا۔ (از خرس موئے بس است) میں تو اس بات سے خوش ہوا ہوں اور اس بات کو موجب افتخار سمجھتا ہوں کہ بی بی سی نے مجھے پہلی بار نظم سنانے کا موقع دیا۔ بہرحال آپ کے ارشاد کے مطابق آپ کا پہلا کنٹریکٹ مبلغ پانچ گنی کا منسوخ کرتا ہوں اور دوسرے یعنی آٹھ گنی والے فیاضانہ کنٹریکٹ پر دستخط کر کے خدمت عالی میں پیش کرتا ہوں...... آپ کا مخلص...... ٹی ایس ایلیٹ۔

لاحول ولاقوۃ! بی بی سی کے کنٹریکٹ ڈپارٹمنٹ نے فیاضی بھی دکھائی تو صرف تین گنی کی۔ یہ تھا ٹی ایس ایلیٹ کا پہلا براڈ کاسٹ جس میں اس نے اپنی نظم پڑھی تھی۔ اس کے بعد تو برٹش کونسل نے اس کی تمام لمبی نظموں کے ریکارڈ اس سے بھروائے اور دنیا بھر میں بھیجے۔ لیکن اس کی نظم کا پہلا ریکارڈ یادگار رہے گا اور یہ بات بھی یاد رہے گی کہ بی بی سی کے ڈائریکٹر جنرل پروفیسر اوگلوی نے مجھے متنبہ کیا تھا کہ ٹی ایس ایلیٹ بہت ہی بری طرح نظم پڑھتا ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ کو ایسی چھتری بہت مرغوب تھی جس کا دستہ بڑا ہو۔ میں نے اس کی خدمت میں ایک چھتری پیش کی۔ اس کا دستہ میں نے خاص طور پر بہت بڑا بنوایا تھا۔ بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ یہ دستہ بھرے ہوئے فٹ بال کو احاطے میں لے لیتا اور پھر بھی خاصہ ڈھیلا رہتا۔ ٹی ایس ایلیٹ کو یہ چھتری بہت پسند آئی اور آج یہی چھتری اٹھائے پھرتا ہے۔

ایک مرتبہ ایک نوادرات کی دکان پر تمباکو پینے کا ایک پرانا پائپ مجھے دکھایا گیا۔ یہ بے حد بڑا تھا۔ اس کے دونوں بازو زاویہ قائمہ بناتے تھے۔ اس کا تمباکو والا بازو کوئی 9 انچ لمبا تھا اور گھیر اس کوئی تین انچ قطر کا تھا۔ کش لگانے والا بازو بھی تقریباً اتنا ہی۔ اس پائپ پر بہت خوب صورت کھدائی کا کام کیا تھا۔ یہ پائپ کافی مہنگا تھا، مگر میں نے خرید لیا۔ اس کے نیچے چھتری لگائی اور یہ شان دار چھتری ٹی ایس ایلیٹ کو بھیجی۔ وہ بہت ممنون ہوا، بہت خوش ہوا۔ لیکن جب دیکھو پہلی چھتری اٹھائے اٹھائے پھرتا تھا۔ دوسری چھتری میں نے اس کے ساتھ میں کبھی نہیں دیکھی۔ ایک دن میں نے کہا، آپ وہ دوسری چھتری استعمال نہیں کرتے، کیا وہ پسند نہیں آپ کو۔ فرمایا نہیں بہت اچھی ہے لیکن ذرا شان دار ہے، ضرورت سے زیادہ شان دار۔ چنانچہ میں نے اس کو سنبھال کر خاص موقعوں کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ مثلاً کوئی جنازہ یا بکنگھم پیلس کا کوئی عصرانہ۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

ہفتہ/03 مئی 2014ء
روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

لندن میں ہندو کا ہوٹل اوباش نوجوانوں کا گڑھ تھا

ہندوستانی طلبا ہوٹل میں جا کر پھنس جاتے - ایک دوست کا بیٹا بھی وہاں دل ہار بیٹھا - گوری اسے "آزاد" کرنے کے سو پاؤنڈ مانگ رہی تھی پتہ چلا وہ مزید تین لڑکوں کو بھی بلیک میل کر رہی تھی - میری حکمت عملی پر اسے رفو چکر ہونا پڑا - زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس

جوانی دیوانی نہیں ہوتی، بعض جوان آدمی دیوانے ہوتے ہیں۔ میں نے بعض کہا ہے، سب نہیں کہا۔ اگر سب دیوانے ہوں تو دنیا میں رہنا مشکل ہو جائے۔ صرف بعض کا دیوانہ ہونا زندگی کیلئے ایسا ناخوش گوار بھی نہیں۔ آخر زندگی میں تھوڑا بہت تفنن بھی تو چاہیے، سو وہ چند دیوانے مہیا کر دیتے ہیں۔ جوانی دیوانی نہیں، جوان دیوانے ہیں اور وہ بھی معدودے چند، یہ بات کیا بنی۔ سنیے عرض کرتا ہوں۔ لیکن جو کچھ مجھے عرض کرنا ہے اس سے پہلے گزارش کر دوں کہ مجھے اس سلسلے میں اپنی جوانی کے قصے بیان نہیں کرنا بلکہ میں تو جب کبھی کسی عمر رسیدہ شخص سے ہائے جوانی کا نعرہ سنتا ہوں تو لاحول پڑھتا ہوں۔ اس ہائے جوانی کے نعرے پر بھی اور اس شخص پر بھی جو نہ اپنے سفید بالوں کو دیکھے، نہ اپنی خمیدہ پشت کو، نہ اپنے پوپلے منہ کو، نہ اپنے گالوں کی جھریوں کو اور لگے ہائے جوانی کہہ کر اپنا کچا چٹھا سنانے۔ غریب سادہ لوح، یہ قصہ سناتے وقت اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ سننے والے نوجوان دل ہی دل میں ہنس رہے ہیں کہ بڑے میاں کو کیا ہو گیا۔ ہم تو ان کو اچھا خاصا شریف آدمی سمجھتے تھے، مگر یہ تو کچھ اور ہی نکلے۔ خیر ان لوگوں کا کیا ذکر کروں۔ چھوڑیے ان کو۔ یہ سٹھیا گئے ہیں۔ شیکسپیر والی بات کہ "ضعف سن کے باعث انسان کی عقل ماؤف اور بے عقلی معروف ہو جاتی ہے"۔ ان لوگوں کا یہی حال ہے۔ مگر خیر، خطائے بزرگان گرفتن خطا است۔ مجھے چند نوجوانوں کا ذکر کرنا ہے اور یہ عرض کرنا ہے کہ یہ حضرات لندن میں جا کر کیا کیا گل کھلاتے ہیں۔

لندن میں اک صاحب شفیع نامی گزرے ہیں۔ بہت عرصے کا ذکر ہے کہ انہوں نے لندن کے وسط میں ایک ہندوستانی ہوٹل کھولا۔ میں شفیع کے زمانے میں انگلستان ہی نہیں گیا تھا۔ ان کے ہوٹل میں تو کیا جاتا۔ ہاں جب میں انگلستان گیا تو یہ ہوٹل ایک ہندو نے خرید رکھا تھا اور وہی اس کو چلاتا تھا۔ نام شفیع ہوٹل کا بہت مشہور تھا۔ چنانچہ اس ہندو نے ہوٹل کے اثاثے کے ساتھ یہ نام بھی خرید لیا اور اسی نام سے ہوٹل چلانے لگا۔ قورمے، پلاؤ، شامی کباب کا ہوٹل اور چلائے اس کو ایک ہندو، ذرا ان ہونی سی بات ہے۔ لیکن مرچ مسالے کا چٹخارا ایسی بری بلا ہے کہ دوپہر ہو یا شام، اس ہوٹل میں ہندوستانی لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا اور انہیں حضرات کے باعث اس ہوٹل کا کاروبار خوب چلتا تھا۔ جب دیکھو یہاں ہندوستانی نوجوانوں کی محفل گرم نظر آتی تھی۔ یہ نوجوان اکثر ایک آدھ سہیلی بھی پال لیتے تھے۔ یہ سہیلیاں انگلستان کی رہنے والی ہوتی تھیں، اس لیے گوری چٹی تو ضرور تھیں لیکن ہندوستانی شرفا کے لڑکوں کے دامن پر کالا داغ تھیں۔ ہندوستانی شرفا کے بیٹوں کے دامن پر کیا، خود اپنے ملک کے دامن پر بدنما دھبہ تھیں۔ لیکن ان ہندوستانی نوجوانوں کو کون سمجھاتا کہ میاں یہ دوسرے ملک کا پنچھی اگر تمہارے پنجرے میں پھنس بھی گیا تو یوں سمجھو کہ پنچھی نہیں ہوگا، ہاتھی ہوگا، جسے تم اپنے دروازے پر باندھ لو گے۔ انہیں کون یاد دلاتا کہ میاں تم اپنی ماؤں، بہنوں کی طرف دیکھو۔ خدمت کرتی ہیں، بزرگوں کے سامنے سر پر دوپٹہ اوڑھ لیتی ہیں، برتن مانجھتی ہیں، بچے پالتی ہیں، کپڑے دھوتی ہیں، گھر میں جھاڑو دیتی ہیں، جھاڑ پونچھ کرتی ہیں۔ ان فرنگنوں کا رہن سہن الگ، ہمارا الگ۔ یہ انگریزی بیل ہندوستانی منڈھے پر چڑھ نہ سکے گی۔ رہ جاؤ، کچھ دن صبر کرو، جب ہندوستان لوٹو گے تو تمہاری شادی بیاہ کا بھی انتظام ہو جائے گا۔ تمہیں ماں باپ نے یہاں تعلیم حاصل کرنے کیلئے بھیجا ہے یا درس عشق پڑھنے کے لیے؟

میں اس ہوٹل میں کبھی کبھار جاتا تھا اور وہ بھی بہ امر مجبوری۔ اس ہوٹل سے الگ تھلگ رہنے کا باعث ایک تو یہی تھا کہ یہ ہوٹل باقی ہوٹلوں کے مقابلے میں گندا تھا۔ اس میں ہوا کا گزر نہ تھا۔ ہوٹل کی اندر کی فضا میں دھویں اور باسی پڑے ہوئے سالن کی سڑاند گھٹا بن کر تلی کھڑی رہتی تھی۔ دوسرا سبب اس ہوٹل سے دور رہنے کا یہ تھا کہ یہاں اوباش قسم کی لڑکیاں، اوباش قسم کے لڑکوں کے ساتھ کھلم کھلا داد عشرت دیتی تھیں۔ انگلستان میں جتنے نوجوان لڑکے بغرض تعلیم آتے تھے، اکثر ان کے گھر والے مجھے بالواسطہ یا بلاواسطہ جانتے تھے۔ جب کبھی اپنے بچے کو سرزنش کرنی ہو یا کوئی روپے پیسے کا معاملہ ہو تو مجھے لکھ بھیجتے کہ ہمارے فلاں برخوردار کی خبر لو۔ ہم بہت پریشان ہیں۔ ایک مرتبہ مجھے ہندوستان سے خط آیا کہ ہمارا بچہ فلاں لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ہم نے اسے لکھا ہے کہ اگر بخاری صاحب اس لڑکی کے حالات معلوم کرنے کے بعد تمہیں شادی کرنے کی اجازت دے دیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اب تم جانو۔ سپردم بتو مایہ خویش را۔ یہ خط ملا تو بیشتر اس کے کہ وہ برخوردار میرے پاس تشریف لائیں، میں نے اپنے طور پر اس لڑکی کے حالات دریافت کیے۔ نتیجہ اس دریافت کا یہ نکلا کہ وہ لڑکی ایسی نہیں کہ کسی شریف آدمی کا گھر بسائے۔ چہرہ اس کا گورا، لیکن اطوار اس کے سیاہ، بال اس کے بھورے، لیکن دل اس کا کالا۔ اب میں کیل کانٹے سے لیس ہو کر برخوردار سعادت آثار کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

آخر ایک دن آئے۔ کوئی ساڑھے پانچ فٹ کا زنانہ قد، زنانہ ہاتھ پاؤں، دھان پان جسم، بات ایک کریں اور کمر تین بل کھائے، رنگ سیاہ بھجنگ، لباس فوق البھڑک۔ نازک کلائی پر نازک سی گھڑی۔ رنگین سگریٹ کا نیلا دھواں اڑاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ میں نے انہیں دیکھا، جی چاہا کہ اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دوں، لیکن پھر نہ جانے کیا خیال آیا کہ درگزر کیا اور صاحب زادے کی گل افشانی کیلئے ہمہ تن گوش ہو گیا۔ کچھ جھینپے، کچھ زیر لب مسکرائے اور گردن نہوڑا کر وہ خط مجھے پیش کیا، جو ان کے والد بزرگوار نے ان کو لکھا تھا۔ مجھے خط کا مضمون تو پہلے ہی سے معلوم تھا۔ میں نے خط کا لفافہ لے کر میز پر رکھ لیا اور کہا خط تو بعد میں پڑھوں گا، پہلے تم بتاؤ کہ کیا کہنا چاہتے ہو۔ ایک ہاتھ کے ناخنوں کو دوسرے ہاتھ کے ناخنوں سے کریدنے لگے اور فرمایا "جی، جی، جی......"۔ پھر فرمایا "وہ، وہ، وہ!"۔ اس کے بعد خاموشی۔ خاموشی کے اچھے خاصے لمحات کے بعد انہوں نے خوشبودار رومال جیب سے نکالا اور ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ پسینہ پونچھنے کے فوراً بعد آنکھیں اٹھائیں اور میری آنکھوں میں ڈال دیں۔ اب کے میں جھینپ گیا!۔

آخر میں نے ذرا کرخت لہجے میں کہا۔ تم شادی کرنا چاہتے ہو؟ انہوں نے منہ سے تو کچھ نہ کہا، مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے کہا کیوں؟ اس سوال پر وہ بہت سراسیمہ ہوئے۔ انگلی کالر کے اندر ڈال کر کالر کو اور ڈھیلا کیا اور پھر میری طرف دیکھا۔ میں نے منہ موڑ لیا۔ آخر اس جھینپا جھینپی کے بعد میں نے مناسب یہی سمجھا کہ صاف صاف بات کہی جائے۔ میں نے کہا تمہیں لڑکی سے محبت ہے؟ سر ہلایا کہ ہاں۔ میں نے کہا بہت؟ پھر سر ہلایا کہ ہاں۔ میں نے کہا کتنی؟ خاموش ہو گئے۔ میں نے پوچھا اسے بھی تم سے محبت ہے؟ میرا یہ پوچھنا تھا کہ ان کا سارا جسم کانپ گیا، پسینہ پھوٹ آیا، اور بدا کر بولے جی ہاں بہت۔

اف، میرا پارہ چڑھ گیا۔ میں نے کہا، سن بے چغد۔ میں تمہارے گھر بھر کو جانتا ہوں، تمہارے باپ سے میری پرانی علیک سلیک ہے، غریب میری طرح مزدور آدمی ہے، گھر تمہارا میری طرح کرایہ کا ہے، ماں تمہاری ہماری ماؤں بہنوں کی طرح سیدھی سادھی خاتون ہیں، یہ گٹ پٹ والا ڈولا لے کر تو جائے گا کہاں؟ اپنی کھال میں رہ اور بھاگ جا یہاں سے۔ وہ دروازے کے پاس پہنچ کر رک گیا اور کہا، مجھے کچھ اور بھی کہنا ہے۔ میں نے کہا کہو۔ فرمایا میں تو اس سے شادی نہ کرتا مگر مجبور ہوں۔ میں نے کہا، وہ کیوں؟ اس نے کہا وہ کہتی ہے کہ اگر شادی نہیں کرتے تو سو پونڈ دو۔ اب میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے کہا یہ سو پونڈ کیسے؟ فرمایا وہ دو جان سے ہے۔ کہتی ہے کہ سو پونڈ ہوں تو کسی نیم حکیم کو دے کر خلاصی پاؤں اور اگر خلاصی نہیں پا سکتی تو یہی صورت ہے کہ شادی کر لوں۔

میں نے کہا تو آپ کے نزدیک شادی آسان ہے اور سو پونڈ مہیا کرنا مشکل؟ فرمایا جی ہاں۔ اب ابا کو کیسے لکھوں کہ سو پونڈ بھیجیے تاکہ وغیرہ وغیرہ۔ شادی کا لکھ دیا۔ کیونکہ شادی تو کوئی ایسی ویسی بات نہیں۔ میں نے کہا میاں تم جاؤ، ایک دن کے بعد آنا۔ اس وقت تم نے میرا دماغ معطل کر دیا ہے۔ وہ لڑکا چلا گیا اور میں سوچ میں پڑ گیا کہ اب اس مسئلے کا حل کیا ہو؟ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد میں نے دو چار اور لڑکوں کو اپنے فلیٹ پر بلایا۔ مقصد میرا اس سے یہ تھا کہ ان لڑکوں سے جو ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے، باتوں باتوں میں اس لڑکی کم بخت کے مزید حالات دریافت کروں۔ ان لڑکوں میں کچھ ہندو تھے اور ایک سکھ۔ سب کے سب شراب کے رسیا۔ جب وہ چار پانچ گلاس شراب کے انہوں نے زہر مار فرمائے تو کھلے اور خوب کھلے۔ ایک تو رونے لگا اور رو رو کر مجھ سے کہنے لگا، اجی بخاری صاحب، بڑی مصیبت میں ہوں۔ میری جان بچائیے۔ میں نے کہا کیا ہوا، کچھ کہو تو سہی، مجھ سے جو کچھ ہو سکے کروں گا۔

فرمایا ایک لڑکی سے میرا ملنا جلنا تھا، کم بخت وہ دو جان سے ہو گئی ہے اور مجھ سے سو پونڈ مانگتی ہے۔ دوسرا بولا ارے ارے میرے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ میری کم بخت ڈیڑھ سو پونڈ مانگتی ہے۔ یہ کہہ کر دونوں ہائے ہائے کرنے لگے۔ میں ایک کو الگ لے گیا اور اس سے پوچھا میاں اس لڑکی کا نام کیا ہے؟ اب جو اس نے نام بتایا تو وہی جو اس دھان پان صاحبزادے نے بتایا تھا۔ دوسرے لڑکے کو الگ جا کر میں نے لڑکی کا نام پوچھا تو پھر وہی۔ بس اب کیا تھا۔ اب میں نے اس لڑکی کو بلوایا۔ پہلے تو میاں دھان پان کا ذکر چھیڑا اور کہا کہ دیکھو وہ شادی تو نہیں کر سکتا، اب اگر تم سو پونڈ سے کچھ کم کر دو تو مہربانی ہوگی۔ پہلے تو وہ بہت جز بز ہوئی، مگر آخر میں کہنے لگی اچھا پانچ دس پونڈ کم سہی۔ میں نے کہا خوب، میں اس لڑکے سے کہوں گا۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ وہ دوسرا لڑکا، سکھ لڑکا، اس سے بھی تم نے سو پونڈ مانگے ہیں، وہ بھی دس پانچ پونڈ کم کرو گی نا؟ اور سنو، کم بخت وہ تیسرا لڑکا، جس سے تم نے ڈیڑھ سو پونڈ مانگے ہیں، اس کی رقم میں کتنا کم کرو گی؟ وہ لڑکی تو دو گیارہ ہو گئی اور پھر کبھی اس نے شفیع ہوٹل کا رخ نہیں کیا۔ (جاری ہے)

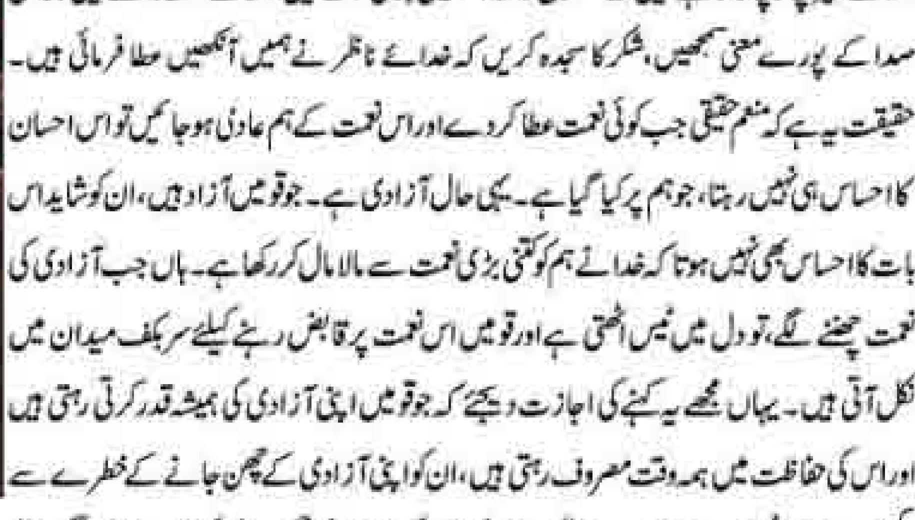
☆☆☆☆☆

اتوار/04 مئی 2014ء
روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

مجمع میں تقریر جھاڑنے والے ریڈیو پر "پھسڈی" ہو جاتے تھے

چرچل اس ڈھب سے بولتے کہ سننے والے مسحور ہو جاتے - دوران جنگ فوجی بھرتی سے

انگلستان میں نوجوان ملازمین کی کمی ہو گئی تھی - زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



اندھے فقیر پکار پکار کر کہتے ہیں کہ آنکھوں والو، آنکھیں بڑی نعمت ہیں، مگر کتنے آنکھ والے ہیں جو اس صدا کے پورے معنی سمجھیں، شکر کا سجدہ کریں کہ خدائے ناظر نے ہمیں آنکھیں عطا فرمائی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ منعم حقیقی جب کوئی نعمت عطا کردے اور اس نعمت کے ہم عادی ہو جائیں تو اس احسان کا احساس ہی نہیں رہتا، جو ہم پر کیا گیا ہے۔ یہی حال آزادی ہے۔ جو قومیں آزاد ہیں، ان کو شاید اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ خدا نے ہم کو کتنی بڑی نعمت سے مالا مال کر رکھا ہے۔ ہاں جب آزادی کی نعمت چھننے لگے، تو دل میں ٹیس اٹھتی ہے اور قومیں اس نعمت پر قابض رہنے کیلئے سر بکف میدان میں نکل آتی ہیں۔ یہاں مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ جو قومیں اپنی آزادی کی ہمیشہ قدر کرتی رہتی ہیں اور اس کی حفاظت میں ہمہ وقت مصروف رہتی ہیں، ان کو اپنی آزادی کے چھن جانے کے خطرے سے کبھی دوچار ہی نہیں ہونا پڑتا۔ جب ہٹلر نے انگلستان کی آزادی کو چھین لینے کی ٹھان لی، تو انگریز قوم کے افراد خواب غفلت سے بیدار ہوئے اور مقابلے کیلئے میدان میں اتر آئے، حالانکہ اس وقت انگلستان جرمنی کے مقابلے میں بے سروسامان تھا۔ جوں جوں ہٹلر کی یلغار بڑھتی جاتی تھی، انگریز کی ہمت زیادہ اور بے سروسامانی کم ہوتی جاتی تھی۔ ہٹلر کی یورش پر انگریز خواب غفلت سے بیدار ہوا۔ چونکہ شروع شروع میں مقابلے کیلئے تیار نہ تھا، یعنی تازہ تازہ خواب غفلت سے بیدار ہوا تھا، لہٰذا آئے دن اپنی کابینہ کے وزیر بدلتا رہا۔ بہت ہی تھوڑے عرصے میں وزارت اطلاعات کے یکے بعد دیگرے کئی وزیر بدل ڈالے۔ بی بی سی کے ڈائریکٹر جنرل کی اسامی پر "تو چل میں آیا" والی بات صادق آتی تھی۔ آج یہ ڈائریکٹر جنرل ہے، تو کل دوسرا، پھر تیسرا، پھر ایک کے بجائے دو ڈائریکٹر جنرل۔ غرض یہ کہ جہاں تک بڑے بڑے عہدوں کا تعلق تھا کسی چیز کو ثبات نہ تھا، ہاں اگر ثبات تھا تو صرف تغیر کو۔ آخر کار انگلستان کو چرچل مل گیا، اس نے انگریز قوم کی شیرازہ بندی کی، بکھرے ہوئے حواس کو سمیٹا اور قوم کو فتح کے میدان میں لا اتارا۔ چرچل اعلیٰ درجے کا ادیب ہے۔ ریڈیو پر بولنے کا ڈھب اس نے اس غضب کا پایا ہے کہ سننے والے مسحور ہو جاتے ہیں۔ یہ شخص ریڈیو پر بولنے کیلئے آئے تو جب چاہے رلا دے، جب چاہے ہنسا دے اور جب چاہے حیرت کی مورت بنا دے۔ چرچل کی کامیابی میں اس کی ریڈیو پر بولنے کی صلاحیت کو بڑا دخل ہے۔ خدا معلوم ریڈیو میں کیا بات ہے کہ بڑے بڑے لوگ جو مجمع میں اچھی خاصی تقریر کر لیتے ہیں، ریڈیو پر پھسڈی رہ جاتے ہیں اور ایسے لوگ بھی ہیں جو ریڈیو پر بولتے وقت جادو جگاتے ہیں، لیکن عام مجمع میں ان کی تقریر بڑی مایوس کن ہوتی ہے۔ لائیڈ جارج جو بہت ہی اچھا مقرر تھا، ریڈیو پر ناکام ثابت ہوا۔ خدا نے یہ سعادت چرچل ہی کو بخشی ہے کہ ریڈیو کا بھی بادشاہ اور مجمع میں بھی تقریر کا شیر۔

میں نے چرچل کو ریڈیو پر تقریر کرتے دیکھا ہے۔ مسودے میں اتنی کاٹ چھانٹ کرتا ہے کہ خدا کی پناہ، میری سمجھ میں یہ کبھی نہیں آیا کہ ایسے کٹے چھٹے مسودے کو یہ شخص اس قدر روانی کے ساتھ کیوں کر پڑھتا ہے۔ تقریر سنئے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ مسودہ پڑھتے پڑھتے اپنی طرف سے وقت کے وقت کوئی چبھتا ہوا فقرہ جڑ دیتا ہے۔ لیکن یہ شخص اپنے مسودے سے سرمو انحراف نہیں کرتا۔ یہ شخص بولتا ہی اس طرح ہے کہ اس پر زبانی تقریر کا گمان ہوتا ہے حالانکہ لکھی ہوئی تقریر اس کے سامنے رہتی ہے اور یہ ایک ایک حرف پڑھتا ہے۔ ان کی تقاریر سن کر انگریز قوم خواب غفلت سے بیدار ہو گئی تھی، اس کے بعد اس قدر چاق و چوبند ہو کر میدان میں اتری کہ ہٹلر کو شکست دے کر ہی دم لیا۔ مجھے یہاں انگریز عوام کا اور صرف عوام کا ذکر کرنا ہے اور یہ دکھانا مقصود ہے کہ عوام نے کس ہمت اور کس جذبے کا ثبوت دیا۔

جنگ کے زمانے میں انگلستان پر کنٹرول اور راشن مسلط تھا۔ تقریباً ہر ایک چیز راشن پر ملتی تھی اور جو اشیا راشن کی حد سے باہر تھیں ان کی قیمت پر کنٹرول تھا۔ مثلاً سگریٹ کی قلت تھی، لیکن اس پر راشن عائد نہیں تھا۔ قیمت پر کنٹرول ضرور تھا۔ لیکن اس کے باوجود میں نے دوران جنگ میں کبھی سگریٹ کو بلیک مارکیٹ میں بکتے ہوئے نہیں دیکھا اور نہ کوئی ایسی مثال میرے دیکھنے میں آئی کہ کسی نے دکان دکان پھر کر ضرورت سے زیادہ سگریٹ کی ڈبیاں جمع کر لی ہوں۔ سگریٹ کے علاوہ ماچس کی بھی بڑی قلت تھی۔ یہ لائٹر اسی زمانے کی ایجاد ہے۔ جنگ سے پہلے لائٹر بہت کم استعمال ہوتے تھے اور وہ بھی صرف غربا استعمال کرتے تھے۔ امرا کو لائٹر سے نفرت تھی۔ وہ اسے بہت گھٹیا چیز سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ لائٹر سے سگریٹ یا سگار سلگایا جائے، تو اس میں پیٹرول کی بو آجاتی ہے۔ انگلستان کا دکاندار بہت عقلمند ہے۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ کسی نہ کسی طرح امرا کو لائٹر استعمال کرنے پر آمادہ کرنا چاہئے۔ اس نے سونے اور چاندی کے لائٹر بنائے۔ پانچ پاؤنڈ سے لے کر بیس، پچیس پچیس پاؤنڈ کے لائٹر بنائے۔ عورتوں کیلئے جو لائٹر بنایا، اس میں لپ اسٹک، پاؤڈر اور چھوٹے سے آئینے کیلئے بھی جگہ رکھی۔ بس اب کیا تھا، امرا کے گھروں سے ماچس کو دیس نکالا ملا اور اس کی جگہ ہر میز اور ہر کمرے میں لائٹر براجمان ہو گیا۔ لائٹر کی منڈی نے اتنا زور پکڑا کہ امرا کے بجائے اب غربا نے ماچس استعمال کرنا شروع کر دی۔

خیر یہ تو فیشن کی بات ہے۔ جہاں تک آزادی کی حفاظت کا تعلق ہے امرا اور غربا سب ایک ہی صف میں تھے۔ خوراک کے متعلق، کپڑوں کے متعلق، پیٹرول کے متعلق، جو حکم امرا کیلئے تھا، وہی غربا کیلئے بھی تھا۔ یہاں پیچیدگی یہ آپڑی کہ امرا اپنی دولت کے بل پر بڑے بڑے ہوٹلوں میں جا کر کھانا کھا سکتے تھے۔ غربا کیلئے، بوجہ غربت، ہوٹلوں کے دروازے مسدود تھے۔ اس کا حل حکومت انگلستان نے عجیب نکالا، وہ یہ کہ کسی شخص کو ہوٹل میں پانچ شلنگ سے زیادہ کا کھانا دینے کی مناہی کر دی۔ اس کے ساتھ حکومت نے اپنے ہوٹل بھی چلائے، جہاں نہایت معقول کھانا، صرف چھ پنس میں ملتا تھا۔ امیر ہو کہ غریب کوئی شخص اپنے گھر کا ردی سامان مثلاً سگریٹ کی خالی ڈبیاں، پرانے اخبار، خالی ڈبے ضائع نہیں کرتا تھا۔ یہ تمام چیزیں سنبھال کر رکھ لی جاتی تھیں۔ سرکاری گاڑی بازاروں، محلوں، گلی کوچوں اور دیہات میں پھرتی تھیں اور یہ جمع کیا ہوا ردی سامان ان گاڑیوں میں ڈال دیا جاتا تھا۔ اس ردی سامان کو دوبارہ کارآمد بنانے کیلئے خاص کارخانے کھولے گئے تھے، جہاں یہ ردی سامان پہنچا دیا جاتا تھا اور پھر نئی صورت میں ڈھل کر بازار میں آجاتا تھا۔ جنگ کے زمانے میں انگلستان میں بھرتی لازمی ہو گئی تھی۔ صرف بوڑھے لوگ تو رہ گئے تھے، باقی تمام جوان 45 برس کی عمر تک کے فوج میں بھرتی ہو گئے۔ اس لازمی بھرتی کے باعث انگلستان میں نوکروں کی کمی ہو گئی اور انگلستان کے بڑے بڑے مکانوں میں رہنے والوں کو قدر عافیت معلوم ہوئی۔ جو لوگ شاندار حویلیوں میں رہتے تھے، وہ اب حویلیوں کو چلائیں تو کیونکر۔ مرتے کیا نہ کرتے، اپنے مکانوں کے بہت سے کمروں کو بند کر دیا۔ صرف دو کمرے کھلے رکھتے تاکہ اپنے ہاتھ سے ان دو کمروں کی جھاڑ پونچھ کر سکیں۔ زیبائش کا سارا سامان اٹھا کر بکسوں میں بند کر دیا کہ نہ میلا ہو اور نہ صاف کرنے کی نوبت آئے۔ نوکروں کی قلت کو اس شدت سے محسوس کیا گیا کہ بے شمار امرا نے اپنے مکانوں کو سرکاری تحویل میں، دفتر اسکول وغیرہ چلانے کیلئے دے دیا اور خود ہوٹلوں میں اٹھ آئے یا رہنے کیلئے چھوٹے چھوٹے فلیٹ کرائے پر لے لئے۔ ایک آدھ بوڑھا ملازم اگر مل گیا تو اس کو کچے پان کے پتے کی طرح سنبھال سنبھال کر رکھا اور اس کی ناز برداری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

میری ملنے والیوں میں ایک معمر خاتون تھیں، نہایت ہی امیر اور نہایت ہی مہمان نواز۔ ان کے یہاں اکثر شام کی دعوتیں ہوا کرتی تھیں۔ یہ دعوتیں بے تکلف دعوتیں نہ تھیں۔ ان میں بہت رکھ رکھاؤ سے کام لیا جاتا اور ایسے لوگوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر بلایا جاتا تھا، جو ایسی محفلوں کے رکھ رکھاؤ سے واقف ہوں۔ ان پارٹیوں میں مجھے شرکت کی دعوت ملا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ میں اس دعوت میں شریک ہوا، تو دیکھا کہ لگی ہوئی میز سے ایک کرسی ہٹوائی جا رہی ہے۔ میں نے پوچھا کون نہیں آ رہا؟ میری خاتون دوست نے فرمایا لارڈ فلاں کو بلایا تھا اس نے معذرت لکھ بھیجی ہے۔ یہ دیکھو اس کا خط۔ خط میں لکھا تھا کہ چونکہ راشن کے قواعد کے مطابق کلف لگانا ممنوع ہو گیا ہے، اس لئے میں وہ قمیص نہیں پہن سکتا جو ڈنر کے کپڑوں کے ساتھ پہنی جاتی ہے، میری معذرت قبول فرمائی جائے۔ اگر کبھی دوپہر کے کھانے پر مدعو فرمائیں گی تو میں ضرور حاضر ہوں گا۔

رسی جل گئی، مگر بل نہ گیا۔ خوراک کی قلت کے باعث کپڑوں پر کلف لگانا ممنوع قرار دے دیا گیا، لیکن امرا کے فیشن میں فرق نہ آیا۔ انہیں یہ تو منظور کہ کھانے کی دعوت میں شریک نہ ہوں، لیکن یہ قبول نہیں کہ شام کے کھانے کی دعوت میں ایسی قمیص پہن کر آئیں جس میں کلف نہ لگا ہو۔ یہ تو دعوتوں کا ذکر ہے، لائینل فیلڈن کا باپ تو اپنے گھر میں بھی شام کا کھانا بغیر ڈنر جیکٹ اور کلف دار قمیص پہنے نہیں کھاتا تھا۔ فیلڈن کے باپ کے گھر کا دستور عجیب تھا۔ ان کے مکان میں چالیس بیڈ روم یعنی سونے کے کمرے تھے۔ اکثر امرا یہاں تک کہ موجودہ ملکہ انگلستان کے والد شہنشاہ جارج ششم بھی، گھوڑوں پر سوار ہو کر لومڑی کے شکار پر جانا ہوتا اس گھر میں آ کر ٹھہرا کرتے تھے۔ شام کے سات بجے اس مکان میں ایک برج پر لگا ہوا گھنٹہ بجتا تھا۔ اس کو سن کر ہم سب کھیل یا باغ کی سیر کو چھوڑ کر اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے تھے۔ یہاں ہمیں اپنا ڈنر سوٹ استری کیا ہوا، تیار ملتا تھا۔ غسل کر کے ہم ڈنر سوٹ پہنتے تھے اور کوئی پونے آٹھ بجے سونے کے کمرے سے نکل کر نیچے ڈرائنگ روم میں جمع ہوتے تھے۔ جس کو کاک ٹیل پینا ہو، وہ کاک ٹیل پیتا تھا۔ اتنے میں عورتیں کمرے میں آجاتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر مردوں پر لازم آتا تھا کہ ان کے لباس کی تعریف کریں۔ اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوتی تھیں۔ ٹھیک آٹھ بجے ملازم آ کر کہتا تھا کہ کھانا تیار ہے، سب کھانے کی میز پر آ کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے تھے۔ فیلڈن کا باپ کرسی پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیتا تھا اور ہاتھ جوڑ کر دعا مانگتا تھا۔ "اے خدا تو جو کچھ بھی ہمیں دینے والا ہے اس کے ساتھ ہمیں یہ توفیق بھی عطا فرما کہ ہم تہہ دل سے تیرے شکر گزار ہوں"۔

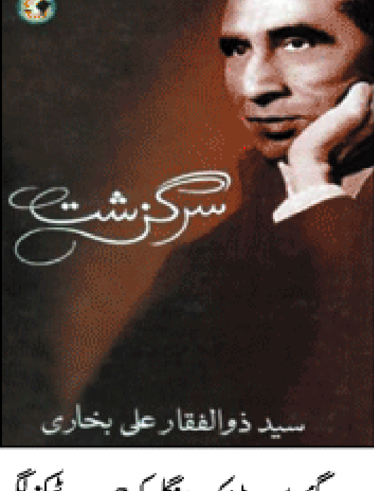
کھانا اس رفتار سے کھایا جاتا تھا کہ ٹھیک نو بجے کافی کے دور کی نوبت آئے۔ کافی کے ساتھ بیٹری کا ریڈیو سیٹ بھی لا کر میز پر رکھ دیا جاتا تھا۔ لوگ کافی پیتے جاتے تھے اور بی بی سی سے خبریں بھی سنتے جاتے تھے۔ خبریں سننے کے بعد، عورتیں اٹھ کر چلی جاتی تھیں، مرد کچھ دیر بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔ کوئی ساڑھے نو بجے فیلڈن کا باپ کہتا تھا: "ہاں تو چلئے"۔ مرد اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آتے تھے، کچھ دیر باتیں ہوتی تھیں، سوا دس بجے گڈ نائٹ کہہ کر سب اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے تھے۔ جب قمیصوں پر کلف لگانا ممنوع قرار دیا گیا تو فیلڈن کے باپ نے کھانے کی میز پر بیٹھ کر ڈنر کھانے سے انکار کر دیا۔ وہ اپنا کھانا الگ اوپر کی منزل میں منگواتے تھے اور وہیں اکیلے بیٹھ کر کھایا کرتے تھے۔ یقین مانئے کہ فیلڈن کا باپ کلف دار قمیص نہ پہننے کا صدمہ برداشت نہ کر سکا اور اسی صدمے میں گھل گھل کر مر گیا۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

روزنامہ امت کراچی/حیدر آباد

جرمنی کیخلاف جنگ کو چرچل نے مذہبی رنگ دیا

زبان کے بادشاہ کا کہنا تھا برطانیہ کلیسائی تہذیب کی حفاظت کیلئے لڑ رہا ہے- صرف میں نے آواز اٹھائی کہ ہندوستان کے 40 کروڑ ''غلام'' عیسائی نہیں- بی بی سی کے پروگرام میں تخریبی کارروائیاں سکھائی جاتی تھیں- زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



روس کا دورہ یوں کیا جیسے آندھی چلے، طوفان آئے، سیلاب امڈے۔ کابل سے تاشقند، تاشقند سے ایریوان۔ ایریوان سے باکو، باکو سے مہاج کلا۔ مہاج کلا سے لینن گرڈ، لینن گرڈ سے ماسکو۔ ماسکو سے کابل، کابل سے کراچی۔ اتنا بڑا سفر اور وقت ایک مہینے سے بھی کم۔ تقدیر یاور تھی کہ ان مقامات کو دیکھا، مگر پاؤں میں چکر اتنا تھا کہ اس سفر میں سر چکرا گیا۔ جب ہی تو کہتا ہوں کہ حواس ٹھکانے ہوں تو اس تازہ سفر کا حال لکھوں۔ لکھوں گا ضرور مگر ٹھہر ٹھہر کر، سوچ سوچ کر، حواس کو اکٹھا کر کے۔ کاتا اور لے دوڑی میرا شیوہ نہیں۔ میں سہج پکے سو میٹھا کا قائل ہوں۔ انگریز تو ہوں نہیں کہ کسی ملک کو اچٹتی ہوئی نظر سے دیکھا۔ ڈاک بنگلے میں قیام کیا۔ پیتل کے برتن خریدے اور وطن مالوف میں پہنچ کر کتاب لکھ ماری اور نہایت وثوق سے تبصرہ فرمایا کہ تمام ملک ہمارے نام کا کلمہ پڑھتا ہے اور میرا بیرا تو رو رو کر کہتا تھا کہ صاحب جب سے آپ گئے ہیں، ڈاک بنگلے کی چھت ٹپکنے لگی ہے۔ دیگر یہ کہ ہندوستان کے پیتل کے برتن بہت خوب صورت ہیں۔

میرے بیان میں مبالغہ نہیں۔ لندن میں سر مالکم ڈارلنگ کے ایک پروگرام پر میں نے تبصرہ کیا اور گزارش کی کہ آپ کا پروگرام نہایت لغو ہے۔ سر مالکم ڈارلنگ مسکرائے اور جیب سے ایک خط نکالا اور فرمایا پڑھو۔ میں نے پڑھا۔ معلوم ہوا کہ یہ خط حضور کے بیرے نے لکھا ہے اور اس میں تحریر فرمایا ہے کہ آپ کا خط ملا۔ میں نے ایک دکان پر جا کر اپنے دوستوں کے ساتھ آپ کا پروگرام سنا۔ واہ واہ بہت خوب تھا۔ آپ کا پروگرام سن کر ہم کو یقین ہو گیا کہ سرکار برطانیہ کی فتح ہو گئی۔ ہم نے بھی بہت بہت دعا مانگی کہ خدا سرکار برطانیہ اور بادشاہ سلامت کو فتح دے۔ دیگر گزارش یہ ہے کہ میرے لیے گھڑی یا کوئی اور نشانی ضرور بھیجیں، تاکہ یادگار رہے۔ اسی برہان قاطع کے بعد میرے پاس صاحب بہادر کے پروگرام کو لغو قرار دینے کی کوئی دلیل باقی نہ رہی۔ میں نے ہاتھ اٹھائے اور دعا مانگی کہ اللہ تعالیٰ صاحب بہادر کو شفائے کلی عطا فرما۔

جنگ کے دوران میں مجھے ہندوستان بھیجا گیا اور ہدایت کی گئی کہ ملک بھر میں گھوم کر یہ اندازہ لگاؤ کہ پبلسٹی کا کام کس نہج پر چل رہا ہے۔ میں لندن سے دہلی آیا تو اندازہ لگایا کہ معاملہ سرکار کی نظر میں تو درست ہے، مگر عوام کی حالت یہ ہے کہ جہاں سرکار پٹتی ہے، خوش ہوتے ہیں۔ جرمنی کی نشریات کو سچا اور برطانیہ کی نشریات کو محض پروپیگنڈہ سمجھتے ہیں۔ زجر و توبیخ کا یہ عالم ہے، ایک تانگے والے کو پکڑ کر قید کر دیا۔ قصور اس مسخرے کا یہ تھا کہ اس نے اپنے مریل گھوڑے سے کہا ''اے گھوڑے کے بچے! ہٹلر کی طرح چل، چرچل کی طرح کیوں چل رہا ہے''۔ خیر، میں نے ہندوستان بھر کا سفر کیا اور اپنے مشاہدے کے مطابق روداد مرتب کر کے سرکار کو پیش کی۔ سرکار دہلی نے میری رپورٹ کا مطالعہ فرمانے کے بعد فیصلہ صادر فرمایا کہ یہ شخص گردن زدنی ہے۔ مگر آخر کار مراحم خسروانہ سے کام لے کر ایک میٹنگ طلب فرمائی تاکہ میٹنگ کی چار دیواری کے اندر، میرے دماغ کی تطہیر کی جائے۔ مجھے اسی میٹنگ میں سمجھایا گیا کہ برخوردار، تمہاری نیت نیک مگر تمہارا دماغ خراب معلوم ہوتا ہے۔ برصغیر ہندوستان کا بچہ بچہ سرکار برطانیہ پر جان فدا کرنے کو تیار ہے۔ اگلے دن فوجی خیموں کے کھونٹے بنانے والے ٹھیکیدار نے بالکل اپنی مرضی سے اپنے منافع کا پچاس فیصد حصہ سرکار کو قومی جنگی محاذ کے لیے عطیہ دیا ہے۔ اس سے اور اسی قسم کی متعدد مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ رعایا سرکار کی بہت وفادار ہے اور دل و جان سے چاہتی ہے کہ قومی جنگی محاذ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے۔ اور پھر سرکار کی قدر شناسی دیکھو کہ اسی فوجی خیموں کے کھونٹے بنانے والے ٹھیکیدار کی وفاداری سے خوش ہو کر اس کو خان بہادر کا خطاب عطا کیا، حالانکہ ٹھیکیدار کہتا رہا کہ جناب اس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے جتنے ٹھیکے ملیں گے ان سب کا نصف منافع سرکار کو قومی جنگی محاذ کے لیے دیتا رہوں گا۔ اب آپ کب تک مجھے خطاب دیتے رہیں گے۔

قومی جنگی محاذ کا سن کر میرے کان پک گئے۔ آج کل تو ہمارے یہاں قومی کے معنی قومی ہیں، لیکن غلامی کے دور میں قومی کے معنی ہر وہ بات ہوا کرتی تھی جو سرکار کے خلاف ہو۔ مجھے شرارت سوجھی۔ میں نے کہا بہت اچھا سرکار، آپ کا پروپیگنڈہ بہت خوب ہے، مگر جگہ جگہ آپ نے یہ اشتہار کیوں لگا رکھے ہیں کہ اس جنگی محاذ کے لئے چندہ دو جو سرکار کے خلاف قائم کیا گیا ہے۔ قومی محاذ کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ یہ محاذ سرکار کے خلاف ہے۔ میری معروضات سن کر صاحب بہادر بہت چکرائے۔ بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔ حکم صادر فرمایا کہ یہ لفظ ''قومی'' بدل دیا جائے۔ میں نے گزارش کی کہ حضور لفظ غریب کا کیا قصور، اس کو نہ بدلیے حکومت کو بدل دیجئے۔ اس واقعہ کے بعد دہلی کے دفاتر میں انگریزوں کے سامنے میرا اقتدار گھٹ گیا۔ دیسی لوگ حسب معمول ملتے رہے، لیکن انگریز نے مجھے اپنے حسابوں راندہ درگاہ گردانا۔ جب اس کھینچا تانی نے طول کھینچا تو میں نے کہا اچھا تم جانو تمہارا کام۔ میں اب لوٹ کر انگلستان نہیں جانا چاہتا۔ مجھے بی بی سی سے واپس بلا لو۔ انگریز نے فیصلہ کیا کہ میری واپسی کی درخواست کا فیصلہ محکمہ اطلاعات کے سیکریٹری تھاپر صاحب فرمائیں۔ میں ان کے حضور پیش ہوا اور کہا کہ تھاپر جی مہاراج، یہ انگریز من مانی کرنا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ ہم اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں۔ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ مجھے بی بی سی سے واپس بلا لیجئے۔ میری یہ گزارش سن کر تھاپر صاحب ابلتی ہوئی دال کی طرح ابلے، منہ میں جھاگ لائے اور فرمایا کہ تم لوٹ کر آنا چاہتے ہو تو تم لکھ کر درخواست بی بی سی والوں کو دو اور ان سے اپنے واپس آنے کی التجا کرو۔ میں نے کہا اب یہ بی بی سی والے مجھ سے اگر پوچھ بیٹھیں تم کیوں واپس جانا چاہتے ہو تو میں جواب میں کیا کہوں گا؟ یہی نا کہ ہندوستان کے چند بیرا پسند انگریزوں سے مجھے اختلاف ہے۔ اگر میں نے یہ کہا تو ان کا جواب یہی ہو گا کہ بھئی اختلاف تو تم کو ہندوستان کے خوشامد پسند انگریزوں سے ہے اور چھوڑ کر جانا چاہتے ہو تم بی بی سی کو۔ یہ کہاں کی منطق ہے؟

تھاپر صاحب کے پاس میری معروضات کا جواب صرف یہی تھا کہ انہوں نے میز پر دو ایک مکے اور مارے۔ اس پر میں نے ان کو سلوٹ مارا اور کمرے سے باہر نکل آیا، ٹکٹ کٹوایا اور سیدھا لندن پہنچا۔ مراد میری تھاپر صاحب والا قصہ سنانے سے یہ تھی کہ صاحب بہادر کو خوش کرنے کے لیے تھاپر جیسے اعلیٰ افسر نے بھی میری معمولی سی گزارش پر توجہ نہ فرمائی۔ مجھے حق پہنچتا تھا کہ میرا محکمہ مجھے واپس بلا لے، تاکہ میری بات بنی رہے۔ تھاپر صاحب ایک تو خود پرلے درجے کے متعصب۔ اس پر کریلا اور نیم چڑھا۔ انگریز کا اشارہ وہ پا گئے۔ انہیں کیا پڑی تھی کہ میرا نام رکھنے کے لیے کوئی اقدام کرتے۔ اچھا تھاپر صاحب! آپ کی بات یاد رہے گی اور کبھی فراموش نہ کروں گا کہ آپ...... خیر جانے دیجئے۔ اب کیا معلوم کہ آپ زندہ ہیں یا سرگباشی ہو گئے۔ ہاں تو میں لوٹ کر لندن پہنچا۔ وہاں پہنچ کر میں نے صاحبان اقتدار سے کہا کہ ہندوستان میں پروپیگنڈے کا نام لے کر روپیہ ضائع کیا جا رہا ہے۔ ملک میں تخریبی کارروائیاں زور و شور پر ہیں۔ ان کا اثر عوام کے دلوں پر زیادہ ہے اور پروپیگنڈے کا کم۔

انگریز بات دیر میں سمجھتا ہے، مگر سمجھتا ضرور ہے۔ آخر انگریز کی سمجھ میں میری بات آ گئی اور پروپیگنڈے کے کاروبار میں کچھ ردوبدل ہوا۔ یہاں ایک تبدیلی کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ شاید دلچسپ ہو۔ پیرس پر ان دنوں ہٹلر قابض تھا۔ بی بی سی کی جانب سے ایک خاص پروگرام یورپ کے لیے اور خاص کر پیرس کے سننے والوں کے لیے نشر ہوتا تھا۔ اس پروگرام میں بتایا جاتا تھا کہ تخریبی کام کیوں کر کیا جائے۔ فیکٹریوں کو اڑا دینے کی ترکیبیں بتائی جاتی تھیں۔ ریل کو پٹری سے اتار دینے کے ڈھب سمجھائے جاتے تھے اور اسی قسم کی دیگر تخریبی کارروائیوں کے نشیب و فراز سمجھائے جاتے تھے۔

اب لطف کی بات یہ ہے کہ جو ترکیبیں انگریز پیرس والوں کو سمجھاتا تھا، ان ترکیبوں پر عمل پیرس سے قبل ہندوستان میں ہو جاتا تھا۔ انگریز حیران ہوا کہ بی بی سی کا وہ خاص پروگرام جو پیرس کے لیے نشر کیا جاتا ہے، ایسے میٹر پر نشر کیا جاتا ہے کہ ہندوستان والے بھی سن لیتے ہیں اور سن کر وہ تخریبی کارروائیاں ہندوستان میں کرتے ہیں، جن کے لیے بی بی سی والے فرانسیسیوں کو پٹی پڑھاتے ہیں۔ جب اس غلطی کا انکشاف ہوا تو کچھ نہ پوچھئے کہ کیا کھلبلی مچی۔ یہ میٹر بدل، وہ میٹر بدل۔ یہاں پردہ ڈال، وہاں دیوار کھڑی کر۔ غرض کہ شب و روز کی تگ و دو کے بعد ایسا انتظام ہوا کہ فرانس والی نشریات ہندوستان میں نہ سنی جا سکیں۔ نشر و اشاعت کی دنیا بھی عجیب ہے۔ یہاں ہر بات ناپ تول کر کرنی پڑتی ہے۔ ایک لفظ کی ہیر پھیر سے کہیں کی بات کہیں جا پہنچتی ہے۔

جنگ کے آغاز میں برطانیہ کی وزارت اطلاعات نے ایک پوسٹر جاری کیا، جس کے مخاطب فوجی تھے۔ پوسٹر کا مضمون تھا۔ تمہاری جرات...... تمہاری شجاعت...... تمہاری بسالت...... ہمیں فتح کے دروازے پر لے جائے گی۔ بظاہر یہ پوسٹر برا نہیں معلوم ہوتا، مگر اس پوسٹر کے نکلتے ہی فوج میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ واہ صاحب واہ، آپ نے تو اپنی حکمت عملی کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ دکھ بھریں بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں۔ جرأت ہماری، شجاعت ہماری، بسالت ہماری، لیکن فتح آپ کی۔ اگر آپ کو اپنے لیے فتح حاصل کرنی ہے تو آپ خود جرأت دکھایئے۔ خود شجاعت کے جوہر نمایاں کیجئے۔ خود بسالت کے مظاہرے کیجئے۔ ہمیں کیا غرض پڑی ہے کہ فتح تو ہو آپ کی اور مرتے پھریں ہم۔ اس اعتراض نے اس قدر زور پکڑا کہ حکومت برطانیہ نے سارے پوسٹر بحق سرکار ضبط کر لیے۔ اسی طرح کسی صاحب کو، غالباً خود چرچل کو سوجھی کہ انگلستان اور جرمنی کی جنگ کو مذہبی جنگ بنا دیا جائے۔ چرچل زبان کا بادشاہ۔ فرمایا کہ برطانیہ یہ جنگ کلیسائی تہذیب کی حفاظت کے لیے لڑ رہا ہے۔ انگلستان، امریکہ اور یورپ کے تمام اخبارات نے چرچل کے اس فقرے پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسا دیئے۔ میں کیا اور میری بساط کیا۔ لیکن میں نے ایک یادداشت نہایت مؤدبانہ وزارت اطلاعات کی خدمت میں ارسال کی کہ دولت مشترکہ کی کل آبادی پچاس کروڑ ہے۔ اس میں چالیس کروڑ غلام ہندوستان میں آباد ہیں، باقی دس کروڑ دیگر ممالک محروسہ میں مکیں ہیں۔ ہندوستان کے چالیس کروڑ غلام عیسائی نہیں۔ انہیں کیا غرض کہ کلیسائی تہذیب کے تحفظ کے لیے جنگ کریں۔ ہوتے ہوتے یہ بات سب کے کان میں پہنچ گئی کہ برصغیر ہندوستان کو کلیسائی تہذیب کی حفاظت کے لیے جنگ پر آمادہ کرنا چنداں درست نہ ہو گا۔ چنانچہ یہ فقرہ نشر و اشاعت کی فرہنگ سے خارج کر دیا گیا۔

ایک دن برطانیہ کی وزارت اطلاعات کے ایک کمرے میں یار لوگ بیٹھے کلیسائی تہذیب والے فقرے کی ضبطی پر بحث کر رہے تھے۔ میں بھی شریک محفل تھا۔ بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچی کہ یاران محفل مجھ پر برس پڑے اور پوچھا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ برصغیر ہندوستان کے لوگ نہ تو برطانیہ کے تاج کے لیے لڑ رہے ہیں، نہ کلیسائی تہذیب کے لیے۔ پھر آخر جنگ میں شریک کس لیے ہوئے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ پیٹ کے لیے۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

روس کے بازاروں میں کاغذ قلم کا فقدان تھا

کتابوں کی دکانوں پر خریداروں کی بھیڑ- پڑھنے والوں کا ہجوم-لیکن لکھنے کیلئے کاغذ نہ قلم-''اے پیچ ٹو انڈیا'' کے مصنف فوسٹر کو نت نئے موضوعات پر لکھنے میں کمال حاصل تھا- دوستی کا عملی مفہوم اسی سے پتہ چلا- زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



کسی عادت کو چھوڑ دینا مشکل ہوتا ہے۔ چھوٹی ہوئی عادت کو دوبارہ اختیار کر لینے میں کوئی دقت نہیں ہوتی، البتہ لکھنے کی عادت ایسی ہے کہ چھٹ جائے تو دوبارہ قلم رواں کرنے میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میں روس کیا گیا لکھنا پڑھنا ہی چھوٹ گیا۔ اب لکھنے بیٹھتا ہوں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ریگ مال پر قلم چلا رہا ہوں۔ میرا وتیرہ رہا ہے کہ روز کچھ نہ کچھ لکھتا ہوں۔ بات بن گئی تو بن گئی ورنہ کاغذ پھاڑ دیتا ہوں یا کسی پلندے میں باندھ لیتا ہوں کہ شاید کبھی کام آئے۔ اب کے جو روس گیا تو اس قدر مصروف رہا کہ لکھنے پڑھنے کا وقت ہی نہ ملا اور اگر کبھی جی چاہا بھی کہ بیٹھ کر کچھ لکھوں تو کاغذ میسر نہ آیا۔ یقین مانئے یہ واقعہ ہے کہ کاغذ میسر نہ آیا۔ یورپ ہو کہ امریکہ، انگلستان ہو کہ کینیڈا، افریقہ ہو کہ آسٹریلیا، جہاں بھی گیا ہوٹلوں میں کاغذ کی فراوانی دیکھی۔ ہوٹل کے لونج میں خط پتر لکھنے کی میزیں، ان میں ہوٹل کے نام کے کاغذ اور لفافے، سونے کے کمرے میں میز کی دراز میں ہوٹل کے نام کے کاغذ، ہوٹلوں میں دکانیں، جہاں لکھنے کا کاغذ مل جاتا ہے۔ مگر روس کے شہروں کے بازاروں میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلے جایئے کہیں کاغذ کا پرزہ یا قلم فروش کی دکان نظر نہیں آتی۔ کتابوں کی دکانوں پر خریداروں کی بھیڑ، یعنی کتابیں پڑھنے والوں کا ہجوم۔ لیکن کتابیں لکھنے والوں کے لئے یا خط پتر لکھنے والوں کے لئے کاغذ کا فقدان۔

ممکن ہے یہ محض اتفاق ہو کہ مجھے کسی کاغذ فروش کی دکان نظر نہیں آئی۔ بس یوں سمجھئے کہ اس اتفاق کا برا ہو کہ مجھے اپنی روز کے دو چار صفحے لکھنے کی عادت ترک کرنا پڑی۔ پڑھا بھی کچھ نہیں۔ انگریزی اردو کی کتاب ہی کوئی میسر نہ آئی۔ اور اگر کوئی ایک آدھ کتاب مل بھی گئی تو چشمہ ندارد کہ پڑھوں۔ میرا چشمہ ٹوٹ گیا تو میں نے اپنے مترجم اناطول سے کہا کہ بھیا یہ چشمہ بنوا دو، میرے پاس دو چشمے تھے، ایک کھو گیا ہے اور اس دوسرے کی کمانی ٹوٹ گئی ہے۔ ذرا جلد بنوا دو۔ فرمایا، یہاں مہاچ کلا میں تو چشمے کا بننا مشکل ہے۔ لینن گراڈ چل کر دیکھیں گے۔ لینن گراڈ میں کہا کہ یہاں نہیں ماسکو چل کر دیکھیں گے۔ ماسکو سے روانہ ہوتے ہوتے وقت میں نے کہا میاں میرا چشمہ؟ فرمایا اُفو! اچھا خیر بنوا کر تمہارے نام پاکستان بھجوا دوں گا۔ میں نے کہا بھیا، اب تم اس عینک کو اپنے پاس ہی رہنے دو۔ میری چشم عبرت کھل چکی ہے، میں اسی سے کام چلا لوں گا۔ کابل پہنچا تو ایک ایسا خط ملا جو میں کسی اور سے پڑھوانا نہیں چاہتا تھا مگر کیا کرتا، چشمہ پاس نہیں تھا کہ وہ پڑھتا، لامحالہ اس نامہ جان پرور کو حرز جان بنایا اور کراچی آ کر کاتب خط کے سامنے پڑھا اور دونا حظ اٹھایا۔

ہاں تو عرض کر رہا تھا کہ لکھنا ایک عادت ہے، چھٹ جائے تو دوبارہ اس کو اختیار کرنے میں دقت ہوتی ہے۔ ای، ایم، فوسٹر کہ انگریزی ادب میں ان کا بہت بلند مقام ہے، ایک دن فرمانے لگے کہ میں روز کچھ نہ کچھ لکھتا ہوں۔ اگر ایک دو دن بھی قلم نہ چلاؤں تو؟؟ خامے کا ذکر کیا کہ سیاہی رواں نہیں'' والا معاملہ ہو جاتا ہے۔ میں نے کہا صاحب آپ کو ہر روز لکھنے کے لئے موضوع کہاں سے مل جاتا ہے اور اگر موضوع مل بھی جائے تو اس کے مختلف پہلوؤں پر سوچنے اور حسب ضرورت مواد مہیا کرنے میں تو آپ کو ضرور مشکل پڑتی ہوگی۔ فرمایا یہ ضرور ہے کہ بکھرے ہوئے خیالات کو یکجا کرنا آسان نہیں اور بارہا خیالات ایسے کھنڈ جاتے ہیں کہ اکٹھے نہیں ہوتے۔ میں نے کہا تو پھر آپ لکھتے کیوں کر ہیں؟ کہا جب کوئی مضمون نہ سوجھے یا خیالات کی شیرازہ بندی نہ کر پاؤں، تو کسی اچھے مصنف کی کتاب کے کچھ صفحے نقل کرنے بیٹھ جاتا ہوں تاکہ قلم چلتا رہے۔

ایک مقولہ ہے کہ

''گر تو می خواہی کہ باشی خوش نویس

می نویس و می نویس و می نویس

خدا جانے یہ کس کا مقولہ ہے۔ ایطائے جلی سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یا تو کسی بڑے آدمی کا یہ قول ہے اور اگر ہے تو بہت برے حال میں ہم تک پہنچا ہے۔ بہرحال کسی کا ہو، کہنے والا بات پتے کی کہہ گیا ہے۔ خوش نویس کے معنی اگر خوشخط کے نہ ہوں بلکہ صاحب تحریر کے ہوں، تو بات وہی بنتی ہے، جو ای، ایم، فوسٹر نے کہی تھی۔

ای، ایم، فوسٹر جنگ کے زمانے میں میرے پروگراموں میں ہر ہفتے شریک ہوا کرتے تھے۔ کتابوں پر تبصرہ کرنا ان کے ذمے تھا۔ کتابوں پر تبصرہ اور وہ بھی ہر ہفتے، ذرا مشکل بات ہے۔ پہلی دقت تو یہ کہ ہر ہفتے نئی کتابیں کہاں سے آئیں، پھر انہیں پڑھنے کا وقت، سوچ بچار کرنے کی مہلت اور ان پر تبصرہ لکھنے کی فرصت کہاں سے آئے۔ ایک دن اپنی اس مشکل کا ذکر انہوں نے مجھ سے کیا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ بھی کیا ضرور کہ صرف نئی کتابوں پر تبصرہ کیا جائے۔ پرانی کتابوں پر جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ ان کتابوں کی اہمیت کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ اور پھر یہ کہ نقد و تبصرہ کے نظریات بدلتے رہتے ہیں۔ پہلے لوگوں نے ان کتابوں کو چراغوں کی روشنی میں دیکھا۔ اب آپ انہیں بجلی کے قمقموں کے اجالے میں پڑھئے اور ان پر اپنی رائے کا اظہار کیجئے۔ فوسٹر صاحب کو میری بات پسند آئی اور انہوں نے اپنی نشری تقریروں میں بیشتر پرانی کتابوں پر تبصرہ کیا۔ لیکن ای، ایم، فوسٹر کے تبصرے کا یہ اثر ہوا کہ اکثر پرانی کتابوں کے نئے ایڈیشن چھپنے لگے۔

میں نے پاکستان میں بھی پرانی کتابوں پر تبصرے کرائے، مگر اس کا کیا علاج کہ پرانی کتابیں یہاں میسر ہی نہیں آتیں۔ لاہور بھر میں گھوم جایئے سعدی کی گلستان یا بوستان نہ پائے گا۔ پرانا نسخہ کوئی حافظ شیرازی کا مل جائے تو مل جائے، نیا نسخہ کسی کو چھپوانے کی ہمت نہیں پڑتی۔ یہاں تو ڈپٹی نذیر احمد کی کتابوں کا بھی کال ہے۔ اب تو سنتا ہوں کہ ہندوستان میں منشی نول کشور کے مطبع کی چھپی ہوئی اردو فارسی عربی کی کتابیں پنساریوں کے یہاں پڑیا باندھنے کے کام آتی ہیں۔ کاش کوئی ہمت کرے اور صوفی تبسم، مولانا غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام، حفیظ ہوشیار پوری جیسے کسی صاحب علم کو ہفتے عشرے کے لئے بھارت بھیج دے کہ دو چار ہزار خرچ کر کے مسلمانوں کی ثقافت کے اس بیش بہا خزانے کا ایک ایک نسخہ خرید لائے۔ یہ نسخے کسی لائبریری میں دیمک کی خورد برد سے محفوظ کر کے رکھ لئے جائیں۔ دیکھئے شاید آئندہ ہماری اولاد میں کسی کو توفیق ہو کہ ان کتابوں کو پڑھے، انہیں چھپوائے اور یوں شاید وہ ثقافت آنکھوں کے سامنے آ جائے، جس کا ذکر کرتے کرتے ہماری گلے کی رگیں پھول گئی ہیں۔

کتابوں کا ذکر چل نکلا ہے تو ان درسی کتب کا بھی ذکر کر دوں جو آج کل ہمارے طالب علم پڑھتے ہیں۔ ان کتابوں میں تحریر فرمایا گیا ہے کہ کلفٹن کراچی کی مشہور بندرگاہ ہے۔ حجاز عرب کا ایک مشہور شہر ہے۔ بیمہ شرعاً حرام ہے۔ چلئے چھٹی ہوئی۔ تجارت سب ختم، کلفٹن کس سیر تفریح کے لئے جایا کرتے تھے وہ بند ہے۔ اور حجاز شہر کا ٹکٹ ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔ دنیا بھی گئی اور دین بھی گیا۔ یہ تو ہوئیں معنی کی غلطیاں۔ زبان کی غلطیاں ان کتابوں کی اگر آپ گننے بیٹھیں تو اختر شماری کا مزا آ جائے۔ چشم بد دور، ہمارے یہاں کے اہل تدریس نے فارسی میں بھی درسی کتابیں تحریر فرمائی ہیں۔ اگر ان کتابوں کے کسی جملے پر آپ حرف گیری کریں تو فوراً ارشاد ہوگا کہ یہ نئی فارسی ہے۔ اگر آپ نے جدید فارسی کے قواعد کے مطابق کوئی اعتراض کیا، تو ارشاد ہوگا کہ صاحب یہ پرانی فارسی ہے۔ خدا جانے ''آب زر'' ''کف دست'' والی فارسی کی ابتدائی کتب میں کیا کیڑے پڑ گئے تھے کہ نئی کتاب لکھنے کی ضرورت ان حضرات کو مرض کی طرح لاحق ہوگئی۔

ان حضرات کو تو پرانی کتابوں میں سے اقتباس کا بھی سلیقہ نہیں۔ ابتدائی درسی کتابوں میں پرانے بزرگوں کی وہ تحریرات شامل کرتے ہیں جن کا مضمون جدید تحقیقات کے رو سے ساقط ہو چکا ہے۔ مثلاً ایک ادیب شہیر نے اگر کبھی کوئی مضمون اپنے زمانے کے خیالات کے مطابق حفظان صحت پر یا طب پر لکھ دیا تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہی مضمون نکالا اور درسی کتب میں شامل کر دیا۔ یہ نہ سمجھا کہ جدید زمانے میں ایسی پرانی باتوں کی گنجائش نہیں۔ اگر آج کل بھی وہی پرانی حکمت چلتی تو یونانی طب کے علمبردار اور عالم تحقیقاتی ادارے قائم نہ کرتے، صرف پرانی ڈگر پر اکتفا کرتے۔ میں اپنی سرگزشت لکھتے لکھتے لیکچر بازی پر اتر آیا۔ معافی کا خواستگار ہوں۔

ذکر ضمناً ہی سہی ای، ایم، فوسٹر کا کر رہا تھا۔ یہ وہی ای، ایم، فوسٹر ہیں جنہوں نے مشہور کتاب ''اے پیچ ٹو انڈیا'' لکھی ہے۔ فوسٹر کی تحریرات میں طنز، ہلکی سی موج کی طرح بل کھاتا رہتا ہے۔ یہی حال اس کی گفتگو کا ہے۔ فوسٹر اور سر مالکم ڈارلنگ کا قدیم یارانہ تھا۔ فوسٹر میری نظروں میں محترم اور مالکم ڈارلنگ میری آنکھ کا کنکر۔ مالکم ڈارلنگ کے ساتھ میری چپقلش کا ہر جگہ چرچا تھا اور جو دوست بھی ملتا تھا اس چپقلش کا ذکر ضرور کرتا تھا۔ مگر فوسٹر نے کبھی اس طرف دھیان نہ دیا۔ میں جوان اور منہ پھٹ۔ ایک دن میں نے خود ہی اس تنازعہ کا ذکر فوسٹر سے کیا۔ وہ میری بات سنتے رہے اور بیچ بیچ میں بولتے رہے کہ مالکم میرا دوست ہے۔ جب دو چار مرتبہ انہوں نے یہی فقرہ دہرایا تو میں نے جل کر کہا کہ صاحب مجھے مالکم ڈارلنگ سے شکایت ہے۔ مالکم ڈارلنگ آپ کے دوست ہیں، اسی لئے آپ کے سامنے اس شکایت کا ذکر کر رہا ہوں۔ غصے کے مارے فوسٹر صاحب کا رنگ لال ہو گیا۔ مگر ہنس کر فرمایا تم کو ان سے شکایت ہے، مجھے تو نہیں کہ میں ان سے ناراض ہو جاؤں۔ ان کا تمہارے ساتھ جو سلوک ہے، ہوا کرے مجھے اس سے کیا مطلب؟ میں ان سے دوستی چاہتا ہوں، وہ مجھے مل رہی ہے۔ تمہاری بدقسمتی ہے کہ تم کو نہیں ملی۔

یقین مانئے کہ فوسٹر کی بات سن کر مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ دوستی کے بارے میں فوسٹر کا اصول میں نے پلے باندھ لیا۔ لیکن میری شوراپشتی دیکھئے کہ اس واقعہ کے بعد فوسٹر کا احترام تو میرے دل میں بڑھ گیا لیکن اس عناد میں کمی نہ ہوئی جو مالکم ڈارلنگ کی طرف سے میرے دل میں جاگزیں تھا۔ اب تو یہ قصہ قصہ پارینہ ہے لیکن جب کبھی خیال آتا ہے کہ میں نے برسوں شتر کینے سے کام لیا تو سخت ندامت ہوتی ہے۔

فوسٹر نے بہت عرصہ سے کوئی کتاب نہیں لکھی ہاں تنقیدی مضامین لکھتا رہا ہے۔ ان کا ایک پرانا دوست ہے ''جو ایکلے''۔ اس سے میری بھی یاد اللہ ہے۔ اس نے دو کتابیں لکھی ہیں۔ ایک تو جنگی قیدیوں کے متعلق ڈرامہ اور دوسری کتاب ایک ڈائری۔ اس ڈائری کا نام ''ہندو ہالی ڈے'' ہے۔ یہ کتاب مختصر تو ہے لیکن بے حد خوب صورت انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس کا انداز تحریر پڑھ کر اس قدر مسرت ہوئی کہ بیان نہیں کر سکتا۔ ایک دن جو ایکلے سے میں نے کہا، بھائی تم جیسے صاحب قلم کو کچھ اور لکھنا چاہئے۔ ایکلے مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ جب میں نے اصرار کیا کہ کچھ تو لکھو تو ایک آہ بھری اور کہا بخاری، یقین کرو مجھے کوئی موضوع ہی نہیں سوجھتا، لکھوں تو کس موضوع پر۔ اس کے بعد کئی کتابوں اور کئی نظموں کا حوالہ دیا اور کہا کہ دیکھو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کتابوں اور نظموں کے مصنفین کے پاس کوئی موضوع تھا نہیں لیکن پھر بھی لکھنے بیٹھ گئے اور کچھ نہ کچھ دھر گھسیٹا۔ ایکلے کی بات میرے دل میں گھر کر گئی۔ مجھے خود اپنا واقعہ یاد آیا، کہ کسی نے مصرع طرح دیا اور ہم بیٹھ گئے قافیہ پیمائی کرنے۔ مگر قافیہ پیمائی سے کیا ہوتا ہے۔ دل سے بات نکلے تو اثر کرے۔

کچھ تو جنگ کے زمانے کی اکتاہٹ، کچھ فوسٹر اور ایکلے کی باتوں کا اثر، میرا جی انگلستان سے اچاٹ ہو گیا اور میں ہندوستان واپس آنے کیلئے پر تولنے لگا۔ کبھی تو اس خیال سے وطن لوٹوں گا، جی اچھلنے لگتا اور کبھی اس خیال سے کہ انگلستان کو الوداع کہنا ہے، جی بیٹھ جاتا۔ خدا جانے میری مٹی کہاں کی ہے۔ ہر جگہ جانے کو جی چاہتا ہے، مگر کہیں بھی رہ کر خوش نہیں ہوتا۔ چاہتا ہوں کہ ساری دنیا ایک ہی مقام پر سمٹ آئے اور میں اس مقام پر چھایا رہوں۔

نہ بہ جادواش قرارے نہ بہ منزلش مقامے

دل من مسافر من کہ خداش یار بادا

شیخ سعدی کا قول ہے کہ غم نداری بز بخر۔ اگر تجھے کوئی غم نہیں تو ایک بکری خرید لے، پھر دیکھ تیرا کیا حال ہوتا ہے۔ ہر وقت بکری کی فکر میں ڈوبا رہے گا۔ وہ رسی تڑا گئی، ارے لینا میری بیاض کے ورق کھا رہی ہے، ارے دیکھنا دانہ نہیں کھاتی۔ غرض یہ کہ غم نہ داری بز بخر۔ شیخ صاحب نے تو صرف ایک بکری کا ذکر کیا ہے میں نے ایک کیا، کئی ایک بکریاں پال رکھی تھیں۔ مکان کا کیا کروں، اس سامان کا کیا کروں، جو گلی گلی کوچے کوچے پھر کر خریدا ہے۔ دوستوں یاروں کے مجمع کہاں سے آئیں گے۔ اس گاڑی کا کیا کروں۔ فیلڈن اٹلی سے واپس انگلستان آیا تو تنہائی محسوس کرے گا اور پھر بندرا کا کیا ہوگا۔

بندرا ایک ہندوستانی ریاست کی راج کماری تھی۔ میری اس کی واقفیت یوں ہوئی کہ ایک دن مجھے اس کی طرف سے خط آیا کہ کسی دن مجھ سے دفتری اوقات میں آ کر ملو تا کہ اس موضوع پر مزید گفتگو ہو۔ اس کے دو چار دن بعد وہ تشریف لے آئیں۔ بہت حسین مگر پھٹے حالوں۔ پہلے تو مجھے یقین نہ آیا کہ یہ اتنی بڑی ریاست کی راج کماری ہیں۔ لیکن باتوں باتوں میں دریافت ہو گیا کہ میرا شبہ غلط ہے۔ پہلی ہی ملاقات میں یہ کیا پوچھتا کہ محترمہ یہ قصہ کیا ہے، وہاں تو ہاتھی بندھے ہیں اور یہاں آپ نان شبینہ کے لئے تگ و دو کر رہی ہیں۔ خیر رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ یہ لڑکی انگلستان زدہ ہے۔ یہاں کی چاٹ اس کو ایسی لگ گئی ہے کہ واپس جانے کے نام سے گھبراتی ہے۔ بس اس کی ہٹ سے برہم ہو کر گھر والوں نے وظیفہ بند کر رکھا ہے۔ یہ لڑکی انگریزی اچھی خاصی کیا بہت اچھی بولتی تھی۔ آواز بھی اس نے غضب کی پائی تھی، مگر اردو ہندی میں صفر تھی۔ چنانچہ اردو پروگراموں میں اس کا شامل ہونا ناممکن نظر آتا تھا۔ باقی رہا انگریزی کا پروگرام تو اس میں اس کو کس کام پر لگاتا۔ صاحب تحریر تھی نہیں کہ اس سے تقریریں ہی کراتا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اس کی خوب صورت آواز کو استعمال کیوں کر کروں۔

ریڈیو والوں پر لوگوں کو اعتراض ہے کہ محض جان پہچان والوں کو پروگرام دیتے ہیں، دوسروں کو پوچھتے ہی نہیں۔ ایک دن بمبئی میں ایک صحافی نے مجھے انٹرویو میں کہا کہ یہ پروگرام کیوں، وہ پروگرام کیوں نہیں، یہ ملازم کیوں اور وہ ملازم کیوں نہیں؟ جب ان طفلانہ سوالوں کا جواب ان کو خاطر خواہ مل گیا تو کہا کہ ایک آخری سوال! میں نے کہا فرمایئے۔ کہا تم پر یہ الزام ہے کہ تم صرف اپنی جان پہچان والوں کو پروگرام دیتے ہو۔ میں نے کہا یہ بالکل درست ہے کہ میں صرف ان لوگوں کو پروگرام دیتا ہوں جن کو جانتا ہوں۔ صحافی صاحب میرا جواب سن کر بہت اچھلے کودے اور فرمایا اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم گناہ کا اعتراف کرتے ہو۔ میں نے کہا میں نے گناہ کیا ہے؟ گناہ تو جب ہوتا کہ میں کسی کو بغیر دیکھے بھالے، جانے پہچانے پروگرام دے دیتا۔ صحافی میاں کا جوش دھیما پڑ گیا تو میں نے کہا، میاں برخوردار تم اپنی مثال لو۔ فرض کرو میں چاہتا ہوں کہ تم کو پروگرام دوں۔ اب تم ہی بتاؤ کہ کیا پروگرام دوں؟ ممکن ہے تم طبلہ بجاتے ہو۔ ممکن ہے تم کو شعر کی سوجھ بوجھ ہو۔ ممکن ہے تم ایکٹر ہو۔ اب یہ تمام باتیں تو صرف اسی وقت معلوم ہو سکتی ہیں جب میں تم کو اچھی طرح جانوں اور تمہاری صلاحیتوں کا اندازہ لگاؤں۔ ریڈیو والوں کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ لوگوں کو جانیں اور ان کی صلاحیتوں سے واقف ہوں۔ چنانچہ میں نے بندرا کی صلاحیتوں کا اندازہ لگانے کا تہیہ کر لیا۔ میں اس کو اکثر اپنے یہاں بلاتا، اکثر ہم دن کا ایک آدھ کھانا اکٹھے کھاتے، تھیٹر سینما بھی دونوں ساتھ جاتے، رفتہ رفتہ وہ مجھے بہت قریب دکھائی دینے لگی۔ اب آگے کیا لکھوں۔ تصور میں ہزاروں باتیں گھوم رہی ہیں۔ آنکھیں بند کئے بیٹھا ہوں۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

روزنامہ امت کراچی/ حیدرآباد

ہندوستانی راج کماری نے برطانوی حکومت کو نیچا دکھا دیا

بندرا اپنے نام کے ساتھ پرنس لکھتی تھی۔ بی بی سی کو نوٹس ملا کہ یہ لقب شاہی خاندان کیلئے مختص ہے۔ بندرا نے بیسیوں کتابوں کے حوالے دے ڈالے۔ جن میں انگریزوں نے ہندوستانی راجاؤں کو پرنس لکھا تھا۔ حکام کو ہار ماننی پڑی۔ زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



جی چاہتا ہے کہ راج کماری بندرا کا قصہ پھر شروع کروں۔ کیا کیا جائے یہ قصہ زلف پریشان کا قصہ ہے۔ اس کے ہر پل میں پیچ در پیچ اور خم در خم افسانے ہیں، افسانہ در افسانہ۔ جوں جوں بندرا سے میری رسم و راہ بڑھتی گئی، رقابتوں کے سلسلے دراز ہوتے گئے۔ میری سب سے بڑی رقیب ایک عورت تھی۔ فارگو اس کا نام تھا۔ کوئی پینتیس برس کا سن، دائم المریض، بندرا اور اس کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہی مکان میں رہتی تھیں۔ فارگو کچھ تو بیمار تھی اور کچھ بیمار بنتی تھی۔ جہاں بندرا باہر جانے لگے یہ ہائے اللہ کہتی اور پلنگ پر پیٹ پکڑے دراز ہو جاتی۔ بندرا کی اور میری کئی شامیں فارگو کی تیمارداری کی نذر ہو گئیں۔ کئی تھیٹر فارگو کے اس ناٹک کی بھینٹ چڑھ گئے۔ یہ عجیب قسم کا بلیک میل تھا۔ جذباتی بلیک میل۔ مگر بندرا بھی مجبور اور میں بھی بے بس۔ اگر کوئی شخص درد کے مارے، ہر چند کہ وہ درد مصنوعی ہو، کروٹیں بدل رہا ہو تو کون جیوٹ ایسا ہو گا جو کہے کہ اچھا تو تم درد کے ہاتھوں کراہو، اتنے میں ہم تھیٹر ہو آئیں۔

فارگو کے سر سے جب رقابت کا بھوت گھنٹے دو گھنٹے کو اتر جاتا تو بڑے مزے کی باتیں کرتی۔ کتابوں کی باتیں، ہنسی مذاق کے قصے، محبت پیار کے افسانے۔ ایسے موقعوں پر میں اس کی باتیں حد سے زیادہ توجہ کے ساتھ سنتا اور اپنے اوپر وہ تاثر طاری کرتا جو وہ چاہتی تھی کہ طاری ہو۔ اس کے لطیفوں پر ضرورت سے زیادہ ہنستا۔ اگر آپ کو کسی سے قرب پیدا کرنا ہو تو اس کے لطیفوں پر ہنسیے، ضرورت سے زیادہ ہنسیے، ہر مرتبہ نئے انداز سے ہنسیے۔ اس بات کی طرف کبھی دھیان نہ دیجئے کہ لطیفہ پھس پھسا ہے یا پرانا ہے۔ میرے حق میں یہ نسخہ کارگر ثابت ہوا۔ لیکن محض ایک آدھ دن کے لئے۔ اس کے بعد فارگو پر پھر وہی جنون سوار ہو جاتا۔

خیر یہ تو فارگو کی رقابت کا حال تھا۔ اب سنئے گورنمنٹ برطانیہ کی رقابت کا حال۔ بندرا اپنے نام کے ساتھ انگریزی زبان کا لفظ پرنس لکھا کرتی تھی، یعنی پرنس بندرا۔ اس کا نام اسی طرح بی بی سی کے پروگراموں کے سلسلے میں کہیں شائع ہو گیا۔ بس صاحب پھر کیا تھا۔ حکومت برطانیہ کے انڈیا آفس میں کھلبلی مچ گئی۔ بی بی سی کے نام خط آیا کہ پرنس کا لقب برطانیہ کے شاہی خاندان کے لئے مختص ہے، یہ لفظ کوئی ہندوستانی غلام استعمال نہیں کر سکتا۔ بندرا ایک آفت کی پرکالا۔ اسے جب معلوم ہوا کہ میں اپنے نام کے ساتھ پرنس نہیں لکھ سکتی تو آگ بگولا ہو گئی۔ اس نے بیسیوں کتابوں کے حوالے دیئے جن میں خود انگریزوں نے ہندوستانی راجاؤں کو پرنس لکھا تھا۔ اس نے کہا کہ اگر مرد پرنس ہو سکتے ہیں تو عورت پرنس کیوں نہیں ہو سکتی؟ اس بات نے کافی طول کھینچا۔ لیکن آخر جیت بندرا کی ہوئی۔ یعنی حکومت برطانیہ نے بندرا کو اپنے نام کے ساتھ پرنس لکھنے کی اجازت دے دی۔

بندرا کے ساتھ میری پہلی سیر حاصل ملاقات بلراج ساہنی کے مکان پر ہوئی تھی۔ بلراج اور اس کی آنجہانی بیوی دمینتی نے، بندرا کو کھانے پر بلایا تھا اور مجھے بھی مدعو کیا تھا۔ دمینتی دیسی کھانا بہت اچھا پکاتی تھی۔ بندرا کو دیسی کھانا برسوں کے بعد ملا، پل پڑی اور اتنا کھایا کہ مجھے گھن آنے لگی۔ اگر میں کسی کو پرخوری کرتے دیکھوں تو مجھے اس شخص سے خدا واسطے کا بیر ہو جاتا ہے۔ میں پرخوری کو حریص اور خود غرض آدمی کی خاص نشانی سمجھتا ہوں اور پھر یہ بھی سمجھتا ہوں کہ پرخور آدمی، پرخوری کر کے اپنی کسی اور سفلی بھوک کی خانہ پری کرتا ہے۔

بندرا کی پرخوری نے میری شام خراب کر دی۔ کھانے سے پہلے بڑے مزے مزے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ بلراج کے چٹکلے، دمینتی کے لطیفے، بندرا کی ٹوٹی پھوٹی اردو اور پنجابی اور اس کی بے پناہ ہنسی۔ غرض یہ کہ شام بڑے لطف سے کٹ رہی تھی۔ اگر ہم اس دن کھانا نہ کھاتے تو وہ شام یادگار رہتی۔ اس کھانے نے سب مزا کرکرا کر دیا۔ لیکن، دوبالا یا زیادہ کھانے کے بعد میں اور بندرا ایک ساتھ روانہ ہوئے۔ گاڑی بندرا کی تھی اور وہی چلا رہی تھی۔ میرا گھر بندرا کے گھر کے راستے میں پڑتا تھا۔ طے پایا کہ بندرا مجھے گھر اتار کر اپنے گھر چلی جائے گی۔ اب جو ہم بلراج کے گھر سے چلے تو راستے میں دھند نے آگھیرا۔ دھند اور لندن کی دھند، وہ بھی رات کے وقت، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ لیمپوں کی روشنی بے کار محض ہو کر رہ گئی تھی۔ لندن کی دھند میں گاڑی چلانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ایک آدمی گاڑی کے آگے آگے ٹارچ لے کر چلے اور اس کی روشنی میں گاڑی پیدل انسان کی رفتار سے آگے بڑھتی رہے۔ اگر ٹارچ کی روشنی میسر نہ ہو تو گاڑی کبھی پٹڑی پر چڑھ جاتی ہے اور کبھی کسی بجلی کے کھمبے سے جا ٹکراتی ہے۔

بندرا کو ٹارچ دکھانے کی خدمت میرے سپرد ہوئی۔ میں آگے آگے ٹارچ لے کر پیدل چلتا رہا اور بندرا میرے ٹارچ کی روشنی میں دھیرے دھیرے گاڑی چلاتی رہی۔ بلراج کا گھر ہو گا سات آٹھ میل بندرا کے گھر سے دور۔ چنانچہ یہ خاکسار سات آٹھ میل مشعل راہ بنا ہوا بندرا کی گاڑی کے آگے آگے چلتا رہا۔ اگر میرے سپرد وہ خدمت ہوتی جو فرہاد کے سپرد ہوئی تھی تو کچھ نام تو ہوتا، لیکن اب تو میں مفت میں ہانپ رہا تھا۔ سردی کا موسم، کندھوں پر کوٹ کا پالان، پاؤں میں بھاری بھاری بوٹ، ہاتھ میں ٹارچ، نذرالاسلام کا گیت ''چل رے چل رے چل رے نوجوان'' گنگناتا ہوا چلتا رہا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ساری دنیا میں نذرالاسلام کے ارشاد پر عمل کرنے والا صرف میں ہی ہوں۔

خدا خدا کر کے یہ مسافت طے ہوئی اور گاڑی بندرا کے گھر کے دروازے کے سامنے پہنچی۔ خدا جانے بندرا نے واقعی ہمدردی کی بنا پر کہا یا محض تکلفاً کہا، مگر اس نے ضرور کہا کہ آؤ۔ سردی لگی ہو گی، کافی بناتی ہوں، پی لو۔ اور پھر یہیں سے ٹیلی فون کر کے تمہارے لئے ٹیکسی منگواتی ہوں۔ رات کے دو بجے ہیں، سڑکوں پر کہاں ٹیکسی کے لئے مارے مارے پھرو گے۔ میں نے بندرا کی بات مان لی اور اس کے ساتھ اس کے مکان میں داخل ہوا۔ فارگو جاگ رہی تھی۔ بس صاحب پھر کیا تھا، اللہ دے اور بندہ لے۔ اس نے بندرا کو اور مجھے وہ آڑے ہاتھوں لیا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ میں بالکل خاموش تھا اور وہ برابر بولے چلے جا رہی تھی۔ جب بکتے بکتے تھک گئی تو بولی تم بھی تو منہ سے کچھ پھوٹو۔ میں نے کہا، فارگو تمہارا خیال ہے کہ میں بندرا پر فریفتہ ہوں۔ فرض کر لو کہ ہوں، مگر جان من! اس دھند میں اور سردی میں آٹھ میل ٹارچ تھام کر گاڑی کے آگے چلتے چلتے میرا سارا عشق ہرن ہو گیا ہے۔ میری بات سن کر فارگو لپک کر کھڑکی کی طرف گئی، کھڑکی کھولی، جھانک کر باہر دیکھا، ہائے افسوس کہ اس وقت دھند اٹھ چکی تھی اور مطلع صاف تھا۔ اب فارگو کا پارہ مزید چڑھا اور میں نے خیریت اسی میں دیکھی کہ بغیر کافی پئے وہاں سے چل دوں اور ٹیکسی کے لئے سڑکوں پر مارا مارا پھروں۔ اگلے روز میں نے سارا واقعہ بلراج اور دمینتی کو سنایا۔ ہوتے ہوتے سارے بی بی سی میں مشہور ہو گیا کہ بخاری عشق سے تائب ہو گیا۔

یہاں ایک واقعہ پروفیسر صوفی تبسم کے فرزندوں کا سن لیجئے۔ صوفی صاحب کے تین صاحب زادے سیر و تفریح کے لئے کراچی آئے اور میرے یہاں مقیم ہوئے۔ انہوں نے اخبار میں پڑھا کہ یہاں الائٹ تھیٹر میں لیلیٰ مجنوں کا ناٹک ہو رہا ہے۔ میرے سر ہوئے کہ ہمیں ناٹک دکھاؤ، ہم نے کبھی کسی پیشہ ور کمپنی کا ناٹک نہیں دیکھا۔ الائٹ تھیٹر کی ناٹک کمپنی ایسی ویسی ہی تھی، مگر پھر بھی میں نے بچوں کا دل توڑنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے انہیں تھیٹر جانے کی اجازت دے دی، بلکہ خود ان کے ساتھ گیا۔ ڈرامہ لغو، ایکٹر ضرورت سے زیادہ دراز گو، ہر معمولی بات کو گلا پھاڑ کر کہنے والے، محبت کا اظہار سینے پر ہاتھ مار کر اور نفرت کا اظہار زمین پر تھوک کر کرنے والے۔ ڈرامہ نویس اور ایکٹروں نے مل جل کر مجنوں کو لیلیٰ کے ساتھ عشق کرنے کی وہ سزا دی کہ ہٹلر بھی شرم کے مارے زمین میں گڑ گیا ہو گا۔

خیر ڈرامہ ختم ہوا اور ہم گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں صوفی تبسم صاحب کا منجھلا لڑکا بولا، ''بخاری صاحب، خدا آپ کو ہمارے سروں پر سلامت رکھے، آپ نے ہم پر بہت احسان کیا ہے، بے حد احسان۔ اب ہم مجنوں کے حال سے عبرت پکڑیں گے اور ساری عمر کبھی عشق نہ کریں گے''۔ اب میں ان بچوں کو بندرا، دھند، اور ٹارچ والا واقعہ کیا سناتا، صرف اتنا کہا کہ بچو تم سستے چھوٹے۔ علاقے سے چھٹکارا پانے کا بہترین ذریعہ نقل مکانی ہے۔ بعد مکانی بہت سے دماغی زخموں کو مندمل کر دیتا ہے۔ شاید ناسخ کا شعر ہے:

مرض عشق سے اب کے جو سنبھل جاؤنگا
تو میں دو چار برس کو کہیں ٹل جاؤں گا

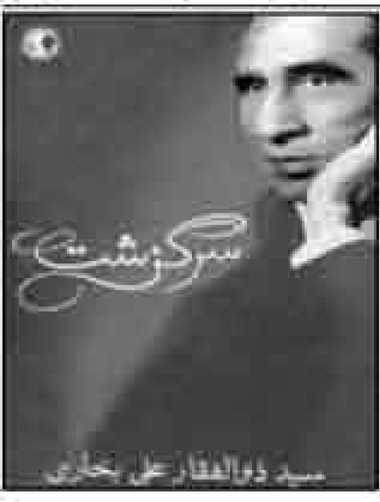
ناسخ نے تو مرض عشق سے سنبھلنے کی قید لگا دی، میری گزارش یہ ہے کہ اگر مرض عشق سے سنبھل ہی گئے تو پھر دو چار برس کے لئے کہیں ٹل جانا کیا ضرور۔ دو چار برس کے لئے کہیں ٹل جانا تو اس لئے ضروری ہے کہ انسان یوں کہیں ٹل جائے تو مرض عشق سے سنبھل جاتا ہے۔ جب سنبھل ہی گیا تو ٹلنا کیا۔ اور تو کسی کے ساتھ مجھے کیا عشق ہوتا، البتہ عشق مجھے تھا انگلستان کے تھیٹر سے۔ انگلستان کی ''کسے را با کسے کارے نہ باشد'' والی زندگی سے۔ انگلستان کی لائبریریوں سے۔ انگلستان کے اہل قلم سے۔ کئی کاکل تھے جن میں میرا دل دیوانہ الجھا ہوا تھا، لیکن تا بکے۔ رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ بہت دن جنگل کے چکر کاٹے، اب شہر میں چل کر دھونی رماؤں۔ بیوی تنہائی محسوس کر رہی ہے، بچیاں سیانی ہو رہی ہیں، اب چلو ہندوستان چلو، پھر جو خدا کرے۔ میں نے انگلستان سے روانہ ہونے میں بہت تعجیل سے کام لیا۔ میں نے دل سے کہا، دل بھیا سوچو مت، بس چل دو، یہاں سے جلدی چلو، ورنہ کیا معلوم تم کب پسار بیٹھو۔ میں نے انگلستان سے روانہ ہونے میں اتنی جلدی کی کہ بھرا گھر بنک والوں کے سپرد کر دیا کہ تم جانو اور تمہارا کام۔ سامان سب سمیٹو، باندھو اور میرے نام ہندوستان روانہ کر دو، مجھے فرصت نہیں۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

جمعۃ المبارک/09 مئی 2014ء
روزنامہ امت کراچی/حیدر آباد

کلکتہ ریڈیو اسٹیشن میں رشوت کا بازار گرم تھا

پروگرام ڈائریکٹر موجمدار رقم کے عوض غیر معروف لوگوں کو ڈراموں میں کردار دیتا-قلیل تنخواہ کے باوجود شہر میں دو مکان بنا لیے-انگریز ڈائریکٹر کی سرپرستی حاصل تھی-زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



جب میرا تبادلہ کلکتے ہونے لگا تو میں بہت تلملایا۔ بمبئی چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر کرتا کیا، حکم حاکم مرگ مفاجات۔ کلکتے گیا اور بادل ناخواستہ گیا۔ میں نے بہتیرا کہا کہ میرا تبادلہ نہ کرو اور اگر کرنا ہی ہے تو مجھے کلکتہ کے بجائے پشاور بھیج دو، مگر میری کسی نے نہ سنی۔ بلکہ جب وزارت کے کانوں تک یہ بات پہنچی کہ بخاری اپنا تبادلہ پشاور میں چاہتا ہے تو افسران بالادست بہت جز بز ہوئے۔ انہوں نے سمجھا کہ بخاری احتجاج کے طور پر یہ کہہ رہا ہے کہ مجھے پشاور بھیج دو، ورنہ اتنا دانا آدمی پشاور کے چھوٹے سے اسٹیشن پر کیوں کر لگایا جاسکتا ہے۔ اس زمانے میں پشاور سب سے چھوٹا اسٹیشن تھا، لیکن میں اس معاملے میں ذرا قلندر واقع ہوا ہوں۔ مجھے اس بات کا خیال نہیں آتا کہ فلاں کام چھوٹا ہے اور میں بڑا ہوں۔ بڑا نام صرف اللہ کا اور پھر کام کا کیا ہے، اکثر چھوٹے کام میرے نزدیک بڑے کاموں سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ میں پشاور کا رہنے والا ہوں، پشاور میری رگ رگ میں سمایا ہوا ہے، پشاوری زبان اور پشاوری تہذیب کا دلدادہ ہوں۔ میرا جب بھی خیال تھا اور اب بھی خیال ہے کہ اگر میں دوران ملازمت میں پشاور کے ریڈیو اسٹیشن پر متعین کر دیا جاتا تو کچھ نہ کچھ ضرور کر گزرتا۔ مگر اب سوائے اس کے کہ آہ بھر لوں اور کر ہی کیا سکتا ہوں۔

ریڈیو اس معاملے میں بہت بدقسمت رہا کہ اس کو کسی خطے کے اسٹیشن چلانے کیلئے وہی کے لوگ نہ مل سکے۔ اگر اتفاق سے لاہور کے اسٹیشن پر کسی لاہوری کا تقرر ہو بھی گیا تو کے دن کا؟ ہمارے یہاں سرکاری ملازمت اور تبادلے لازم و ملزوم ہیں۔ میں نے اکثر دیکھا ہے، اگر اسٹیشن ڈائریکٹر اپنے اسٹیشن کے حلقے کی زبان جانتا ہو تو اسٹیشن کے پروگرام اچھے ہو جاتے ہیں۔ انگلستان والوں نے بھی یہی کیا ہے۔ اسکاٹ لینڈ کے اسٹیشنوں پر اسکاٹ لینڈ والے کام کرتے ہیں اور آئرلینڈ کے اسٹیشن پر آئرلینڈ والے۔ یہاں تک کہ اناؤنسر بھی خطے ہی کے ہوتے ہیں، تا کہ خطے کے لب و لہجہ میں بول سکیں۔ یہ لوگ بولتے ہیں انگریزی، مگر اپنے مخصوص لہجہ میں، اس کے برخلاف یہاں یہ حالت ہے کہ اگر کوئی شخص ریڈیو پر یا فلم میں پنجابی، بنگالی یا سندھی، بلوچی، سرحدی لہجہ میں اردو بولے تو اہل زبان کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں، آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور لاحول پڑھتے ہیں۔ کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟ اردو ہم سب کی زبان ہے اور ہم سب ایک ہی لہجہ میں اردو کیا کوئی زبان بھی نہیں بول سکتے۔

خیر میں کلکتہ پہنچا۔ ان دنوں گارسٹن پلیس کے ایک نہایت ہی تنگ و تاریک مکان میں کلکتے کا ریڈیو اسٹیشن داد عشرت دیتا تھا۔ اسٹیشن کا ڈائریکٹر ایک انگریز تھا۔ وہ نوکری سے الگ ہوا تو مجھے اس کی جگہ ملی۔ یہ انگریز رہتا ہندوستان میں تھا، مگر ہندوستان سے قطعی نا آشنا اور ہندوستانیوں سے بدرجہ اتم متنفر تھا۔ ریڈیو اسٹیشن کی عمارت کی دو منزلیں تھیں۔ اس کی اوپر کی منزل انگریزی پروگراموں کے لئے مخصوص تھی۔ یہاں تک کہ انگریزی پروگراموں کے دوران میں سوائے انجینئر کے کسی کالے آدمی کو اوپر جانے کی اجازت نہ تھی۔ انگریز اناؤنسر، انگریز پروڈیوسر، انگریز ایکٹر، انگریز گویے، انگریز سازندے۔ کالا آدمی انجینئر صرف کنٹرول روم میں بیٹھتا تھا۔ اس کو باہر نکل کر گوروں کے ساتھ خلط ملط ہونے کی اجازت نہ تھی۔ انگریز کوئی کام بغیر شراب کے نہیں کر سکتا، چنانچہ پروگرام کے دوران میں شراب کی بوتلیں کھلتی تھیں اور صاحب لوگ اور میم صاحب لوگ سیر ہو کر پیتے تھے۔ کالا انجینئر صرف کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھتا رہتا تھا۔ یعنی: ''آنکھیں میری باقی ان کا''۔ کنٹرول روم کے ساتھ ایک وسیع اسٹوڈیو تھا، جہاں یہ انگریز دھما چوکڑی مچایا کرتے تھے۔ اس اسٹوڈیو میں ایک دری بچھی تھی۔ مائیکروفون کا تار دری کے نیچے بچھایا گیا تھا اور دری کے ایک سوراخ میں سے اس کا سرا باہر نکلتا تھا۔ میں نے دری کو دیکھا تو پوچھا کہ یہ دری جب سے آئی ہے باہر نکال کر کبھی صاف ہوئی ہے یا نہیں۔ جواب ملا نہیں۔ وجہ صاف نہ کرنے کی یہ کہ مائیکروفون سے تار کو الگ کرنا اور اسے دری کے نیچے سے نکالنا پھر دری کو اٹھانا ذرا لمبی بات ہے۔ اس لئے صرف اوپر اوپر سے تو دری صاف ہو جاتی ہے۔ اسے اٹھا کر جھٹکنے کی کبھی لوبت ہی نہیں آئی۔ میں نے کہا ایسی بھی کیا سستی۔ مائیکروفون کے تار کھولو، تار باہر نکالو، دری اٹھاؤ اور باہر لے جا کر جھٹکو۔ اب جو دری اٹھائی گئی تو شرم کے مارے ہم سب کی آنکھیں جھک گئیں۔ دری کے نیچے سے ضبط تولید کے مختلف فرسودہ سامان نکلے۔ یہ تھی کلکتے کے انگریزی کی انگریزیت۔ یقین مانئے کہ انگلستان میں اس قدر بیہودگی اور بے حیائی کہیں دیکھنے میں نہیں آئی۔ یہ بے راہروی صرف ہندوستانی انگریزوں کا حصہ تھی۔ تعجب مجھے اس بات پر ہوا کہ دفتر میں کام کرنے والے دیسی لوگ انگریزوں سے دبتے تھے۔ دبتے کیا تھے انگریز کے نام سے کانپتے تھے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر میں تاڑ گیا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کلکتے ریڈیو کے ڈائریکٹر آف پروگرامز ایک صاحب موجمدار نامی تھے۔ انگریز اسٹیشن ڈائریکٹر نے تمام دیسی پروگرام اس موجمدار کے سپرد کر رکھے تھے۔ یہ موجمدار سیاہ و سفید کا مالک تھا، جس کو چاہے پروگرام دے۔ پروگرام کی فیس بھی یہی شخص مقرر کرتا تھا۔ انگریز اسٹیشن ڈائریکٹر نے کہہ رکھا تھا کہ سال بھر میں اتنی رقم تمہیں دیسی پروگرام کیلئے ملے گی۔ اب تم جانو اور تمہارا دیسی پروگرام۔

اس شخص موجمدار نے اپنے اقتدار کے بل پر رشوت کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ اور عجیب عجیب ڈھنگ رشوت وصول کرنے کے اختراع کیا کرتا تھا۔ یہ شخص ہفتہ میں ایک ڈرامہ کیا کرتا تھا، تین گھنٹے کا۔ اس ڈرامے میں کردار کوئی پچاس ہوا کرتے تھے۔ ایک شخص آواز لگا رہا ہے، سبزی لے لو سبزی۔ یہ کردار وہ شخص ادا کرتا تھا جس کے یہاں سے موجمدار کے گھر سبزی آیا کرتی تھی۔ ایک شخص آواز لگایا کرتا تھا مچھلی لے لو مچھلی، اس کی دکان سے موجمدار کے گھر مچھلی آیا کرتی تھی۔ ایک شخص آ کر کہتا تھا، چلئے حضور کھانا حاضر۔ یہ موجمدار کے گھر کا ملازم تھا۔ غرض یہ کہ موجمدار وہ اندھا تھا جو اپنوں میں ریوڑیاں بانٹا کرتا تھا۔ یہ شخص تنخواہ قلیل پاتا تھا، مگر دو مکان کلکتے جیسے شہر میں بنوا رکھے تھے۔

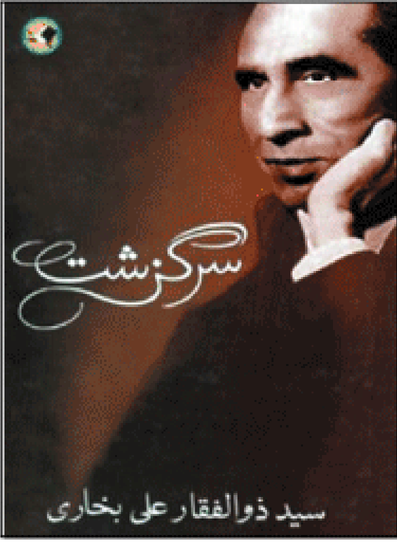
اب یہ شخص انگریز سے نہ دبتا تو اور کون دبتا۔ عملہ میں کوئی مسلمان نہ تھا، سب ہندو تھے۔ پروگرام کے فنکار بھی سب ہندو تھے۔ ریڈیو سے آداب عرض وغیرہ نہیں بلکہ نمسکار کہا جاتا تھا۔ یہ تھی اس صوبے کی حالت جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس نمسکار پر میرا جی بہت کڑھا۔ دل نے کہا اگر نمسکار درست ہے تو السلام علیکم کو کیوں نہ درست قرار دیا گیا۔ اب میں سرکاری ملازم، پٹیل وزارت نشریات کا وزیر۔ میں کرتا تو کیا کرتا۔ ترکیب میں نے یہ سوچی کہ مسلمان اخباروں سے مطالبہ کرایا جائے کہ نمسکار کے ساتھ یہ اناؤنسر السلام علیکم بھی کہا کرے۔ یہ مطالبہ جب اخباروں میں چھپ جائے تو سرکار دہلی کو اس مطالبہ کی تائید میں خط لکھا جائے پھر جو ہو سو ہو۔ میں ایک مسلمان اخبار نویس سے ملا، تمام معاملہ اس کو سمجھایا اور درخواست کی کہ اس نمسکار اور السلام علیکم کے مسئلے پر ایک آدھ مضمون لکھ دے۔ میری تجویز سن کر اس شخص نے جو کچھ کہا مجھے آج تک یاد ہے اور آج تک اس پر آنسو بہا رہا ہوں۔ اس نے کہا بخاری صاحب آپ سمجھے نہیں، نمسکار بنگالی ہے اور السلام علیکم اردو۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

”ھندو فنکاروں نے میرے خلاف محاذ بنالیا“

میرا کہنا تھا ریڈیو کو فلم پر فوقیت دی جائے- ”وشوا بھارتی“ کے سربراہ کی شہ پر فنکار من مانی پر اتر آئے- 7 سو فنکاروں نے ہڑتال کردی- احتجاجی جلسے میں میری تقریر نے مخالفین کی سازشوں کو ناکام بنادیا- زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



کلکتے ریڈیو پر ٹیگور کا جادو چلا ہوا تھا۔ ٹیگور اچھا شاعر سہی لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا کہ آخر نذرالاسلام کو کیوں فراموش کیا جارہا ہے۔ نذرالاسلام کلکتے ریڈیو کا ملازم رہ چکا تھا اور ملازمت کے دوران میں سیکڑوں منظوم فیچر ریڈیو کے لئے اس نے لکھے تھے۔ ان کے مسودے ڈھونڈ ڈھونڈ کر میں پاگل ہوگیا، مگر ایک پرزہ تک نہ ملا۔ یار لوگوں نے قاضی نذرالاسلام کا کوئی نشان تک ریڈیو میں نہ رہنے دیا۔ یہاں مجھے ناکامی ہوئی تو سوچا لاؤ ان کا چھپا ہوا کلام ہی براڈ کاسٹ کروں۔ مگر معلوم ہوا کہ قاضی صاحب مٹھی بھر جو کے عوض اپنا کلام حریص ناشروں کے ہاتھ بیچ چکے ہیں۔ ناشروں سے ملا، کہا کہ بھائی قاضی صاحب کا کلام ہمیں براڈ کاسٹ کے لئے دیدو، ہم تم کو معاوضہ دیں گے۔ مگر ناشر صاحبان نے ہم کو ٹال دیا۔ ہم نے کہا اچھا براڈ کاسٹ نہ سہی تم ان کے کلام کو چھاپ تو دو، فرمایا فرصت میں چھاپیں گے۔ میں قاضی نذرالاسلام سے ملا۔ غریب بیمار تھے۔ فرش پر چٹائی بچھا کر لیٹے ہوئے تھے۔ میرے کہنے سننے پر میرے ساتھ ریڈیو اسٹیشن آنے پر تیار ہوگئے، مگر چلتے چلتے رک گئے اور فرمایا جی نہیں، میں نہیں جاتا، میں جانتا ہوں کہ تم مجھ کو اسپتال لے جاؤ گے۔ یوں میرا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ اب میرے لئے ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ جہاں سے بھی ان کا کلام مل سکے حاصل کروں اور براڈ کاسٹ کراؤں۔ حق تصنیف کا کوئی دعویٰ کرتا ہے تو کرے۔

قاضی صاحب کے کلام کے براڈ کاسٹ کرنے کا راستہ نکالنے کے بعد، میں اس طرف متوجہ ہوا کہ کسی نہ کسی طرح کلکتہ ریڈیو اسٹیشن کو تمام بنگال کا نمائندہ بنایا جائے۔ اگر مسلمان پروگرام میں بالکل ہی مفقود ہے تو اسٹیشن کے پروگرام بنگال کی تہذیب کو پیش کرنے سے قاصر رہیں گے۔ خوف مجھے یہ تھا کہ اگر میں نے یونہی مسلمانوں کو پروگرام میں شامل کرنا شروع کردیا تو سردار پٹیل مجھ پر جانب داری کا الزام لگادیں گے۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے سر فضل حسین مرحوم کا نسخہ استعمال کیا۔ یعنی پروگرام کے دو حصے کردیئے۔ ایک حصہ وہ جس میں شہری شریک ہوں اور دوسرا وہ جس میں دیہاتی شامل ہوں۔ دیہات کے فنکاروں کی تلاش کے لئے میں نے جسیم الدین صاحب سے مدد چاہی۔ جسیم الدین کا خدا بھلا کرے، رات دن محنت کرتا رہا اور وہ مسلمان فنکار دیہاتوں سے ڈھونڈ نکالے کہ کلکتے والوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ ان پروگراموں کے علاوہ ہم نے کیرتن اور قوالی کا پروگرام بھی روزانہ براڈ کاسٹ کرنا شروع کردیا۔

عجیب بات ہے کہ بنگال جو کسی زمانے میں موسیقی کا گھر تھا، ایسا اجڑا کہ اب کیا مشرقی پاکستان اور کیا مغربی بنگال، کہیں بھی کوئی نامی گویا نہیں۔ گویا کیا کوئی نامی سازندہ بھی نہیں۔ نہ کسی کو راگ کا علم، نہ لے کی خبر۔ یہ وہ کلکتہ ہے جہاں واجد علی شاہ جلاوطنی کی حالت میں رہے اور جہاں انہوں نے موسیقی کا دربار قائم کیا تھا۔ یہ وہ کلکتہ ہے کہ جہاں گوہر جان، پیارا صاحب، علاؤالدین خان آخری فنکار تھے۔ پھر عجیب بات ہے کہ ساز آج تک کلکتے میں بنتے ہیں۔ گراموفون کمپنی کلکتے میں ہے مگر گویے کہیں اور سے آتے ہیں۔ آواز بنگال والوں کی بہت اچھی ہے مگر موسیقی کا علم صفر کے برابر۔ خیر مغربی بنگال جانے اور اس کا کام، اے کاش کوئی مشرقی پاکستان میں چند نامی گویوں کو بھیج دے کہ وہاں اقامت اختیار کریں۔ وہاں کے لوگوں کو موسیقی سیکھنے کا بہت شوق ہے، مگر افسوس کہ انہیں کوئی سکھانے والا ہی نہیں ملتا۔ وہ گویے اور سازندے جو یہاں ”کس نمی پرسد کہ بھیا کون ہو“ کے عالم میں سڑکیں ناپتے پھرتے ہیں، اگر مشرقی پاکستان چلے جائیں تو لوگ انہیں آنکھوں پر بٹھائیں۔

کلکتہ کے پروگرام تو کچھ بہتر ہوگئے مگر ”مہانالابس“ صاحب (مجلہ نویس) جو ٹیگور کے کارناموں کی محافظ جماعت، وشوا بھارتی کے مہتمم تھے، جل گئے۔ انہوں نے طرح طرح کی ریشہ دوانیاں کیں۔ ہندو فنکاروں کو اپنے ساتھ ملایا اور میرے خلاف محاذ قائم کردیا۔ فنکاروں کو میرے خلاف اور کوئی بات نظر نہ آئی تو اس بات پر اصرار کیا کہ ہم لوگ اگر ریڈیو سے باہر جا کر کوئی کام فالتو وقت میں کریں تو اس پر نہ کوئی اعتراض کیا جائے اور نہ ہمیں اس بات پر مجبور کیا جائے کہ ہم اسٹیشن ڈائریکٹر کی اجازت لے کر یہ فالتو کام کریں۔ قصہ دراصل وہی سازندوں کے فقدان کا تھا۔ گنتی کے چند اچھے سازندے اور وہ بھی ریڈیو کے ملازم، فلم والوں کا کام ان کے بغیر چلتا نہ تھا۔ چنانچہ سازندے ریڈیو پر ٹوں ٹاں کرنے کے بعد، فلم کمپنیوں میں چلے جاتے تھے۔ ریڈیو پروگرام کاری ہرسل گیا جہنم میں......

آر، سی، بورال فلم کے میوزک ڈائریکٹروں میں بہت مشہور تھا۔ یہ شخص بھی ریڈیو کا ملازم تھا، لیکن استعفیٰ دے کر این این سرکار کی فلم کمپنی نیو تھیٹرز میں شامل ہوگیا تھا۔ علامہ آرزو گیت لکھنے والے۔ سہگل گانے والا۔ آر، سی، بورال میوزک ڈائریکٹر۔ یہ کمپنی ایسی چمکی کہ باید و شاید۔ کچھ تو اس کمپنی کی شہرت کے باعث اور کچھ بورال کے ساتھ دوستانہ تعلقات کی بنا پر ریڈیو کے تمام آرٹسٹ فلم کی طرف پل پڑے۔ یہ فنکار نہ تو ریڈیو سے الگ ہوتے تھے اور نہ فلم کو چھوڑتے تھے۔ میرا اصرار یہ تھا کہ یہ حضرات ریڈیو کے کام کو فلم کے کام پر فوقیت دیں۔ ان کا اصرار یہ تھا کہ فلم پہلے اور ریڈیو بعد میں......

ہم نے ذرا سختی سے کام لیا تو مہانالابس صاحب کی شہ پر فنکاروں نے اپنی ایک یونین بنائی اور ریڈیو کا بائیکاٹ کردیا۔ سات سو فنکاروں نے ہڑتال کردی۔ ان میں ریڈیو کے ملازم فنکار بھی تھے اور وہ بھی جنہیں مہینے میں ایک دو پروگرام ملا کرتے تھے۔ این این سرکار ان کے صدر، امرت بازار تیرکا کے ایڈیٹر توشار کانتی گھوش، ان کے نائب صدر اور پنکھج ملک ان کے سیکریٹری تھے۔ پنکھج ملک نے مجھے کہا بخاری صاحب اب تو صرف آپ کو ریکارڈ بجا کر پروگرام کرنا ہوگا۔ کوئی فنکار آ کر ریڈیو پر خود نہیں گائے گا۔ ریکارڈ بجانے میں کوئی ہرج نہیں بلکہ سننے والے تو ریکارڈ کو زندہ گانوں سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ مگر پنکھج ملک نے میری غیرت کو للکارا تھا۔ یہ میری برداشت سے باہر تھا۔ میں نے پنکھج سے تو صرف یہ کہا کہ اچھا دیکھا جائے گا مگر سیدھا ریڈیو اسٹیشن پر آ کر ریکارڈوں کا وہ پروگرام بھی منسوخ کردیا، جو عام طور پر دوپہر کو ہوتا ہے۔ اس کی جگہ بھی میں نے زندہ گانا رکھا۔

دس دن تک یہ ہڑتال جاری رہی اور دس دن تک ہم پروگرام بغیر ریکارڈوں کے چلاتے رہے۔ دسویں دن نذیر احمد نے مجھ سے آ کر کہا کہ تمام آرٹسٹ مل کر فلاں ہال میں جلسہ کررہے ہیں اور تمہارے خلاف کوئی سخت تدابیر اختیار کرنے والے ہیں۔ یہ سنتے ہی میں اٹھا اور میں نے کہا چلو نذیر میرے ساتھ چلو، میں جلسے میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔ نذیر منحنی سا آدمی ہے، مگر بڑے دل والا ہے، تیار ہوگیا۔ ہم جلسہ گاہ میں پہنچے۔ ہندو فنکاروں کا اژدھام تھا۔ پنکھج ملک، توشار کانتی گھوش وغیرہ اوپر ڈائس پر بیٹھے تھے۔ میں سیدھا اگلی صف کی طرف گیا، لکڑی کا فرش، اس پر میں یوں زور زور سے ڈگ بھرنے لگا جیسے زمین کو روندرہا ہوں۔ پاؤں کی چاپ یا کھٹ کھٹ سے سب کے کان کھڑے ہوئے، سارا مجمع پلٹ کر دیکھنے لگا، مقرر غریب خاموش ہوگیا، میں اس خاموشی میں کھٹ کھٹ کرتا ہوا آگے بڑھا اور اگلی صف میں جا کر صوفے پر براجمان ہوگیا۔ توشار کانتی گھوش نے کاغذ الٹے پلٹے، کھنکارا اور کہا کارروائی جاری رکھی جائے۔ یہ کہہ کر اس نے مقرر کی طرف اشارہ کیا کہ تقریر شروع کرو۔

مقرر بنگالی میں بول رہا تھا، مگر اتنے دنوں میں میں نے بنگالی زبان سیکھ لی تھی۔ مقرر کی تقریر کا سمجھنا میرے لئے دشوار نہ تھا۔ اس تقریر میں مقرر صاحب نے مجھے وہ صلاحیاں سنائیں کہ مزا آگیا۔ پھر دوسرا مقرر، پھر تیسرا، پھر چوتھا، جو اٹھا میرے خلاف زہر اگلتا رہا۔ میں بیٹھا سب کچھ سنتا رہا۔ آخر میں نے ایک کاغذ کے پرزے پر یہ درخواست لکھ کر صدر کے پاس بھجوائی کہ مجھے بھی کچھ بولنے کی اجازت دی جائے۔ گھوش نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھسر پھسر کرنی شروع کردی۔ کوئی پانچ منٹ کے مشورے کے بعد مجھے بولنے کی اجازت ملی۔ میرا تعارف پنکھج ملک نے کرایا اور اس تعارفی تقریر میں فرمایا کہ وہ شخص کہ جس کے ظلم کی تلوار کے گھائل یہاں ہم سب بیٹھے ہیں، ہمارے کیمپ میں گھس آیا ہے اور اس مجمع کو مخاطب کرنے کی جرات کررہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تقریر کے دوران میں یہ شخص اپنے گناہوں کا مزید ثبوت مہیا کرے گا یا گزشتہ گناہوں کا اعتراف کر کے ہم سب سے معافی کا طلبگار ہوگا۔

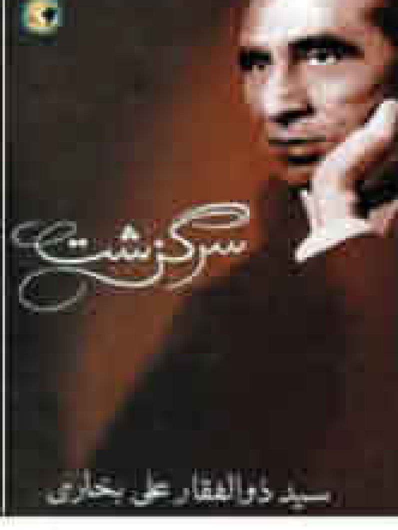
اس تعارف کے بعد میں تقریر کرنے کھڑا ہوا۔ تقریر تو مجھے یاد نہیں، لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ باوجود صدر کی خاموش خاموش کی صداؤں کے مجمع اٹھ کھڑا ہوا اور انہوں نے کہا کہ ہم کل سے ریڈیو پر جا کر کام کریں گے۔ یوں ہڑتال ختم ہوئی۔ اس ہڑتال کو ختم کرنے کا انعام سردار پٹیل کی سرکار سے ہم کو یہ ملا کہ بذریعہ تار ہم سے پوچھا گیا کہ اے نالائق تجھ کو بہ حیثیت سرکاری ملازم کے مجمع عام میں تقریر کرنے کی اجازت کس نے دی۔ اب بتا کہ تجھے دار کیوں نہ کھینچا جائے۔ واہ سردار پٹیل جی! (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

کلکتہ پوسٹنگ کے دوران میں نے بنگالی سیکھ لی

انیل بسواس، ستیہ جیت رائے اور نذیر احمد جیسے دوست ہر وقت میری دلجوئی کرتے تھے۔ معروف بنگالی مصور جامنی رائے کانگریسیوں کی بدذوقی سے نالاں نکلا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کلکتے آئے تو مجھے ملاقات کیلئے خصوصی وقت دیا۔ زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



نو گرفتار پنچھی ہمیشہ قفس کی تیلیوں سے سر پٹکا کرتا ہے، شروع شروع میں میری حالت بھی یہی تھی۔ کلکتہ مجھے زہر لگتا تھا۔ ریڈیو دقیانوس کے زمانے کا پرانا زنبیل، میرا سرکاری مکان، میر صاحب کے مکان سے زیادہ خستہ، دفتر کے کارندے لوگ، زیادہ اور کارندے کم۔ ہائے بمبئی، ریڈیو اسٹیشن نیا، میرے ہاتھ کا بنایا ہوا، فلیٹ دفتر کے ساتھ اور ایسا شاندار کہ اس کے بعد ایسا فلیٹ پھر کبھی نصیب نہیں ہوا، سمندر سامنے ٹھاٹھیں مارتا تھا، اور یہاں کلکتہ میں سمندر تیس میل دور، ہگلی کا نظارہ انسان کب تک کرے۔ سطح سمندر کی چادر کے نقش ونگار، ہر لحظہ بدلتے رہتے ہیں، لیکن دریا مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے تختے کا تختہ آئینہ پڑا ہو۔ نہ اتار نہ چڑھاؤ، نہ مد نہ جزر نہ لہرانہ موج نہ جوش نہ خروش۔ سمندر شعلہ مزاج، غیور، شور انگیز، اور دریا نرم سیر۔ میں شوراپشت تو نہیں ہوں پھر بھی سمندر کو دریا سے زیادہ اپنے مزاج کے مطابق پاتا ہوں۔

ہاں، پہلے پل کلکتے میں میرا جی نہ لگا، لیکن کچھ تو یہ کہ انسان ایسا مجبتی ہے کہ ہر جگہ سے رفتہ رفتہ مانوس ہو جاتا ہے، چاہے زنداں ہو۔ اور کچھ یہ کہ کلکتے میں حسن اتفاق سے مجھے ایسے دوست مل گئے کہ بمبئی کا سارا غم غلط ہو گیا۔ پربھات مکرجی، انیل بسواس، چکرورتی، نرمل رائے، ستیہ جیت رائے، پکاش، نزمان، نذیر احمد، یہ اور کئی اور مخلص دوست، ہر وقت میری دلجوئی کرنے لگے۔ ان سے میں نے بنگالی سیکھی، انہوں نے مجھے بنگال کے ادب سے روشناس کرایا۔ انہوں نے مجھے بنگال کے ادیبوں اور فنکاروں سے ملوایا۔ نذیر ایسا دوست پرور انسان کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ سارے جہاں کا درد اسی کے سینے میں ہے۔ اس کے دروازے سے کسی کو نامراد لوٹتے نہیں دیکھا۔ ماں کا چہیتا، بہنوں کا لاڈلا، بھائیوں کا بازو، میں نذیر کو گھیر گھار کر ریڈیو کے حلقے میں لایا۔ یہ پہلے اناؤنسر ہوا، پھر پروڈیوسر، پھر خدا جانے کیا اور پھر کیا! میں نے جنگی پروگراموں کے سلسلے میں اس کو انگلستان بھجوا دیا۔ وہاں بنگالی پروگراموں کی دیکھ بھال اس کے سپرد کی گئی۔ اس زمانے میں لندن سے بنگالی پروگرام ہفتے میں ایک بار ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ نذیر کے مزے تھے۔ ایک دن پروگرام کرتا اور ہفتے کے باقی دن لندن کے نشیب و فراز کی تحقیق میں گزارتا۔ یہ عقدہ مجھ پر اب تک نہیں کھلا کہ نذیر کے احباب کا حلقہ اس قدر وسیع کیوں کر ہو گیا۔ نذیر کے احباب کا حلقہ اس وقت بھی وسیع تھا جب نذیر بیس اکیس برس کا نوجوان تھا اور آج بیس برس کے بعد بھی ویسا ہی وسیع ہے۔ وسیع ہونے کے علاوہ نذیر کے احباب کا حلقہ متنوع بھی ہے۔ نذیر کے یاران سرپل میں حکما بھی شامل ہیں اور حکام بھی، ڈاکٹر بھی شامل ہیں اور مریض بھی۔

نذیر ہی کی بدولت مجھے کلکتے کے ہر دربار میں رسائی نصیب ہوئی۔ لیکن ایک دربار میں نے خود دریافت کیا، اور اس تک میری رسائی براہ راست ہوئی۔ یہ دربار جامنی رائے کا تھا۔ آج جامنی رائے کی عمر ہو گی کوئی ستر بہتر کے لگ بھگ۔ جس وقت کا میں ذکر کر رہا ہوں اس وقت جامنی رائے کی عمر پچپن برس کی ہو گی۔ میں نے اس کا نام سن رکھا تھا۔ لیکن اس کی تصویر کسی گھر میں لگی ہوئی نہ دیکھی تھی۔ جامنی رائے کی ایک دو تصویروں کی نقلیں کسی رسالے میں دیکھی تھیں، بس اس وقت سے میں اس کے فن کا متوالا ہو گیا تھا۔

اس زمانے میں جامنی رائے امرت بازار پتریکا کے دفتر کے قریب ایک چھوٹے سے مکان میں رہا کرتا تھا۔ میں جامنی رائے کی تلاش میں اس محلے میں پہنچا تو مناسب یہی سمجھا کہ سب سے پہلے پتریکا کے دفتر میں جا کر توشار کانتی گھوش سے ملوں، تجدید ملاقات بھی ہو جائے گی اور ممکن ہے کہ جامنی رائے کے نام تعارفی خط بھی مل جائے۔ میں، توشار کانتی گھوش کے کمرے میں گیا، بہت تپاک سے ملے، بہت خاطر تواضع کی اور پوچھا اس طرح کہاں بھٹک آئے۔ میں نے عرض کیا کہ جامنی رائے سے ملنے آیا تھا، سوچا آپ کو بھی سلام کرتا جاؤں۔

جامنی رائے کا نام سن کر توشار کانتی گھوش متجسس نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ کون جامنی رائے؟ کیا کام کرتا ہے؟ مجھے توشار کانتی گھوش کی لاعلمی پر اور آرٹ کی کسمپرسی پر بے حد تعجب اور ملال ہوا، مگر ضبط کیے بیٹھا رہا اور استعجاب سے توشار کانتی گھوش کا منہ تکتا رہا۔ آخر میں نے آہ بھری اور کہا کہ جامنی رائے ایک مصور ہے۔

جب میں نے کہا کہ جامنی رائے ایک مصور ہے، تو شار کانتی گھوش واقعی یہ سمجھا کہ بخاری نے کوئی فنی مذاق کی بات کی ہے۔ اس نے بہت زور سے قہقہہ لگایا، اور قہقہہ لگاتے وقت اپنا منہ اس قدر پھاڑا کہ اگر میں میز پر رکھی ہوئی دوات اس کے منہ میں ڈال دیتا تو شاید آسانی سے اس کے منہ میں کھپ جاتی۔

امرت بازار پتریکا سے نکل کر میں پوچھتا پچھاتا جامنی رائے کے گھر پہنچا، دستک دی، دروازہ کھلا اور ایک معمر انسان میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ یہ جامنی رائے تھا۔ سفید براق دھوتی، سفید کرتا، خوبصورت سر پر خوبصورت سفید بال، انگلیاں ایسی پتلی جیسے کسی خوبصورت درخت کی شاخیں ہوں۔ آنکھوں میں چمک، لیکن کسی اور کو خیرہ کرنے والی نہیں، بلکہ تجسس کی چمک، آگاہی کی چمک، گیان دھیان کی چمک۔

جامنی رائے کے گھر میں کسی قسم کا فرنیچر نہ تھا۔ صرف سامان بند کرنے والے لکڑی کے صندوق تھے، یعنی کھوکھے مختلف پیمائش کے، کوئی چھوٹا، کوئی بڑا، کوئی مستطیل، کوئی مربع، ان کھوکھوں پر اس نے سفیدی کر رکھی تھی اور سفید میز پوش سا بچھا رکھا تھا۔ ایک کھوکھے پر بیٹھ جائیے اور دوسرے کھوکھے کو اپنے آگے بچھا کر میز بنا لیجئے، اللہ اللہ خیر سلا۔ اس کا پلنگ بھی ویسا ہی تھا، دو چار کھوکھے ملا کر رکھے ہوئے اور ان پر چٹائی۔ جامنی رائے نے مجھ سے کہا کہ میرے گھر کا اثاثہ بیس تیس روپے سے زیادہ کا نہیں۔ اتنے میں جامنی رائے کی فرشتہ صورت اور فرشتہ سیرت بیوی چائے لیکر آئی۔

جامنی رائے کی بیوی کے کپڑے سفید، کھوکھے سفید، کھوکھوں کے میز پوش سفید، چائے کی طشتری سفید، پیالے سفید، مجھے اپنے نیلے رنگ کا سوٹ بہت برا لگنے لگا۔ میری بڑی لڑکی میرے ساتھ تھی۔ کہنے لگی اگر مجھے اس بات کا علم ہوتا تو میں بھی سفید ساڑھی باندھ کر آتی۔

جامنی رائے نے ہمیں تصویریں دکھانا شروع کیں۔ ”کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست“ سمجھ میں نہ آیا کہ کس تصویر کو دیکھوں اور کس کو نہ دیکھوں یہی حالت میری بیٹی کی بھی تھی، تصویروں کو دیکھتی اور دیوانہ وار دیکھتی رہ جاتی۔

تصویریں دیکھنے کے بعد جب ہم کمرے میں آ کر بیٹھے تو میں نے کہا آؤ جامنی رائے سے تصویروں کے علاوہ کسی اور جہاں کی بات کریں۔ میں نے کانگریس کی تحریک پر گفتگو کرنا شروع کر دی۔ اس زمانے میں میری بنگالی اچھی خاصی رواں تھی، لیکن پھر بھی میں کانگریس کی تحریک کا ذکر کرتے ہوئے مشکل محسوس کرنے لگا۔ دل میں رہ رہ سوچتا تھا کہ اگر جامنی رائے نے کانگریس کی حمایت کر دی تو بات خواہ مخواہ بحث و مباحثہ میں پڑ جائے گی۔ کانگریس کا ذکر سن کر جامنی رائے مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ آخر بولا کہ تم نے بھی کن کا ذکر شروع کر دیا۔ یہ لوگ انتہائی بدذوق ہیں۔ اگلے روز میں ان لوگوں کے جلسے میں گیا تھا، گیا کیا تھا لوگ مجھے زبردستی لے گئے تھے۔ بدذوق کانگریسیوں نے جلسہ کا آغاز یوں کیا کہ چند کالج اسکول کی لڑکیوں کو سب سے پہلے اسٹیج پر لائے، ایک لڑکی ہارمونیم لے کر بیٹھ گئی باقی لڑکیاں ہارمونیم والی لڑکی کے پیچھے نصف دائرے کی شکل میں کھڑی ہو گئیں۔ اس کے بعد ان سب نے ہارمونیم جیسے بیہودہ ساز کی سنگت میں بندے ماترم گایا۔ ہارمونیم کی سمع خراش آواز، لڑکیوں کا پریشان کن بے سرا پن، لیکن اس کے باوجود لوگ کھڑے ہو گئے، میں بھی کھڑا ہو گیا، بندے ماترم سننے کے لیے نہیں بلکہ جلسہ گاہ سے باہر نکل آنے کے لیے۔

میں جامنی رائے کے مشاہدے کا قائل ہو گیا، واقعی جس مجلس میں ہارمونیم آ جائے، اس مجلس کو باوقار نہیں کہا جا سکتا۔ ہم اس موضوع پر کافی دیر تک بات چیت کرتے رہے، آخر میں جامنی رائے نے ایک ایسی بات کی جو کوئی مصور ہی کہہ سکتا تھا۔ فرمایا میں نے بارہا کئی کانگریسیوں سے پوچھا ہے کہ تم مجھے صرف ایک بات بتا دو اور وہ یہ کہ اگر تمہیں آزادی مل گئی اور حکومت تمہارے ہاتھوں میں آ گئی تو پولیس والوں کی موجودہ بدزیب وردی بدلو گے یا نہیں اور اگر بدلو گے تو نئی وردی کس ڈھب کی ہو گی؟

جامنی رائے نے بڑے دکھے ہوئے دل سے کہا کہ مجھے کانگریسی نے سوال کا جواب نہیں دیا کہ آزادی مل گئی تو آزاد ملک کے پولیس والے کی وردی کیا ہو گی۔

کچھ عرصے کے بعد میرا تبادلہ پھر بمبئی ہو گیا۔ میں اپنے گھر کا اثاثہ اور جامنی رائے سے خریدی ہوئی تصویریں لے کر بمبئی پہنچا۔

میرے گھر میں جو بھی آتا اس کی نگاہ جامنی رائے کی تصویروں پر اٹھ جاتی۔ اور تقریباً ہر ایک آدمی یہی سمجھتا کہ یہ رنگین کارٹون ہیں۔ ایک صاحب نے تو غضب ہی کر دیا۔ بہت دیر تک ان تصویروں کو دیکھتے رہے اور پھر فرمایا بخاری صاحب کیا یہ تصویریں آپ کی بچیوں نے بنائی ہیں؟

میں ایک کانفرنس کے سلسلے میں کلکتے گیا تو جامنی رائے سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا اور کہا کہ دیکھئے دنیا میں کیسے کیسے لوگ آباد ہیں، آپ کی تصویروں کو بچوں کا کھیل سمجھتے ہیں۔ میری باتیں سن کر جامنی رائے کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ فرمایا آج مجھے اپنے فن کی صحیح داد ملی ہے۔ فن وہی ہے جو بادی النظر میں بچوں کا کھیل دکھائی دے۔

ایک دربار تو جامنی رائے کا تھا جس تک میری رسائی نذیر کی ساطت کے بغیر ہوئی، دوسرا دربار جہاں میں بغیر شرکت غیرے جایا کرتا تھا مولانا ابوالکلام آزاد کا دربار تھا۔

مجھ رند کی اس زاہد سے پرانی ملاقات تھی۔ ترچی پورہ جیل سے رہا ہو کر کلکتے پہنچے تو میں عرض نیاز کے لیے حاضر ہوا۔ مکان کے صحن میں بہت سے لوگ جمع تھے اور اس انتظار میں تھے کہ مولانا سے ملاقات کریں۔ میں بھی ان لوگوں میں جا شامل ہوا۔ مولانا کو جب آنے کی اطلاع ملی تو فوراً مجھے بالائی منزل پر بلا بھیجا۔ کوئی بارہ چودہ فٹ کے کمرے میں فرش پر بیٹھے تھے ہر طرف کتابوں کی الماریاں تھیں۔ مولانا کے اردگرد فرش پر بھی کتابیں بکھری پڑی تھیں۔

جب ملاقات کے ابتدائی مراحل طے ہوئے تو میں نے ترچی پورہ سے کلکتے تک کے سفر کا حال پوچھا۔ مولانا گویا بھرے بیٹھے تھے، فرمایا کچھ نہ پوچھو، یہ سفر ایک عذاب تھا۔ میں نے ترچی پورہ جیل والوں سے کہہ دیا تھا کہ میرے بھائیو مجھے ایسی گاڑی سے کلکتے بھیجو جو تیز چلتی ہو اور بہت کم اسٹیشنوں پر رکتی ہو۔ مگر ان نیک بختوں نے مجھے پسنجر گاڑی میں سوار کر دیا۔ یہ گاڑی ہر چھوٹے موٹے اسٹیشن پر رکتی، لوگ میری گاڑی کے ڈبے میں گھس آتے، کوئی مجھے ہار پہناتا، کوئی مجھے سنگترے کھلاتا، اور کوئی میرے ہاتھوں کو بوسہ دیتا۔ رات کے سفر کا حال اس سے بھی زیادہ دردناک ہے۔ میں سونا چاہتا تھا لیکن لوگ مجھے سونے نہ دیتے تھے۔ آخر میں نے یہ تہیہ کیا کہ لوگ نعرے لگاتے رہیں، میں آنکھیں میچے لیٹا رہوں گا۔ چنانچہ اب کے جو اسٹیشن آیا تو میں نے ایسا ہی کیا۔ سانس کھینچ لی، آنکھیں بند کر لیں اور خراٹے بھرنے لگا۔ مگر لوگ میرے ڈبے میں گھس آئے۔ میرے چہرے پر تارچ کی روشنی ڈالی، تارچ کی تیز روشنی کی ایذا سے مجبور ہو کر جب میں نے آنکھیں کھولیں تو لوگوں کی باچھیں کھل گئیں۔ زور زور سے نعرے لگانے لگے، بھارت ماتا کی جے، ابوالکلام آزاد کی جے، نہرو کی جے۔ کم بخت آخر دم تک فیصلہ نہ کر سکے کہ کس کی جے۔

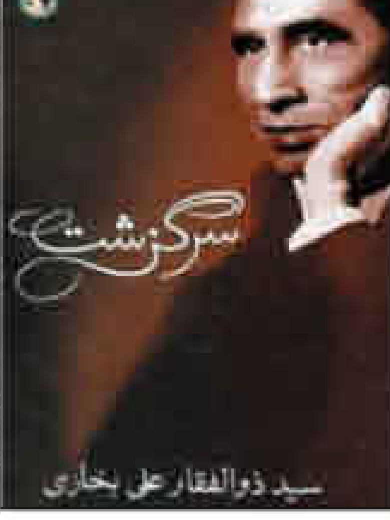
☆☆☆☆☆

روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

’’پطرس بخاری پر کتاب لکھنے کا ارادہ ترک کر دیا‘‘

کتاب ’’بھائی بھائی‘‘ کے کچھ صفحات لکھ لیے تھے - سید امتیاز علی تاج نے ہم قلمی کا شرف بخشنے کا ارادہ بھی کرلیا تھا

’’نقوش‘‘ میں اس کے کچھ اقتباسات پر لکھے گئے مضمون سے دل کھٹا ہوگیا - زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



پانچ دسمبر کو میرے بھائی کا انتقال نیویارک میں ہوا تھا۔ ہر 5 دسمبر کو میں سخت تنہائی محسوس کرتا ہوں۔ میرے بھائی احمد شاہ میرے لیے سب کچھ تھے۔ بڑے بھائی بھی، استاد بھی، دوست بھی۔ میں جب کلکتہ میں ریڈیو کا ڈائریکٹر تھا تو بھائی صاحب ریڈیو کے کنٹرولر تھے۔ آغا عبدالمجید صاحب ان کے ڈپٹی تھے۔ پٹیل صاحب وزیر تھے۔ کلکتہ میں جب فنکاروں نے ہڑتال کر دی تو بھائی جان کو سخت پریشانی ہوئی۔ ان کی پریشانی کی خاص وجہ یہ تھی کہ یہ ہڑتال میرے خلاف تھی۔ ہڑتالی فنکار زیادہ تر ہندو تھے اور سردار پٹیل تمام تر ہندو۔

پٹیل کو کلکتے سے تو شارکانتی اور این این سرکار وغیرہ لمبے لمبے خط ہڑتال کی حمایت میں اور میرے خلاف لکھتے رہے۔ پٹیل یہ خط تو بھائی جان کو نہ بھیجتا تھا، مگر آئے دن دریافت ضرور کرلیتا تھا کہ ہڑتال کا کیا ہوا؟ ایسے موقعوں پر بھائی جان ہمیشہ یہ کہہ کر بات ٹال دیتے کہ چونکہ معاملہ میرے بھائی کا ہے، اس لیے میں ذاتی طور پر اس میں دخل انداز نہیں ہونا چاہتا۔ میں نے یہ معاملہ اپنے ڈپٹی آغا عبدالمجید کے سپرد کر رکھا ہے۔

آغا صاحب کو خدا خوش رکھے۔ ان ہڑتال کے دنوں میں ایک بات مجھے ایسی سمجھا گئے کہ اب تک کام آ رہی ہے۔ ہڑتالیوں کے مطالبات اور ان کے اعتراضات کے بارے میں میری توجیہیں سن سن کر آغا صاحب تنگ آ گئے تھے، لیکن تحمل ان کا شیوہ ہے۔ انہوں نے تحمل سے کام لیا اور نہایت اطمینان سے فرمایا: بھئی ذوالفقار صاحب، آپ کی منطق درست ہے۔ اگر اسی طرح درست منطق چلاتے رہے تو ہڑتال کبھی ختم نہ ہوگی۔ ہر کام منطق سے چلتا تو دنیا میں اتنے جھگڑے کیوں ہوتے؟

آغا صاحب کی بات مجھے ساری عمر کے لیے بیدار کر گئی۔ بات نئی نہ سہی لیکن آغا صاحب نے ایسے وقت اور ایسے موقع پر کہی تھی کہ آنکھیں کھل گئیں۔ آغا عبدالمجید، فیض، راشد اور اس قبیل کے اہل علم اور اہل دانش کے استاد میرے بھائی تھے۔ وہ ان شاگردوں پر بہت فخر کرتے تھے اور خود اس بات پر ناز کرتے تھے کہ انہیں پروفیسر سعید دہلوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ پروفیسر صاحب مرحوم و مغفور بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کے حضور میں کئی مرتبہ حاضر ہوا اور ہر مرتبہ فیض پایا۔ دہلی ریڈیو کے ابتدائی دنوں میں پروفیسر مرزا محمد سعید اکثر ہماری درخواست پر براڈ کاسٹ کرنے کی زحمت گوارا فرمایا کرتے تھے۔

میں نے فیلڈن کو پروفیسر صاحب اور ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب سے متعارف کرایا تھا اور کہا تھا کہ یہ دو حضرات ہماری ثقافت کے علم بردار ہیں۔ فیلڈن چند ہی ملاقاتوں میں پروفیسر مرزا محمد سعید کا گرویدہ ہوگیا۔ اکثر مجھے ساتھ لے کر پروفیسر صاحب کے مکان پر حاضری دیا کرتا تھا۔ مرزا صاحب کوچہ چیلان میں رہتے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے مرزا صاحب کے مکان کی کرسی کوئی ہاتھ بھر زمین سے اونچی تھی۔ صدر دروازہ چھوٹا سا تھا۔ دستک سن کر پروفیسر صاحب خود دروازہ کھولنے تشریف لاتے۔ اندر ایک چھوٹا سا صحن تھا۔ صحن کے ساتھ چھوٹا سا کمرے نما برآمدہ۔ اس میں سرکنڈے کے مونڈھے چمڑے سے منڈے ہوئے۔ آس پاس کتابیں۔ تمام فضا میں علم اور حلم۔

یہاں آ کر ہماری آواز مدھم پڑ جاتی تھی۔ مرزا صاحب اکثر خاموش رہتے تھے۔ اس خاموشی میں وہ کیفیت تھی جو بڑے بڑے وعظوں میں نہیں دیکھی۔ فیلڈن ایک آدھی بات کہہ کر خاموش ہو جاتا اور مرزا صاحب بکمال حلم و انکسار علم و حکمت کے دریا بہاتے اور اس قدر دھیمی آواز سے کہ ہمیں اپنے کان ان کے قریب لانے پڑتے۔ 1947ء کے بعد مرزا صاحب ہجرت کرکے پاکستان آئے اور لاہور میں اقامت اختیار کی۔ بچے ان کے کراچی میں تھے۔ ان کے اصرار پر کچھ عرصے بعد مرزا صاحب کراچی تشریف لائے، مگر اس طرح کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی۔ مرزا صاحب واقعی گوشہ نشین قسم کے عالم تھے۔ اور یہی باعث ہے کہ راج دربار میں کسی کو خبر بھی نہ ہوئی اور وہ انتقال فرما گئے۔

جن دنوں مرزا صاحب تشریف لائے، ان دنوں ریڈیو پاکستان کا کراچی اسٹیشن انٹیلی جنس اسکول کی ایک بارک میں نصب تھا۔ ٹرانسمیٹر بھی وہیں اور اسٹوڈیو بھی وہیں۔ ایک دن شام کے کوئی چار پانچ بجے ریڈیو اسٹیشن سے آ رہا تھا کہ پیلس ہوٹل کے قریب دیکھا کہ مرزا صاحب جا رہے ہیں۔ وہ آگے اور میں پیچھے گاڑی میں سوار، ان کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا کہ اچھی طرح دیکھ لوں کہ وہی ہیں یا کوئی اور۔ جب مجھے اچھی طرح یقین ہوگیا کہ مرزا صاحب ہی ہیں تو میں نے مرزا صاحب کو سلام کیا اور مودب ان کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ عرض کیا کہ گاڑی حاضر ہے۔ مرزا صاحب میری گاڑی میں سوار ہو گئے اور میں گاڑی چلانے لگا۔ آہستہ آہستہ تاکہ ان سے باتیں کروں۔ معلوم ہوا کہ مرزا صاحب کو آئے ہوئے کئی دن ہو گئے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ جناب کو مکان مل گیا۔ فرمایا کہ نہیں داماد کے گھر میں اترا ہوں۔ یہ کہہ کر مرزا صاحب کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا۔ کچھ دیر خاموش رہے اور پھر فرمایا، تمام کتابیں لاہور میں ہیں، یہاں منگواؤں تو رکھوں کہاں۔ میں خواب کے عالم میں گاڑی چلاتا رہا اور وہاں پہنچا جہاں اب احمد جعفر کی دکان کے سامنے وہ بیہودہ سا فوارہ لگا ہے۔ یہاں دائیں بائیں کئی راستے نکلتے ہیں۔ اس لیے میں نے مرزا صاحب سے دریافت کیا کہ صاحب کہاں تشریف لے جایئے گا۔ فرمایا کہیں نہیں۔ میں تو چہل قدمی کے لیے گھر سے نکلا تھا، تم نے کہا گاڑی میں بیٹھ جاؤ، میں بیٹھ گیا۔ اب جہاں چاہو اتار دو، میں وہاں سے پیدل گھر پہنچ جاؤں گا۔

اب یاد نہیں کہ میں نے اس وقت کیا کیا تھا یا کیا کہا تھا۔ اتنا ضرور یاد ہے کہ میں پسینے میں تر ہو گیا تھا۔ میری یہ تمنا، یہ خواہش، آرزو یہ التجا کہ مرزا صاحب کراچی ریڈیو سے براڈ کاسٹ کرنا شروع کر دیں، مگر مرزا صاحب ہر مرتبہ یہ عذر کرتے رہے کہ اب میں بند کمرے میں بیٹھ کر براڈ کاسٹ نہیں کر سکتا۔ میں نے کہا اچھا حضور آپ اپنے گھر سے براڈ کاسٹ کریں۔ فرمایا، میری کتابیں میرے پاس نہیں اور بغیر کتابوں کے میں کچھ لکھ نہیں سکتا۔ میں نے کہا اچھا ہم کچھ سوال پوچھیں گے، آپ ان کے جواب دیجئے گا، ہم یہ سوال و جواب کا سلسلہ ریکارڈ کرلیں گے اور یہی براڈ کاسٹ کریں گے۔ مرزا صاحب نے بات ٹال دی اور ہر مرتبہ ٹالتے رہے۔ میں نے ظفر حسین صاحب کو مرزا صاحب کے پیچھے لگا دیا۔ ظفر صاحب میں سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ اگر انسان کو ان پر غصہ آئے بھی تو غصے کا اظہار نہیں کر سکتا۔ یہ حضرت بات ہی کچھ اس ڈھب کی کرتے ہیں کہ چڑھا ہوا پارہ اترتا ہے، چڑھنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر اتر آتا ہے۔ میرے نزدیک ظفر صاحب اس کام کے لیے بہت موزوں تھے کہ مرزا صاحب کو براڈ کاسٹ پر آمادہ کریں۔ اور ان کو گھیر گھار کر ریڈیو اسٹیشن لے آئیں۔ ظفر صاحب ایک مرتبہ گئے، دو مرتبہ گئے، تین مرتبہ گئے مگر ہر بار مرزا صاحب نے ظفر صاحب کو ٹال دیا۔ ظفر صاحب کہاں ہار ماننے والے تھے۔ پھر مرزا صاحب کے در دولت پر حاضر ہوئے۔ ایک مرتبہ، دو مرتبہ، تین مرتبہ۔ آخر مرزا صاحب کو ہار ماننا پڑی یعنی زچ آ گئے اور زچ آ کر فرمایا، ظفر حسین صاحب لوگ براڈ کاسٹ کرتے ہیں طلب زر کی خاطر یا نام و نمود کی خاطر یا اس خاطر کہ براڈ کاسٹ سے خلق خدا کا بھلا ہوگا۔ اب یقین مانئے کہ مجھے طلب زر کی خواہش نہیں، نام و نمود کے لیے تگ و دو نہیں کرتا اور نہ یہ سمجھتا ہوں کہ براڈ کاسٹ سے خلق خدا کا بھلا ہوتا ہے۔ اب فرمایئے کہ میں کیوں براڈ کاسٹ کروں؟ بات کہنے کی نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ظفر حسین جیسے حاضر جواب، شیریں زبان اور رطب مقال کی زبان بھی بند ہوگئی۔

ایک مرتبہ فیلڈن پاکستان آیا۔ میرے یہاں مقیم تھا۔ اسے لے کر مرزا صاحب کے در دولت پر میں حاضر ہوا۔ مرزا صاحب نے ہم پر شفقت فرمائی اور بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کتابوں کی باتیں، سیاست کی باتیں، مذہب کی باتیں۔ فیلڈن نے پوچھا پاکستان کو اشتراکیت کا تو کوئی خطرہ نہیں۔ فرمایا نہیں، ملائیت کا خطرہ البتہ ضرور ہے۔ یہ بات مرزا صاحب نے کوئی دس بارہ برس ہوئے کہی تھی۔

بھائی صاحب جب کبھی امریکہ سے پاکستان آتے، مرزا صاحب سے ملنے ضرور جایا کرتے۔ مرزا صاحب کو دیکھ کر بھائی جان پر ایک خوف سا طاری ہو جایا کرتا تھا۔ مرزا صاحب کے سامنے بھائی صاحب دم نہ مار سکتے تھے۔ میں ان کو یوں دبکتے ہوئے دیکھتا تو مجھے ایک گونہ خوشی ہوا کرتی تھی۔ کیوں کہ بھائی صاحب کے سامنے کچھ ایسا ہی حال ہمارا بھی ہوا کرتا تھا۔ بھائی جان کے انتقال کے بعد میں نے ان پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا۔ اس گھر کا اور اس شہر کا ذکر کرنے لگا جس میں ہم دونوں نے پرورش پائی تھی۔ نام میں نے اس کتاب کا رکھا تھا ’’بھائی بھائی‘‘۔ چند ہی صفحے لکھے تھے کہ ایک دن میں نے یہ چند صفحے مشہور افسانہ نویس غلام عباس کو سنائے۔ بے حد پسند فرمایا۔ ان ہی دنوں سید امتیاز علی تاج کراچی تشریف لائے۔ غلام عباس صاحب نے امتیاز صاحب سے میری مجوزہ کتاب کا ذکر میرے سامنے کیا۔ امتیاز صاحب نے مجھے حکم دیا کہ جو کچھ لکھا ہے سناؤ۔ تعمیل ارشاد کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ امتیاز صاحب نے بھی میرا حوصلہ بڑھایا اور ارشاد فرمایا کہ ذوالفقار تم یہ داستان لکھو اور میرے پاس بھیج دو۔ میں کالج کے واقعات کا ذکر کروں گا اور مکمل ہونے پر کتاب دونوں کے نام سے شائع ہوگی، تمہارے اور میرے نام سے۔

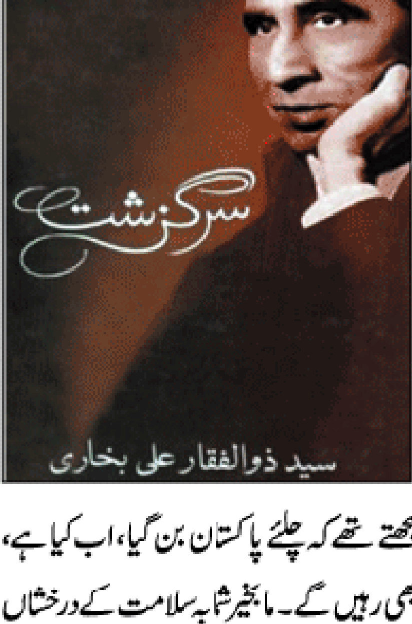
یہ میری خوش قسمتی تھی کہ امتیاز صاحب جیسے اہل قلم نے مجھے ہم قلمی کا شرف بخشنے کا ارادہ کیا۔ طے یہ پایا کہ جو کچھ بھی لکھتا جاؤں عباس صاحب کو دیتا جاؤں۔ وہ اسے صاف نقل کرائیں اور بعد نظر ثانی میں مسودہ امتیاز صاحب کو بھیج دوں۔ ان ہی دنوں لاہور کے رسالے نقوش نے پطرس نمبر نکالنے کا اعلان کیا اور طفیل صاحب نے مجھے حکم دیا کہ تم بھائی پر کچھ لکھو۔ میں نے جواباً عرض کیا کہ ایک کتاب بھائی پر لکھنے کا ارادہ ہے، اس کے ابتدائی صفحات کا مسودہ عباس صاحب کے پاس ہے۔ ان سے عرض کرتا ہوں کہ وہ صفحات کے اقتباسات کی تدوین کرکے آپ کو بھیج دیں۔

میں ان دنوں مصروف تھا۔ شاید کہیں دورے پر گیا تھا۔ عباس صاحب نے یہ مضمون تدوین کرکے طفیل صاحب کو بھیج دیا اور اس پر ایک نوٹ شوکت تھانوی نے لکھا، جب مضمون چھپ کر میرے سامنے آیا تو مجھے سخت ملال ہوا۔ نہ نوٹ مجھے پسند آیا اور نہ مضمون کی تدوین۔ بس اس دن جی ایسا کھٹا ہوا کہ کتاب لکھنے کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

"ہندوؤں نے زندگی بھر کی کمائی لوٹ لی"

پاکستان بننے کے بعد مال گاڑی سے بیٹیوں کے جہیز کا سامان اور ساڑھے 3 ہزار کتابیں بھیجی تھیں-حکومت نے اس سامان کا معاوضہ بھی نہ دیا-بی بی سی کا نام بدل کر ریڈیو پاکستان میں نے رکھا-خبروں کا محکمہ سرفراز نے قائم کیا- زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



زندگی کی بھاری راتیں پلک جھپکتے نہ سہی، ایڑیاں رگڑتے رگڑتے سہی، گزر ضرور جاتی ہیں۔ مگر انسان ایسا بے صبرا ہے کہ سمجھتا ہے کہ کبھی نہیں گزریں گی۔ کچھ تو انسان کو غلامی کی زندگی ویسے بھی کھلتی ہے اور اس پر مزید اضافہ ہوا اس احساس کا جو آزادی کی تحریک نے دلوں میں پیدا کر دیا تھا۔ بس یوں معلوم ہونے لگا جیسے پاؤں میں بھاری بھاری زنجیریں پڑی ہیں۔ جن کے باعث قدم نہیں اٹھتا، آنکھیں بوجھل ہو رہی ہیں، جیسے کسی کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی ہوں، دست و بازو شل ہو گئے تھے، جیسے زندگی کا مگدر ہلاتے ہلاتے رہ گئے ہوں۔ ذہن کی یہ کیفیت تھی جیسے کھوپڑی میں روئی کے گالے بھرے ہوں۔

خدا خدا کر کے وہ دن آیا جب کانگریس اور انگریز دونوں کو مسلمانوں کا مطالبہ ماننا پڑا اور آزادی کی فضا میں سانس لینے کیلئے مسلمانوں نے ہندوستان کو کاٹ کر اپنے لئے پاکستان بنایا۔ میں کیا ہم سب یہی سمجھتے تھے کہ چلئے پاکستان بن گیا، اب کیا ہے، جس طرح امریکہ اور کینیڈا دو الگ الگ ملک آپس میں دو بھلے ملکوں کی طرح آباد ہیں، ہند اور پاکستان بھی رہیں گے۔ ما بخیر شما بہ سلامت کے درخشاں اصول پر عمل کریں گے۔ مگر بھارت ماتا کے رہنے والوں نے مسلمانوں پر ہجرت اور ظلم و ستم، قتل و غارت گری کے دروازے کھول دیئے اور یوں وہ خواب جو ہم صلح و آشتی کا دیکھتے تھے، خواب پریشان ثابت ہوا۔ اس قتل و غارت کے ہنگامے کے بعد کٹر ہندوؤں کے حوصلے یہاں تک بڑھ گئے کہ انہوں نے کشمیر، جوناگڑھ، حیدرآباد دکن وغیرہ سب پر ہاتھ صاف کیا۔ اور پھر آخر میں پاکستان کا پانی بند کر دینے کی ٹھانی۔

چند تصویر بتاں، چند حسینوں کے خطوط، میرا جو کچھ اثاثہ تھا میں نے بمبئی سے دو مال گاڑیوں میں بند کر کے لاہور بھجوایا، مگر راستے میں یہ سب سامان لٹ گیا۔ یہ گاڑی بھٹنڈے کے راستے آئی تھی۔ خدا جانے کیا مصلحت تھی کہ حکومت نے کہا کہ جن لوگوں کا سامان بھٹنڈے کے راستے آیا، ان کو لٹے ہوئے سامان کا معاوضہ نہیں ملے گا۔ چلئے ایک تو گھر کا سب اثاثہ لٹ گیا اور پھر یہ کہ معاوضہ بھی اس کا نہ ملا۔ میری بیوی کیلئے سامان کا لٹ جانا بہت ہی تکلیف دہ ثابت ہوا۔ اس غریب نے مدراس، سورت اور میسور نہ جانے کہاں کہاں کا کپڑا بیٹیوں کے لئے تھوڑا تھوڑا کر کے خریدا تھا۔ پرانے زمانے کی خاتون ہیں، انہوں نے سوچا یوں آہستہ آہستہ سامان خریدتی رہوں گی تو وقت پر ایک دم بوجھ نہیں پڑے گا۔ چنانچہ کپڑا، ہلکا پھلکا غریبی دعوے کا زیور، برتن بھانڈے، جو کچھ بھی ان کا داؤ لگا خرید کر جمع کرتی رہیں۔ اس کے علاوہ میں خود بہت سا کپڑا اور سامان امریکہ سے بچوں کے واسطے خرید کر لایا تھا۔ وہ سب لٹیروں کے ہاتھ لگا۔

تقسیم برصغیر سے کچھ پہلے یعنی 1946ء کے آخری دنوں میں مجھے امریکہ میں ایم جی ایم نے بلایا اور فلموں کے کام پر لگا دیا۔ میں چھٹی لے کر امریکہ گیا تھا۔ تنخواہ الگ اور پھر امریکہ میں فلموں کی اندھی آمدنی۔ جو کچھ نظر آیا خرید لیا۔ یہ زمانہ جنگ کے فوراً بعد کا زمانہ تھا۔ دنیا بھر کی دکانیں خالی تھیں۔ ہاں اگر کہیں مخمل خواب ریشم خرید ملتا تھا تو امریکہ میں۔ چنانچہ میں نے ندیدوں کی طرح سب کچھ خریدنا شروع کر دیا۔ کچھ سامان سمندر کے راستے بمبئی بھیجا اور کچھ اپنے ساتھ لایا۔ ان دنوں بھائی علم الدین بمبئی میں کسٹم کے کلکٹر تھے۔ ان کو خط لکھا کہ خبردار، ہوشیار، نگاہ روبرو، ہم آ رہے ہیں۔ اپنے ماتحت عملے سے کہہ دیجئے کہ ہوائی اڈے پر ہم کو پریشان نہ کرے اور خواہ مخواہ ہماری تلاشی نہ لے۔ ہم جو کچھ لائے ہیں سچ سچ بتا دیں گے۔

جب میں بمبئی کے ہوائی اڈے پر پہنچا تو کسٹم کے ایک دو آدمیوں نے مجھے مودبانہ سلام کیا اور فرمایا، کلکٹر صاحب نے ہم کو حکم دیا ہے کہ آپ کی زبان پر اعتبار کریں اور جو کچھ آپ فارم میں لکھیں اس کو سچ مان کر آپ سے کسٹم ڈیوٹی وصول کریں۔ یہاں میری نیت میں خلل پڑ گیا۔ لایا تو تھا میں اپنے ساتھ اصلی ریشم مگر فارم میں لکھا کہ مصنوعی ریشم دو ہزار کا لایا ہوں۔ کسٹم والوں نے کہا بہت خوب سولہ سو روپے کسٹم عنایت فرمایئے۔ میرے ہوش اڑ گئے۔ میں نے کہا ارے بھائیو کیا غضب کرتے ہو، مصنوعی ریشم دو ہزار روپے کا اور کسٹم سولہ سو روپے! فرمایا جی، ہاں اصلی ریشم پر کسٹم 30 فیصد ہے اور مصنوعی پر 80 فیصد۔ اگر آپ اصلی ریشم لاتے تو کسٹم ڈیوٹی سولہ سو کے بجائے صرف چھ سو بنتی۔ خیر مراد یہ کہ میں امریکہ سے بھی بیٹیوں کے لئے بہت کچھ لایا تھا اور بمبئی میں میری بیوی نے بہت کچھ اکٹھا کر رکھا تھا۔ یہ تمام سامان اور میری زندگی بھر کی کمائی کوئی ساڑھے تین ہزار کتابیں ظالموں نے راستے میں لوٹ لیں۔

اب میں لاہور آیا تو عجب بے سروسامانی کا عالم تھا۔ اگر بھائی ہاتھ نہ پکڑتے تو خدا جانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھاتا۔ بیوی بچوں کو بھائی کے یہاں اتارا اور خود مکان کیلئے دوڑ دھوپ میں لگ گیا۔ ان دنوں مکان کا مل جانا کوئی مشکل بات نہ تھی۔ ہندو چلے گئے تھے یا جا رہے تھے۔ ان کے مکان سب خالی پڑے تھے۔ میں نے 4 نمبر ڈیوس روڈ والا مکان سرکار سے کرائے پر لیا اور یہاں بیوی بچوں کو لے کر آیا، مگر نہ برتن نہ بھانڈا نہ بستر نہ چارپائی۔

دہلی میں بھائی جان، غلام محمد مرحوم اور چودھری محمد علی صاحب نے فیصلہ کیا تھا کہ ریڈیو کا صدر دفتر سردست لاہور میں قائم کیا جائے۔ کراچی میں ریڈیو اسٹیشن ہی نہیں، وہاں بالفعل ریڈیو کا صدر دفتر قائم کرنا بے معنی بات ہوگی۔ ادھر ادھر دیکھنے کے بعد میں نے نیڈوز ہوٹل میں متعدد کمرے ریڈیو کے صدر دفتر کیلئے منتخب کئے۔ اس زمانے میں سرفراز صاحب ریڈیو کی خبروں کے ڈائریکٹر تھے۔ مگر خبریں کہاں سے آتیں۔ تار کا سلسلہ ناپید۔ خبر رساں ایجنسیاں سرے سے غائب۔ ٹیلی فون آج کرو تو کل ملتا تھا، اور وہ بھی قسمت سے۔ خدا جانے سرفراز نے کیا جادو چلایا کہ خبروں کا محکمہ پہلے ہی دن سے قائم ہو گیا۔ اور ایسا قائم ہوا کہ شاید اس کی مثال اور کہیں نہ مل سکے۔ یہ خبریں لاہور اور پشاور سے بیک وقت نشر ہوتی تھیں۔ ڈھاکہ میں سرفراز نے خبروں کا ایک الگ محکمہ قائم کیا اور سرفراز ہی جانے کہ کس طرح اس نے ڈھاکہ سے لاہور اور لاہور سے ڈھاکے خبریں پہنچائیں۔

اس زمانے میں ریڈیو کا نام ریڈیو پاکستان نہ تھا بلکہ پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس تھا۔ یہ نام میں نے بدلا اور بدل کر ریڈیو پاکستان رکھا۔ لوگوں نے نئے نام کی مخالفت کی، مگر میں اپنی بات پر اڑا رہا۔ میں ریڈیو کا کوئی ایسا نام چاہتا تھا جو اردو بھی ہو اور باقی زبانوں میں بھی مستعمل ہو۔ اس لئے مجھے ریڈیو پاکستان بہ نسبت پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس کے بہتر معلوم ہو رہا تھا۔ ریڈیو پاکستان اردو بھی ہے، انگریزی بھی ہے، پنجابی بھی ہے، پشتو بھی، بلوچی بھی ہے، اور سندھی بھی، بنگالی بھی ہے اور فارسی بھی۔

ہاں تو ریڈیو پاکستان کا خبروں کا محکمہ ساری عمر سرفراز کو یاد رکھے گا۔ اس محکمے کے نوجوان، اللہ ان کو توفیق دے، جب بھی اس محکمہ کی تاریخ پڑھیں گے سرفراز کو یاد کریں گے۔ سرفراز سے کوئی ہزار باتوں میں مجھے اختلاف رہا مگر جہاں تک سرفراز کے کام کا تعلق ہے، اس کی ہمت اور اس کے تدبر کا تعلق ہے، سرفراز کی یاد سے میرا دل ہمیشہ گرم رہتا ہے۔ لاہور میں ریڈیو کا صدر دفتر تو قائم ہو گیا مگر آئے دن مجھے کراچی میں یاد کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں اور یہ صرف سولہ سال کی بات ہے کہ لاہور سے کراچی کا سفر واقعی سفر تھا۔ ایک مرتبہ تو میں فرسٹ کلاس کے ڈبے میں کھڑے کھڑے کراچی پہنچا۔ سارے راستے میں بیٹھنے کی جگہ نہ ملی۔ مجھے کیا کسی کو نہ ملی۔ چار مسافروں کے ڈبے میں ہم کوئی پندرہ مسافر تھے۔ ریل گاڑی کی چھت پر بھی مسافر بیٹھے تھے۔ کچھا کچھ۔ ملتان کے قریب ایک اسٹیشن پر، اوپر چھت پر بیٹھی ہوئی ایک عورت کے بچہ پیدا ہوا! توبہ...... ! یہ تھی اس زمانے کی حالت آج سے سولہ سال پہلے کی حالت، اب اگر ہم اپنی موجودہ حالت پر خدا کا شکر نہ کریں تو ہم ایسا ناشکرا کون ہوگا۔

اس زمانے کے ہوائی جہاز بھی عجیب ہوتے تھے۔ ڈکوٹہ، جن کے کل پرزے غالباً کباڑیوں کے یہاں سے خریدے جاتے تھے۔ ایئر ہوسٹس کا لباس عجیب، مخمل کی شلوار، مہری پر گوٹا ٹکا ہوا، سلمے ستارے والی قمیص، جگہ جگہ سے تنگ، بادلے کے کام کا دوپٹہ، ہاتھ میں تام چینی کی تھالی، اس میں ادھ کٹا ہوا زنگ آلود سیب، سوتوں کو جگاتی تھی اور کہتی تھی "ایپل"۔

یہ جہاز لاہور اور کراچی کے درمیان چلنے لگے، تو اس راستے سے چلے جو جہاز چلانے والوں نے جغرافیے کی پہلی کتاب میں پڑھا تھا، یعنی کوئٹے کے راستے۔ کوئٹے کے ہوائی اڈے پر نان کباب کی ایک دکان تھی، وہیں بیٹھ کر مسافر پیٹ کا دوزخ بھرا کرتے تھے۔ پھر عرض کروں کہ یہ واقعہ صرف سولہ سال کا ہے۔ ترقی کی تڑپ بہت اچھی بات ہے، مگر کبھی کبھی اللہ کا شکر بھی کرنا چاہئے۔

لاہور میں ریڈیو پاکستان کا صدر دفتر اور کراچی میں نشریات کی وزارت، مجھے آئے دن کراچی آنا پڑتا تھا۔ آخر ان روز روز کے پھیروں سے تنگ آ کر میں نے گزارش کی کہ ریڈیو پاکستان کے صدر دفتر کو کراچی بلا لیا جائے۔ گو میں کراچی اور لاہور کے سفر سے زچ آیا ہوا تھا مگر ریڈیو پاکستان کے دفتر کو کراچی بلانے کی تجویز ایک خاص واقعے سے تنگ آ کر کی تھی۔ میں کراچی میں کام کے سلسلے میں آیا تو ایک وزیر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد فرمایا، کل میرے یہاں چائے پر آنا۔ میں نے کہا جناب کا شکریہ۔ ضرور حاضر ہوں گا۔ کتنے بجے حاضر ہوں؟ فرمایا یہی کوئی ساڑھے سات آٹھ بجے! میں نے کہا حضور صبح یا شام کے ساڑھے سات آٹھ بجے۔ فرمایا شام کے ساڑھے سات آٹھ بجے کون چائے پیتا ہے، صبح کے ساڑھے سات آٹھ بجے آنا۔ میں اگلے دن صبح آٹھ بجے وزیر صاحب کے در دولت پر حاضر ہوا اور صبح کا ناشتہ ان کے دسترخوان پر کھایا۔ اگلی مرتبہ پھر کراچی آیا تو پھر وزیر صاحب نے مجھے چائے پر بلایا۔ اب میں نے وقت پوچھنا ضروری نہ سمجھا۔ عرض کیا ضرور حاضر ہوں گا۔ 8 بجے صبح؟ فرمایا ٹھیک۔ میں نے عرض کیا، وہیں کلفٹن والے مکان میں؟ فرمایا ہاں وہیں۔

کمانڈر مقبول میرے عزیز دوست ہیں۔ لندن میں ان سے بڑی یاد اللہ تھی۔ یہ ہمیشہ مجھ پر کرم کرتے تھے۔ ان دنوں یہ کراچی میں تھے۔ میں نے کہا مقبول بھیا مجھے صبح کلفٹن جانا ہے۔ اپنی گاڑی تو مستعار دیدو۔ مقبول صاحب کی گاڑی کا رنگ لال تھا۔ یہ وہ گاڑی تھی جس کو اسپورٹس ماڈل کہتے ہیں۔ زمین سے لگی ہوئی، دروازہ تنگ، اندر گھسنے کیلئے جسم کو سکیڑنا پڑتا تھا۔ اس گاڑی کا ٹپ کرمچ تھا۔ ایک کمانی دباؤ تو چڑھ جاتا تھا۔ دوسری دباؤ تو اتر جاتا تھا۔ اس گاڑی میں سر نیچا ڈال کر بیٹھنا پڑتا تھا۔ ذرا سا بھی سر اونچا کرو تو کرمچ چپت مارتی تھی۔

میں اس گاڑی میں سوار، کلفٹن وزیر صاحب کی کوٹھی پر ٹھیک آٹھ بجے پہنچا۔ مگر یہاں ہو کا عالم۔ میں برآمدے میں بیٹھ گیا۔ جب مجھے بہت دیر بیٹھے بیٹھے ہو گئی تو میں نے بغیر کسی شرم لحاظ کے کھڑکیوں کے اندر جھانکنا شروع کیا۔ پہلے تو کوئی نظر نہ آیا مگر آخر ایک بیرے سے آنکھیں چار ہوئیں اور میں جھینپ سا گیا۔ بیرا باہر آیا، سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا اور کہا کیا ہے؟ میں نے کہا، ہے تو کچھ بھی نہیں، معمولی سی بات ہے، وزیر صاحب کہاں ہیں؟ خیریت سے تو ہیں؟ فرمایا ہاں خیریت سے ہیں۔ غسل فرما رہے ہیں۔ میں بیٹھا رہا، بیٹھا رہا اور وزیر صاحب غسل فرماتے رہے، فرماتے رہے۔ وزیر صاحب نے بہت ہی غسل فرمایا اور جب بہت غسل فرما کر باہر تشریف لائے تو یہ وہ وزیر صاحب نہ تھے جنہوں نے مجھے چائے پر بلایا تھا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ شاید غسل فرمانے کے باعث ان کا ناک نقشہ بدل گیا، مگر غور سے دیکھنے پر یقین ہو گیا کہ یہ کوئی اور وزیر صاحب ہیں۔ یہ ہندو ہیں، وہ وزیر صاحب مسلمان تھے۔ میں نے دست بستہ دریافت کیا کہ اے ہندو وزیر صاحب وہ مسلمان وزیر صاحب کہاں ہیں جنہوں نے مجھے چائے پر بلایا ہے۔

ہندو وزیر صاحب بہت ہنسے اور فرمایا وہ تو دو ہفتے ہوئے یہاں سے چلے گئے ہیں۔ وہ تو وکٹوریہ روڈ پر رہتے ہیں۔ میں نے کہا مگر انہوں نے مجھے کل ہی یہاں کا پتہ دیا تھا۔ کہا اچھا ٹھہرو میں ٹیلی فون کر کے دریافت کروں۔ میں نے کہا آپ تکلیف نہ فرمایئے گا۔ میں وکٹوریہ روڈ پر جاتا ہوں۔ میں بھاگا، گاڑی میں گھسا اور گاڑی بگٹٹ بھگائی۔ غضب خدا کا نو بجنے والے اور وزیر صاحب نے آٹھ بجے چائے پر بلایا تھا۔ وزیر کیا کہے گا! آخر وقت کی پابندی بھی تو کوئی چیز ہے! میں نے کلفٹن کی سڑک پر مقبول کی گاڑی بھگائی۔ گاڑی نے شور مچایا اور اس کا ٹپ کھل گیا اور بادبان کی طرح کھڑا ہو گیا۔ میں نے گاڑی روکی، نیچے اتر کر ٹپ کو نیچے کیا، گاڑی میں سوار ہوا اور گاڑی روانہ ہوئی۔ ذرا ہوا لگی اور ٹپ پھر بادبان کی طرح کھڑا ہو گیا۔ اب کے میں نے ٹپ بند کیا اور بائیں ہاتھ سے پکڑ لیا۔ صرف دائیں ہاتھ سے گاڑی چلاتا رہا۔ وزیر کی کوٹھی میں داخل ہوا تو گاڑی کے ٹپ سے کہا کہ یہاں وزیر کی کوٹھی میں اگر تو کھلا تو لعنت ہے تجھ پر...... !

وزیر صاحب سے میں نے جاتے ہی معذرت کی۔ کہا، حضور میں غلطی سے کلفٹن چلا گیا تھا۔ ہنسے اور فرمایا مجھے معلوم تھا کہ تم کلفٹن جاؤ گے۔ میں نے کہا حضور کو کس طرح معلوم تھا کہ یہ خاکسار پہلے کلفٹن جائے گا۔ ہنسے اور فرمایا، میں نے ہی تو تم سے کہا تھا کہ کلفٹن آنا۔ میں نے عرض کیا حضور جب یہاں وکٹوریہ روڈ پر اٹھ آئے تو حضور نے یہ کیوں فرمایا تھا کہ کلفٹن آنا۔ ہنسے اور فرمایا "وہ مذاق تھا، جوک تھا"۔ اس "جوک" کے بعد وزیر صاحب بہت دیر تک ہنستے رہے اور میں خاموش کھڑا رہا۔ جب ان کی ہنسی تھمی اور ان کا کھلا ہوا منہ اپنی اصلی جگہ پر آ گیا تو خدا جانے مجھے کیا ہوا کہ میں نے یک لخت ہنسنا شروع کر دیا۔ اور وزیر صاحب کو دیکھ دیکھ کر بہت دیر تک ہنستا رہا۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

تقسیم کے بعد پاکستان کے حصے میں صرف 3 ریڈیو ٹرانسمیٹر آئے

پشاور-لاہور اور ڈھاکہ میں نصب ٹرانسمیٹر بھی فرسودہ تھے-کراچی اسٹیشن کیلئے مواصلاتی مشینری امریکہ سے منگوائی گئی-تنصیب کیلئے لانڈھی کا علاقہ منتخب کیا گیا-ناکارہ ٹرانسمیٹر کارآمد بنانے کے لئے پرزے بمبئی سے خرید کر لایا-زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



ایک ٹرانسمیٹر پشاور میں، ایک دقیانوس کے زمانے کا ٹرانسمیٹر لاہور میں اور ایک عمر رسیدہ کھولت زدہ ٹرانسمیٹر ڈھاکے میں۔ یہ تھی کل کائنات ریڈیو پاکستان کی۔ زمانہ تھا یہ 1947ء کا، یعنی جنگ کے بعد کا زمانہ۔ منڈیاں خالی تھیں۔ ہاں اگر کچھ ملتا تھا تو جنگ کے زمانے کا پرانا سامان کباڑیوں کی دکانوں پر۔ انگلستان کی دکانیں خالی، جرمنی اجڑا ہوا، جاپان ایٹم بموں کے زخموں سے چور۔ امریکہ میں البتہ تھوڑا بہت سامان موجود تھا، مگر وہ بھی ایسا کہ دیگچی ہے تو ڈھکن نہیں، پاجامہ ہے تو کرتا ندارد۔ ضرورت ہمیں اس کی تھی کہ ہتھیلی پر سرسوں جمائی جائے۔ اور روایات ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے خلاف۔ حکومت کے نکتہ چین کو کوئی غم دل کیا سنائے۔ یہاں تو بنائے نہیں بنتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دور میں کام پہلے دور کے مقابلے میں دگنی سرعت سے ہوتا ہے۔ پہلے دور میں تو پبلک سروس کمیشن کے امتحان کا نتیجہ پورے سال بھر میں نکلتا تھا، اور پھر اس نتیجے پر عمل درآمد ہونے میں ایک آدھ سال اور نکل جاتا تھا۔ ریڈیو میں ملازمت کرنے کا خواہش مند نوجوان اس عرصہ میں دو چار بیویوں کو پیارا ہو جاتا تھا۔

چوہدری محمد علی صاحب کو خدا خوش رکھے، اگر یہ مدد نہ فرماتے تو ریڈیو کے کام میں بے حد تاخیر ہوتی۔ سوچ بچار کے بعد ہم نے تجویز پیش کی کہ ریڈیو کے لمبے چوڑے کام تو اپنے وقت پر ہوتے رہیں گے۔ سب سے پہلے ہمیں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان ریڈیو کا رشتہ قائم کرنا ہے، تاکہ مغرب و مشرق ایک دوسرے کے دلوں کی دھڑکنیں سن سکیں۔ مراد اس سے یہ کہ ایک شارٹ ویو ٹرانسمیٹر ڈھاکے میں نصب ہو اور ایک کراچی میں۔ ڈھاکے میں تو ایک میڈیم ویو ٹرانسمیٹر مقامی ضرورتوں کو کسی حد تک پورا کرنے کے لئے تھا۔ لیکن کراچی میں میدان بالکل صاف تھا۔ یہاں سرے سے کوئی ٹرانسمیٹر ہی نہ تھا۔ نہ شارٹ ویو نہ میڈیم ویو۔ مقامی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے لازم آیا کہ کراچی میں شارٹ ویو کے ساتھ میڈیم ویو بھی نصب کیا جائے۔ اب سوال پیدا ہوا کہ پاکستان نیا نیا ملک بنا ہے، یہ بے حد ضروری ہے کہ بیرونی ممالک پاکستان کی آواز سن سکیں یا یوں کہیے کہ یہ امر بھی ہمارے خیال میں ضروری قرار پایا کہ کراچی میں ایسے شارٹ ویو ٹرانسمیٹر بھی نصب کئے جائیں جو بیرونی نشریات کی خدمت سر انجام دیں۔ میں نے اس مضمون کا ایک نہایت ہی مختصر نوٹ لکھ کر چودھری محمد علی صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ اس نوٹ میں جان کر میں نے اختصار سے کام لیا تھا، بے حد اختصار سے۔ چودھری صاحب لمبی داستان سے ویسے ہی گھبراتے ہیں، اور پھر ان دنوں تو انہیں سر کھجانے کی بھی فرصت نہ تھی۔ میں چودھری صاحب کے کمرے میں گیا۔ کام سے فارغ ہوئے تو میرے پاس آئے۔ میں نے وہ نوٹ پیش کیا۔ چودھری صاحب نے پڑھا اور فرمایا درست ہے، جاؤ کام شروع کرو۔ میں نے کہا ہمارے چیف انجینئر ریاض صاحب ہیں، مناسب یہ ہوگا کہ انہیں انگلستان اور امریکہ بھیج دیا جائے تاکہ ٹرانسمیٹر کا سودا کریں۔ فرمایا درست۔ ریاض احمد پہلے انگلینڈ گئے۔ وہاں معلوم ہوا کہ ٹرانسمیٹر کی تیاری میں کئی مہینے لگیں گے، اور پھر وہ ٹرانسمیٹر ایسا ہوگا جو ٹرانسمیٹر کی عمارت کی دو منزلوں پر نصب ہوگا یعنی اس کا کچھ حصہ عمارت کی پہلی منزل پر اور کچھ حصہ دوسری منزل پر۔ میں نے ریاض سے کہا، بھیا یہ بات تو درست لیکن ایسے ٹرانسمیٹر کو چلانے کیلئے دگنے آدمیوں کی ضرورت ہوگی، آدھے نیچے کی منزل میں کام کریں گے اور آدھے اوپر کی منزل میں۔ اتنے انجینئر کہاں سے لاؤ گے۔ ان دنوں انجینئروں کا بہت کال تھا۔ صرف دو چار مسلمان انجینئر ہندوستان سے ہجرت کرکے پاکستان آئے تھے۔ ریاض صاحب تو سول ہوائی محکمے سے مستعار لئے گئے تھے کہ ریڈیو کی گاڑی چلائیں۔ مسلمان انجینئر آل انڈیا ریڈیو میں بھی بہت کم تھے۔ ریاض صاحب تو چلے گئے انگلستان اور امریکہ ٹرانسمیٹر خریدنے، اور بشیر احمد صاحب نے یہاں نوجوان انجینئر تلاش کرنا شروع کئے کہ کسی طرح یہ ریڈیو کی نیا پار اترے۔

عام طور پر دستور ہے کہ ٹرانسمیٹر خریدے جاتے ہیں تو کارخانے والے ٹرانسمیٹر لگانے میں مدد دیتے ہیں اور جب ٹرانسمیٹر چلنے لگے اور اطمینان ہو جائے کہ درست کام کر رہا ہے تو اس وقت ٹرانسمیٹر کی قیمت وصول کرتے ہیں۔ مگر ہمارے معاملے میں امریکہ والوں نے زیادتی کی۔ ان کا بھی کیا قصور، انہوں نے پاکستان کا نام ہی نہ سنا تھا، قرضہ کس کو دیتے۔ طے پایا کہ پاکستان نقد روپے ادا کرے تو ٹرانسمیٹروں کا کچھ حصہ اب پہلے لے جائے اور باقی جب کارخانے میں تیار ہو جب۔ ان شرائط کو مان لینے کے سوا اور کوئی چارا نہ تھا۔ پاکستان کے سفارت خانے کی معرفت ٹرانسمیٹر خریدے گئے۔ ان ٹرانسمیٹروں کو جہاز پر لادنے اور جہازوں کے یہاں آنے میں سال بھر کا عرصہ لگ گیا۔ اس دوران میں ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ ٹرانسمیٹر کی عمارت تعمیر کرلی جائے۔ مگر کہاں؟ ٹرانسمیٹر نصب کرنے ہوں تو پہلے یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ مجوزہ ٹرانسمیٹر کے قریب کوئی ہوائی اڈا تو نہیں۔ اور اگر ہے تو اس سے پانچ میل دور ٹرانسمیٹر کا کھمبا لگایا جائے۔ اب مصیبت یہ آن پڑی کہ اس زمانے میں کراچی کے گردونواح میں گیارہ ہوائی اڈے تھے۔ ان میں سے اکثر امریکن لوگوں نے جنگ کے دوران میں بنائے تھے۔ اب ہر ایک ہوائی اڈے سے پانچ میل دور یعنی کراچی سے پچپن میل دور ٹرانسمیٹر کہاں نصب کیا جاتا۔ اور اگر کر بھی دیا جاتا تو پانی کہاں سے آتا، بجلی کہاں سے آتی، لوگ نوکری پر کیونکر پہنچتے۔ اور اگر وہیں ان کے رہنے سہنے کا بندوبست کر دیا جائے تو ان کے بچے کیونکر زندگی بسر کرتے، کون سے اسکول میں جاتے، شفاخانے کا کیا انتظام ہوتا؟

اب کیا عرض کروں کہ کن کن مصیبتوں کے بعد لانڈھی میں ایک قطعہ زمین دیا گیا، کہ اگر چاہو تو یہاں ٹرانسمیٹر لگالو۔ یہ قطعہ زمین بھی ہاشم رضا صاحب کی مہربانی اور تگ و دو سے ملا۔ یہ اس زمانے میں کراچی کے کلکٹر تھے۔ ریڈیو کے ساتھ ان کا عجیب معاملہ ہے۔ جس مکان میں، میں اٹھارہ برس رہا وہ مکان بھی ہاشم رضا صاحب نے دلوایا۔ جس جگہ اب کراچی براڈ کاسٹنگ ہاؤس ہے، یہ عمارت بھی ریڈیو کیلئے ہاشم رضا صاحب نے دلوائی۔ براڈ کاسٹنگ ہاؤس کی عمارت پہلے ڈسٹرکٹ بورڈ کی عمارت تھی۔ یہاں ایک پتھر نصب کیا گیا تھا، اس پر لکھا تھا کہ عمارت ہاشم گنڈر صاحب نے تعمیر کی اور اس پر پچپن ہزار روپے لاگت آئی۔ کل پچپن ہزار روپے! خدا جانے اب یہ پتھر کہاں ہے، لیکن میں نے اپنے ریڈیو کے زمانے میں اس پتھر کو بہت سنبھال کر رکھا تھا کہ داشت آید بکار۔

یہاں لگے ہاتھوں میرے مکان کا قصہ بھی سن لیجئے۔ میں کراچی آیا، کلفٹن پر ایک مکان الاٹ ہوا۔ اس زمانے میں کلفٹن آج کے کلفٹن سے بہت مختلف تھا۔ کلفٹن اور شہر کے درمیان کوئی بس نہیں چلتی تھی، نہ کوئی سواری میسر تھی۔ مہتا پیلس کے پاس ایک چھوٹی سی پرچون کی دکان تھی جو اب بھی وہیں موجود ہے۔ سودا سلف لانے کے لیے ملازم کو شہر بائیسکل پر جانا پڑتا تھا، اور کلفٹن کی تیز ہوا میں سائیکل چلانا کارے دارد والی بات تھی۔ سب سے بڑی مصیبت ان دنوں یہ تھی کہ کلفٹن میں فلش سسٹم کا کوئی انتظام نہ تھا، بیت الخلا کی صفائی کے لیے خاکروب ملازم رکھنا پڑتا تھا اور خاکروب اس زمانے میں عنقا تھے۔ ایک خاکروب بڑی مشکل سے ملا مگر اس نے کہا کہ دن میں صرف دو دفعہ بیت الخلا صاف کروں گا اور ہر بار صاف کرنے کے تین روپے لوں گا۔ چھ روپے روز، گویا ایک سو اسی روپے مہینہ!

ان دقتوں کے پیش نظر میری بیوی نے صلاح دی کہ شہر میں آبادی کے قریب مکان تلاش کرلیا جائے۔ سب سے اہم سہولت شہر کے مکان میں یہ ہوگی کہ بچوں کی تعلیم میں خلل واقع نہ ہوگا، ورنہ کلفٹن سے شہر اسکول میں بچوں کو بھیجنا بہت مشکل ہے۔ میں شہر میں مکان تلاش کرنے آیا مگر جاؤں کہاں؟ نہ کوئی واقف نہ آشنا۔ اتفاق سے حسن بیگ محمد سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے میری دستگیری کی اور دلالوں کی معرفت مجھے اس خالی مکان کا پتہ بتایا جس میں اب میں رہتا ہوں۔ ان دنوں رینٹ کنٹرولر نیاز صاحب تھے۔ اللہ انہیں غریق رحمت کرے، بہت ہی قابل شخص تھے۔ افسوس اورینٹ ایئرویز کے ہوائی جہاز کے ایک حادثے میں جنگ شاہی کے قریب ہلاک ہو گئے۔ نیاز صاحب نے مکان کا الاٹمنٹ تو دیا مگر فرمایا کہ اس پر کلکٹر صاحب کے دستخط ہونا ضروری ہیں۔ نام پوچھا تو معلوم ہوا کہ کلکٹر ہاشم رضا ہیں۔ جب میں یہ باتیں کر رہا تھا تو قریب دو چار نوجوان مجھے غور سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا، آؤ ہم تمہیں ہاشم رضا صاحب کے پاس لے چلیں۔ میں نے نوجوانوں کا شکریہ ادا کیا۔ ان کا نام پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایک صاحب تو سعید ہارون ہیں اور دوسرے قمر رضا، ہاشم رضا کے بھتیجے ہیں۔ خدا ان دونوں کو خوش رکھے۔ یہ ان کی مسافر نوازی تھی کہ میں ہاشم رضا کے کمرے میں پہنچا۔ ہاشم رضا اس تپاک اور خلوص سے پیش آئے کہ میں اپنی ساری کلفتیں بھول گیا۔ انہوں نے مکان الاٹ کردیا۔ پولیس ساتھ کردی۔ پولیس نے مکان کا دروازہ کھلوایا اور مجھے اس مکان کا مکین بنا دیا۔ اس زمانے میں اس مکان کی نچلی منزل میں کسٹم کے افسر ساجد علی خان رہتے تھے۔ نوجوان مگر پکے دیندار اور حد درجے کے مہمان نواز۔ شام کو میں بیوی بچوں کو لے کر اس مکان میں آیا تو شام کو کھانا ساجد میاں کے گھر سے آیا۔ آج تک میں اس مہمان نوازی کا ممنون ہوں، اور ہمیشہ رہوں گا۔

بیوی کو مکان ملا تو گھرداری کی بھی فکر ہوئی۔ مگر باورچی خانے میں جائیں اور آنکھوں میں آنسو لے کر آجائیں۔ نہ برتن بھانڈا، نہ چائے کا پیالہ، نہ چائے دانی۔ یہ سب سامان تو ہندوستانی لٹیروں کی نذر ہو چکا تھا۔ مجھ سے بھی بال بچوں کی سروسامانی نہ دیکھی گئی۔ میں نے ان سب کو واپس لاہور بھیج دیا۔ میں نے کہا تم لوگ لاہور جاؤ، مجھے دو تین ماہ کی مہلت دو۔ میں مکان میں کرسی میز، برتن بھانڈے کا انتظام کرلوں تو آنا۔ ان کو لاہور روانہ کیا اور خود مکان کے پیچھے لگ گیا۔ خدا جانے کس طرح میں نے سامان خریدا۔ میز کرسی بنوائی، فرش کا بندوبست کیا اور پلنگ مہیا کئے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ کتابیں فراہم کیں۔ جس مکان میں کتابیں نہ ہوں وہ مکان مجھے اجاڑ نظر آتا ہے۔ جب میں یہ سب کچھ کر چکا تو بیوی بچوں کو لاہور سے بلوالیا۔ جب سے لے کر آج تک اس مکان میں رہتا ہوں۔ اور سرکار کو کرایہ دیتا ہوں۔ اس مکان کے متعلق اور بھی بہت سی داستانیں ہیں جو پھر کبھی سناؤں گا۔ فی الحال تو مجھے ٹرانسمیٹر کا ذکر کرنے دیجئے۔

لانڈھی کا علاقہ اس زمانے میں سخت اجاڑ تھا، وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ جب لوگوں نے سنا کہ ہم وہاں ٹرانسمیٹر لگانا چاہتے ہیں تو میرے پاس بہت دوست آئے اور فرمایا میاں مارے جاؤ گے۔ وہاں تو دن دہاڑے ڈاکے پڑتے ہیں۔ مگر میں نے جواب دیا کہ دیکھو اللہ پر بھروسہ رکھو اسی جنگل میں منگل ہوگا۔ چھوٹا ملیر دریا ان دنوں بڑی جولانیاں دکھایا کرتا تھا۔ ہم سامان اور عملے کو تیرنے والی جیپ گاڑی اور اونٹ گاڑیوں میں لے جایا کرتے تھے۔ خیر کسی نہ کسی طرح یہ عمارت تعمیر ہونا شروع ہوئی۔ اب ہم نے کہا کہ اس نئے ٹرانسمیٹر کے نصب ہونے میں تو کوئی دو سال لگیں گے، اس دوران میں کراچی خاموش کیوں رہے، یہاں کوئی نہ کوئی ٹرانسمیٹر ضرور نصب کرنا چاہیے۔ میں فیریر روڈ پر پیدل چل رہا تھا کہ مجھے ایک دکان دکھائی دی۔ میں اس دکان کے اندر چلا گیا۔ حیدر صاحب اس کے مالک تھے۔ بہت بااخلاق آدمی ہیں۔ اب تو یہ دکان چھوڑ چکے ہیں اور خدا جانے کہاں ہیں۔ لیکن ریڈیو پاکستان کی تشکیل میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ باتوں باتوں میں ان سے میں نے دریافت کیا کہ کوئی پرانا ٹرانسمیٹر امریکنوں کے فوجی سامان کا مل سکتا ہے۔ فرمایا ہاں میرے پاس ایک دو سو واٹ کا چھوٹا سا ٹرانسمیٹر ہے۔ مگر وہ چلتا نہیں۔ اگر اس کے کل پرزے مل جائیں تو ضرور چل پڑے گا۔ میں نے ٹرانسمیٹر ریاض کو لا کر دکھایا۔ انہوں نے کہا چلے گا تو سہی مگر لگواؤ گے کہاں؟ اور پھر اس کے کل پرزے کہاں سے آئیں گے؟ ہندوستان میں تو مل جائیں گے، لیکن پاکستان میں ان کا ملنا بالکل ناممکن ہے۔ میں نے ریاض سے کہا ان کل پرزوں کی فہرست بناؤ جن کی تم کو ضرورت پڑے گی۔ اس نے فہرست بنائی اور میں عباسی صاحب سے اجازت لے کر سیدھا بمبئی پہنچا۔ عباسی صاحب ان دنوں ہمارے جوائنٹ سکریٹری تھے۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا اور آج مجھے خود بھی یقین نہیں آتا مگر یہ ہے کہ میں نے بمبئی کے بازاروں سے مال خریدا۔ اسے بکسوں میں بند کرایا۔ کسٹم سے گزارا۔ ہندوستانی جہاز سے یہاں وہ سامان کراچی پہنچ گیا۔ کسی قسم کی پوچھ گچھ نہ ہوئی!!!

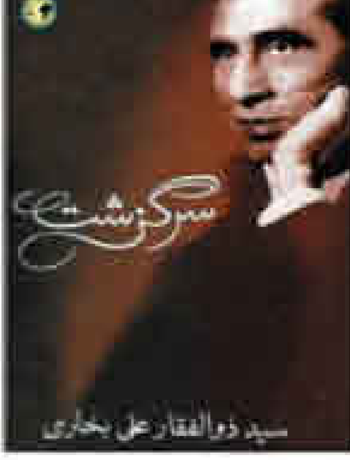
یہاں آکر اب جگہ کی تلاش ہوئی۔ کہیں جگہ نہ ملی تو میں نے وہ جگہ جو محض رہنے سہنے کیلئے تھی، اور وہاں دفتر بنانے کی اجازت نہ تھی۔ ہم نے کہا چلو جھوٹ بولو۔ حکومت کی اس وزارت سے جس کے تحت یہ انٹیلی جینس اسکول آتا تھا۔ ہم نے کہا کہ ہم کو اپنا سامان رکھنے کے لئے ایک گودام کی تلاش ہے۔ آپ دو کوارٹر ہمیں سامان رکھنے کیلئے دے دیجئے۔ یوں دو کوارٹر لیکر ہم نے دو دن کے اندر اندر ٹرانسمیٹر نصب کر دیا۔ ٹرانسمیٹر کا کھمبا کہیں نہ ملا تو کمیٹی کے گٹر پائپ کھمبے کی جگہ نصب کرکے کام چلایا۔ اس اسٹیشن کا افتتاح علامہ شبیر احمد عثمانی کی تلاوت قرآن پاک کے بعد شہید ملت لیاقت علی خان نے کیا تھا۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

جمعرات/15 مئی 2014ء
روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

ریڈیو کی گاڑیوں اور کینٹین کا نظام چلانا ٹیڑھی کھیر ثابت ہوا

لیٹ آنا اور پیٹرول چرانا ڈرائیورز کیلئے معمول کی بات تھی-ٹنکی کی پیمائش کرنے پر فیول میں پانی ملایا جانے لگا-کینٹین والا ریڈیو ملازمین کا ادھار بند کرتا تو اس کیخلاف شکایات کا ڈھیر لگ جاتا-زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



بری طرح ہو یا بھلی طرح، ریڈیو پاکستان چل پڑا اور اس کے مختلف شعبے اپنا اپنا کام کرنے لگے۔ بس دو چیزیں ہم سے نہ چل سکیں۔ ایک تو ریڈیو کی موٹر گاڑیاں اور دوسرے ریڈیو کی کینٹین یعنی ہوٹل۔ گاڑیاں تھوڑی تھیں اور ڈرائیورز زیادہ۔ سرکاری قانون کے مطابق ایکسی ڈینٹ کرنے والے یا دیر سے آنے والے ڈرائیور کی سزا صرف یہی ہوسکتی ہے کہ اس سے کیفیت طلب کی جائے کہ کیوں میاں برخوردار، ایکسی ڈینٹ کیوں ہوا؟ اور کیوں میاں صاحب زادے دیر سے کیوں آئے۔ جواب اس برخوردار سعادت آثار کا یہ ہوتا ہے کہ غلطی سراسر اس ٹرام والے کی تھی جو پٹری پر ٹرام چلاتا رہا۔ اور یہ نہ دیکھا کہ میں اپنی گاڑی سمیت عین پٹری پر کھڑا فکر سخن میں محو ہوں۔ باقی رہا دیر سے آنے کا سوال تو اس کا جواب مودبانہ یہ ہے کہ کراچی کی بسوں میں اس قدر بھیڑ ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ، مجھے جگہ نہ مل سکی۔ اور میں آبلہ پا، خار مغیلاں کو روندتا ہوا پیدل لانڈھی سے دفتر آیا ہوں۔

دیر سے آنے کی سزا ڈرائیور کو یوں نہیں مل سکتی کہ ایسے معمولی اور چھچھورے قصور پر سرکاری ملازم کو سزا دینے کی کوئی روایات ہی نہیں۔ وہ تو خدا بھلا کرے انقلابی حکومت کا کہ اس نے آکر سرکاری ملازمین کے دلوں میں کچھ خوف خدا ڈالا اور لوگ کسی حد تک وقت کی پابندی کے قائل ہوگئے ورنہ اس سے پہلے تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے پاکستان میں گھڑی دیکھنے کا رواج ہی نہیں۔

ایکسی ڈینٹ کا معاملہ تو جب تک پولیس کے دفتر میں رہے یا عدالت کے پیش ہو اس وقت تک سرکاری محکمہ اپنے ڈرائیور کا بال بھی بیکا نہیں کرسکتا۔ باقی رہا پیٹرول اور موٹر کے تیل کا معاملہ، سو اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ ڈرائیور حضرات تیل اپنے جسم پر مل لیتے تھے تاکہ اگر کوئی ان کو پکڑے تو اس کا ہاتھ پھسل جائے۔

یہ عجیب بات ہے کہ تقریباً ہر سرکاری گاڑی کے میٹرز کار رفتہ ہوتے ہیں۔ مسافت دکھانے والا میٹر کام نہیں کرتا، پیٹرول دکھانے والا میٹر بیکار، رفتار دکھانے والا میٹر ہمیشہ بگڑا ہوا۔ اب کوئی اندازہ لگائے تو کیونکر کہ موٹر کے خزانے میں کتنا پیٹرول ہے۔ ایک لال بجھکڑ نے ہمیں صلاح دی کہ ناپنے کا ایک گز خریدو، وہ گز ٹینک میں ڈال کر دیکھتے رہا کرو کہ گاڑی میں کتنا پیٹرول ہے۔ ہم نے یہ صلاح مان لی۔ ایک لوہے کی سلاخ خریدی۔ اس پر بہت احتیاط سے نشان ڈالے، ایک گیلن سے لیکر دس گیلن تک کے نشان۔ سلاخ ٹینک میں ڈالی اور نکال کر دیکھی کہ کہاں تک گیلی ہوئی ہے۔

اس جدید آلہ پیمائش کو حاصل کرلینے کے بعد ایک گونا اطمینان ہوا کہ اب ہم پیٹرول کے نشیب و فراز سے ہمیشہ آگاہی حاصل کرتے رہیں گے لیکن دوسرے تیسرے ہی دن ہمیں اطلاع ملی کہ گاڑی چھک چھک کرکے رک جاتی ہے۔ مستری کو بلایا اس نے گاڑی کا اگلا ڈھکنا اٹھایا۔ گاڑی کے کاربوریٹر پر انگلی ملی، پھر انگلی کو دیکھا اور سونگھا، بھیگی ہوئی انگلی کو دیکھنے اور سونگھنے کے بعد اس نے گاڑی کا مرض یہ تشخیص کیا کہ پیٹرول میں پانی ملا ہوا ہے۔

ہم نے پیٹرول ناپنے والی سلاخ کو زمین میں گاڑ دیا اور ڈرائیوروں سے کہا کہ بھائیو اب کوئی سلاخ تم کو آزار دینے کے لئے نہیں رکھی جائے گی۔ اب پانی ملا ہوا نہیں بلکہ خالص پیٹرول پیا کرو تاکہ تمہاری صحت پر برا اثر نہ پڑے۔

کینٹین کا معاملہ اس سے بھی عجیب و غریب ہے۔ سفارشوں کی یورش اور یلغار سے بچتے بچاتے ہوئے کسی ایک معقول ٹھیکیدار کو کینٹین کا ٹھیکہ دیتے۔ وہ غریب ہمارے حسب منشا میز کرسی برتن بھانڈے اکٹھے کرتا، شامی کباب ٹوسٹ چائے وغیرہ کی فہرست مضامین مع قیمت ہمارے پیش کرتا، اسے ہم تھوڑی سی کانٹ چھانٹ کے بعد منظور کرتے اور کینٹین چلنے لگتا۔ مگر تا بہ کے۔ جب اہل دفتر پر کینٹین کا قرضہ چڑھ جاتا تھا، اور کینٹین کا ٹھیکیدار قرضہ طلب کرتا تھا، تو ہمارے پاس شکایتوں کے طومار آنے لگتے کہ شامی کباب چھوٹا ہے اور ٹوسٹ کچا ہے، چائے ہلکی ہے، دودھ پتلا ہے اور انڈے کچھوے کے ہیں۔ جب گاہک اس شدت سے شاکی ہوں تو لامحالہ ہمیں ٹھیکیدار کو جواب دینا پڑتا کہ جاؤ میاں ما بخیر شما بہ سلامت، قیامت کے دن ملیں گے۔ وہ جواب دیتا کہ صاحب میرے لئے تو آج ہی کا دن قیامت کا ہے، یہ دیکھئے ڈھائی ہزار کی رقم مختلف ملازموں کے نام نکلتی ہے۔ یہ کیونکر وصول ہوگی؟ آپ مدد فرمائیے اور یہ رقم متعلقہ ملازموں کی تنخواہ سے کاٹ لیجئے۔ یہاں پیچ یہ ہے کہ ہم کسی نجی قرضے کی رقم مقروض کی تنخواہ سے کاٹنے کے مجاز نہیں، چنانچہ ٹھیکیدار غریب گھاٹا اٹھا کر ہمیں بددعائیں دیتا ہوا اپنے گھر چلا جاتا تھا۔

کینٹین کو صحیح طور پر چلانے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ کینٹین والا کسی کو ادھار نہ دے یا ادھار دے تو وصول کرنے کی کوشش نہ کرے۔ جہاں اس نے قرضہ وصول کرنے کی کوشش کی اس کے شامی کباب چھوٹے اور ٹوسٹ کچے نظر آنے لگیں گے، اور آخرکار اس کو کینٹین کی ٹھیکیداری سے ہاتھ دھو کر گنڈیریوں کا خوانچہ لگانا پڑے گا۔

کینٹین کی کامیابی کے راستے میں ایک اور بھی رکاوٹ ہے اور وہ یہ کہ افسر صاحبان چائے کینٹین میں نہیں نوش فرماتے، چائے کی کشتی اپنے کمروں میں طلب کرتے ہیں۔ جب اپنے کمرے میں چائے نوش فرمالیتے ہیں تو چینی چائے اور دودھ کا بچ رہنا لازمی ہے تاکہ برخوردار چپراسی بھی چائے پی کر اپنا نشہ پورا کرے۔ جو کینٹین کا ٹھیکیدار اس فالتو چینی، چائے اور دودھ کا بندوبست نہیں کرتا تو اس کا چمچہ غائب یا ایک آدھ پیالی گم۔

بظاہر یہ باتیں بہت معمولی معلوم ہوتی ہیں لیکن کیا عرض، ساری زندگی اس تگ و دو میں گزر گئی کہ چھوٹی چھوٹی باتیں بڑی باتوں کے راستے حائل نہ ہوں۔ پشتو میں ایک مثل مشہور ہے کہ "وادہ خو آسان دی وادے لیک تکے گراں دے" شادی کرنا تو آسان ہے لیکن شادی بیاہ رچانے کے سلسلے میں جو چھوٹے چھوٹے کام کرنے پڑتے ہیں، وہ بہت مشکل ہیں۔

کہنے کو تو لوگ کہتے ہیں کہ ریڈیو کا فلاں پروگرام خراب ہے فلاں پروگرام نہایت ہی خراب، لیکن یہ اللہ کے بندے کبھی یہ سوچنے کی تکلیف گوارہ نہیں فرماتے کہ ریڈیو والوں کو برا پروگرام پیش کرنے میں کیا لطف آتا ہے۔

پروگرام مرتب کرنے میں سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ ملک میں ثقافتی سرگرمیاں ان دنوں بہت ماند پڑی ہوئی تھیں۔ موسیقی ناجائز، کلاسیکل موسیقی ناقابل ہضم، ڈرامہ مفقود اور مقرر ناپید۔ آج کل حالت اس معاملے میں کچھ بہتر ہے۔ اب تو فنکاروں کو خطاب بھی ملتے ہیں، یعنی حکومت کی نظروں میں یہ مخلوق قابل نفرت نہیں رہی۔ اس زمانے میں، الٰہی توبہ، جسے دیکھو ثقافت کے پیچھے لٹھ لئے پھرتا تھا۔ اس زمانے کے اخبارات اگر آپ دیکھیں تو تعجب کریں کہ ہم پر کیا وقت گزرا ہے۔ زیادہ تعجب آپ کو اس بات پر ہوگا کہ اب بھی کچھ اگلے زمانے کے لوگ موجود ہیں۔

دو چار دن کی بات ہے کہ پاکستان کے ایک نہایت موقر اخبار میں ایک مراسلہ شائع ہوا کہ راگ سخت غیر اسلامی چیز ہے۔ ریڈیو پاکستان کو حکم دیا جائے کہ راگ بالکل بند کردے۔ راگوں کی بجائے قوالیاں نشر کرے۔ کاش کوئی اس بندہ خدا کو آگاہ کرے کہ آج کل کے مروجہ راگ تمام کے تمام مسلمانوں کی ایجاد ہیں۔ راگوں کے سب سے بڑے موجد امیر خسرو، حضرت سلطان شرقی والی جونپور اور عطا حسین خان عرف میاں تان سین گزرے ہیں۔ حضرت بلھے شاہ کا تقریباً تمام کلام موسیقی کے لئے لکھا گیا ہے۔ اور موجودہ دور میں حضرت خواجہ فرید کی تمام کافیاں موسیقی کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ باقی رہا قوالیوں کا معاملہ تو حضرت کوئی ایسی قوالی آپ گا ہی نہیں سکتے جو کسی راگ میں نہ ہو۔ راگ تو مختلف سروں کے امتزاج کا نام ہے۔ اس امتزاج سے نفرت کیسی اور تنافر کیا معنی؟ لاحول ولا قوۃ۔

اب تو خدا کا شکر ہے کہ تصویروں کی نمائش بھی ہو جاتی ہے۔ اس زمانے میں ایک سرپھرے نے لاہور کے مصوری کے کالج کو یہ حکم دیا تھا کہ خبردار، تمہارے یہاں کے لوگ کسی جاندار کی تصویر نہ بنائیں۔ صرف پھولوں وغیرہ کی تصویر بنائیں۔ اگر گوبھی کے پھول کی تصویر بنائیں تو بہت ہی مناسب ہوگا کیونکہ ہمارے ملک کی پالیسی یہ ہے کہ ملک میں ترکاریاں زیادہ اگائی جائیں۔

ایسے حالات میں پروگرام کیا ہوتی! قابل داد ہیں ریڈیو کے نوجوان، جنہوں نے لوگوں کے طعن سنے لیکن اپنے کام میں لگے رہے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے پاکستان میں ڈرامے کی بنیاد ڈالی، ورنہ یہاں ڈرامہ کیسا اور ایکٹر کہاں۔ اب تو کوئی دردِ دل رکھنے والا ایک آدھ ڈرامہ اسٹیج پر پیش کرتا ہے تو اخبارات میں اس کا ذکر آتا ہے، تصویر چھپتی ہے، مگر اس زمانے میں اگر کوئی بدبخت ڈرامے کا نام بھی لیتا تھا تو لوگ کہتے تھے "پھٹے منہ" غرض یہ کہ ریڈیو کے نوجوانوں نے موسیقی کو گلے لگائے رکھا اور ڈرامے کا دامن نہ چھوڑا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ کار عظیم انہوں نے کیوں کر سرانجام دیا ہے۔ پیشہ ور گویے تو اس ملک میں بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ اٹھتے جاتے ہیں اور ڈرامہ کوئی لکھتا ہی نہیں۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

ریڈیو کیلئے عید ملن پارٹی کی ریکارڈنگ ناکام رہی

تقریب کی ریکارڈنگ سن کر انتہائی خفت ہوئی - شور شرابے کے سوا کچھ سنائی نہ دیا - پشاور میں عید کی نماز کے دوران قرات سن کر بزرگوں کے ساتھ بچے بھی رو پڑتے - شہر میں انڈے لڑانے کے مقابلے منعقد کرائے جاتے - زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



آج کل ساری دنیا میں کلچر کا بڑا زور ہے۔ انگریز اپنا کلچر پھیلانے کی فکر میں، امریکہ والے اپنا کلچر پھیلاتے پھر رہے ہیں۔ لب لباب اس کلچر کا یہ ہے کہ ایک ملک یا تو اپنے یہاں کی موسیقی کا ڈھول پیٹ رہا ہے یا اپنے یہاں کے رقص اور ناٹک کا، بہت ہوا تو کبھی کبھار اپنے ملک کے مصوروں کے کارنامے بھی پیش کر دیتا ہے۔ اگر کلچر محض رقص و سرود تک محدود ہوتا تو دس بیس ریکارڈ سن کر یا دو چار رقص اور تمثیل کی فلم دیکھ کر ہم گھر بیٹھے امریکن یا انگریز بن جاتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ شے لطیف جسے کلچر کہتے ہیں ایک احساس ہے قومیت کا جو زندگی کے ہر قدم ہم کو سمجھاتا ہے کہ یہ نشیب ہے اور یہ فراز۔ اسی زیر و بم اسی سیاہ و سفید کے احساس کے بل بوتے پر قومیں تاج محل بناتی ہیں۔ میرک کو جنم دیتی ہیں، ابن سینا، فردوسی، رومی، حافظ، سعدی، غالب، بیدل، خسرو، اقبال پیدا کرتی ہیں۔

جب کبھی بھی عید آتی ہے مجھے اپنے بچپن کا زمانہ یاد آ جاتا ہے۔ والد مرحوم سب بڑے بچوں کو اپنے ساتھ عیدگاہ لے جایا کرتے تھے۔ میں اس زمانے میں بڑا تو نہ تھا لیکن اتنا بڑا ضرور تھا کہ والد کے ساتھ جا کر عیدگاہ میں نماز پڑھوں۔ بھائی جان مرحوم اور میں صبح کی نماز سے فارغ ہو کر نئے کپڑے پہننے میں مصروف ہو جایا کرتے تھے اور کپڑے پہن کر اپنے ہی دالان میں بیٹھ جاتے تھے، باہر نہ نکلتے تھے۔ ہم دونوں کو اس بات کا بڑا خیال تھا کہ جب ہم نیا جوڑا پہن کر باہر نکلیں تو سب گھر والوں کی نظریں ہم پر پڑیں۔ جب کوئی آ کر کہتا کہ شاہ صاحب عیدگاہ جانے کیلئے تیار ہیں، تو ہم دونوں بھائی دولہا بنے ہوئے باہر نکلتے، سب کو سلام کرتے، سب سے انعام پاتے اور گاڑی میں سوار ہو کر والد کی ہمرکابی میں عیدگاہ پہنچتے۔

عید کے دن گھوڑے کی باگ والد مرحوم ہمیشہ اپنے ہاتھ میں لے لیتے۔ عیدگاہ جانے کیلئے نہ ہم میں سے کوئی گاڑی چلانے کا مجاز تھا نہ سائیس۔ عیدگاہ کے دروازے سے بہت دور سواری روک لی جاتی تھی اور ہم سب تکبیر پڑھتے ہوئے پیدل عیدگاہ کی طرف روانہ ہوتے تھے۔ ہجوم میں بہت سے لوگ والد مرحوم کی جان پہچان کے ہوتے تھے۔ وہ ہجوم ہی میں آ کر والد مرحوم سے عید ملتے، ہم انہیں سلام کرتے اور وہ ہمیں دعائیں دیتے۔ تکبیریں پڑھتے ہوئے یہ ہجوم عیدگاہ میں داخل ہوتا، صفیں باندھی جاتیں۔ والد ہم سب کو عید کی نماز پڑھنے کا طریقہ یاد دلاتے۔ نماز کا وقت آتا تو ہم سب مودب امام کے پیچھے کھڑے ہو جاتے۔ بار بار قرات سنتے سنتے قلب اس قدر گداز ہوتا کہ ہم رو پڑتے۔ جب فریضہ نماز سے فارغ ہوتے اور والد ہاتھوں کو چومتے تو دیکھتے کہ ان پر رقت طاری ہے اور آنسوؤں سے ان کی داڑھی بھیگی ہوئی ہے۔ اس زمانے میں یہ عام دیکھا گیا کہ عید کے فریضے کے بعد شہر میں محبت اور مروت کی فضا پائی جاتی تھی۔ ایک طہارت کی فضا، ایک پاکیزگی کی فضا، ایک شادمانی کی لہر۔

پشاور شہر میں جگہ جگہ جھولے اور ہنڈولے پڑتے تھے۔ گاؤں والے ہزاروں کی تعداد میں انڈے لے کر شہر آتے تھے۔ ان انڈوں کو سرخ، زرد، سیاہ اور سبز رنگ دیا جاتا تھا۔ جگہ جگہ ٹولیاں بیٹھ جاتی تھیں اور انڈے لڑائے جاتے تھے۔ انڈے لڑانے کا طریقہ یہ تھا کہ سو پچاس انڈے داؤ پر لگا دیئے جاتے تھے اور دو حریف ایک ایک انڈا اٹھا کر ایک دوسرے کے انڈے پر مارتے تھے۔ جس کا انڈا ٹوٹ جائے وہ ہارا اور دوسرا داؤ پر لگے ہوئے انڈے جیتا۔ یہ انڈے پھر بڑے پکوڑے والوں کی دکان پر بیچ دیئے جاتے اور وہاں بیسن میں تل کر فروخت ہوتے۔ ڈفلیاں، نفیریاں، ہزاروں کی تعداد میں بکتیں۔ گھر گھر ڈفلی، گھر گھر نفیر، گھر گھر چرخی۔

آپ کو شاید یقین نہ آئے، لیکن میں اب بھی عید اسی طرح منانا چاہتا ہوں جس طرح بچپن میں مناتا تھا۔ لیکن کیا کروں۔

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

آج کل صفیں عام طور پر کج، دل آوارہ، چند ایک خطیبان کرام کو چھوڑ کر باقی سب بے لذت۔ چھوٹے چھوٹے بچے اور بچیاں صفوں میں آزادانہ گھوم رہی ہوں تو نماز میں یکسوئی کہاں سے آئے اور قلب میں وہ گداز کیوں کر پیدا ہو کہ قرات سن کر آنکھوں میں آنسو آ جائیں۔ صوفی تبسم صاحب قبلہ ایک واقعہ سناتے ہیں کہ عید قربان کی نماز پڑھنے گیا۔ صفیں قیام کی حالت میں تھیں کہ دور سے دو صفوں کے درمیان ایک قد آور بکرا خراماں خراماں آگے بڑھتا دکھائی دیا۔ صوفی صاحب فرماتے ہیں کہ اس بکرے کو دیکھ کر میری روح فنا ہو گئی اور ڈر یہ لگا کہ بکرا کہیں نماز میں کھنڈت نہ ڈالے اور ہوا بھی یہی۔ یہ کمبخت بکرا چلتے چلتے میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اب جو تکبیر بلند ہوئی اور میں رکوع میں جانے لگا تو بکرا سمجھا کہ صوفی مجھ سے ٹکر لینا چاہتا ہے۔ چنانچہ بکرا بھی پینترے سے کھڑا ہو گیا۔ اب نہ میں رکوع میں جا سکوں اور نہ بکرے کو ہٹا سکوں۔ اتنے میں دو چار بچے بھاگتے ہوئے آئے اور بکرے کو پکڑ کر صفوں سے باہر لے گئے۔ ہوا یہ کہ کوئی نمازی صاحب نماز پڑھنے گھر سے چلے تو اپنے بچوں کو بھی لائے اور بکرے کو بھی! خود تو نماز پڑھنے لگے اور بکرا بچوں کی تحویل میں دے دیا۔ بچے آخر بچے ہی ہوتے ہیں، خدا جانے انہوں نے بکرے کو ہشکا دیا یا بکرا خود ہی تڑا کر بھاگا۔ خیر کچھ بھی ہو لیکن اس دن صوفی تبسم صاحب کی نماز میں جو خلل پڑا اس کی ذمہ داری اس نمازی پر عائد ہوتی ہے، جو عیدگاہ میں اپنے ہمراہ بکرا لے آیا تھا۔

ریڈیو کے فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ عیدین کے موقع پر خاص پروگرام پیش کرے۔ مگر غریب ریڈیو کیا پروگرام پیش کرے؟ یہ بات میری سمجھ میں اس وقت بھی نہیں آئی، جب میں ریڈیو سے وابستہ تھا اور اب بھی نہیں آتی۔ عید کے متعلق جو اشعار ہمارے بڑے بڑے شعراء نے لکھے ہیں، ان میں عام طور پر افسردہ دلی پائی جاتی ہے۔ اور یہاں ضرورت اس کی متقاضی ہے کہ افسردہ دلوں کو لذت شادمانی دی جائے۔ اصل موسیقی سے لوگ بھاگتے ہیں، نقلی موسیقی عید کے وقار کے منافی ہے۔ ہاں صرف قوالی ہے، جو پیش کی جا سکتی ہے یا ایک آدھ تقریر فضیلت عید پر۔

عید پر فیچر لکھنے کی کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ عید کا دن ہے، منا رو رہا ہے کہ جوتا تنگ ہے، والد فرماتے ہیں کہ جوتے میں ذرا سا پانی ڈال لو، ڈھیلا ہو جائے گا۔ بچہ کہتا ہے کہ جوتا کاٹتا ہے، والد فرماتے ہیں کہ ایڑی کے پیچھے کاغذ رکھ لو۔ درزی دروازے پر ابھی ابھی ننھے کا کوٹ لے کر آیا ہے۔ والد صاحب والدہ کو متنبہ کر رہے ہیں کہ اگر کچھ دن پہلے کوٹ سلنے دے دیا جاتا تو نماز قضا نہ ہوتی۔ غرض کہ اس قسم کی طفلانہ باتیں کر کے جی بہلا لیا جاتا ہے۔ ابھی ہمارے سننے والوں میں یہ جرات پیدا نہیں ہوئی کہ صفوں کی کجی کے بارے میں کچھ سن سکیں۔ جنگ چھڑ جائے اگر ہم یہ کہہ دیں کہ بھائی صاحب پٹیل پارک سے باہر نکلنے کا دروازہ بہت چھوٹا ہے، اگر آپ کو اس دروازے سے باہر آنا ہو تو قطار لگا لیجئے۔ یہ دھکا پیل تو مناسب نہیں۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ اس دروازے سے باہر نکلنے کیلئے بھی پولیس کی مدد لی جائے۔ فساد ہو جائے اگر ہم یہ کہہ دیں کہ فلاں مولوی صاحب بہت کریہہ الصوت ہیں، ان کی بجائے کوئی خوش الحان مولوی نماز پڑھائے۔ دنگا ہو جائے اگر ہم یہ کہہ دیں کہ اکثر نمازی رکوع کی بجائے سجدے اور سجدے کی بجائے قیام کرتے ہوئے پائے گئے۔ کچھ تو ان دقتوں کے پیش نظر اس خیال سے کہ آخر ہم ریڈیو والے بھی مسلمان ہیں، عید کی نماز ہم پر بھی فرض ہے، فیصلہ یہ کیا گیا کہ عید کے دن خبروں کے بعد ریڈیو بند کر دیا جائے اور سننے والوں سے کہہ دیا جائے کہ عید کی نماز کے بعد

"پھر ملیں گے اگر خدا لایا"

فی الحال ہمیں اجازت دیجئے۔ عید مبارک۔

کچھ عرصے سے عید ملن پارٹیوں کو بھی عید کی تقریبات میں شامل کر لیا گیا ہے۔ ریڈیو کے زمانے میں جب میں نے سنا کہ عید ملن پارٹی کہیں ہونے والی ہے تو میری پروگرام کی رگ پھڑک اٹھی۔ دوستوں کو جمع کیا اور کہا دوستو عید ملن پارٹی فلاں جگہ ہو رہی ہے، جلسہ ہوگا، موسیقی ہوگی، تقریریں ہوں گی، تماشا ہوگا، اگر اس تقریب کو ریکارڈ کر لیا جائے تو کیسا رہے گا۔ میں نے یہ مشورہ حمید نسیم سے کیا تھا۔ میری بات سن کر حمید نسیم صاحب زیر لب مسکرائے اور فرمایا جیسا ارشاد ہو۔ تقریب کے بعد ریکارڈ کو آپ سن لیں تو بہتر ہوگا۔ ہم نے کہا بچشم۔ ریکارڈ تیار کر کے حمید صاحب لائے اور ہم نے سنا۔ ہم سنتے جاتے تھے اور پسینے میں شرابور ہوتے جاتے تھے۔ حمید نسیم صاحب ریکارڈ بجاتے جاتے تھے اور زیر لب مسکراتے جاتے تھے۔ ریکارڈ سے کچھ اس طرح کی آوازیں برآمد ہو رہی تھیں:

پوں پوں...... (یہ موٹر کی آواز تھی)

کھٹ...... (یہ موٹر کے دروازے کے بند ہونے کی آواز تھی)

پھر خاموشی...... بہت خاموشی۔

پھر ایک آواز

چودھری صاحب السلام علیکم

عید مبارک

او یار میری تو تم نے پسلیاں توڑ دیں

عید مبارک

پھر خاموشی

پھر کھن کھن (یہ پرچ پیالیوں کی آواز تھی)

پھر خاموشی

پھر آواز، بیرا ذرا چائے ادھر لانا

پھر خاموشی...... بہت خاموشی

پھر آواز

ٹھنڈی ہے یہ چائے...... بیرا

خاموشی......

بیرا او بیرا...... کوئی ادھر آؤ

خاموشی...... بہت خاموشی

انتظام بہت ناقص ہے

خاموشی

اس سے تو بہتر یہی تھا کہ ہم گھر میں دو روپے کی چائے پی لیتے

خاموشی

کھٹ کھٹ......

پوں پوں......

موٹروں کے جانے کی آواز

مجھے جتنی خفت حمید نسیم کے سامنے اس دن ہوئی شاید عمر بھر نہ ہوئی۔ میں نے آہ بھری اور ریکارڈ الٹا چلا دیا تاکہ یہ بے ہودہ قسم کی اصوات مٹ جائیں اور ٹیپ دوبارہ استعمال ہو سکے۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

ضیا جالندھری اور اعجاز بٹالوی کی کام سے لگن مثالی ہوا کرتی تھی

ریڈیو پر تقریروں کا انتظام ان دونوں کے سپرد تھا - ایک بار عید میلاد النبیؐ سے متعلق تقریر لکھوانے کے لئے انہیں بڑے پاپڑ بیلنے پڑے - ایک گھر سے تو دھکے دے کر نکالا گیا - زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



ملک کے تقریباً ہر شعبے میں آپ کو ایسے افسر ملیں گے، جو کسی زمانے میں ریڈیو سے وابستہ تھے۔ یہ حضرات بفضلہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ ان کی قابلیت اور ان کا جذبہ خدمت وطن تھا ہی اس معیار کا کہ یہ ملک کا انتظام و انصرام سنبھالیں۔ لیکن کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ اگر یہ حضرات ریڈیو ہی سے وابستہ رہتے تو ریڈیو کا معیار کتنا بلند رہتا۔ اس سے میری مراد یہ نہیں کہ اب ریڈیو کا معیار بلند نہیں، مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ

کہاں وہ بات مگر مولوی مدن کی سی

ریڈیو کے انہی پرانے کارکنوں میں ضیا نثار احمد صاحب ہیں، جو ادب کی دنیا میں ضیا جالندھری کے نام سے مشہور ہیں۔ ضیا صاحب کسی زمانے میں ریڈیو کی تقریروں کے منصرم تھے۔ ان کے ساتھ ان کے اور ہم سب کے یار عزیز اعجاز بٹالوی کام کرتے تھے۔ یہ وہ اعجاز بٹالوی ہیں جنھوں نے فیض احمد فیض کے مقدمے کی پیروی سہروردی مرحوم کے ساتھ مل کر کی تھی اور نام پایا تھا۔ اعجاز بٹالوی اس وقت ملک کے سربرآوردہ وکلا کی صف میں ہیں اور ضیا صاحب ڈائریکٹر جنرل پاکستان پوسٹل ڈپارٹمنٹ کے کہیں قریب قریب ہیں۔ اللہ ان حضرات کو زیادہ ترقی دے۔

یہ دونوں حضرات اپنی نوجوانی کے زمانے میں ریڈیو پاکستان لاہور سے وابستہ تھے۔ تقریروں کا انتظام و انصرام ان کے سپرد تھا۔ ایک تو پہلا زمانہ اور پھر ان دونوں حضرات کا ادیبانہ تجرا اور دماغ، ہر تقریر کو بہت انہماک سے دیکھتے تھے اور نہایت انہماک سے اس بات کے لیے کوشاں تھے کہ ریڈیو کی تقریروں کے لیے نئی زبان پیدا ہو۔ اخباروں کی زبان مختلف، ڈرامے اور ناول کی زبان مختلف، ریڈیو کی زبان بھی نئی ہونی چاہئے۔ ریڈیو کا میدان نیا ہے اس میں اشہب قلم نئی جولانیاں دکھائے تو کام چلے۔

ایک مرتبہ ان حضرات کو عید میلاد النبیؐ کے موقع پر کسی عالم سے تقریر کرانا تھی۔ کنٹریکٹ اس مجوزہ مقرر کو بھیج دیا تھا لیکن نہ کنٹریکٹ کا جواب آیا، نہ تقریر کا مسودہ۔ انہیں بہت تشویش کہ اب کیا ہوگا۔ آخر جب عید میلاد النبیؐ کے دن میں صرف ایک رات باقی رہ گئی، تو مولوی صاحب نے مسودہ بھیجا۔ ان دونوں نے بیٹھ کر مسودہ پڑھا تو سخت پریشان ہوئے۔ مولوی صاحب قبلہ نے عید میلاد تو یونہی ضمناً کر دیا تھا۔ لیکن سکھوں اور ہندوؤں کے متعلق صفحے کے صفحے سیاہ کر دیئے تھے۔ ضیا اور اعجاز نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس تقریر کو کس طرح کانٹا چھانٹا جائے۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر اتعلق حصے اس تقریر میں سے حذف کر دیئے جائیں، تو باقی کچھ بچتا ہی نہیں۔ بہتر یہی ہوگا کہ مولوی صاحب کی خدمت میں حاضری دی جائے اور ان سے درخواست کی جائے کہ سکھوں اور ہندوؤں کا ذکر کاٹ کر میلاد النبیؐ کے موضوع پر دو چار صفحے مزید لکھ دیں۔

چنانچہ یہ دونوں دوست اپنی بائیسکلوں پر پاؤں چلاتے اور طرح طرح کے فقرے سوچتے ہوئے مولوی صاحب کے دردولت پر حاضر ہوئے۔ مولوی صاحب ویسے تو ذرا تیز آدمی تھے، غصہ ہر وقت ان کی ناک پر دھرا رہتا تھا۔ مگر اس وقت، مولوی صاحب کی طبیعت ذرا شگفتہ تھی۔ بہت خندہ پیشانی سے ان دونوں کا استقبال کیا، نہایت قرینے سے ان کو اپنے پاس بٹھایا، چائے کی پیالی پلائی اور پوچھا کہئے صاحبان کیسے تشریف لائے۔

ضیا بولے، مولوی صاحب قبلہ کل عید میلاد النبیؐ ہے۔ مولوی صاحب نے ارشاد فرمایا، ہاں اور میں نے مسودہ اپنی تقریر کا ارسال کر دیا۔ امید ہے کہ وصول ہو گیا ہوگا۔ اعجاز بولے، جی قبلہ وہ مسودہ تو موصول ہو گیا اور اسے پڑھ کر ہم نے استفادہ بھی کیا ہے لیکن۔

مولوی صاحب نے فرمایا لیکن کیا معنی؟

ضیا صاحب بولے، حضور اس میں سکھوں اور ہندوؤں کے مظالم کا ذکر ہے۔ اعجاز نے اضافہ کیا کہ نہ صرف یہ کہ سکھوں اور ہندوؤں کے مظالم کا ذکر ہے کہ بلکہ بہت ذکر ہے۔ اب ضیا اور اعجاز باری باری بولنے لگے۔ ضیا بولے ذکر زیادہ ہو یا کم عید میلاد النبیؐ کے موقع پر یہ ذکر کرنا موزوں نہیں معلوم ہوتا۔ اعجاز نے فرمایا ہر چند کہ جو کچھ آپ نے سکھوں اور ہندوؤں کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے وہ درست ہے...... ضیا نے بات آگے بڑھائی، لیکن

ہر سخن موقعہ و ہر نکتہ مقامے دارد......

مولوی صاحب چپ تھے۔ ان دونوں حضرات کے حوصلے مولوی کی خاموشی دیکھ کر بڑھے اور ان دونوں نے کورس کے انداز میں فرمایا کہ مولوی صاحب یہ سکھوں اور ہندوؤں والا حصہ کاٹ دیجئے اور اس کی جگہ......۔

اتنا ہی کہا تھا کہ مولوی صاحب نے ارشاد فرمایا ذرا ادھر آیئے۔ یہ کہہ کر مولوی صاحب دروازے کی طرف چلے۔ یہ حضرات بھی مولوی صاحب کے پیچھے پیچھے چلے۔

دروازے کے پاس پہنچ کر مولوی صاحب یک لخت پلٹے، ان دونوں حضرات کی گدی میں ہاتھ دیا اور انہیں دھکا دے کر دروازے کے باہر نکال دیا۔

ستون چشم بدور ہیں آپ دیں کے
نمونہ ہیں خلق رسول امیں کے

ضیا اور اعجاز بٹالوی مولوی صاحب کے مکان کے باہر آئے یا پہنچائے گئے۔ یہاں پہنچ کر یہ حضرات خدا جانے کیوں بہت زور سے ہنسے اور ہنستے رہے۔ ان کی ہنسی اس بلا کی تھی کہ اس کی آواز سن کر لوگ کھڑکیوں میں سے جھانک جھانک کر دیکھنے لگے۔

وقتاً فوقتاً مولوی صاحب کے کھانسنے کی آواز بھی آ رہی تھی، مگر اس ہنسی کے طوفان میں کسی نے اس طرف توجہ نہ کی۔ آخر ضیا اور اعجاز نے اپنی اپنی سائیکلیں سنبھالیں اور وہاں سے چل پڑے۔ راستے میں اعجاز بائیسکل سے اتر پڑا اور ضیا سے کہا اترو۔ ضیا بائیسکل سے اتر کر اعجاز کے پاس آیا اور کہا، کہو کیا بات ہے۔ اعجاز نے کہا ہم جا کہاں رہے ہیں؟ ضیا نے کہا دفتر۔ اعجاز نے کہا رات کے دس بجے ہیں، اس وقت دفتر جا کر کیا کریں گے، مگر خیر یہ تو بتاؤ کہ کل کی تقریر کا کیا ہوگا۔ مولوی صاحب نے تو ہمیں گھر سے دھکے دے کر باہر نکال دیا، اب تقریر کہاں سے آئے گی۔ ضیا نے کچھ دیر توقف کے بعد کہا، ٹھیک ہے آؤ میرے ساتھ۔ اعجاز نے کہا کہاں۔ ضیا بولے بس تم چلے آؤ۔ دونوں پھر بائیسکل پر سوار ہوئے اور شہر کی ایک بڑی مسجد کے مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولوی صاحب بہت خلیق آدمی تھے۔ اکثر ریڈیو سے تقریریں کیا کرتے تھے اور ضیا اور اعجاز دونوں کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ جب علیک سلیک کے بعد یہ دونوں مولوی صاحب کے پاس بیٹھ گئے، تو ضیا نے کہا حضور آپ کی تقریر کا مسودہ نہیں پہنچا۔ مولوی صاحب حیران ہو کر بولے، کون سی تقریر؟ اب اعجاز کی سمجھ میں ضیا کی چال آ گئی تھی۔ فوراً بولا عید میلاد النبیؐ کی تقریر۔ کل عید میلاد النبیؐ ہے۔

مولوی صاحب کچھ فرمانے ہی لگے تھے کہ ضیا بولا، آپ کو کنٹریکٹ معلوم ہوتا ہے نہیں ملا۔ اعجاز نے کہا کہ خیر دوسرا کنٹریکٹ بن جائے گا۔ مولوی صاحب بہت سٹپٹائے اور فرمایا عزیزان گرامی مصروفیات کے باعث آپ کا فرستادہ اجارہ نامہ اس عاجز نے نہ دیکھا ہوگا، بہر حال آپ حضرات تشریف لائے ہیں، تو میں راتوں رات بیٹھ کر تقریر کا مسودہ تیار کر دوں گا۔ اب ان حضرات کو یہ خیال کہ اگر کل صبح مولوی صاحب تقریر کا مسودہ عین تقریر کے وقت لے کر آئے اور اس میں بھی ہندوؤں اور سکھوں کا ذکر ہوا تو کیا ہوگا۔ اعجاز نے کہا مولوی صاحب آپ کو تقریر خود تیار کرنے میں بہت زحمت ہوگی، ہم دونوں آپ کے نیازمند ہیں، اس لیے حاضر خدمت ہوئے ہیں کہ آپ بولتے جائیں اور ہم کاتب بن کر آپ کی تقریر لکھتے جائیں۔

مولوی صاحب کو یہ تجویز پسند آئی۔ آپ نے چند لمحوں کے توقف کے بعد تقریر لکھوانا شروع کی اور یہ دو حضرات جلدی جلدی مولوی صاحب کی تقریر لکھتے رہے اور یوں جا کر ریڈیو پر وہ تقریر نشر ہوئی۔

یہاں مجھے ایک مولوی صاحب کی برائی اور دوسرے مولوی صاحب کا اخلاق دکھانا اس قدر مقصود نہ تھا جتنا یہ دکھانا مقصود ہے کہ اعجاز اور ضیا میں کام کی کتنی لگن تھی۔ رات کے دو ڈھائی بجے تک تقریر کا مسودہ حاصل کرانے کے لیے مارے مارے پھرتے رہے۔ سردی کا موسم اور وہ بھی لاہور کی سردی اور پھر اس پر طرہ بائیسکل کی سواری، ٹھنڈی ہوا کے طمانچے مگر......

چوں عشق حرم باشد سہل است بیاباں ہا

ان کے لیے یہ کتنا آسان تھا کہ ریڈیو پر آ کر اعلان کر دیتے، ہمیں افسوس ہے کہ بعض مجبوریوں کی وجہ سے ہم چھپے ہوئے پروگرام کی جگہ قوالی پیش کر رہے ہیں، مگر نہیں۔ ضیا اور اعجاز ایسے سرفروشوں اور جانبازوں سے یہی توقع کی جا سکتی تھی کہ رات کے دو ڈھائی بجے تک بھوکے پیاسے مارے مارے پھریں اور تقریر حاصل کر کے چھوڑیں۔

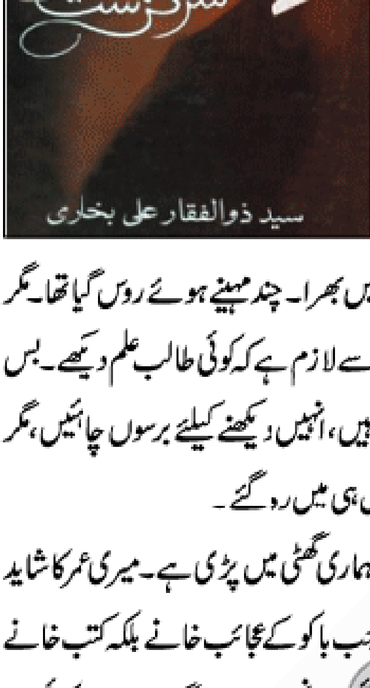
ان لوگوں کا ایمان تھا کہ چھپے ہوئے پروگرام کی جگہ چھپا ہوا پروگرام ہی نشر ہو، ہاں اگر کوئی موت واقع ہو جائے تو اور بات ہے۔ ورنہ یہ امر اشد ضروری ہے کہ ریڈیو سننے والوں کے ساتھ جو وعدہ ہوا سے پورا کیا جائے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

☆☆☆☆☆

آل انڈیا ریڈیو نے بڑے غلام علی خان کو میرے خلاف بھڑکایا

دورہ بھارت میں میرا نام استعمال کر کے خان صاحب کو کم معاوضہ دیا گیا- پاکستان واپسی پر مجھ پر برس پڑے- میں نے لاکھ تردید کی لیکن اعتبار نہ کیا- بھارتی سازش نے بالآخر موسیقی کے عظیم فنکار کو ہم سے چھین لیا- زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



لوگ تو کہہ گئے کہ "جھونکا ہوا کا تھا ادھر آیا اور ادھر گیا" مگر زندگی کے متعلق میرا نظریہ یہ نہیں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ زندگی بہت سہج سہج گزری ہے اور اب تو گویا گھٹنیوں چل رہی ہے۔ اب چاہتا ہوں کہ جھونکے کی طرح گزرے۔ اب میری یہ تمنا ہے کہ شب و روز آندھی کی طرح گزریں۔ اس سے میری یہ مراد نہیں کہ میں زندگی سے اکتا گیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ یہ رات جلد ختم ہو۔ مراد میری یہ ہے کہ زندگی میں جو تجربہ اٹھایا ہے وہ کسی کام آئے۔ مثلاً زندگی سے یہ تجربہ اٹھایا کہ جو علم حاصل کرنا چاہئے تھا وہ نہ کیا۔ اب ہوک اٹھتی ہے کہ پیر شو بیا موز پر عمل کروں اور کچھ اس طرح عمل کروں کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاؤں۔ آپ اسے باسی کڑھی کا ابال کہئے یا کسی اور نام سے موسوم کیجئے، لیکن میرے نزدیک یہ جذبہ ہی میری زندگی میں اب رہبری کرنے کو رہ گیا ہے اور بس۔ اس جذبے کے تحت چاہتا ہوں کہ سفر کروں۔ بہت سفر کیا ہے، ابھی جی نہیں بھرا۔ چند مہینے ہوئے روس گیا تھا۔ مگر طوفان کی طرح گیا اور آندھی کی طرح واپس آ گیا۔ اتنی فرصت نہ ملی کہ روس کو اس نظر سے دیکھوں جس نظر سے لازم ہے کہ کوئی طالب علم دیکھے۔ بس اچٹتی نظر سے دیکھا۔ روس میں ہماری تہذیب اور ہمارے تمدن کے بڑے بڑے بیش بہا خزانے پڑے ہیں، انہیں دیکھنے کیلئے برسوں چاہئیں، مگر میں نے انہیں دیکھا چند گھنٹوں میں۔ ایک تو میں ویسے ہی بے بضاعت اور پھر وقت کی تنگی، دل کے ارمان دل ہی میں رہ گئے۔

باکو، آذربائیجان میں ہے اور آذربائیجان وہ خطہ ہے جس نے نظامی گنجوی پیدا کیا۔ نظامی گنجوی کی مخزن اسرار ہماری گھٹی میں پڑی ہے۔ میری عمر کا شاید ہی کوئی مسلمان ایسا ہو جس نے مخزن اسرار کا مطالعہ نہ کیا ہو یا جسے اس مثنوی کے کچھ اشعار یاد نہ ہوں۔ میں جب باکو کے عجائب خانے بلکہ کتب خانے میں گیا تو سب سے پہلے نظامی گنجوی کی کتابوں کا رخ کیا اور کچھ یادداشتیں بیٹھ کر لکھنا شروع کیں۔ خیر یہ تو کوئی بات نہیں، میری جگہ میری عمر کا کوئی اور آدمی ہوتا تو وہ بھی اس نعمت غیر مرقبہ سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور اٹھاتا جس کا ڈھیر سامنے لگا ہوا تھا۔ تعجب تو مجھے اس بات پر ہوا کہ اس کتب خانہ کے کارپرداز میرے انہماک پر نہیں بلکہ اس بات پر متعجب ہوئے کہ یہ شخص فارسی جانتا ہے اور نظامی کے کلام سے کچھ شدبد رکھتا ہے۔ ان کا استعجاب دیکھ کر میں نے مناسب یہی سمجھا کہ سب کام چھوڑ کر ان کی خدمت میں عرض کروں، حضرات آپ کا ملک بڑا اور ہمارا چھوٹا ہی سہی، لیکن ذرا دیوار کے باہر جھانک کر دیکھ تو لیجئے کہ ایک پاکستان میں نظامی کے کتنے دلدادہ پڑے ہوئے ہیں۔ پروفیسر لالہ عبدالرحیم، صوفی تبسم، عابد، حفیظ ہوشیارپوری، شیخ محمد اکرام، مولانا غلام رسول مہر، عندلیب شادانی۔ کس کس کے نام گنواؤں۔ خیر ان سے تو جو کچھ میں نے کہا سو کہا، اپنے آپ کو بھی تھوڑا بہت ملامت کیا کہ ہم ایسی مری مٹی کے کیوں ہیں کہ ہمارے ملک کے اہل علم کا حال روسیوں کو معلوم ہی نہیں۔ اتنا بھی نہیں معلوم کہ اب بھی لاہور کی پبلک لائبریری میں ان فارسی کتابوں کا بیش بہا ذخیرہ ہے، جن کے مصنفوں کے بت روس والوں نے جا بجا نصب کر رکھے ہیں۔

لاہور کے کتب خانہ میں فارسی کتابوں کا بیش بہا ذخیرہ پڑا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کتابوں کو کوئی پڑھنے بھی جاتا ہے یا نہیں اور اگر جاتا ہے تو اس کا سن کیا ہوتا ہے۔ آیا ان میں نوجوان بھی ہیں یا نہیں۔ نوجوان آج کل کے سائنس پڑھتے ہیں یا انگریزی ادب۔ نہ سائنس بری شے ہے نہ انگریزی ادب۔ لیکن وہ اسلامی ثقافت، وہ اسلامی تمدن، وہ اسلاف پر افتخار کہاں سے آئے گا، جس کی ہمیں جستجو چاہئے۔ ہائیڈروجن بم کی ساخت کا نسخہ اگر ہاتھ آ گیا تو کیا مخزن اسرار کے نسخے کا نعم البدل قرار دیا جا سکے گا؟ میں بہک گیا ہوں۔ مجھے بہکنا نہ چاہئے۔ روس کا ذکر کر رہا تھا۔ بس روس ہی کی حد میں اپنے آپ کو محدود رکھنا چاہئے۔ باکو کے اس کتب خانے میں صرف وہ کتابیں اور تصاویر وغیرہ رکھی گئی ہیں جن کا تعلق آذربائیجان سے ہے۔ اس میں نظامی گنجوی کے جملہ کلام کے علاوہ ہر اس شاعر کا کلام بھی پایا جاتا ہے جو آذربائیجان میں پیدا ہوا ہو۔ یہاں تک کہ فضولی کا کلام بھی آب و تاب کے ساتھ شائع کر کے اس کتب خانے میں جمع کر دیا گیا ہے۔ فضولی جیسے بیسیوں شاعر ہمارے یہاں گزرے اور گمنامی کی گرد کے نیچے دفن ہو گئے ہیں۔ مراد میری یہ ہے کہ یہ شاعر فارسی ادب میں وہ درجہ نہیں رکھتا جو فارسی کے دیگر مستند اساتذہ کو حاصل ہے۔ مگر پھر بھی چونکہ آذربائیجان کا رہنے والا تھا اس کی قدر و منزلت کی گئی اور اس کا دیوان زینت کتب خانہ بنا۔ خیر یہ تو ہوا کتب خانہ آذربائیجان۔ ایک بات میں نے ایسی دیکھی کہ روسیوں کے جذبہ حب الوطن کی داد دینا پڑی۔ اس کتب خانے میں دنیا بھر کی ہر وہ کتاب موجود ہے جس میں کسی نہ کسی طرح آذربائیجان کا ذکر آیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کتاب کے مصنف کی تصویر بھی موجود ہے۔ ایک ولولہ اٹھا کہ لاہور، پشاور، ملتان، ٹھٹھہ اور ڈھاکے کا تذکرہ دنیا بھر کی کتابوں میں موجود ہے۔ ہم بھی اگر ان میں وہ کتابیں اکٹھی کریں جن میں ان شہروں کا تذکرہ ہے تو شاید ہمارے نوجوانوں کو اس امر کا احساس ہو کہ ہم بھی کچھ تھے اور ہم بھی کچھ بن سکتے ہیں۔ مگر پھر خیال آیا کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے:

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میر جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

اب سنتا ہوں کہ ایک ثقافتی ادارہ پاکستان کونسل کے نام سے زیر تشکیل ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا اس ادارے کو پروان چڑھائے۔ کیا تعجب کہ اسی ادارے کے باعث ہم وہ گنج ہائے گراں مایہ پھر حاصل کر لیں، جس کی گمشدگی کا حال ہم خاک لئیم سے پوچھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔

ہم نے ایک مرتبہ آغا شاعر قزلباش کو زحمت دی کہ ریڈیو پر چند بڑے بڑے مشاعروں کا ذکر کریں، جن میں آغا صاحب نے شرکت کی ہو۔ آغا صاحب مرحوم و مغفور ہماری درخواست سن کر کچھ متعجب ہوئے۔ مجھ سے پوچھا کہ کیوں میاں ان مشاعروں کا حال سن کر تم کیا کرو گے۔ میں اور تو ان کی خدمت میں کچھ عرض نہ کر سکا صرف یہ کہا کہ حضور، آج کل مشاعروں میں مدعو کئے جاتے ہیں۔ کیا حضور کو آج کل کے مشاعروں میں اپنا کلام سنا کر یا دوسروں کا کلام سن کر وہی حظ حاصل ہوتا ہے جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ فرمایا ہرگز نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ اس کا کوئی باعث ہوگا۔ میری بات سن کر آغا صاحب قبلہ خاموش ہو گئے۔ یوں کہئے کہ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر کہا، ہاں میاں آج کل کچھ مزا نہیں آتا۔ یہ چبوترے پر کھڑے ہو کر شعر پڑھنا ہمیں راس نہیں آتا اور پھر سامعین! اللہ کی پناہ کرسیوں پر بیٹھے ہیں، تالیاں بجا رہے ہیں، سگریٹ پی رہے ہیں، فقرے بازی فرما رہے ہیں۔ اب بتائیے کہ ایسی حالت میں شعر پڑھنے کو کیا جی چاہے اور شعر سے حظ اٹھانے کا موقع کیونکر میسر آئے۔

میں نے عرض کیا کہ قبلہ اگر آپ پرانے مشاعروں کا تذکرہ ریڈیو پر فرمائیں گے تو ممکن ہے کہ آئندہ مشاعرے منعقد کرنے والا کچھ سبق حاصل کرے۔ مثلاً یہ کہ یا تو سرے سے مشاعرے کرانے سے تاب ہو جائے یا اگر مشاعرہ کرائے تو مخصوص اور محدود۔ یہ نہیں کہ ہر ایک کو دعوت مبارزت دے کر کرسیاں تڑوائے اور تالیاں پٹوائے۔ آغا صاحب بمشکل تمام راضی ہوئے اور تقاریر کا سلسلہ ریڈیو پر شروع ہوا۔ آغا صاحب نے داغ اور امیر مینائی کے مشاعروں کا ذکر کیا۔ اے کاش وہ مسودے کہیں سے دستیاب ہو جائیں۔ آغا صاحب کے بیان میں ایک سحر تھا۔ ایک جیتا جاگتا جادو تھا۔ لفظوں لفظوں میں نقشہ کھینچ کر رکھ دیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ واقعی حضرت داغ شعر پڑھ رہے ہیں اور حضرت امیر مینائی واقعی بیٹھے شعر سن رہے ہیں۔ یہ تقریر سن کر ہماری جو کیفیت ہوئی سو ہوئی خود حضرت آغا قزلباش کا یہ حال تھا کہ تقریر کرتے کرتے ان کی گھگھی بندھ گئی۔ داغ کا شعر پڑھنے لگے تو بے اختیار منہ سے نکل گیا، ہائے استاد...... کوشش تو ریڈیو کی یہی رہی کہ ریڈیو کی موسیقی ایسی ہو کہ معیار پر درست اترے، لیکن زبردست کا ٹھینگا سر پر۔ ہزاروں خطوط اس مضمون کے موصول ہوئے کہ ہمیں تو وہ موسیقی سناؤ جو لنکا کے ریڈیو سے نشر ہوتی ہے۔ اگر ان فرمائشوں کو قابل اعتنا نہ سمجھا جائے تو اپنے ملک کا ریڈیو گردن زدنی ہو جاتا ہے۔ سننے والے کسی غیر ملکی ریڈیو کو سن کر اپنی تسکین کا سامان مہیا کر لیتے ہیں اور اس بات سے بالکل بے نیاز ہو جاتے ہیں کہ غیر ملک نے موسیقی کی مٹھاس کی تہ کے نیچے وہ زہر چھپا رکھا ہے جو ہماری قوم اور ہماری قومیت کیلئے سخت مضرت رساں ہے۔

کشمیر کے مسئلہ نے اور بھارت سے مسلمانوں کے انخلا کے معاملے نے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں، ورنہ ابھی کل کی بات ہے کہ ہم اس بات پر مصر تھے کہ فلم ہو تو بھارت کی، موسیقی ہو تو بھارت کی، ریشم ہو تو بھارت کا، کھدر ہو تو بھارت کا۔ چلئے خیر صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہنا چاہئے۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ ہماری آنکھیں تو کھلیں، ہم میں قومیت کا احساس تو پیدا ہوا۔ جن صاحب نے راگوں کو غیر اسلامی بتایا ہے انہوں نے بھی قومیت ہی کے جذبے سے سرشار ہو کر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ جب انہیں اس بات کا احساس ہو جائے گا کہ یہ راگ ہمارے ہیں، ہم مسلمانوں کی ایجاد ہیں، ہم مسلمانوں نے راگوں کو دنیا میں پھیلایا ہے، ہم مسلمانوں نے یورپ کو ساز دیئے ہیں اور سروں کے مختلف امتزاج سے واقف کرایا ہے تو یقین ہے کہ وہ اپنی رائے بدل لیں گے۔ غلط فہمی اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ بھارت نے ہمارے راگوں کو اپنا لیا ہے۔ بالکل اس طرح جس طرح ہماری شیروانی اور ہمارے آڑے پاجامے کو اپنا لیا ہے۔ مگر ان کے اپنانے سے کیا ہوتا ہے، ہم اپنی ملکیت کو کیوں چھوڑ دیں، مگر ہائے!

غنی روز سیاہ پیر کنعان را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

یہ سب وشنو ڈگمبر اور بھارت کھنڈے کا کام ہے۔ انہوں نے موسیقی میں ہمارے کارناموں کی زبردستی شدھی کرانی چاہی، مگر اصل اصل ہے اور نقل نقل۔ بڑے غلام علی خان صاحب، نزاکت سلامت، امان علی فتح علی، قدرت اللہ عاشق علی، امید علی مہر علی کی موسیقی جب اہل بھارت سنتے ہیں تو انہیں ضرور احساس ہوتا ہے کہ تصنیف را مصنف نیکو کند بیان۔ بڑے غلام علی خان صاحب کا ذکر چل نکلا ہے تو آج وہ بات بھی عرض کر دوں جو بہت مدت سے میرے دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی ہے۔ بڑے غلام علی خان صاحب مجھ سے ناراض ہیں۔ فنکار نازک مزاج اور حساس ہوتے ہیں۔ جب ایک مرتبہ ان کے دل میں کوئی بات گھر کر جائے تو نکالے نہیں نکلتی۔ ہوا یہ کہ ایک مرتبہ خان صاحب کسی میوزک کانفرنس میں شرکت کرنے کیلئے ہندوستان گئے۔ کانفرنس میں شرکت کرنے کے بعد بھارت کے ریڈیو سے ان کے پروگرام نشر ہونے کی باتیں ہونے لگیں۔ جب بھارت کے ریڈیو والے خان صاحب کے پاس معاملہ طے کرنے آئے تو پروگرام کیلئے خان صاحب کی خدمت میں بہت ہی کم معاوضہ پیش کیا۔ خان صاحب اس بنئے پن سے بہت ناراض ہوئے اور بجا طور پر ناراض ہوئے۔ خان صاحب نے صاف کہہ دیا کہ میں اتنے کم معاوضے پر پروگرام نشر نہیں کروں گا۔ بھارتی ریڈیو والوں نے جب خان صاحب کو برہم دیکھا تو کہا کہ خان صاحب، ہم تو آپ کو سونے چاندی میں تول دیتے مگر ہم اس کا کیا علاج کریں کہ ہمیں بخاری نے لکھا ہے کہ خان صاحب کو فلاں رقم سے زیادہ معاوضہ نہ دیا جائے۔

خان صاحب نے جب میرا نام سنا تو کم معاوضے پر پروگرام نشر کرنے کی ہامی بھر لی مگر جب بھارت کے دورے کے بعد کراچی آئے تو انہوں نے میرے لتے لینے شروع کر دیئے اور مجھ سے پوچھا کہ بتاؤ تم نے بھارت والوں سے یہ کیوں کہا کہ خان صاحب کو کم معاوضہ پر پروگرام دینا۔ اب میں ہزار کہتا ہوں کہ خان صاحب اگر کوئی ملک آپ کو ہیرے جواہرات دے تو چشم ما روشن دل ماشاد، ہمیں کیا ضرورت پڑی تھی کہ ہم غیر ملکیوں میں آپ کی فیس کم کراتے پھریں۔ میں نے تو یہاں تک کہا کہ میں آپ کو لکھ کر دیتا ہوں کہ بھارت والوں سے میری اس معاملے میں کوئی خط و کتابت یا کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ آپ یہ خط ان کو دکھا دیں اور پھر دیکھیں کہ وہ کیا کہتے ہیں، مگر خان صاحب نے میری ایک نہ مانی اور یہی رٹ لگاتے رہے کہ نہیں تم نے انہیں ضرور لکھا ہوگا۔ رفتہ رفتہ بات سب اخباروں اور سب موسیقی دانوں تک پہنچ گئی اور بے چارے بخاری کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ کسی سرکاری ادارے کے خلاف کوئی بات ایک مرتبہ پھیل جائے تو بس خدا دے اور بندہ لے۔ آپ ہزار تردید کیجئے مگر بات وہیں کی وہیں رہتی ہے۔ آپ کی تسکین ضرور ہو جاتی ہے کہ چلو ہم نے تردید کر دی، لیکن تردید کے مرہم سے غلط افواہ کا زخم مندمل نہیں ہوتا۔ بات راج دربار تک پہنچی اور راج دربار نے ہم سے کیفیت طلب کی۔ کیفیت طلب کا ریڈیو میں انسان کو عادی ہونا پڑتا ہے۔ میں اس توبیخ کا عادی تھا۔ مگر اب کے مجھے اس کیفیت طلبی سے شدید صدمہ پہنچا۔ پہلی بات تو یہ کہ میں موسیقی کا دلدادہ ہوں، دوسری بات یہ کہ میں غلام علی خان صاحب کا مداح ہوں اور تیسری بات یہ کہ مجھے باؤلے کتے نے کاٹا تھا کہ میں بھارت کے ریڈیو سے مل کر خان صاحب غلام علی خان کے خلاف ساز باز کروں۔ استغفر اللہ۔ میں نے کیفیت پیش کی اور یہ کیفیت قابل قبول بھی سمجھی گئی، لیکن پھر بھی اس صدمے کا داغ دل پر رہا جو خان صاحب نے محض اپنی فنکارانہ ہٹ دھرمی کے باعث مجھے پہنچایا تھا۔ اجی خان صاحب!

تم کو تو چاہنے والوں کی بھی پہچان نہیں

اب خان صاحب آئے دن ہندوستان کا دورہ کرنے لگے۔ ایک مرتبہ دورے سے واپس آئے تو مجھ سے کہا کہ بھارت میں میری بڑی قدر ہوتی ہے، یہاں تم لوگ میری کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ ہم نے کہا خان صاحب ہم آپ کو پاکستان کا سب سے بڑا موسیقار تسلیم کرتے ہیں اور آپ کی ہر طرح دلجوئی کرنے کو تیار ہیں۔ فرمائیے، آپ کیا چاہتے ہیں۔ خان صاحب نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو مجھے تین ہزار روپے ماہوار ریڈیو سے ملنا چاہئے۔

یہاں میں معذور تھا

گر جان طلبی مضائقہ نیست
زر می طلبی سخن در ین نیست

میں تین ہزار روپے ماہانہ کہاں سے لاتا کہ خان صاحب کو پیش کرتا۔ جب میں نے اپنی معذوری ظاہر کی تو خان صاحب پھر بگڑے اور فرمایا، اچھا اگر یہ بات ہے تو میں پاکستان چھوڑ کر ہندوستان جا رہا ہوں۔ میں خان صاحب کی بات سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ پاکستان میں مقیم بھارتی نمائندوں نے پہلے ہی خان صاحب پر ڈورے ڈال رکھے تھے اور خان صاحب کو پاکستان چھوڑنے پر اکسا رہے تھے۔ آخر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ اب کی مرتبہ جو خان صاحب بھارت کے دورے پر گئے تو وہیں کے ہو رہے اور بھارتی قومیت حاصل کرنے کیلئے تگ و دو شروع کر دی۔ بھارت والے ایک کائیاں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ شکار جال میں پھنس گیا ہے تو انہوں نے کہا، جال میں پھنسے ہوئے پنچھی کو جال سے باہر نکالنے کی کیا جلدی ہے، اسے یہیں تڑپنے دو، ذرا اس کا زور ٹوٹے۔ مراد میری یہ ہے کہ خان صاحب کو ہندوستانی قومیت حاصل کرنے میں برسوں لگ گئے۔ خان صاحب نے کہا چلو یہ کام ہوتا رہے گا، اب ریڈیو پر پروگرام کر کے گزر بسر کیلئے کچھ کماؤں تو سہی، چنانچہ خان صاحب نے دہلی ریڈیو کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مگر وہاں سے یہ جواب ملا کہ خان صاحب جب تک آپ کو ہندوستانی قومیت کا پروانہ نہ مل جائے ہم آپ کا پروگرام ریڈیو سے نشر نہیں کر سکتے۔ آخر بڑی دوڑ دھوپ کے بعد برسوں میں کہیں جا کر خان صاحب کو بھارتی قومیت کا پروانہ ملا۔ مگر وائے تقدیر۔ ابھی چند ہی پروگرام کرنے پائے تھے کہ فالج کے موذی مرض نے ان کو آ گھیرا۔ پاکستان بھی چھوڑا، بھارتی بھی بنے، بھارت سے خطاب بھی پایا، لیکن افسوس کہ صحت نے جواب دے دیا۔

یہ تو ہے واقعہ خان صاحب غلام علی خان کے پاکستان چھوڑنے کا۔ مگر اب بھی جب کبھی خان صاحب کا ذکر چھڑ جائے تو لوگ باگ یہی کہتے ہیں کہ خان صاحب نے بخاری کے ہاتھوں پاکستان چھوڑ کر ہندوستانی قومیت اختیار کی۔ اب میں کیا کہوں سوائے اس کے کہ......

تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

ریڈیو تو اکیلا چنا ہے، یہ کیا بھاڑ پھوڑے گا۔ صرف ریڈیو کی کمائی پر بڑے بڑے فنکار زندہ نہیں رہ سکتے اور ملک کے اہل دل اس طرف توجہ نہیں فرماتے۔ ملک کے اکثر و بیشتر موسیقار اس وقت پریشان حال ہیں۔ اگر ان کی سرپرستی نہ کی جائے تو ہم امیر خسرو، سلطان حسین مشرقی جیسے اہل دل اور اہل علم کی میراث سے محروم رہ جائیں گے۔ ایک طرف تو اہل فن کی پریشان حالی اور پھر یہ ہانک کہ راگ غیر اسلامی شے ہے۔ توبہ! ہم کو بھی کیسے کیسے ثقافتی تاریخ دان ملے ہیں۔

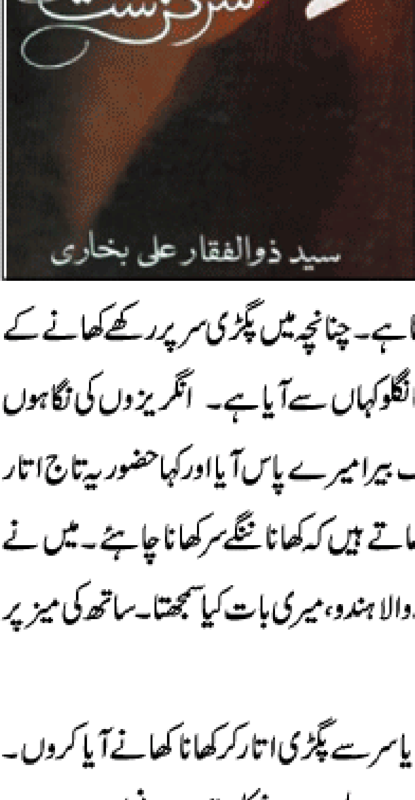
ان نینن کا یہی بسیکھ
وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھا

(جاری ہے)

☆☆☆☆☆

انگریزوں کی خفگی کے باوجود سر سے پگڑی نہیں اتاری

کلکتہ کے انگریزی ہوٹل میں پگڑی باندھ کر پہنچا تو گورے حیرت سے دیکھنے لگے-ایک بیرے نے کہا، حضور یہ تاج اتار دیں-صاحب لوگ فرماتے ہیں کھانا ننگے سر کھانا چاہئے- میں نے کہا، ننگے سر شیطان دھولیں مارتا ہے- زیڈ اے بخاری کی کتاب سے اقتباس



رضا علی وحشت اور منشی عبدالکریم نشتر دونوں اس دنیا میں نہیں رہے۔ مگر ان کی یاد اب تک دل کو تڑپاتی ہے اور مرتے دم تک تڑپاتی رہے گی۔ انیس سو پچیس یا سن چھبیس کا ذکر ہے کہ میں پہلی مرتبہ کلکتے گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب میں شملے کے آرمی ہیڈ کوارٹرز میں ملازم تھا۔ سال میں دو مرتبہ ملازمت کے سلسلے میں کلکتے کا دورہ لگتا تھا اور یوں سال میں دو مرتبہ کلکتے کی سیر ہوتی تھی۔

جب میں پہلی مرتبہ کلکتے گیا تو ایک انگریزی طرز کے سستے ہوٹل میں ٹھہرا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے بیرے، خانساماں اور میرے علاوہ اس ہوٹل میں کوئی دیسی نہ تھا۔ سب کے سب انگریز یا نیم انگریز تھے۔ میں ویسے تو اس زمانے میں سوٹ پہنتا تھا، مگر میرے سر پر عموماً پگڑی ہوا کرتی تھی اور وہ بھی پشاوری۔ انگریزی ہوٹلوں کا قاعدہ ہے کہ انگریز، کھانے کے کمرے میں داخل ہوتے وقت اپنا سر پوش اتار دیا کرتے ہیں۔ اب میں پگڑی کیسے اتارتا۔ ہیٹ کی طرح پگڑی اتارنا بہت معیوب معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ میں پگڑی سر پر رکھے کھانے کے کمرے میں داخل ہوا۔ مجھے دیکھ کر انگریزوں کو بہت حیرت ہوئی۔ سب مجھے تعجب سے دیکھنے لگے یہ جانگلو کہاں سے آیا ہے۔ انگریزوں کی نگاہوں کے تیر مجھے چھپ رہے تھے مگر میں ٹس سے مس نہ ہوا اور سر پر پگڑی رکھے سوپ زہر مار کرتا رہا۔ آخر ایک بیرا میرے پاس آیا اور کہا حضور یہ تاج اتار دیجئے۔ میں نے کہا میاں تاج اس آسانی سے نہیں اترتے۔ کہا صاحب لوگ اعتراض کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ کھانا ننگے سر کھانا چاہئے۔ میں نے کہا کہ میاں ان سے کہہ دو کہ ننگے سر دستر خوان پر بیٹھیں تو شیطان دھولیں مارتا ہے۔ وہ بیرا بہار کا رہنے والا ہندو، میری بات کیا سمجھتا۔ ساتھ کی میز پر جا کر انگریز صاحبان سے کہا کہ، ہم صاحب کی بولی نہیں سمجھتا"۔

خیر اس وقت تو بات آئی گئی ہو گئی مگر میں نے مناسب یہی سمجھا کہ یا تو اس ہوٹل سے کنارہ کشی کرلوں اور یا سر سے پگڑی اتار کر کھانا کھانے آیا کروں۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ ایک مرتبہ پگڑی اتارنے سے انکار کر چکا تھا۔ اب انکار کو اقرار میں تبدیل کرنا میرے لئے بہت مشکل تھا۔ جوانی کا زمانہ اور انانیت کا زور، جذبہ نخوت نے اور جذبہ انا نے جیسا دیس ویسا بھیس کے زرین اصول پر کاربند ہونے سے روکا اور میں ہوٹل سے کنارہ کشی کرنے کی فکر میں باہر نکل آیا۔ مگر کہاں جاؤں؟ خیال آیا کہ اسی شہر میں رضا علی وحشت رہتے ہیں۔ ان سے جا کر ملا جائے پھر جو ہو سو ہو۔ وحشت صاحب سے میں غائبانہ طور پر متعارف تھا۔ ان کا کلام اکثر رسائل میں پڑھتا تھا اور اس سے استفادہ کرتا تھا۔ مگر وہ مجھے کیا جانیں۔ میں ہوں ہی کیا یا تھا ہی کیا، وحشت جیسا عظیم المرتبت انسان مجھے درخور اعتنا سمجھتا۔

وحشت صاحب ان دنوں کلکتے کے مدرسے میں اردو کے پروفیسر تھے۔ ان کا پتہ لگانا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ میں مدرسے میں گیا تو معلوم ہوا کہ گھر پر تشریف لے گئے ہیں۔ گھر کا پتہ پوچھا اور ٹیکسی میں سوار ہو کر در دولت پر جا کر دستک دی۔ دوپہر کا وقت تھا، ملازم نے میرا نام پتہ پوچھا۔ مگر بندہ خدا نے یہ نہ بتایا کہ مولانا آرام فرما رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں مولانا باہر تشریف لائے۔ میں نے معذرت چاہی کہ اس استراحت کے وقت میں مخل ہوا۔ وحشت صاحب نے فرمایا، استراحت کہاں، خواب غفلت میں تھا، اچھا ہوا کہ تمہارے آنے سے بیدار ہو گیا۔ دیوان خانے میں لے گئے۔ ان دنوں ان کا ایک صاحبزادہ دماغی مرض میں مبتلا تھا اور گھر کے صحن کے ستون کے قریب پابہ زنجیر تھا۔ میرا فرض تھا کہ اس نوجوان کے مزاج کا حال مولانا سے پوچھوں۔ مولانا نے ایک آہ بھری اور کہا، کیا کروں متعدد بار ارادہ کیا کہ اس بچے کو دماغی امراض کے شفاخانے میں داخل کر دوں، مگر محبت مانع آتی ہے۔ میں خود دیوانہ ہوں اور دیوانوں سے محبت کرتا ہوں۔ خیر ادھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ مجھ سے کہا کہ تمہارا نام میں نے سنا ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ تم کلکتے میں آئے ہوئے ہو۔ میرا فرض تھا کہ تمہارے پاس آتا، لیکن مکروہات نے آج تک روکے رکھا۔ آج ارادہ تھا کہ تم سے جا کر ملوں۔ میں نے کہا، حضرت یہ تو میرا فرض تھا کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ میرا اتنا کہنا تھا کہ مولانا نے تنبیہ کے انداز میں "ہاں" کہا۔ میں سہم کر چپ ہو گیا تو بہت تحمل سے فرمایا کہ قدیم زمانے کی میراث یہی اخلاق رہ گیا۔ وہ بھی تم چھیننا چاہتے ہو۔ گفتگو کے ابتدائی مراحل طے ہوئے تو میں نے کہا کہ حضرت آپ کے ایک دوست منشی عبدالکریم نشتر چھپروی کی بہت تعریف سنی ہے اور ان سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے کا بہت مشتاق ہوں۔ فرمایا ہاں نشتر صاحب میرے خاص دوست ہیں بلکہ یوں کہیئے کہ کلکتے میں میرے دوست نشتر صاحب ہی ہیں۔ یہاں قریب ہی رہتے ہیں۔ بہت قریب۔ مگر بات یہ ہے کہ ہم دونوں صرف اتوار کے روز ایک دوسرے سے ملا کرتے ہیں۔ ہفتے کے دوران میں ایک دوسرے کے اوقات میں مخل نہیں ہوتے۔ میں نے عرض کیا کہ وحشت صاحب ہفتے کے دوران میں آپ کو ایک دوسرے سے کوئی کام نہیں پڑتا۔ فرمایا پڑتا ضرور ہے مگر ایسا موقع آئے تو ہم ایک دوسرے کو پوسٹ کارڈ لکھ کر بھیج دیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ پوسٹ کارڈ کیوں، آپ تو فرماتے ہیں کہ مولانا نشتر کا گھر بہت قریب ہے۔ آپ ملازم کے ہاتھ رقعہ کیوں نہیں ارسال فرماتے۔ فرمایا اس میں ایک قباحت ہے اور وہ یہ کہ اگر نشتر صاحب کا ملازم میرے دروازے پر آئے تو اسے بات کرنا اور نشتر صاحب کا مزاج پوچھنا میرا فرض ہو جاتا ہے۔ یہی حال نشتر صاحب کا ہے۔ اگر میرا آدمی میرا رقعہ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہو تو نشتر صاحب کا باہر نکل کر ملازم سے بات کرنا لازمی ہے۔ اخلاق کے یہ ضروری مسائل طے کرنے میں وقت صرف ہوتا ہے۔ اس لئے ہم ایک دوسرے کو ڈاک کے ذریعے پوسٹ کارڈ بھیج دیتے ہیں۔ ہفتے کے دوران میں ایک دوسرے سے مل کر یا ایک دوسرے کے ہاں اپنا ملازم بھیج کر ایک دوسرے کے اوقات پر دست درازی نہیں کرتے۔ میں نے کہا کہ حضرت یہ سب درست ہے لیکن میں نشتر صاحب سے ملنے کا خواہشمند ہوں۔ مجھے ان کے گھر کا پتہ بتا دیجئے، بس میں خود ہی چلا جاؤں گا۔ آپ کی استراحت میں مخل ہونے کے گناہ کا ارتکاب کیا ہے تو ان کے اوقات میں خلل ڈالنے کا جرم بھی کرتا جاؤں۔ مولانا کچھ خاموش ہو گئے اور اٹھ کر شیروانی پہننے لگے۔ میں نے کہا، آپ بھی نشتر صاحب کے وہاں تشریف لے جائیں گے۔ فرمایا اب تم کو اکیلا کیوں کر بھیج دوں۔

غرض یہ کہ مولانا اور یہ خاکسار نشتر صاحب کے در دولت کی طرف روانہ ہوئے۔ میں یہ سمجھا تھا کہ نشتر صاحب کا مکان اگر قریب بھی ہے تو کم از کم دس بارہ منٹ تو وہاں تک پیدل چلنے میں لگیں گے۔ مگر نہیں گلی کا موڑ مڑے ہی تھے کہ نشتر صاحب کا مکان آگیا۔ اور نشتر صاحب مولانا وحشت کو اور مولانا وحشت نشتر صاحب کو ہفتے کے دوران میں اگر کوئی کام آپڑے تو ڈاک کے ذریعہ پوسٹ کارڈ بھیجا کرتے تھے۔ اللہ اکبر۔

نشتر صاحب کے دروازے پر دستک دی۔ ملازم باہر نکلا اور ہمیں دیکھتے ہی سلام کر کے فوراً چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں نشتر صاحب تہبند باندھے بنیان پہنے گھبرائے ہوئے باہر نکلے۔ اور سخت مضطرب ہو کر پوچھا، خیر باشد، خیر باشد۔ وحشت صاحب کیسے تشریف لائے؟ مراد نشتر صاحب کی یہ تھی کہ آج تو اتوار کا دن نہیں ہے۔ یہ آپ پر کیا افتاد پڑی کہ آپ غریب خانے پر آئے، اللہ خیر کرے! مولانا نے میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ ان کو لایا ہوں۔ یعنی مولانا نے نشتر صاحب کو بتایا کہ خلاف معمول ہفتے کے دوران میں اس لئے آیا کہ بخاری کی افتاد مجھ پر پڑ گئی ہے۔ نشتر صاحب بڑے اخلاق کے آدمی تھے اور بے حد مسافر نواز۔ مجھے اور مولانا وحشت کو دیوان خانے میں لے گئے اور خاطر تواضع میں وہ فیاضی دکھائی کہ آج تک یاد ہے۔

چھپرے کے متعلق بہت سی روایات سن رکھی تھیں اور چھپرے کے علم و فضل کا دل سے قائل تھا۔ پٹنہ اور چھپرہ ہماری ثقافت کے مرکز رہے ہیں۔ یہ وہی پٹنہ یا عظیم آباد ہے۔ جو بیدل کا وطن تھا۔ شاد عظیم آبادی کا وطن تھا۔ مرزا یاس یگانہ کا مولد تھا اور یہ وہی چھپرہ ہے جہاں مولوی خدا بخش پیدا ہوئے۔ وہ مولوی خدا بخش جنہوں نے پٹنے میں اورینٹل لائبریری قائم کی۔ نشتر صاحب اور وحشت صاحب دونوں شاعری کے دلدادہ تھے۔ وحشت کا نام نامی، سارے ہندوستان میں مشہور تھا۔ نشتر صاحب بھی کلکتے کے شعرا میں بہت ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ یہ شمس کے شاگرد تھے اور یوں ان کا سلسلہ ذوق سے ملتا تھا۔ مجھے شرارت سوجھی تو میں نے ذوق و غالب کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں غالب کا طرفدار، نشتر صاحب ذوق کے مداح اور وحشت صاحب ہم دونوں کا تماشہ دیکھنے والے۔ اس دن کی صحبت کچھ ایسی لطیف اور کیف آور تھی کہ نہ میرا جی چاہے کہ نشتر صاحب کو چھوڑوں اور نہ ان کا جی چاہے کہ مجھے رخصت کریں۔ آخر فیصلہ ہوا کہ ہوٹل سے میرا سامان منگوا کر نشتر صاحب کے گھر میں اتارا جائے اور میں نشتر صاحب کے یہاں رہوں۔ ہم تینوں ہوٹل جانے کے لئے سواری کی تلاش میں باہر نکلے۔ دو چار ٹیکسیاں نکل گئیں، مگر نشتر صاحب ویسے کے ویسے کھڑے رہے۔ آخر ایک گھوڑا گاڑی کو ٹھہرایا۔ اس پر ہم تینوں سوار ہو کر ہوٹل کی طرف چلے۔ راستے میں ہمت کر کے میں نے پوچھ ہی لیا کہ حضرت سست رفتار گھوڑا گاڑی کو تیز رفتار ٹیکسی پر کیوں ترجیح دی گئی۔ نشتر صاحب بولے، جلدی کاہے کی ہے؟ اس بات کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ میں کھسیانا ہو کر وحشت صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔ وحشت صاحب کو ہر بات پر ہنسی آتی تھی۔ یہ زمانہ ان کی جوانی کا تھا۔ اس قدر خوش مزاج اور ہنس مکھ تھے کہ شاید ہی کوئی ہو۔ آخری ایام میں جب ان کو ڈھاکے میں دیکھا تو اعتبار نہ آیا کہ یہ وہی وحشت ہیں، جن کے قہقہے کلکتے کے "فرپو" میں گونجا کرتے تھے۔ ہوٹل سے میرا سامان اٹھا لیا گیا اور میں نشتر صاحب کے یہاں فروکش ہوا۔ وحشت صاحب سے یہ قرار پایا کہ جب تک میں کلکتے میں نشتر صاحب کے یہاں ہوں اتوار کی ملاقات کے اصول کو ترک کیا جائے اور ہر روز ملنے کی صورت نکالی جائے۔ اب ہر روز محفلیں گرم ہونے لگیں۔ کبھی محفلِ عام اور کبھی محفلِ خاص، ایسی ہی خاص محفل میں ایک دن مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات ہوئی۔ یہ میری مولانا کی خدمت میں پہلی حاضری تھی۔ معلوم ہوتا ہے ان دنوں ہنسی بہت ارزاں تھی۔ وحشت، نشتر اور آزاد کی ہنسی کی آواز اب تک کانوں میں آرہی ہے۔

دوپہر کا وقت تھا اور گرمی کا موسم، مولانا وحشت، مولانا آزاد، حضرت نشتر اور یہ خاکسار نشتر صاحب کے دیوان خانے میں نیم دراز حالت میں بیٹھے خوش گپیاں اڑا رہے تھے۔ شعر پڑھ رہے تھے، شعر گا رہے تھے، شعروں پر رو رہے تھے، شعروں پر ہنس رہے تھے کہ سامنے کا دروازہ کھلا اور ایک باریش شخص دروازے پر یوں کھڑا ہو گیا جیسے دروازہ چوکھٹا اور وہ شخص تصویر۔ ہم سب یک لخت چپ ہو گئے۔ مولانا آزاد نے اس شخص کی طرف ایک دو ثانیہ دیکھا اور پھر زور سے کہا لاحول ولا قوۃ۔ لاحول کا سننا تھا کہ وہ شخص دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ خدا جانے لاحول کی اس تاثیر پر ہم لوگ کتنی دیر تک ہنستے رہے۔ یہ ہر بات پر ہنسنے والے حضرت جب غور و فکر کے دریا میں غوطے لگاتے تو تہہ کی خبر لاتے تھے، اس وقت ان کے چہروں پر ہنسی کا کوئی نشان نہیں ہوتا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ساری عمر کبھی ہنسے ہی نہ ہوں۔ ایک دن جو میں نشتر صاحب کے یہاں گیا، تو دیکھتا ہوں کہ مولانا وحشت اور مولانا نشتر دونوں سخت مغموم بیٹھے ہیں اور اس قدر خاموش بیٹھے ہیں کہ اللہ کی پناہ۔ میں نے کہا خدا خیر کرے، کہیں کوئی سانحہ تو نہیں ہو گیا۔ مگر پوچھوں کیسے، میں بھی خاموش بیٹھ گیا۔ بہت دیر کے بعد نشتر صاحب نے فرمایا، وحشت صاحب واقعی آپ تو گومگو کے عالم میں رہ گئے ہوں گے، وحشت صاحب بولے ہاں حضرت کیا عرض کروں۔ بس کچھ نہ پوچھئے۔ اب مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا حضرت کیا بات ہے؟ کچھ ہمیں بھی معلوم ہو۔ وحشت صاحب نے دروازے کی طرف یوں دیکھا جیسے اطمینان کر رہے ہوں کہ بند ہے۔ اور کوئی غیر آدمی ہماری بات نہ سن سکے گا۔ اس کے بعد نہایت رازداری کے لہجے میں فرمایا کہ آج میں مدرسے میں حضرتِ آتش کا کلام پڑھا رہا تھا۔ دہن بگڑا، کفن بگڑا، والی غزل زیر تدریس تھی۔ مگر حضرت ایک شعر نے میری سٹی گم کر دی۔ سمجھ میں نہ آیا کہ طلبا کے سامنے کیا عرض کروں۔ میں نے کہا فرمایئے کون سا شعر۔ فرمایا سنئے۔

لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زبان بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجئے دہن بگڑا

میں نے کہا، حضرت اس شعر میں کیا اشکال ہے۔ میری بات سن کر یہ دونوں حضرات ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ کبھی حیرت سے میرا منہ دیکھیں۔ کبھی ایک دوسرے کا۔ زبانِ حال سے فرما رہے تھے کہ یہ شخص بھی کودن نکلا۔ میں نے پھر عرض کیا حضرت اس شعر میں کیا اشکال ہے۔ وحشت صاحب نے فرمایا اشکال تو کوئی نہیں مگر حضرت زبان! میری سمجھ میں نہ آیا کہ زبان کی اس شعر میں کیا غلطی ہے۔ وحشت صاحب نے فرمایا، غور کیجئے، بخاری صاحب، توبہ توبہ، حضرتِ آتش اور ایسی فروگذاشت۔ میں نے کہا کہ حضرت کچھ پتہ بھی چلے کہ کیسی فروگذاشت؟ فرمایا۔ زبان بگڑی تھی تو بگڑی تھی یا زبان بگڑی تو بگڑی ہونا چاہئے تھا۔ مگر یہ کیا کہ زبان بگڑی تو بگڑی تھی۔ یہ "تھی" بیچ میں کہاں سے ٹپک پڑی۔ اب آپ بتایئے کہ میں طلبا کو کیا منہ دکھاؤں۔ یہ کہا اور دونوں پھر مراقبے میں چلے گئے۔ اب آپ کو کیا بتاؤں کہ میں نے کیا کیا جتن کئے جب جا کر یہ حضرات کہیں مراقبے سے باہر آئے اور پھر وہی شام اور وہی گھوڑا گاڑی اور وہی فرپو اور وہی کلکتے کے میدان۔ چند برس کے بعد سنا کہ نشتر صاحب مفقود الخبر ہو گئے ہیں۔ کسی نے کہا کہ مر گئے۔ کسی نے کہا کہ نہیں اپنے خیالوں میں غرق چھپرے کے کسی کونے میں چھپے ہوئے ہیں۔

ہائے وحشت! یہ تو وہ وحشت نہ تھا، جس کو کلکتے میں دیکھا تھا۔ وحشت تو ایسا خستہ حال کبھی نہ تھا۔ وحشت ایسا افسردہ دل کبھی نہ تھا۔ وحشت تو ایسا بیمار کبھی نہ تھا۔ وحشت اور بے گھر! میں نے نشتر کا حال پوچھا تو بولے جانے کہاں گیا، مگر اب تک دل میں چبھ رہا ہے۔ وحشت صاحب بھی اس جہاں سے چلے گئے۔ ان کے دل سے چبھن جاتی رہی۔ مگر نشتر کی چبھن اب تک میرے دل میں موجود ہے اور وحشت کا سودا بھی۔

☆☆☆☆☆